تعلیم نمبر

محور

۱۹۷۷ء

طلبہ و طالبات پنجاب یونیورسٹی کا اُردو مجلہ

سرپرست

ڈاکٹر خیرات محمّد ابنِ رسا

(وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی)

مشیر

پروفیسر مسکین علی حجازی

(ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ صحافت)

☆

☆

مدیرِ اعلیٰ

سلیم منصور خالد

ایم اے فاضل پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج

نگراں محور

پنجاب یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین

Printed by
Allahwala Printers 81 Shahrah Quaid-e-Azam Lahore

مشیر

مدیر اعلیٰ

طلبہ کی رہنمائی

زندگی کے ناقابل فراموش واقعات

گفتگو

پاکستان ہمارا

مطلع

مطلع ابر آلود نہیں !

مطلع "خشک" ۔ خشک تر ہے !

اس موسم کا نیمی پھل ——— "محور" —— "اس کی نظر میں خشک اور قلندر کی نظر خود آگاہ میں تر بہ تر ——!

محور" —— طرح طرح کے اشاروں، تبصروں اور نقروں کے جھکڑوں میں آپ کے درمیاں ——!

"بدقسمتی" سے "ہم واقع ہی ہوئے "خشک قلم" —— ہمارا "تصور حسن" پیام زندگی سے مرصع ہمارا "لطیفہ" خشک رومی اسرار خودی سے مالا مال ——!

"خوش قسمتی" سے "وہ" واقع ہی ہوئے "رنگیں مزاج" —— ان کا تصور رنگ و طرب ہے دل کے لیے موت ، اور زندوں کے لیے پیغام مرگ ——!

اس خشکی میں —— اس تری میں لے قارئین محترم ! لیجئے حاضر ہے آپ کا محور ——!

★ قائداعظمؒ اور اقبالؒ کی سوچوں کا نقیب ——— محور !

★ نئی نسلوں کا ترجمان ، شہدائے پاکستان کے لہو کا ——— محور !

★ مالک کی قربانی اور تسنیم عالم منظر کے ایثار کا ——— محور !

★ وحید شہید کے کردار اور البدر کے جذبۂ تحفظ پاکستان کا ——— محور !

ساتھیو ! آؤ ! اس محور میں اپنی تعلیم کا پہیہ گھمائیں ، سبز سے تیز تر طریق پہ چلا دیں —— !! آپ کو یاد ہو گا بوڑھے ہوتے ہی خشک رو ہیں ! اسی لیے تو مقصدیت کی "پھیکی پھیکی" باتیں کرتے رہتے ہیں ، ہمیں خوشی ہے کہ ہم "جوان نہیں ، ۲۴ ، ۲۵ کے پیٹے "بوڑھے" ہیں اور عزم رکھتے ہیں اُس پیغام انقلاب ، آوازۂ عظمت و کردار کی زندہ و جاوید لہروں کو کہساروں سے صحراؤں تک —— اور صحراؤں سے میدانوں تلک —— ! پھیلائیں گے ۔ انہیں پھیلانا ، اُبھارنا ، حق کو طاغوت کے کل پرزوں کو توڑ پھوڑ کے انہیں مسلط کرنا آپ کی —— ہم سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے ۔ آیئے ! مل جل کر ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں ، —— بظاہر کام کٹھن ہے ۔ ظاہر ہے اس راہ پُرپیچ میں نہ قالینوں سے آراستہ رم و گداز راستے ہیں اور نہ کہکشاں کی سی ٹھنڈک —— ! سچ ہے کہ ذمہ داری ہوتی ہی کٹھن ہے "جس میں ہو نہ کش مکش موت ہے وہ زندگی" !!

جوانو !

ایک بات یاد آئی —— خشک موسم اس بات کا ضامن ہے کہ کپاس کی فصل بہتر ہو ۔ اور یاد ہے کچھ

ذرا ذرا کر ــــ کپاس شرم و حیا کی ضامن، تن بدن ڈھانپنے کا وسیلہ! اے کاش! کہ ہم خشکی کے" ان سوتوں" سے عفت و حیا کی جوت جگا کر اپنی ملت، اپنی قوم کا تن ڈھانپ سکیں۔

ــــ کہ جس کا ستر مغرب کے سفید ہاتھوں نے

ــــ کہ جس کا تن مشرق کے سُرخ پنجوں نے

کھول رکھا ہے ــــ پیرہن تار تار کر رکھا ہے ــــ بنیادیں ریزہ ریزہ کر رکھی ہیں ــــ! یہ ریزے ــــ یہ تار ہم سب کا قیمتی سرمایہ ــــ اور حقیقی سرمایہ ہیں ــــ آؤ! انہیں سمیٹ لیں انہیں ڈھانپ لیں ــــ!!

اگلی بات ــــ!

اسلامی نظامِ تعلیم ــــ اسلامی انقلاب ہی کا ایک جزو اور اس کی جدّ و جُہد، عظیم جدّ و جہد ــــ!

ادارہ "محورؔ" اس انقلاب آفرین، پیہم رواں ــــ ہر دم جواں ــــ پھر جاوداں ــــ اور کامراں ــــ جذبے کو سلام کہتا ہے۔

وہ جذبہ کہ جس نے پاکستان کی نظریاتی اساس کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے والے اقتدار کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ــــ!

وہ حوصلہ کہ جس نے تحریکِ پاکستان کی ابتداء سے آج کے " عہد ہزار داستاں" تک ــــ لہو کے چراغ جلائے

وہ تڑپ کہ جس کے نتیجے میں طلبہ گھمبیر اندھیروں سے لڑتے رہے، اپنے لہو سے روشنی دیتے رہے، ٹمٹماتے دیوں کو اپنے سینوں کی حدّتِ جذبات سے روشن رکھتے رہے۔

وہ مقدس لہو جو ماؤں کی زندگی، بہنوں کی روشنی، والدین کا سہارا تھا ــــ! اسے قاتلوں، ظالموں، آمروں کی طرف سے چھیننا چاہا، بجھانا چاہا ــــ پھر ہزاروں زندگیاں چھن ھی گئیں، مگر ــــ مگر روشنیوں اور جذبوں کا سفر رک نہ سکا! کروڑوں انسانوں کو زندگی دے گیا ــــ جذبۂ مستانہ دے گیا۔

آج جامعہ پنجاب کے سربسر طالبِ علم کا یہ عہد ہے کہ یہ چراغِ زندگی روشن رہے گا، جلتا رہے گا۔ ضیاء پاش رہے گا۔ ع شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اگر کل تحریکِ پاکستان کا گڑھ مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ تھی ــــ تو آج

پاکستان میں اسلامی انقلاب کا سُورج ــــ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے طلوع ہوگا اور یہی حقیقی طلوع ہوگا باقی سب غروب! طلوع میں روشنی ہے۔ غروب کے بعد اندھیرا ہے۔ اندھیرے چھٹ جائیں گے۔ چہرے نہیں سماج بدلے گا، سماج! زندگی بندگانِ زر کی غلام ہوگی، ــــ نہ بندگانِ ثقافت کی باندی بنے گی!

ذرا سُنیئے تو سہی!

سحر کا ــــ اُجالے کا ــــ بگل بج رہا ہے!

سلیم منصور خالد

۲۴ر تا ۱۲ ماہ تغیر احسان

نعیمہ صدیقی

محسنِ انسانیت بحیثیت معلمِ انسانیت

رفتارہ یہ آغاز، خداوند علیم و حکیم کے نام سے جو اپنی پیدا کردہ ہر مخلوق کے لیے خلق کے ساتھ ہی ساتھ اس کی تقدیر متعین کرتا ہے اور اس کے لیے راہِ ہدایت کی نشاندہی کرتا ہے۔ جس نے اپنے پیدا کردہ آدمؑ کو علّم الاسماء کے ہنر سے نوازا اور جو تمام انسانوں کے لیے اولین معلمِ حقیقت و ہدایت ہے۔

حضور ﷺ اسلام اس انسانِ اعظم پر ختم ہوئی جسے خود انسانوں ہی کے اندر سے بشیر و نذیر بنا کر اٹھایا گیا اور ساری انسانیت کے لیے معلمِ فلاح و سعادت کے منصب پر قیامت تک کے لیے مامور کیا گیا۔ وہ کہ جس کی تعلیم کی صداقت اور جس کے معلمانہ کردار کی اعجاز آفرینی پر تاریخ کا یہ حیرت انگیز واقعہ گواہ ہے کہ سرزمینِ حجاز کے صحرائی کلاس روم میں معلمِ صدق و صفا سے درس لینے والی تہذیب نا آشنا قوم دیکھتے دیکھتے اقوامِ عالم کے لیے نہ صرف راستی، مساوات، عدل، اخوت، احسان اور امن کی رہنما بنی، بلکہ اس نے تدبر و تفکر کی کلیدوں سے علوم و فنون کے بند خزانوں کے دروازے ساری نوعِ انسانی کے لیے کھول دیئے۔ حق یہ ہے کہ حضورؐ ہی کی تیار کردہ جماعت نے بین الاقوامی دورِ تہذیب کا افتتاح کیا اور آج کے جاندار علوم اور زندہ تر تحریکوں میں جہاں کہیں کسی قابلِ قدر جوہر کا کوئی ذرہ چمکتا دکھائی دیتا ہے، یہ اسی قومِ محمدؐ کے فیضان کی یادگار ہے جو دوسروں کو منزل کا سراغ بتانے کے بعد خود اپنا سراغ گم کر بیٹھی۔

اصل بحث کا آغاز کرنے سے پہلے میں اپنے اس احساسِ ندامت کو پیش کرنا چاہتی ہوں کہ امتِ اسلامیہ ہونے کی حیثیت میں ہم نے نبی پاکؐ جیسے عظیم ترین معلمِ ایمان و عمل کی پیروی کا حق ادا نہیں کیا۔ ہمارا مقام یہ تھا کہ ہم حضورؐ کو اپنی تمام فکری و عملی سرگرمیوں میں سرچشمۂ ہدایت تسلیم کرتے، اپنے کاروانِ حیات کو ہر پیچ و خم تاریخ سے گزارتے ہوئے حضورؐ کا دامنِ قیادت تھامتے، اور سیاست و اقتصاد اور تعلیم و دفاع اور دوسرے تمام شعبوں کے کارہائے حضورؐ کے معلمانہ منصب سے روشنی حاصل کرتے، مگر ہماری افسوسناک حرکت یہ ہے کہ ہم اس ہستی کو جو قائدِ تہذیبِ انسانی تھی، ایک آراستہ پیراستہ محرابِ عقیدت میں مسند آرا کر کے اپنے قافلے کے فکر و عمل کو وادی وادی میں گھماتے پھرتے ہیں۔ موجودہ گمراہ تہذیب کے مدار اور پراگندہ افکار کے دروازوں پر ہدایت کی بھیک مانگنے کے لیے مرعوبیت کا کشکول اٹھائے صدا لگاتے ہیں۔

تاریخ اور علم کے افق پر اُبھرنے والے بت جنہیں "آفلین" کی عارضی درخشانی کو دیکھ کر جھومتے ہوئے پکار اٹھتے ہیں کہ یہ رہا ہمارا مقصودِ نظر، پھر جب جگنو کی سی چمک دکھا کر آنکھوں کا ایک تارا ڈوب جاتا ہے، تو پھر کسی اور کو تلاش کر کے اس پر مرمٹتے ہیں۔ ہمیں کبھی اس کا احساس تک نہیں ہوتا کہ حضورؐ کے ہوتے ہوئے ہم کیسی کیسی ٹھگنی اور بھینگی شخصیتوں کی تقلید میں ٹامک ٹوئیے مارتے پھرتے ہیں۔

دوسری تمہیدی بات مجھے یہ عرض کرنی ہے کہ دنیا میں، اور دنیا کے کسی بھی معاشرے میں بڑے بڑے بحران اُس وقت آتے ہیں جب خود علم تاریکیوں میں گھر جاتا ہے، جب تعلیم بھٹک جاتی ہے، جب مکتب اپنے مقصود کو گم کر دیتا ہے، اور جب معلم اپنا فریضہ اور بات صحیح طور سے ادا نہیں کرتا۔ علم اور تعلیم کے بھٹکے ہوئے طور سے پیدا شدہ پرتو میں نہ سیاست صحت مند رہ سکتی ہے، نہ جمہوریت نشوونما پاتی ہے، نہ اقتصادی عدل قائم ہو سکتا ہے، نہ اخلاقی شعور اتنا رو دار ہو سکتا ہے کہ جرائم کا راستہ روک سکے، نہ قومی وجود اس حد تک توانا ہو سکتا ہے کہ بین الاقوامی مسائل کو حل کرنے کے لیے دفاعی، سفارتی اور انتظامی قوتوں کو صحیح طور سے بروئے عمل لا سکے۔

دورِ غلامی تو الگ رہا، آزادی پانے کے بعد بھی ہم لوگ تعلیم کے بھٹکے ہوئے جو راستے کے پرتو میں جادہ پیمائی کر رہے ہیں اسی کا نتیجہ وہ بحران ہے جو ابتداً آہستہ آہستہ پرورش پا کر اب پوری طرح جوان ہو گیا ہے۔

اور اگر ہم نگاہ کو ذرا وسیع کر کے پورے عالمی احوال کو دیکھیں تو اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ علوم و فنون، تعلیمات و ادارات، ذرائع و وسائل اور تحقیقات و تعلیمات کی تیز رفتار افزائش کے باوجود انسان تہذیبی بحران سے دوچار ہے۔ جنگوں، انقلابات، قومی و طبقاتی تعصبات، طرح طرح کے منافرت انگیز متصادم نظریات اور ہوس قسم کے جو کوارا دھرا جرائم کے ہجوم میں گھرا ہوا بے بس انسان دل و دماغ کا سارا سکون گنوا کر ہمدردی کے ایک مخلصانہ بول کے لیے ترس رہا ہے۔

پس آج ملکی اور قومی لحاظ سے بھی، اور عالمی لحاظ سے بھی، زندگی کو سنوارنے کے لیے سب سے زیادہ توجہ طلب شعبہ، تعلیم کا شعبہ ہے اور اسی کی درستی پر ہماری سلامتی کا بھی انحصار ہے، اور اسی کو صحیح اصول و مقاصد کے سانچے میں ڈھال کر ہم نئی نسلوں کو اس قابل بنا سکتے ہیں کہ فساد کردہ دنیا کو امن و انصاف کا راستہ دکھا سکیں۔

میرے مقالے کا مقصد یہی ہے کہ ہم اپنے نظامِ تعلیم کی درستی کے لیے حضورؐ خاتم النبیین کی معلمانہ حیثیت کو سامنے رکھ کر کچھ مفید اشارات و نکات اخذ کر سکیں۔ حضورؐ کے معلمانہ کارنامے پر کوئی گفتگو اس وقت تک بے معنی ہوگی جب تک ہم اُس حکمتِ علم اور حکمتِ تعلیم پر نظر نہ ڈال لیں جس کے مطابق حضورؐ نے سارا معلمانہ کام کیا۔

ہماری حکمتِ علم

علم کیا ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ اور اس کے ذرائع اصول کیا ہیں؟ ان سوالوں کو چھیڑتے ہوئے ہم مغرب کے نظریۂ علم (THEORY OF KNOWLEDGE) کو دیکھتے ہیں تو پھر ہم پیروانِ محمدؐ اور حاملینِ قرآن کی حیثیت سے یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اس رائج شدہ باطل نظریۂ علم کی وجہ سے تمام علوم بگڑ کر رہ گئے ہیں۔ ان میں جو تھوڑے بہت سچائی کے اجزا ہیں وہ غلط افکار و تصورات کے ساتھ اس بری طرح خلط ملط ہو گئے ہیں کہ ان کے ذریعے زندگی کو پوری طرح خیر و خوبی سے آراستہ کرنا ناممکن ہے، اور جو نظامِ تعلیم

محض ان علوم و افکار کو منتقل کرنے کا وسیلہ بن کے رہ گیا ہے، وہ نہ ہمیں مسلمان کے سے ایمان و کردار سے آراستہ کر سکتا ہے اور نہ انسانیت کو موجودہ بحران سے نجات دلا سکتا ہے۔

مغربی نظریۂ علم کے رُو سے حقیقت صرف وہ ہے جسے ہم حواس اور قیاس کے ذریعے پا سکتے ہیں۔ ہمارے حواس اور قیاس کے دائرے سے باہر خواہ کتنے ہی بڑے سے بڑے حقائق موجود ہوں، ہمارے لیے کالعدم ہیں۔ ہم ایک خاص مرحلے میں جو کچھ اور جتنا کچھ جس شکل میں سمجھتے یا جان لیتے ہیں، اس مرحلے میں وہ کچھ حقیقت ہے۔ بعد میں آنے والی معلومات پچھلے مسلمات کو بدل دیتی ہیں تو حقیقت نئی صورت اختیار کر کے سابق صورتوں کو منسوخ کر دیتی ہے۔ اس نظریۂ علم کا منطقی تقاضا یہ ہے کہ ہمارا سارا سرمایۂ علم کسی بھی مرحلے میں ایسے یقینیات سے خالی رہے جن پر ہم انفرادی اخلاق اور اجتماعی تہذیب کی تاسیس کر کے مطمئن ہو سکیں کیونکہ اس میں ہر ایک عمارت امتحانی ہے، اور اسے مزید معلومات و تجربات کی مدد سے نئے سانچے سنوارنے کا کام جاری رکھنا ہے۔ آج کے علمی ظنیات ایسی ٹھوس بنیادی حقیقتیں فراہم کرنے سے قاصر ہیں جن کو ہم تعمیرِ حیات کے عمل میں قابلِ اعتماد اساسیات قرار دے سکیں۔ آج کے نظریے، آج کی تحریکیں، آج کے سماجی نظام آج کے معاشرے اُس طرح کے ریت کے گھروندے ہیں جنہیں بچے ساحلِ سمندر کی ریت سے بناتے ہیں، پھر اپنے حاصلِ محنت کو توڑتے ہیں اور بار بار اسی کھیل کو دہراتے ہیں۔ غضب یہ کہ وہ اس کھیل کھیل میں اپنے اپنے گھروندوں کو صحیح اور بہتر اور دوسروں کے ریت کے قلعوں کو غلط اور گھٹیا قرار دے کر آپس میں لڑتے بھی ہیں۔

اس تنقیدی گفتگو کو طول دینے کے بجائے میں اُس حکمتِ علم پر چند گزارشات پیش کرتا ہوں جسے حضورؐ نے دنیا کے سامنے رکھا۔

واضح رہے کہ یہاں علم کی وہ ٹیکنیکل اقسام زیرِ بحث نہیں ہیں، جن کا مقصد زندگی کی مختلف ضروریات پوری کرنے اور سہولتیں فراہم کرنے کے لیے اسباب و وسائل پیدا کرنا اور ان کو ترقی دینا ہے۔ یہاں مدارِ گفتگو علم کی وہ اقسام ہیں جن کی روشنی میں انسانی رابطوں، رویّوں اور تہذیبی اداروں کی عام سطحیں طے کی جاتی ہیں۔

اس سلسلے میں نبی پاکؐ نے بحیثیت مُعلّمِ انسانیت ہمارے سامنے اوّلین حقیقت یہ رکھی ہے کہ علمِ کامل صرف خدا کو حاصل ہے[1] وہی کائنات کے اسرار و رموز کا جاننے والا، ظاہر و پنہاں سے آگاہ اور ماضی اور مستقبل کا خبیر و بصیر ہے۔

انسان کو جو کچھ علم حاصل ہے یا آئندہ ہوگا وہ سب اسی کا عطیہ ہے[2] انسان کو جو محدود ذرائع علم حاصل ہیں وہ اسی کے عطا کردہ ہیں، سماعت، بصارت اور تفکر کی قوتیں اسی نے دی ہیں[3] انسانی علم کے متعلق یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ وہ صدیوں کی حاصل کردہ ترقیوں کے باوجود اور مستقبل کے ہونے والے انکشافات سمیت بہت ہی محدود ہے[4] خدا کے علمِ کامل کو سامنے رکھتے ہوئے جب انسان کو اپنے علمِ قلیل کی محدودیت کا اندازہ ہو جاتا ہے تو لازمی طور پر اس میں ایک تو طلبِ علم پیدا ہوگی اور دوسرے وہ علمِ کامل کے سرچشمہ سے استفادہ کرنے کے لیے کوشاں ہوگا اور اس سے استفادہ کے وسیلے کو تلاش کرے گا جو صاحبِ علمِ کامل اور اس کے زیرِ تعلیم متعلّم کے درمیان بروئے عقل موجود ہونا چاہیئے۔ ایسے علم کی محدودیت کا شعور انسان کو اس جسارت سے باز رکھنے کا ذریعہ ہے کہ وہ اپنی ناقص اور مشکوک معلومات پر بنے نظاموں اور تمدنوں کے بے ڈھنگے اور غیر متوازن ڈھانچے کھڑے کرے۔ ان پر بے حد انسانی قربانیوں اور محنتوں کی بھاری مقداریں صرف کرے اور پھر وہ یکے بعد دیگرے ہولناک تباہی کے ساتھ ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے ہیں۔ حضورؐ کی حکمتِ علم انسان کو بتاتی ہے کہ انسانی علم کائنات میں خدائی اور کارفرمائی کا پارٹ ادا کرنے کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ اس علم کی محدودیت گواہ ہے کہ انسان بندگی بجالانے کے مقام پر رہ کر کسی بالاتر ہستی کے زیرِ ہدایت کام کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے[5]

علمِ قلیل کے مقام پر ہونے کی وجہ سے انسان مجبور ہے کہ وہ نہ صرف حسی اور قیاسی ذرائع سے کام لے کر اپنے علم میں مسلسل اضافہ کرے، بلکہ حسی و قیاسی دائرے سے بالاتر کسی دوسرے ذریعۂ علم کا بھی سراغ لگائے جو تعمیرِ حیات کے لیے چند یقینی اساسیات مہیا کر سکے۔ بس انسان ایک لامتناہی وادیٔ علم کا مسافر ہے جس کے لیے سرگرمی کی منزل کہیں نہیں آتی۔ حضورؐ کے ذریعے اضافۂ علم کی دعا جذبۂ طلبِ علم کو متحرک رکھنے کے لیے سکھائی گئی ہے[6]

مگر دوسرے نظریوں کے مقابلے میں اسلامی حکمتِ تعلیم یہ چاہتی ہے کہ مسافرِ علم کے سامنے کچھ نشاناتِ راہ ضرور واضح ہوں۔ اس کے پاس کچھ نہ کچھ زادِ راہ بھی ہو اور وہ مشعل بھی ساتھ رکھتا ہو جو تاریکیوں میں راستہ دکھا سکے۔ نبی اکرمؐ کی عطا کردہ قرآنی حکمت کے رُو سے تین حقیقتیں ایسی ہیں جن کے صحیح شعور پر انفرادی کردار اور اجتماعی نظام کی صحت کا دار و مدار ہے۔

ان میں سے اوّلین حقیقتِ عظمیٰ (SUPREME REALITY) خدا کی ہستی ہے۔ یہاں میں خدا کی ہستی پر دلائل نہیں دوں گا۔ کہنا یہ ہے کہ اسلامی حکمتِ علم کی بنیاد تصورِ خدا پر ہے۔ اُس کی ذات، اس کی صفات اور اس کے حقوق کا شعور ہی انسانی زندگی کی فلاح کا ضامن ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہوں آیات: إِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللَّهِ (۶۷-۲۶، ۴۶-۲۳) إِنَّ اللَّهَ عَالِمُ غَيْبِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (۳۵-۳۸) يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ (۶-۳) وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (۲۴-۳) وَسِعَ رَبِّي كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا (۶-۸۰) يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ (۲-۲۵۵)

[2] ملاحظہ ہو آیت: عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (۹۶-۵)۔

[3] ملاحظہ ہو آیت: وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ (۶۷-۲۳)

[4] ملاحظہ ہو آیت: وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا (۱۷-۸۵)

[5] ملاحظہ ہو آیت: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (۵۱-۵۶)

[6] ملاحظہ ہو آیت: رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا (۲۰-۱۱۴)

دوسری بڑی حقیقت خود انسان ہے۔ انسان خدا کی ساری مخلوق میں امتیازی مرتبہ رکھتا ہے[1]۔ اس کا منصب خدا کی عبادت یعنی پرستش و اطاعت ہے[2] وہ اگر صحیح راستہ پر چلے تو اس کے لیے خلافت و نیابت کا درجہ ملا ہے[3] اسے عقل و علم سے بہرہ ور کرنے کے ساتھ ساتھ خیر و شر کی تمیز دی گئی ہے[4] بنا بریں وہ ذمہ دار اور جوابدہ ہے[5]

تیسری بڑی حقیقت مادی کائنات ہے جو نامعلوم محرکات کے تحت کسی حادثے کے طور پر نہیں بن گئی، وہ رام لیلا یا کھیل تماشا نہیں ہے[6] وہ بے مقصد و بے نتیجہ نہیں ہے[7] اس کی ایک غایت ہے[8] اس میں نظم و ترتیب ہے[9] اس میں اٹل قوانین میں جکڑی ہوئی ہے[10] اس میں توازن ہے[11] اور اس میں حسن و زیبائی ہے[12] پوری کائنات ایک ہی کل ہے جو ایک ہی قوت کے زیر فرمان چل رہی ہے[13] اس کائنات کی تمام مادی اشیاء اور قوتیں جن تک انسان کی دسترس ہو، اس کے لیے مسخر کی حیثیت رکھتی ہیں[14] اور ان سے وہ حسب منشا ربانی فائدہ اٹھانے اور ان کو حدود و اللہ کے اندر رہ کر استعمال کرنے کا مجاز ہے کائنات مادی کے موجودات اور ان کی قوتوں سے کام لینے کے لیے ان کا علم حاصل کرنا بھی ضروری ہے، اس علم کو حصول علم کا ذریعہ قرار دیا ہے یعنی وہ علم جو مجسم موجودات مادی وغیرہ اور ان کی قوتوں اور ان کے استعمالات سے بحث کرتے ہیں

ان تینوں حقیقتوں کے درمیان سفر کرنے والے طالب علم کے سامنے حقائق کے دو بڑے دائرے آتے ہیں ایک ظواہر و محسوسات کا دائرہ دوسرا امور غیب[15] کا دائرہ امور غیب محسوسات کے پردے کے پیچھے ہیں اور ان تک براہ راست رسائی حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ ہمیں نہیں دیا گیا، لیکن اہم امور غیب سے بالکل بے نیاز ہو کر ہم نہیں چل سکتے ہر فرد انسانی چند نمایاں سوالات سے دوچار رہتا ہے کہ آیا کوئی خالق و مالک ہے یا نہیں؟ یہ زندگی ایک وقتی ظہور ہے یا اسے موت کے بعد بھی کسی شکل میں جاری رہنا ہے، ہم اپنے اعمال سے جو کچھ جیسے کچھ نتائج فوری طور پر پا لیتے ہیں اس معاملہ ان ہی پر ختم ہے یا کسی باقاعدہ قانون کے تحت عدل و انصاف کے مطابق ان

---

[1] ملاحظہ ہوں آیات: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (۱۷-۷۰) وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (۹۵-۴)

[2] " " " " يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ (۲-۲۱) وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (۵۱-۵۶)

[3] " " " " وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ (۲۴-۵۵)

[4] ملاحظہ ہو آیت: وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ (۹۰-۱۰)

[5] " " " " أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا (۲۳-۱۱۵)

[6] " " " وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِينَ (۲۱-۱۶) لَوْ أَرَدْنَا أَنْ نَتَّخِذَ لَهْوًا لَاتَّخَذْنَاهُ مِنْ لَدُنَّا إِنْ كُنَّا فَاعِلِينَ (۲۱-۱۷)

[7] " " " رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا (۳-۱۹۱)

[8] " " " " خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ (۶۴-۳)

[9] " " " " هَلْ تَرَى مِنْ فُطُورٍ (۶۷-۳)

[10] " " " مُسَخَّرَاتٍ بِأَمْرِهِ (۱۶-۱۲)

[11] " " " " وَوَضَعَ الْمِيزَانَ (۵۵-۷)

[12] ملاحظہ ہوں آیات: إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَهَا (۱۸-۷) إِنَّا زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِزِينَةٍ الْكَوَاكِبِ (۳۷-۶) وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَزَيَّنَّاهَا لِلنَّاظِرِينَ (۱۵-۱۶) حَتَّى إِذَا أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ (۱۰-۲۴)

[13] ملاحظہ ہوں آیات: لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا (۲۱-۲۲) نیز قُلْ لَوْ كَانَ مَعَهُ آلِهَةٌ كَمَا يَقُولُونَ إِذًا لَابْتَغَوْا إِلَى ذِي الْعَرْشِ سَبِيلًا (۱۷-۴۲)

[14] ملاحظہ ہو آیات: ذَلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (۳-۱۴) وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَى حِينٍ (۲-۳۶)

[15] امور غیب کی کئی اقسام ہیں مثلاً ایک وہ تمام امور جو ماضی و مستقبل کے دائرے میں پائے جاتے ہیں جیسے دور رس اور وسیع الاثر قوانین و عوامل جو صدہا تاریخی واقعات کا احاطہ کرتے ہیں پھر اخلاقی و عملی سلسلہ اسباب و علل کے وہ بے حساب اور ناقابل استقصا نتائج جو ہزارہا اشخاص سے ہوتے ہوئے کئی نسلوں تک پھیلے چلے جاتے ہیں اور بسا اوقات ان کا دائرہ وسعت عالمگیر ہوتا ہے (واضح رہے کہ الہامی علم و ہدایت میں ایسے حقائق و امور کی بھی نشاندہی کی جاتی ہے)

دوسرے وہ امور جو ایک وقت میں کسی کے لیے غیب ہیں، کسی کے لیے شہود جیسے مری میں بیٹھے ہوئے ہم نہیں جانتے کہ اس لمحے لاہور کی مال روڈ یا کراچی کی بندرگاہ پر کیا ہو رہا ہے اور وہاں کون کون سے اشخاص موجود ہیں یا مثلاً اس وقت کہاں کہاں بارش ہو رہی یا مثلاً ایک آدمی ریلوے ٹائم ٹیبل دیکھ کر بتا چکا ہے کہ فلاں نام کی گاڑی کس جگہ کب آنے والی ہے اور اب کس مقام سے گزر رہی ہوگی، لیکن اس بارے میں دوسرے بے شمار لوگ لاعلم ہیں، یا مثلاً ایک شخص کسی خاص زبان یا علم و فن کا مطالعہ کرنے کی وجہ سے بے شمار ایسے امور سے واقف ہوتا ہے جن کو دوسرے نہیں جانتے ـــــــ تیسرے وہ امور جو ایک زمانے کے لوگوں کے لیے دائرہ غیب میں ہوتے ہیں اور دوسرے زمانے میں شہود بن جاتے ہیں جیسے ریڈیو، بجلی یا جوہری توانائی کا وجود، یا جیسے چاند کی حقیقت کے بہت سے گوشے جو خلائی جہازوں کے استعمال سے قبل نامعلوم تھے یہ ساری اقسام لکن الشہود و غیب کی تعریف میں آتی ہیں ـــــــ چوتھے وہ امور جنہیں ہم محض اشیا و حوادث کے علم کی ہزار وسعتوں کے بعد بھی براہ راست نہیں جان سکتے مثلاً خدا کی ہستی، سلسلۂ وحی و الہام، حیات بعد الموت وغیرہ

اپنی کتاب میں اس معنی میں ہم نے امورِ غیب کی اصطلاح استعمال کی ہے
کے صحیح اور مکمل نتائج ملتے ہیں؟ زندگی کا معاشی اور جنسی کامرانیوں سے بلند تر بھی کوئی مقصد ہے؟ ان سوالات کا جواب طے کیے بغیر زندگی کی سرگرمی کو حسن و خوبی سے جاری نہیں رکھا جا سکتا۔ ہر شخص اتنا تو نہیں کرتا، شعوری طور پر نہیں تو نیم شعوری طور پر، باقاعدہ استدلال سے نہیں تو ظن و تخمین سے ان سوالات کے جوابات طے کر لیتا ہے اور پھر اس کی زندگی اس کے پسندیدہ جوابات کے مطابق کوئی نہج اختیار کر لیتی ہے۔

ان امورِ غیب کے متعلق انبیاء وحی و الہام سے حاصل کردہ علم کو ہمارے سامنے رکھ کر کائنات اور تاریخ کے شواہد سے ثابت کرتے ہیں کہ الہامی رہنمائی کو پیش کرنے اور قبول کرنے والے ہی فلاح پاتے ہیں۔

اس سلسلے میں یہ وضاحت شاید مفید ہوگی کہ تاریخ کے مطالعہ میں اسلامی حکمت علم جس چیز پر ہماری توجہات کو مرکوز کرتی ہے وہ سنۃ اللہ[1] اور امر اللہ[2] ہے۔ اس سنۃ اللہ اور امر اللہ کے زیر عنوان آنے والے قوانین و لوازمات میں سے جو زیادہ جامع، بدیہی اور اساسی ہیں ان کی تصریح مثالوں کے ساتھ قرآن نے کر دی ہے۔ تاریخ کا صحیح مطالعہ کر کے مزید شواہد دریافت کیے جا سکتے ہیں۔

اسی طرح مطالعۂ کائنات کے سلسلے میں قرآن کی ایک اصطلاح بہت اہم ہے اور وہ ہے آیت[3]۔ جس طرح آیاتِ قرآن علم حقیقت اور علم حوادث سے بہرہ مند ہونے کے لیے ہماری رہنما ہیں، اسی طرح مادی کائنات میں پائے جانے والے تمام مظاہر تلاشِ حقیقت کے سفر میں ہمارے لیے نشاناتِ راہ ہیں اور ان پر بھی آیات کا اطلاق ہوتا ہے۔ کائنات کی "آیات" سے ایک فلسفی اور ایک سائنس داں یکساں استفادہ کر سکتے ہیں مگر ان آیات میں جمال کا جو پہلو پایا جاتا ہے اس سے ادیب، شاعر، مصور اور دوسرے فنونِ لطیفہ کے وابستگان بہرہ اندوز ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔

یہاں اس اشارے کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ کائنات کی آیات اور تاریخ میں کام کرنے والے قوانین الہامی تعلیم کی آیات سے ہم آہنگ ہوتے ہیں اور یہی ہم آہنگی الہامی تعلیم کی صحت و صداقت کے لیے ایک مؤثر عقلی دلیل قرار پاتی ہے۔

اس الہامی ذریعۂ علم سے ہمارے حسی و قیاسی ذرائع حصولِ علم کی کوتاہی کی تلافی ہوتی ہے اور ہمیں ایسے یقینیات حاصل ہو جاتے ہیں جن پر اخلاق اور اجتماعی تمدن کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ یہ الہامی یقینیات نظامِ تمدن میں اسی ضرورت کو پورا کرتے ہیں جیسے ریاضی میں دو اور دو چار کا فارمولا ہے۔

سنت جہاں ہمیں بعض تفصیلی احکام و قوانین اور حدود و شعائر کا سرمایہ فراہم کرتی ہے وہاں اس کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ وہ ہمیں "العلم" (THE KNOWLEDGE) یا اساسی علم (THE BASIC KNOWLEDGE) سے ہم کنار کرتی ہے۔ اس کے ذریعے ہمیں مرکزی حقیقتِ علمی کا شعور ملتا ہے۔ اس کے ذریعے ہمیں رہنما اصولِ حیات (GUIDING PRINCIPAL) اور بنیادی صداقتوں (FUNDAMENTAL TRUTHS) نیز مستقل اخلاقی قدروں (PERMANENT MORAL VALUES) کی دولت بازیاب ہاتھ آتی ہے۔ اسی قسم کے اُن یقینیات کو قرآن "قولِ ثابت"[4] قرار دیتا ہے جو کردار اور تہذیب کی اساس کے طور پر اپنی جگہ قائم رہتے ہیں۔ ان اساسی حقائق و قوانین کے چوکھٹے میں دیگر تفصیلی ضوابط ترتیب پاتے ہیں۔

یہی وہ علم ہے جسے وراثۃ الانبیاء قرار دیا گیا اور یہی وہ العلم ہے جس کے متعلق حضورؐ نے فرمایا کہ اس کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے[5]۔ اگر یہاں علم سے مراد جملہ اقسام کے علوم لیے جائیں، تو پھر ہر مسلمان پر لازم ہوگا کہ روئی دھننے اور چمڑے کی دباغت کرنے سے لے کر انجینئرنگ اور ڈاکٹری اور جراحی، توانائی اور ملاحی پر دار ملک کے سارے علوم حاصل کرے اور اگر نہ کر سکے تو ترکِ فرض کے جرم کی سزا کا مستحق قرار پائے۔ فی الحقیقت سارے کا سارا قرآن اسی العلم کا آئینہ دار ہے اور نبی اکرمؐ نے بحیثیت معلمِ کتاب و حکمت اصل زور اسی العلم کو پھیلانے پر صرف کیا ہے۔ اس کی مختصر جامع تعریف حضورؐ نے ان الفاظ میں کی ہے "وہ علم جس کے ذریعے اللہ کی رضا حاصل کی جاتی ہے۔" (روایت ابو ہریرہ، مشکوٰۃ کتاب العلم)

علم کا آخری مقصد کیا ہے؟ قرآنی اصطلاحات کے مطابق اس سوال کے جواب میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ علمِ حق کے ذریعے عملِ صالح کا حصول، اعمالِ صالحہ سے حیاتِ طیبہ کی تشکیل اور حیاتِ طیبہ سے نفسِ مطمئنہ کے مقام تک رسائی علم کا مقصود ہے۔

اگر ذرا اور اجمال سے کام لیا جائے تو کہا یہ جانا چاہیے کہ علم کا کام یہ ہے کہ وہ غلط اور صحیح، حق اور باطل، مفید اور مضر، نیکی اور بدی کو الگ الگ چھانٹ کر ہمارے سامنے رکھ دے۔ تعلیمِ نبوت کا امتیاز رشد و غی میں امتیاز پیدا کر دینا ہے[6] اس کی تعلیم کا فرقان ہونا لازم ہے[7]۔

اسلامی حکمتِ علم کی پوری تفاصیل کو سمیٹنے کے لیے ایک مستقل مقالہ چاہیے۔ یہاں محض بیان کردہ چند نکات پر اکتفا کیے بغیر چارہ نہیں، البتہ یہ غلط فہمی رفع

---

[1] ملاحظہ ہو آیت ۱۷ : ۷۷

[2] ملاحظہ ہوں آیات ۸ : ۴۴، ۱۱ : ۱۲۶، ۱۶ : ۱، ۳۳ : ۳۸

[3] ملاحظہ ہوں آیات ۱۲ : ۵، ۱۷ : ۱۲، ۱۳ : ۱۶، ۱۶ : ۷، ۱۲ : ۲۰۔ ۷ : ۳۰، ۱۳ : ۱، ۹۲

[4] ملاحظہ ہو آیت: یُثَبِّتُ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ (۱۴ : ۲۷)

[5] ملاحظہ ہو حدیث: طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ (مشکوٰۃ کتاب العلم)

[6] ملاحظہ ہو آیت: قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ (۲ : ۲۵۶)

[7] ھُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْھُدٰی وَالْفُرْقَانِ (۲ : ۱۸۵)

(۳) حضورؐ کو جو حکمتِ تعلیم سکھائی گئی اس کا تقاضا یہ ہے کہ معلم نرم خو ہو، تند خو نہ ہو[1] بصورتِ دیگر یا تو زیرِ تعلیم جماعت تتر بتر ہو جائے گی یا آج کل کے نظام میں اگر ایسے کلاس روم میں بیٹھنے کا پابند کیا گیا تو کم سے کم طلبہ کے دل و دماغ ضرور کلاس روم سے فرار کر جائیں گے۔ حضورؐ نے خود اپنے رفقائے کار کو ہدایات دیں کہ لوگوں کے لیے آسانیاں پیدا کرو، مشکلات پیدا نہ کرو۔ ان کو بشارت دینے والے ہو، نفرت دلانے والے نہ ہو[2]

(۴) حضورؐ کے سامنے اپنا تعلیمی نصب العین پوری طرح واضح تھا یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا۔ ایک ایسی مرکزی جماعت کا تیار کرنا جو ساری انسانیت کے سامنے عملاً اس سارے نظامِ حیات کی صداقت کی گواہی دے سکے اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ اس نظامِ حیات کو چلانے کے لیے ایمان و کردار سے آراستہ لیڈر، افسر، کارکن اور شہری تیار کیے جائیں۔

(۵) حضورؐ کی حکمتِ تعلیم میں معلم کے کام کا مشنری تصور دلاتا ہے۔ ہر نبی نے اپنی مخاطب قوم کو تعلیم حق دیتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ میں تم سے اس خدمت کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ میرا اجر تو اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے[3] یہی اصول حضورؐ کا بھی تھا اور آپ نے اپنے تیار کردہ معلمین کو اس سے منع فرمایا کہ وہ شاگردوں اور طلبہ سے کوئی حق الخدمت وصول کریں۔

اس اصول سے یہ بات لازمی نتیجے کے طور پر اخذ ہوتی ہے کہ معلم کا کام کسی دوسرے ماہر کاریگر کی طرح کا پیشہ ورانہ کام نہیں ہے کہ جس نے پیسے دیئے اس کے حسبِ منشا کام کر دیا بلکہ مشنری سپرٹ سے کرنے کا کام ہے اور اسے وہی انجام دے سکتا ہے جو اس چیز کا خود قائل ہو اور اس پر ایمان رکھتا ہو جس کی تعلیم دینے وہ چلا ہے۔ اسلامی نظامِ تعلیم میں مخالفینِ اسلام یا منافقین کے لیے کام کرنے کی کوئی جگہ نہیں ہے جیسا کہ حضورؐ کا ایک ارشاد ہے کہ منافق میں تفقہ فی الدین کی صفت نہیں پیدا ہو سکتی[4]

تعلیم کے اس مشنری تصور کے ساتھ ساتھ بڑے پیمانے پر تعلیمی ادارات قائم کر کے کثیر التعداد معلمین سے ان کا پورا وقت لیا جاتا ہو تو اس صورت میں یہ ذمہ داری ریاست کی ہے کہ وہ ان کی کفالت کا انتظام کرے۔

(۶) تعلیم کے مشترک کام کو سرانجام دینے کے لیے اوپر کے اشارات کے مطابق معلم میں جہاں اپنے مخاطبین کے لیے محبت و خیر خواہی اور نرم خوئی کے جذبات موجود ہونے چاہئیں وہاں حضورؐ کے سلوک کا تقاضا یہ ہے کہ حسن آمیز طرزِ تکلم اختیار کیا جائے۔ اور بحث و اختلاف کا موقع پیش آئے تو جدالِ احسن سے کام لیا جائے[5] یعنی خوشگوار انداز میں تبادلۂ خیالات کیا جائے[6]

(۷) حضورؐ کی حکمتِ تعلیم کا ایک اصول یہ تھا کہ لوگوں سے ان کی عقل و ذہنی استعداد کے مطابق خطاب کیا جائے۔ اس میں عمر کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا، شہری اور دیہاتی کے فرق پر بھی نگاہ رکھنی ہوگی، مبتدی اور منتہی کے مراتب کا خیال بھی کرنا ہوگا۔

(۸) حضورؐ نے تعلیم و تربیت میں تدریج کے اصول کو اختیار کیا۔ ایک حدیث میں قبائل میں جا کر تعلیم و تبلیغ کا کام کرنے والوں کو ہدایت فرمائی کہ چھوٹتے ہی دین کے سارے تقاضے لوگوں کے سامنے رکھ کر انہیں دہلا نہ دیا جائے بلکہ پہلے انہیں اساسی کلمہ کا قائل بنایا جائے، پھر اگر وہ توحید و رسالت کو مان لیں تو ان کو نماز کی دعوت دی جائے پھر اس کے بعد روزہ، زکوٰۃ اور حج کی دعوت دی جائے[7]

حضورؐ کی حکمتِ تعلیم میں ایک اصولی بات یہ ملتی ہے کہ آپ مخاطب جماعت کی اکتاہٹ کا پورا خیال رکھتے تھے کہ تعلیم و خطابت کا سلسلہ لگاتار نہیں ہونا چاہیئے کہ لوگ اکتا جائیں۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے حضورؐ کی اس خوبی کو بیان کیا ہے کہ آپ مناسب وقفوں پر خطاب فرماتے تھے[8]

حضورؐ کے اس اصول کی ایک شہادت ہمیں ابن عباس کی طرف سے حضرت عکرمہ نے ہم تک پہنچائی ہے کہ ابن عباس نے آنحضرتؐ کے مسلک کو ملحوظ رکھتے ہوئے انہیں یہ تلقین کی کہ لوگوں کو ہفتے میں ایک بار جمعہ کے دن تعلیم دو۔ اگر زیادہ کی ضرورت ہو تو دو بار یا حد سے حد تین بار[9]

اس اصول کی بنا پر حضورؐ ہمیشہ مختصر تعلیمی خطاب فرمایا کرتے تھے جو تیر بہدف ثابت ہوتے تھے۔ حضورؐ کا سب سے طویل خطبہ حجۃ الوداع کا خطبہ ہے مگر وہ بھی اپنی جگہ حد درجہ مختصر ہے۔

پھر ایک خاص بات یہ سامنے آتی ہے کہ احادیث میں متفرق ارشادات اور مجالس سے حضورؐ کی جن تعلیمی گفتگوؤں کا ریکارڈ ملتا ہے ان میں سے بعض میں ایک بات

---

[1] ملاحظہ ہو آیت فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ ۖ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ (۳: ۱۵۹) نیز ملاحظہ ہو: وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ (۱۵: ۸۸)

[2] حدیث يَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا بَشِّرُوا وَلَا تُنَفِّرُوا ریاض الصالحین۔ باب العلم والاناۃ والرفق۔ روایت حضرت انس، نیز حدیث: انما بعثتم میسرین ولم تبعثوا معسرین۔ بخاری روایت ابی ہریرہ۔

[3] ملاحظہ ہو آیت: لَا يَسْأَلُكُمْ أَجْرًا (۳۶: ۲۱)

[4] مشکوٰۃ کتاب العلم روایت ابی ہریرہؓ

[5] ملاحظہ ہو آیت: قُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا (۲: ۸۳)

[6] ملاحظہ ہو آیت: وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (۲۹: ۴۶)

[7] حدیث (مشکوٰۃ کتاب الزکوٰۃ روایت ابن عباس)

[8] حدیث (مشکوٰۃ کتاب العلم روایت عبد اللہ بن مسعود (مسلم و بخاری)

[9] حدیث (مشکوٰۃ کتاب العلم روایت عکرمہ (بخاری)

___ پھر بچوں کی تربیت کے سلسلے میں حضورؐ نے والدین کو یہ تاکید بھی کی کہ وہ اپنی ساری اولاد سے مساوات کا معاملہ کریں بصورت دیگر بچوں میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے یہی اصول اجتماعی نظام تعلیم پر بھی لاگو ہوگا درسگاہوں میں تمام طلبا کے ساتھ مساویانہ معاملہ ہونا چاہیئے اور سب کے لیے حقوق و فرائض یکساں ہیں سب کے ساتھ اساتذہ کا رویہ ایک ہی جیسا ہونا چاہیئے۔

___ حضورؐ کی حکمت تعلیم سے نظریۂ سزا بھی دیا جس کے دو نکات ہیں ایک یہ کہ شدید ضرورت کے تحت سات سال کی عمر سے سزا دی جا سکتی ہے دوسرے یہ کہ ایسی جسمانی سزا نہیں دی جانی چاہیئے جو نشان چھوڑنے والی ہو سخت قسم کے تھپڑ یا گھونسے یا بید یا قمچیاں نہیں لگائی جانی چاہئیں لازم نہیں کہ سزا جسمانی ہی ہو اس کی دوسری صورتیں بھی ہیں جیسے کہ نشوز کی صورت میں عورتوں کو خواب گاہوں سے الگ کرنے کے قرآنی حکم کی مثال موجود ہے۔

نظریۂ سزا کے سلسلے میں چند وضاحتیں ضروری ہیں

(۱) تعلیم کا بنیادی تقاضا محبت و شفقت ہے سزا کی گنجائش محض غیر معمولی مواقع کے لیے استثنائی درجے میں رکھی گئی ہے

(ب) اس نظریۂ سزا کے سامنے یہ خیال ضرور رکھنا چاہیئے کہ بگڑے ہوئے ماحول کے مقابلے میں اس دور سعادت کا معاملہ الگ تھا جس کو پیش نظر رکھ کر حضورؐ نے نظریۂ سزا بیان فرمایا سنوری ہوئی سوسائٹی میں ڈسپلن توڑنے اور سرکشی کرنے کی مثالیں شاذ ہوتی ہیں اور بہ معمولی سی سزا بھی اس لیے مؤثر ہوتی ہے کہ پورا ماحول سزا دینے والے ہاتھ کے پیچھے ہوتا ہے۔ بگڑی ہوئی سوسائٹی میں جہاں برائی کی قوتیں حسین و دلکش اسالیب سے غلط روش کو مزین بنا کر سامنے لاتی ہوں اور ان کی وجہ سے مذہبی و اخلاقی معیار ایک مستقل تحکم رہا ہو وہی طرز عمل ہو سکتے ہیں تاہم اصول عام بن جاتے، مشتعلانہ رویۂ ضرورت اور صورتوں میں سامنے آئے تاہم نیکی اور بھلائی کے معلم اپنی شفقت کو اور زیادہ وسیع و عمیق بنا دیں ظاہر ہے کہ پہلی صورت سزا کو غیر مؤثر بنا دے گی، لہٰذا دوسری صورت ہی مفید نتائج دے سکتی ہے۔

(ج) سزا دہی کا معاملہ طبیب کی سی حکمت عمل کا تقاضا کرتا ہے ہر قسم کے حالات میں موقع اور محل کی مناسبت کا لحاظ ضروری ہے

(د) بعض اصحاب کو ایک حدیث سے غلط فہمی ہوتی ہے جس کی بنا پر حضورؐ نے فرمایا ہے کہ اولاد کے سروں سے تادیب کے عصا کو ہٹا دیا جائے[2] یہاں آپ کے عصا سے مراد ہیچ مچ کا عصا نہیں ہے، بلکہ یہ ویسا ہی ہمارا استعاراتی انداز بیان ہے جیسے کہا جائے کہ اپنے مخالفین کو بھی احسان کی زنجیروں میں باندھ کر رکھو یا دشمن کو مارو تو بھلائی کی تلوار سے مارو اگر کوئی شخص ان مواقع پر زنجیروں اور تلوار کے لفظ کے لغوی معنوں کے لے تو وہ صریحاً غلطی کرے گا۔ یہاں استعاراتی مفہوم لیا جاتا ہے یعنی احسان کی زنجیروں اور بھلائی کی تلوار سے مراد احسان اور بھلائی کے سوا کچھ نہیں ٹھیک اسی طرح تادیب کے عصا سے مراد محض تادیب ہی ہے تادیب یا ادب سکھانا یا تربیت دینا ایک فن لطیف ہے۔

(۳۳) حضورؐ کی تعلیم کا مرکزی نصاب قرآن تھا[3] جو پوری انسانی زندگی کے لیے ایک جامع گائیڈ بک ہے تعلیم کے بقیہ سب اسی مرکزی نصاب کے اردگرد مرتب ہوتے ہیں۔

(۳۴) سرکار رسالت مآبؐ کی حکمت تعلیم کا ایک لازمی تقاضا یہ ہے کہ جس طرح معلم کو متعلمین کے ساتھ محبت و شفقت کا برتاؤ کرنا چاہیئے اسی طرح متعلمین کے لیے لازم ہے کہ وہ معلم کا ادب و احترام رکھیں[4] اس ہدایت میں یہ تقاضا خود مضمر ہے کہ معلم بلحاظ قابلیت اور بلحاظ کردار اور بلحاظ طرز روش کے ایسے اوصاف سے متصف ہو کہ طلبا میں اس کے لیے احترام نشوونما پائے۔

توسیع تعلیم کے لیے حضورؐ کی مساعی

اب اجمالاً ان مساعی پر نگاہ ڈالیے جو حضورؐ نے توسیع تعلیم کے لیے سرانجام دیں۔

ایک طرف تو نظام صلوٰۃ، اس میں تلاوت قرآن اور خطبات جمعہ کا نظام بجائے خود فروغ تعلیم کا ذریعہ تھا، دوسری طرف حضورؐ خاص مواقع پر از خود خطبات بھی دیتے اور تعلیمی مجالس بھی منعقد فرماتے

توسیع تعلیم کے لیے آپ کا یہ ارشاد بڑا اہم ہے کہ اچھے لوگ وہ ہیں جو معلم ہوں یا متعلم[5] پھر آپؐ نے قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا[6] کے قرآنی حکم کے تحت والدین پر ذمہ داری ڈالی کہ وہ اپنی اولاد کو تعلیم دیں[7]۔ پڑوسیوں کو پڑوسیوں سے علم حاصل کرنے کی تلقین کی۔

لکھنے کا بندوبست کرنے کے لیے بدر کے قیدیوں کے لیے یہ فدیہ بھی مقرر کیا گیا کہ وہ مسلمانوں کو لکھنا سکھا دیں[8]

حضورؐ نے دور مکہ میں دار ارقم کو جس طرح عبادات اور مشاورت کا مرکز بنایا اسی طرح وہ تعلیم کا پہلا مرکز بھی تھا[9]

مدنی دور میں دوسرا وسیع تر اور باقاعدہ قسم کا مدرسہ صفہ کے نام سے مسجد نبوی میں قائم ہوا جس میں زیادہ تر باہر سے آنے والے نومسلم اور کچھ مقامی لوگ

---

[1] حدیث مشکوٰۃ کتاب الصلوٰۃ روایت عمرو بن شعیب (ابوداؤد)۔ کتاب الایمان [2] ملاحظہ ہو آیت۔ سورہ نساء آیت ۳۴۔

[3] حدیث: ولا ترفع عنهم عصاك ادبا۔ مشکوٰۃ باب الکبائر و علامات النفاق روایت حضرت معاذؓ۔

[4] متعدد احادیث، مشکوٰۃ۔ کتاب فضائل القرآن۔

[5] حدیث: تواضعوا لمن تتعلمون منه (الجامع الصغیر الکامل لابن عدی منهاج المتعلم)

[6] حدیث سنن دارمی، المقدمہ باب ۲۵-۳۱ [7] ملاحظہ ہو سورۃ تحریم آیت ۶ [8] مسند امام احمد بن حنبل ج ۱، ص ۲۴۶

سیر النبی المبرد۔ ج ۱، ص ۱۷۱۔ [9] تاریخ الامم والملوک (طبری) بحوالہ ڈاکٹر احمد شبلی۔

پہلا اسلامیہ کالج اور اُس کے عظیم طلبہ

دنیا کے سب سے پہلے اسلامیہ کالج کے متعلق یہ مضمون اس لئے نہیں مرتب کیا گیا کہ اس سے معلومات میں اضافہ کیا جائے اور نہ ہی اس لئے یہاں دیا جا رہا ہے کہ اس کے حالات ہمدردانہ طرز بیان اور الفاظ میں پڑھ کر سر دُھنا جائے بلکہ اس میں واقعات و حالات کو ایسی ترتیب اور ایسے طریقے سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کے پڑھنے کے بعد خود بخود یہ واضح ہو جائے کہ مسلمان طالب علم کے نزدیک تعلیم کا مقصد اور اس کا طریقہ کار کیا ہے اور سیاسی مسائل کا حل کیا ہے۔ تعلیم و تربیت اور سیاست کا صحیح تعلق کیا ہے اور اس کی رُو سے میدان عمل میں آنے کا صحیح طریقہ کیا ہے۔ اسلام پوری انسانیت سے کیسے خطاب کرتا ہے اور اس کے نزدیک علم نافع کے حصول کا طریقہ کیا ہے۔ اس کالج کے حالات اور واقعات خود بتاتے ہیں کہ دنیا کا یہ سب سے پہلا اسلامیہ کالج اگر ایک طرف معجزہ ہے تو دوسری طرف وہ قیامت تک پوری انسانیت کے لئے اسوۂ حسنہ بھی ہے۔ (ایڈیٹر محور)

میدانِ عمل میں

اس اسلامیہ کالج کے طالب علم حضرموت کو سرنگوں کرنے والے عالم اور فقیہہ شام و روم کی سلطنتوں کو زیر و زبر کرنے والے بھی تھے، وہی طالب علم صحرائی آواز "صوت الحق" سے بلند کرنے کی ہمت نہیں کر سکتے تھے، ان کے نعرہ ہائے تکبیر سے دنیا کی فضائیں تھرتھراتی تھیں اور کفر کی سلطنتیں ان کی گونج سے لرزتی تھیں۔"

کالج کے ان عام طالب علموں کے علاوہ وہ طالب علم، جو مستقل طور پر صفہ کی درسگاہ میں حصول علم میں مصروف رہتے تھے انہیں بھی مختلف سرایا میں اشاعتِ اسلام کے لیے بھیجا جاتا تھا اور وہ بھی اُس حالت میں جبکہ ملک میں امن و امان نہیں تھا اور دشمنوں کے اس سرے سے اُس سرے تک آگ لگا رکھنے کی وجہ سے ان کی زندگی ہمیشہ خطرے میں ہوتی تھی ——— چنانچہ صفر ۴ھ میں ستر طالب علموں کی جو جماعت قبیلۂ کلاب میں رئیس قبیلہ کی دعوت پر اشاعتِ اسلام کی غرض سے بھیجی گئی تھی، وہ بیر معونہ کے قریب قبائل رعل و ذکوان کے ہاتھوں تمام کی تمام شہید ہوئی صرف ایک طالب علم بچ گئے تھے، جنہوں نے مدینہ آکر خبر کی

وہ طالب علم، جو اس اسلامیہ کالج سے فارغ ہو چکے تھے یا جو ابھی تعلیم و تربیت کے حصول میں مصروف تھے، ان بڑی عمر اور نوجوان طالب علموں کے علاوہ کم عمر کے طالب علم بھی تھے ———

غزوۂ بدر میں عمیر بن ابی وقاص سے، جو ایک کم سن طالب علم تھے، جب واپسی کے لیے کہا گیا تو وہ رو پڑے اور اس طرح آنحضرت صلعم نے انہیں فوج کے ساتھ چلنے کی اجازت دے دی

غزوۂ احد میں جب آنحضرت صلعم نے فوج کا جائزہ لیتے وقت رافع بن خدیج سے فرمایا کہ تم عمر میں چھوٹے ہو، واپس چلے جاؤ تو وہ انگوٹھوں کے بل تن کر کھڑے ہو گئے کہ قد اونچا نظر آئے، ان کی یہ ترکیب چل گئی اور وہ لے لئے گئے ——— سمرہ ایک اور طالب علم ان کے ہم عمر تھے انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں کشتی میں رافع کو پچھاڑ سکتا ہوں اس کو اگر اجازت ملتی ہے تو مجھ کو بھی ملنی چاہیئے۔ دونوں کا مقابلہ کرایا گیا اور سمرہ نے رافع کو زمین پر دے مارا اس لیے ان کو بھی اجازت مل گئی ——— یہ تھے دنیا کے سب سے پہلے اسلامیہ کالج کے ننھے طالب علم

صحابۂ کرامؓ کی بیگمات صحابیات نے جب اس تعلیم و تربیت کا مذاکرہ کیا، جو ان کے بیٹے، بھائی اور شوہر اس اسلامیہ میں جا کر حاصل کر رہے تھے، تو انہوں نے معلم اکبر کے پاس ان میں سے ایک عابدہ کے ذریعہ پیغام بھیجا کہ "یا رسول اللہ! مرد ہم پر سبقت لے جا رہے ہیں آپ ایک دن اپنی طرف سے ہمارے لیے بھی مقرر فرما دیجئے" چنانچہ آپ نے ایک دن خواتین کے لیے مقرر کر دیا آپ ان طالبات کو صدقہ کرنے، اقامتِ دین میں عملی حصہ لینے اور بھلائی کو فروغ دینے کی تلقین فرماتے تھے ———

اور یہ اسی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا کہ اگر ایک طرف مردوں کی طرح ان طالبات میں سے کوئی ہاتھ بڑھا کر اپنے کان کے آویزے اتارتی اور انہیں اللہ کی راہ میں صدقہ کر دیتی اور دوسری انگلی سے انگوٹھی کو الگ کر کے اسے دین کے لیے پیش کر دیتی اور حضرت بلالؓ ان سارے صدقات کو سمیٹ رہے تھے جو وہ اُن کی چادر پر ڈالتی تھیں ——— تو دوسری طرف جب اہل حق پر مصیبتیں توڑی گئیں اس وقت دوسرے طالب علموں کی طرح ان طالبات نے بھی تکلیفیں جھیلیں اور شدائد و مصائب کو برداشت کرنے کی بہترین مثالیں قائم کیں جب مکہ کی فضا اہل حق کے لیے بالکل ہی ناسازگار ہو گئی، تو حبشہ اور مدینہ کی طرف ہجرت میں طالبات نے بھی اپنے وطن اور اپنے اعزا اور اپنے مال و اموال کو خیرباد کہا اور مختلف غزوات میں دنیا کے اس سب سے پہلے اسلامیہ کالج کی طالبات نے پانی پہنچا کر زخمیوں کو پانی پلایا اور ان کی مرہم پٹی کرتے ہوئے ان کی ڈھارس بندھائی

پوری انسانیت کے لئے

دنیا کے اس سب سے پہلے اسلامیہ کالج میں مختلف اطراف سے طالب علم تعلیم و تربیت

کے لئے آئے تھے اور ان کے دلوں و دماغوں اور زبانوں پر ایک ہی پاک کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ جاری کرتے ہوئے رب العالمین نے ملکوں، قوموں، رنگوں اور زبانوں کا فرق دور کرتے ہوئے اس بات کو واضح کر دکھایا کہ آپ ہی تمام جہانوں، تمام ملکوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے تھے۔

اس کالج کے طالب علموں میں سے ایک حبشی غلام بلالؓ تھے جن کے پاس جاہ و منصب کی کمی تھی مگر لوگ ان کی ویسی ہی عزت کرتے تھے جیسے یورپ کی عیسائی اور دوسرے طالب علم عبداللہ بن سلامؓ ہیں جو حضرت یوسفؑ کی اولاد سے ہیں اور جن کو عرب کے تمام یہودی ایک معزز آدمی اور سردار مانتے تھے ——— اگر ایک طرف خالد بن ولیدؓ جیسے طالب علم ہیں جنہوں نے غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کو شکست دی تھی اور اب وہ آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ لات و عزیٰ کے توڑنے کی اجازت دیجیے تو دوسری طرف ذوالبجادینؓ ہیں جنہوں نے گھر بار چھوڑ دیا اس کمل کا تہبند ہے اور کمل کا کرتا، جس کو ببول کے کانٹے سے اٹکا رکھا ہے اور اسی میں خوش ہے

دنیا کے اس سب سے پہلے اسلامیہ کالج کا ایک طالب علم حضرت دحیہ کلبیؓ ہے جو تمام الہامی کتابوں کا جاننے والا ہے جو شام اور بیت المقدس کا سفر کرتا ہے ہرقل شاہ روم کے دربار میں اس کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جس کی فراستوں کا چرچا حبشہ کے دربار سے ہوتا ہے اور جس کو عرب کے تمام عیسائی ایسا لاٹ پادری مانتے ہیں وہ سب کھلم کھلا اقرار کرتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی پوجنے کے لائق نہیں محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور حضرت عیسیٰؑ اللہ کے بندے اور مریم کے بیٹے ہیں ———

اور اسی کالج کے ایک طالب علم سلمان فارسیؓ بھی ہیں جو فارس کے بہت بڑے رئیس زادے کے اکلوتے بیٹے تھے پہلے آگ کو پوجتے تھے پھر عیسائی ہوئے مگر جب اس سے بھی ان کے دل کی پیاس نہ بجھی، تو وہ ایران سے شام، شام سے عراق اور عراق سے حجاز پہنچے اب انہوں نے آپؐ ہی کے قدموں کی مٹی کو اپنا فرش بنا لیا ہے

یہ اسی کالج کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا، کہ اس کالج کے طالب علم رنگ، نسل اور ملک کی تمیز کے بغیر ملت کے درخشندہ ستارے بن گئے، ان کی جھلملاہٹ سے ساری دنیا رہبری حاصل کرنے لگی، یہ مسجد نبوی کے دائرۂ علمیہ (LECTURE THEATER) کی حاضری ہی تھی جس نے انہیں "خیر امت اخرجت للناس ——— سب سے بہتر جماعت جو انسانوں کی رہنمائی کے لیے اٹھائی گئی۔ ——— کا مرتبہ عطا کیا

حق تو یہ ہے کہ اگر تاریخ عالم کا کوئی طالب علم عدل و انصاف کے ساتھ دنیا کے تمام قدیم و جدید کالجوں اور درسگاہوں کو تعلیم و تربیت کی میزان میں تولے تو اسے دنیا کی تاریخ میں صدیقؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، بلالؓ، سلمانؓ جیسے طالب علموں کی کلاس (CLASS) کسی زمانہ اور کسی ملک میں نہیں ملے گی ——— اور کلاس بھی ایسی جس کی تعلیم و تربیت کے فرائض ریگستان عرب کے ایک ان پڑھ چرواہے نے ماہرین تعلیم کی کسی مجلس سے مشورہ لیے بغیر سرانجام دیے۔

علم نافع کا حصول

ابو عبدالرحمٰن عبداللہ کہتے ہیں کہ ہمارے اساتذہ یعنی عثمانؓ بن عفان اور عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کے دوسرے اصحاب نے ہم سے بیان فرمایا کہ وہ جب نبی صلعم سے دس آیات پڑھ لیتے تھے تو وہ ان سے آگے اس وقت تک نہیں پڑھتے تھے، جب تک وہ ان آیات کا جوہر علم اور معنیٰ عملی اخذ نہیں کر لیتے تھے ——— یہ خود اصحاب ہی کا بیان ہے کہ ہم نے یوں القرآن اور العلم کی تعلیم پائی"

اس کالج کے طالب علم محض کثرت معلومات کے حریص نہ تھے بلکہ ان کو حاصل کئے ہوئے علم کی حفاظت اور پھر اس پر عمل کرنے کا ذوق تھا اور اسی لئے مشرق و مغرب کی فضاؤں میں اسلام کا علم بلند کرنے والے یہ طالب علم قرآن کی دس دس آیات کے اسباق پڑھتے تھے اور اس وقت تک آگے نہیں پڑھتے تھے جب تک کہ انہیں مصدق سے حفظ نہ کر لیتے تھے اور ان میں سے جملہ آداب و احکام اور توجیہات و غایات کو تدبر کر کے اخذ نہ کر لیتے تھے اور جب تک کہ اپنے ذہن اور اپنے اعضاء کو ان پر عمل کرنے کی اتنی مشق نہ بہم پہنچا لیتے تھے کہ وہ عمل طبیعت و عادت بن کے رہ جائے

اس کالج کے جوہر شناس طالب علم اس بات کو خوب سمجھتے تھے کہ "علم نافع" صرف وہی ہے جس کو لے کر جب وہ زمین کے راستوں پر چلیں تو دل سے بھی، زبان سے بھی اور عمل سے بھی وہ حق کے علمبردار، حق کے داعی اور حق کے حامی اور ناصر بن کر چلیں ——— ان طالب علموں کی زبان پر نبی صلعم کی یہ دعا ہوتی تھی "اے اللہ ہم علم غیر نافع سے بچنے کے لئے تیری پناہ چاہتے ہیں" اور اسی لئے وہ اپنے عقل و ادراک کو فضولیات اور مابعد الطبیعی فلسفہ کے لاطائل مسائل میں الجھاتے نہ تھے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر سے اپنے علم کا جو حصہ نصوص کی صورت میں نازل فرمایا، اسی پر اکتفا کرتے تھے نہ اس میں اضافہ کرتے تھے اور نہ کمی

رسول پاکؐ عملی تربیت کا جو اسلوب استعمال فرماتے تھے وہ صفات عالیہ کے ساتھ انسانیت کی تعمیر کے لئے اعلیٰ ترین اسلوب تھا، حدیث و احادیث کی کتب ایسی "تر و تازہ" نصوص صحیحہ سے بھری پڑی ہیں کہ گویا ان کے حروف میں براہ راست ہادی اعظم کی آواز سنائی دے رہی ہے اور ان سے مردم سازی کا وہ محمدی طریقہ معلوم ہو سکتا ہے جس نے انسانیت کی اجتماعی تاریخ میں ایک انقلاب اعظم کی تکمیل کرنے والے مردان کار پیدا کر دکھائے تھے۔

معجزہ اور اسوہ

یہ اسی دنیا کے سب سے پہلے اسلامیہ کالج کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا کہ صرف آٹھ برس کی قلیل مدت میں دنیا کے اس سب سے بڑے معلم جنہوں نے مدینہ کے اس اسلامیہ کالج میں ایسے طالب علم تیار کیے جنہوں نے دیکھتے دیکھتے اس علم کی روشنی سے سارے عرب کو منور کر دیا اور پھر یہ روشنی عرب سے نکل کر ساری روئے زمین پر پھیل گئی۔

مدینہ کے اس اسلامیہ کالج کی نقل میں صوفیائے اسلام نے خلافت راشدہ کے بعد چھوٹے چھوٹے مدرسے اور درسگاہیں، جنہیں خانقاہ کہا جاتا ہے اسی تعلیم و تربیت کے لیے قائم کیں، جن میں استعداد رکھنے والے ایسے طالب علم رہتے تھے جنہیں ان خانقاہی کالجوں کے پرنسپل پیروی دنیا کے گندے ماحول سے نکال کر کچھ مدت تک اپنے کالجوں میں رکھتے تھے اور وہاں اعلیٰ درجہ کی تربیت دے کر انہیں اس کام کے لئے تیار کرتے تھے، جس کے لئے معلم اکرمؐ ایسے جلیل القدر طالب علموں کو تیار کیا کرتے تھے

دنیا کے سب سے پہلے اسلامیہ کالج کی تعلیم و تربیت سے جو انقلاب عظیم برپا ہوا تھا اس کی فطرت وہی معلم اکرمؐ خوب جانتا تھا جس نے پہلی مرتبہ اسے برپا کیا، اس معلم اکرمؐ کی سیرت اپنے اخلاق و تقویٰ، حکمت و عدالت، اولو العزمی و قوت شخصیت اور انسانیت کبریٰ کی عظیم الشان خصوصیات کی وجہ سے اگر ایک لحاظ سے معجزہ ہے اور قیامت تک کے لئے معجزہ ہے ——— تو دوسرے لحاظ سے اسوہ بھی ہے کیونکہ اس معلم اکرمؐ نے جو نمونہ چھوڑا ہے اس کا طبعی حاصل وہی انقلاب انگیزی ہے جس کی نظیر اسلامیہ کالج کے نتائج کے طور پر دنیا کے سامنے ساڑھے ——— سو برس پہلے آ چکی ہے۔ اس معلم اکرمؐ کے نمونے کی جتنی زیادہ پیروی کی جائے گی اور جس قدر زیادہ اس سے مماثلت پیدا کی جائے گی، اسی قدر زیادہ انقلاب انگیز نتائج بھی ظاہر ہوں گے اور وہ اس پہلے انقلاب سے اتنے ہی اقرب ہوں گے جو اصل نمونے کی طاقت سے برپا ہوا تھا اسی لحاظ سے وہ اسوہ ہے اور قیامت تک کے لیے اسوہ ہے ——— جب بھی انسان چاہے خواہ بیسویں صدی میں یا چالیسویں صدی میں اور جہاں بھی انسان کوشش کرے خواہ پاکستان میں یا امریکہ و روس میں وہ اس نوعیت کا انقلاب برپا کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ دنیا کے اس سب سے پہلے اسلامیہ کالج کے معلم اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کو سامنے رکھ کر کام کرے۔

بقیہ : محسنِ انسانیت، معلمِ انسانیت

تیسرا سبق آموز تجزیہ سامنے آتا ہے کہ حضورؐ کی تدریج کی تعلیمی مہم نے مسلمانوں میں ایسا فکری، تہذیبی استحکام پیدا کر دیا کہ انہوں نے یونان، ایران اور ہندوستان کے باطل اور فاسد علوم سیکھے مگر وہ ان سے مرعوب نہیں ہوئے، بلکہ انہوں نے تنقیدی صلاحیتوں سے کام لے کر ہر چیز کو اپنے العلم کی کسوٹی پر پرکھا پھر جو کچھ اس کے مطابق پایا اسے قبول کیا اور جو کچھ اس کے خلاف پایا اسے یا تو تشکیل نو کے عمل سے گزارا یا مسترد کر دیا۔ آج جب کہ علمی پسماندگی کے ساتھ ساتھ داخلی طور پر فکری و تہذیبی استحکام موجود نہیں ہے اور بحیثیت ملتِ اسلامیہ کے ہماری اجتماعی خودی کمزور ہو گئی ہے ہم غالب اقوام کے نظریات اور علوم کے سامنے نہایت اطمینان سے شکست کا اعتراف محسوس کرتے ہیں۔

کلمۂ آخر آئیے اس گفتگو کو ختم کرتے ہوئے ہم اپنے مقام کو دیکھیں کہ ہم کہاں کھڑے ہیں؟ ایک غیر قوم نے باہر سے آکر ہمیں اپنی ضرورتوں کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے ایک نظامِ تعلیم ہم پر مسلط کیا جو ملتِ اسلامیہ کے مزاج کے خلاف تھا نبی اکرمؐ کی حکمتِ علم اور حکمتِ تعلیم کے خلاف تھا اور جس نے آہستہ آہستہ اپنے آپ سے بیگانہ کر دیا۔ اس نظامِ تعلیم کے تیزاب میں ہماری خودی اس طرح تحلیل ہوگئی کہ آزادی حاصل کرنے کے بعد سالہا سال گزر جانے کے باوجود ہم اس تعلیمی قفس سے نکل نہیں پا سکتے۔

بدقسمتی سے نظریۂ پاکستان اور اسلام کے دلکش الفاظ کو سیاسی کھلونوں کی طرح استعمال کیا جاتا رہا ہے جب کبھی ایسا ہوا کہ قارِ حاضرہ معاذ میں ہر دوسری رد ہٹ گئی تو مقامروں نے اور نعرۂ اسلام کو اٹھا کر بالائے طاق رکھ لیا۔ پھر جب وقتی ماری مکمل ہو گئی تو اس نعرہ کو کسی آئندہ امرجنسی کے لیے محفوظ رکھ دیا گیا۔

کارپردازانِ تعلیم کے حلقوں میں زیادہ سے زیادہ اب تک جو کچھ سوچا گیا ہے وہ بس اتنا ہے کہ اس مسلط شدہ نظامِ تعلیم کے نصابات میں چند اچھی باتیں اسلام کی بھی داخل کر دی جائیں۔ ظاہر بات ہے کہ یہ ایسا ہی ہے جیسے آپ کسی ٹینک میں جدید ریسر سٹر ساری کی مشین کے فٹ کر کے یہ سمجھیں کہ اب یہ ٹینک ٹھیک ہو جائے گا۔

ایک خاص تہذیبی نظام کی علمبردار ملت اور تحریکِ فلاحِ انسانیت کی مشعل بردار قوم اپنی ضرورت کا پورا نظامِ تعلیم خود بناتی ہے۔ وہ اپنے تعلیمی نظریات کی بنیاد اپنے ایمان و معتقدات پر رکھتی ہے۔ وہ نصابیات کے ہر جزو میں اپنے اجتماعی نصب العین کی روح داخل کرتی ہے۔ وہ اپنی حکمتِ تعلیم پر علوم کی بنیادیں رکھتی ہے اور اس کی تعلیم کا مقصد ایسے انسان تیار کرنا ہوتا ہے جیسے انسان مخصوص نظامِ حیات کو چلانے اور اس کی بین الانسانی تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے مطلوب ہوتے ہیں۔

میں ملک کے دینی شعور رکھنے والے مفکرین اور ماہرینِ تعلیم کو توجہ دلاؤں گا کہ وہ نبی اکرمؐ کے تعلیمی کارنامے کی روشنی میں ملتِ پاکستان کے لیے ایک صحت مند نظامِ تعلیم کا نقشہ مرتب کریں اور اسے موجودہ خلافِ ایمان اور خلافِ مزاج نظامِ تعلیم سے نجات دلائیں جس نے ہماری نسلوں کو فکری اور اخلاقی لحاظ سے کلاڑ کر رکھ دیا ہے۔ ●●

بقیہ : مسلمانوں کی قومی تعلیم

اور مناسب طریق وضع کر لینا چاہیے ثانوی اور یونیورسٹی کے مرحلوں میں بھی VOCATIONAL تعلیم ہونی چاہیے ہر ایک سکول اور کالج ہر طرح کی تربیت نہ دے سکتا ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت ہے، بلکہ مقامی طور پر ہر سکول اور کالج میں مناسب (VOCATIONS) میں تربیت کا معقول انتظام کر سکتا ہے، مثلاً مراد آباد کے سکول میں ظروف (BHARAT) یا گلاس (GLAAS) کی تدریس میں اور علی گڑھ میں تالا سازی کی تربیت میں کوئی مشکل نہ ہونی چاہیے، لیکن لکڑی کا کام، کھانا پکانا، رنگ سازی، خیاطی، کپڑا رنگنا، جلد سازی، اکاؤنٹنسی، سٹینوگرافی، آہنگری، ادویاتِ چمڑے کی اشیاء بنانے وغیرہ جیسے مختلف کاموں سے انتخاب کے لیے کافی مواد مل سکتا ہے۔ ایک طالب علم کو اپنے پورے دورِ طالب علمی میں زیادہ سے زیادہ پیشوں میں مہارت حاصل کرتے رہنا چاہیے تاکہ کچھ ہی عرصہ میں ہندوستانی طالب علم موجودہ مالی بے بسی اور کم تنخواہ والی ملازمتوں مثلاً کلرکوں یا سول سروس کے دوسرے طبقوں پر انحصار سے نجات حاصل کر لیں۔ کوئی نوجوان ایسا نہ ہو جو سرکاری ملازمت پر علامہ انحصار کا یہ جواز پیش کر سکے کہ اس کے پاس بس یہی تعلیم ہے جس سے وہ کلرک بن سکے۔ ضروری نہیں کہ وہ مستقل میں بھی اس پیشہ کو برقرار رکھے جس کی تربیت اس نے سکول اور کالج میں پائی تھی، لیکن اگر کبھی ضرورت پڑے تو یہ تربیت کام آ سکتی ہے اور اس بات کی کوئی وجہ نہیں کہ ان سکولوں میں ادنیٰ اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایک نوجوان لباس سازی، ہوٹل، لانڈری یا آہن گری کی اچھی تجارت نہ کرے۔ ایک تربیت یافتہ نوجوان نہایت قلیل سرمایہ سے، یا صرف اپنی محنت سے کچھ ہی عرصہ میں اپنا کاروبار چلا سکتا ہے۔

اس تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ پڑھے لکھے نوجوان ہاتھ سے محنت و کام کی عظمت اور اہمیت بھی محسوس کریں گے اور وہ بُعد اور علیحدگی دور ہو سکے گی جو اس وقت تعلیم یافتہ طبقہ میں اور ان عوام میں ہے جو محنت و مزدوری کے کاموں پر گزارا کرتے ہیں، ایک طالب علم کو مستقبل میں بہتر مواقع فراہم کرنے کے علاوہ ان پیشوں کا معیار بھی بڑھے گا، کیونکہ ایک پڑھا لکھا اور مہذب انسان محض تقلید نہیں کرے گا، بلکہ ارتقاء و ایجاد کی جانب بھی قدم بڑھائے گا۔ یہ سمجھنا چاہیے کہ پیشہ ورانہ تربیت فنی تربیت کا متبادل ہے۔ یہاں جن اقدامات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ ہیں کہ ادنیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ پیشہ ورانہ تربیت دی جائے جس پر ایک طالب علم ہفتہ میں صرف چند گھنٹے صرف کرے گا جو ایک تھکے ہوئے ذہن کو کتابوں کے بجائے تسکین پہنچائے گی جو اسے چودہ برس کی مدت میں ایک تعلیم یافتہ نوجوان کو ایک تجارتی کاروبار کا اہل بنائے گی تاکہ وہ اپنے ہاتھوں اپنی روزی کما سکے۔ ●●

مرتب احمد جاوید ملک (شعبۂ ارضیات)

قائدِ اعظم ـــ تعلیمی نظریات

قائدِ اعظم محمد علی جناح مسلم قوم کے عظیم رہنما تھے محض تعلیم یافتہ رہیں ان کا کبھی بھی پیشہ رہا نہ میدان۔ لیکن اپنے ہمہ گیر کردار کے سبب وہ جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کے بہترین استاد تھے۔ انہوں نے طلبہ کے مستقبل سے متعلق حکمت کی جو باتیں کہیں ان میں سے چند حسب ذیل ہیں ــــــ (محور)

• ہم پچھلی نسل کے لوگوں کو جتنی بھی آزمائشیں درپیش آئی تھیں درپیش آ چکی ہیں لیکن تکلا کی بات میں یہ ہے کہ جوان دوستوں کی صحت میں ان کو بھول جانا چاہتا ہوں آج کی رات میں ان کے دلوں میں چھپے ہوئے جوان امنگوں کے تاروں سے تیموں کو چھونا چاہتا ہوں کیونکہ یہی ہیں وہ مرد وال عمل جو آئندہ ہماری قوم کی تمناؤں کا بوجھ اٹھائیں گے۔

پیام عید ـ ۱۳، نومبر ۱۹۳۹ء

• میں آپ کو مصروف عمل ہونے کی تاکید کرتا ہوں کام، کام اور بس کام ـــ سکون خاطر، صبر و برداشت اور انکساری کے ساتھ اپنی قوم کی سچی خدمت کرتے جائیے

مسلم طلبہ سے خطاب ـ جالندھر ۱۵، نومبر ۱۹۴۲ء

• جب تک آپ طالب علم ہیں آپ اپنی کوششوں کو محض تیاری پر محدود رکھیں اور عملی سیاست میں حصہ نہ لیں۔ آپ کو لازم ہے کہ طلبہ کی تنظیم کریں اور ان کی ایک مستحکم و منضبط جماعت بنائیں تاکہ مسلمانانِ ہند کے حقوق کی کامل حفاظت ہو آپ کو چاہیے کہ مسلمانانِ ہند کے سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور تعلیمی نشوونما اور ترقی کے لیے ایک لائحہ عمل بنائیں اور اسے عملی جامہ پہنائیں۔ آپ کا یہ بھی فرض ہے کہ اسلامی تہذیب کو بروئے کار لانے میں کوشاں ہوں اور اس امر کی حوصلہ افزائی کریں کہ ہندوستان کے مختلف فرقوں میں باہمی خیر سگالی اور ایک دوسرے کے حق میں نیک نیتی پیدا ہو، اور وہ ایک دوسرے کے حال سے اچھی طرح آگاہ ہوں اور سمجھ لیں کہ ہمارے بھائیوں کی ضرورتیں اور خواہشیں کیا ہیں۔ آپ کا ایک اور اہم فرض یہ ہے کہ ہندوستان اور اسلامی ممالک اور دنیا بھر کے مسلمان طلبہ کے مابین تعاون کار کی تخلیق کریں ـ میں نے ابھی کہا کہ آپ عملی سیاست میں حصہ نہ لیں میں اس کی وضاحت کرتا ہوں تاکہ غلط فہمی کا اندیشہ نہ رہے۔

میں چاہتا ہوں کہ آپ ایسے اور وہ اوصاف پیدا کریں جن کے وسیلے سے آپ طالب علمی کی زندگی ختم کرنے کے بعد عملی سیاست کی جدوجہد میں کامیاب ہوں آپ اس وقت اپنے آپ کو تیار اور ضروری ساز و سامان یعنی علم و آگاہی اور توفیقِ عمل سے آراستہ کریں۔ آپ کی اوّلین اور اہم ترین ضرورت ہے مطالعہ، مطالعہ، مطالعہ ـ اس میں شک نہیں کہ مسلمان طلبہ اور عام طور پر مسلمانوں میں عظیم الشان بیداری پیدا ہو گئی ہے ترقی کی ضرورت کا احساس موجود ہے جوش و خروش ہے طبیعتوں میں ولولے ہیں، جذبات ہیں مگر ساتھ ہی مزاجوں کو محض رانگیختہ کیے جانے سے معرت سے کارآمد نتیجے بھی رہ جاتے ہیں جن سے مسرور ہو جانا بہر گز موزوں نہیں کیونکہ ہندوستان کا مسئلہ انتہائی پیچیدہ اور مشکل ہے جس کی نظیر تاریخِ عالم میں کہیں نہیں ملتی۔ چنانچہ آپ اسی صورت میں دوسروں کے عقیدے بدل سکتے اور ان کو اپنی راہ پر لا سکتے ہیں کہ پہلے آپ خود روشن ضمیر بن جائیں اور معاملے سے کامل طور پر آگاہی حاصل کر لیں آج کل خاص طور پر ہمارے لیے بالخصوص ضرورت ہے کیونکہ برادرانِ وطن اور فریق نے اپنے مقاصد کے لیے ایک منظم پروپیگنڈہ اختیار کر رکھا ہے اکثر اوقات سچائی بالائے طاق رکھ دی جاتی ہے اور ہمارے خیالات اور خواہشات کی ترجمانی دیدہ و دانستہ غلط کی جاتی ہے

سٹوڈنٹس کانفرنس جالندھر ـ ۱۵، نومبر ۱۹۴۲ء

• یہ تلوار جو آپ نے مجھے عنایت کی ہے صرف حفاظت کے لیے اٹھے گی لیکن فی الحال جو سب سے ضروری امر ہے وہ تعلیم ہے علم تلوار سے بھی زیادہ طاقتور ہے جائیے اور علم حاصل کیجئے۔

اجلاس بلوچستان ـ کوئٹہ ـ ۳، جولائی ۱۹۴۳ء

• آپ تعلیم پر پورا دھیان دیں۔ اپنے آپ کو عمل کے لیے تیار کریں یہ آپ کا پہلا فریضہ ہے آپ کی تعلیم کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ آپ دورِ حاضر کی سیاست کا مطالعہ کریں۔ یہ دیکھیں کہ آپ کے گرد دنیا میں کیا ہو رہا ہے ہماری قوم کے لیے تعلیم زندگی اور موت کا مسئلہ ہے دنیا اتنی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے کہ اگر آپ نے اپنے آپ کو تعلیم یافتہ نہ بنایا تو نہ صرف یہ کہ آپ پیچھے رہ جائیں گے بلکہ خدانخواستہ بالکل ختم ہو جائیں گے۔ تعلیم کی اشاعت کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ اس مقصد کی خاطر حتی کی مصیبتیں جھیل جائیں کم ہیں

ویلکاشیکٹ سٹل سکولز کی افتتاحی تقریب کراچی ۲۱ ستمبر ۱۹۴۸ء

• میں پاکستان کے ہر باشندے اور بالخصوص اپنے نوجوانوں کو یہ بات اچھی طرح بتا دینا چاہتا ہوں کہ وہ قدامت، ہمت اور ریاضت کے سچے جذبے کا مظاہرہ کریں۔ ایسی شاندار اور بلند مثالیں قائم کریں کہ آپ کے ہم عصر اور آنے والی نسلیں آپ کی تقلید کریں۔

طلبا سے خطاب لاہور، ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء

• تعمیرِ پاکستان کی راہ میں مصیبتوں اور دشواریوں کو دیکھ کر گھبرائیے نہیں۔ نو زائیدہ اور نئی اقوام کی تاریخ میں کئی ایسی مثالیں موجود ہیں کہ انہوں نے محض قوتِ ارادی، قوتِ عمل اور قوتِ کردار سے خود کو بلند کر لیا۔ آپ خود بھی فولادی قوت کے مالک ہیں اور عزم و ارادے کی دولت میں آپ کی نظیر نہیں ملتی۔ مجھے تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ آپ دوسروں کی طرح اپنے آبا و اجداد کی طرح کامیاب نہ ہوں۔ آپ کو صرف مجاہدوں کا سا جذبہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ ایک ایسی قوم ہیں جس کی تاریخ شجاعت، کردار اور آہنی ارادے کے لوگوں اور کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ اپنی شاندار روایات کے مطابق زندہ رہیے، بلکہ ان میں عظمت و شوکت کے ایک اور باب کا اضافہ کیجئے۔

طلبا سے خطاب، لاہور ــ ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء

• پاکستان کو اپنے جوانوں اور بالخصوص طلبا پر فخر ہے جو آزمائش اور ضرورت کے وقت ہمیشہ صفِ اوّل میں رہے ہیں۔

آپ مستقبل کے معمار قوم ہیں، اس لیے جو مشکل کام آپ کے سر پر کھڑا ہے اس سے نمٹنے کے لیے اپنی شخصیت میں نظم و ضبط پیدا کیجئے۔ مناسب تعلیم اور مناسب تربیت حاصل کیجئے۔ آپ کو پورا پورا احساس ہونا چاہیے کہ آپ کی ذمہ داریاں کتنی زیادہ اور کتنی شدید ہیں اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہر وقت تیار اور مستعد رہنا چاہیے۔

طلبا کے وفد سے ــ ۳۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء

• تعلیم اور صحیح قسم کی تعلیم کی اہمیت سب پر واضح ہے۔ ایک صدی سے زائد عرصے کے غیر ملکی تسلط کا یہ قدرتی نتیجہ ہے کہ ہمارے لوگوں کی تعلیم پر مناسب توجہ نہیں دی گئی۔ اگر ہمیں حقیقی، تیز رفتار اور ٹھوس ترقی کرنی ہے تو ہمیں تعلیم کے مسئلے پر خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ اپنی تعلیمی پالیسی اور پروگرام کو ایسے خطوط پر چلانا ہے جو ہمارے لوگوں کے مزاج کے مطابق ہوں، جو ہماری تاریخ اور ثقافت سے ہم آہنگ ہوں، جو دنیا بھر میں ہونے والی وسیع ترقیوں اور جدید تقاضوں کے مطابق ہو۔

کل پاکستان تعلیمی کانفرنس کراچی ۲۷ نومبر ۱۹۴۷ء

• اپنا اخلاق ہر صورت میں بلند رکھو موت سے نہ ڈرو۔ ہمارا مذہب یہی سکھاتا ہے کہ ہمیں موت کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔ اسلام اور پاکستان کی عزت بچانے کے لیے ہمیں موت کا مقابلہ بہادری سے کرنا چاہیے۔ مسلمان کے لیے اس سے بہتر اور کوئی ذریعہ نجات نہیں ہو سکتا کہ وہ صداقت کی خاطر شہید کی موت مر جائے۔

طلبا سے خطاب، لاہور ــ ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء

• پاکستان کی ترقی کا انحصار زیادہ تر طرزِ تعلیم پر ہے۔ ایسی ہم کیونکر اپنے بچوں کو پاکستان کے سچے خدمت گزار بنا سکتے ہیں۔ تعلیم کا مطلب محض کتابی تعلیم نہیں ہوتا۔ اور جہاں تک کتابی تعلیم کا بھی تعلق ہے، وہ بھی جیسا کہ سب کو معلوم ہے، ابھی بہت پست اور ناقص ہے۔ ہمیں جو کچھ کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ اپنے لوگوں کی توانائیوں کو ایک راہ پر لگائیں اور آنے والی نسلوں کے کردار کی تعمیر بھی کریں۔ اس امر کی فوری اور ناگزیر ضرورت ہے کہ ہمارے جوانوں کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں تعلیم دی جائے کیونکہ اسی سے ہمارے مستقبل کی معاشی زندگی کا معیار بلند ہونے کی امید ہے۔ حصولِ تعلیم کے بعد لوگوں کو تجارت، کاروبار، صنعت و حرفت میں داخل ہونا چاہیے۔ یاد رکھیے ہمیں دنیا کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا ہے جو انتہائی تیزی سے خود کو بدلتی ہوئی چلی جا رہی ہے۔

کل پاکستان تعلیمی کانفرنس ــ ۲۷ نومبر ۱۹۴۷ء

• سکاؤٹنگ ہمارے جوانوں کے کردار کی تعمیر میں بہت اہم حصہ لے سکتی ہے۔ ان کے جسمانی، ذہنی اور روحانی ارتقا میں مدد و معاون ہو سکتی ہے۔ انہیں منظم، مفید اور اچھا شہری بنا سکتی ہے۔

پاکستانی سکاؤٹوں سے خطاب ــ ۲۲ دسمبر ۱۹۴۷ء

• ہم جس دنیا میں اس وقت زندگی گزار رہے ہیں وہ کسی طرح بھی مکمل نہیں کہلا سکتی۔ تہذیب و تمدن کی ترقیوں کے باوجود جنگل کا قانون جاری ہے جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے مصداق طاقتور کمزور سے ناجائز فائدہ اٹھانے سے باز نہیں رہتے۔ اپنی ترقی کو مقدم رکھنا، لالچ اور طاقت حاصل کرنے کی ہوس نہ صرف افراد بلکہ اقوام عالم کے تمام افعال کی محرک ہے۔ اگر ہم دنیا کو زیادہ محفوظ، زیادہ پاکیزہ اور پُر مسرت جگہ بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی اصلاح کا کام افراد سے شروع کرنا پڑے گا۔ یقین جانیے فرد کی زندگی میں سکاؤٹ کا ایثار، خدمت، قول و عمل اور خیال کی پاکیزگی کا مسلک پیدا کر دینا چاہیے۔

اگر ہمارے نوجوان ہر ایک کو دوست رکھنے، ہر ایک کی ہر وقت خدمت کرنے اور ذاتی مفاد کو دوسروں کی بھلائی کے سامنے پس پشت ڈالنے، خیال، الفاظ اور عمل میں تشدد سے بچنے کا سبق سیکھ لیں تو مجھے امید واثق ہے کہ عالمگیر اخوت ہمارے امکان اور دسترس میں ہوگی۔

لوئر سکاؤٹس سے خطاب ۲۲ دسمبر ۱۹۴۷ء

• میرے نوجوان دوستو! میں آپ کو خبردار کرنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ کسی سیاسی جماعت کا آلہ کار بن گئے تو یہ آپ کی سب سے بڑی غلطی ہوگی۔ یاد رکھیے کہ اب ایک انقلابی تبدیلی رونما ہو چکی ہے۔ اب ہماری اپنی حکومت ہے۔ اب ہم آزاد اور خود مختار مملکت کے مالک ہیں۔ اب ہمیں آزاد لوگوں کی طرح اپنے عمل اور اپنے معاملات کا انتظام کرنا چاہیے۔ اب ہم کسی بیرونی طاقت کے تسلط میں نہیں ہیں۔ ہم نے وہ زنجیریں توڑ دی ہیں، ہم نے وہ بیڑیاں کاٹ ڈالی ہیں۔ میرے نوجوان دوستو! اب میں آپ ہی کو پاکستان کا حقیقی معمار سمجھتا ہوں اور دیکھ رہا ہوں کہ آپ اپنی باری پر کیا کچھ کر کے دکھاتے ہیں۔ اس طرح رہیے کہ کوئی آپ کو گمراہ نہ کر سکے، کوئی آپ کو غلط طور پر استعمال نہ کر سکے۔ اپنی صفوں میں مکمل اتحاد اور استحکام پیدا کیجئے۔ ایک مثال قائم کر دیجئے کہ نوجوان کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ آپ کا اصل کام کیا ہونا چاہیے: اپنی ذات سے وفا، اپنے والدین سے وفا، اپنی مملکت سے وفا، اپنے مطالعے پر کامل توجہ۔

جلسۂ عام۔ ڈھاکہ ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء

• آپ کی بھلائی، آپ کے والدین کی بھلائی، بلکہ ساری مملکت کی بھلائی اس میں ہے کہ آپ کی توجہ صرف تحصیلِ علم کے لیے وقف رہے۔ صرف اس طرح آپ خود کو زندگی کی جنگ کے لیے مسلح کر سکتے ہیں۔ اس زندگی کی جنگ کے لیے جو آپ کو عنقریب پیش آنے والی ہے

صرف اس طریقے سے آپ اپنی مملکت کے لیے طاقت اور فخر کا سرچشمہ بن سکتے ہیں اور ان مسائل کے حل کرنے میں مدد دے سکتے ہیں جو اس مملکت کو معاشرتی اور معاشی میدان میں درپیش ہیں۔ صرف اس صورت میں آپ اسے دنیا کی ایک عظیم ترین طاقتور اور ترقی یافتہ قوم بنا کر منزلِ مقصود تک پہنچا سکتے ہیں۔

جلسہ تقسیم اسناد، ڈھاکہ یونیورسٹی ۲۴ مارچ ۱۹۴۸ء

● ہمارے کالجوں کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ زراعت، حیوانات، انجینئری، طب اور دوسرے فنی و خصوصی مضامین میں اول درجے کے ماہرین پیدا کریں۔ صرف اسی طریقے سے ہم ان مسائل کا کوئی ٹھوس حل نکال سکیں گے جو عام آدمی کا معیارِ زندگی بلند کرنے کے کام میں ہمیں پیش آ رہے ہیں۔

ایڈورڈز کالج پشاور ۱۸ اپریل ۱۹۴۸ء

● زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری قوم کی کامیابی کا انحصار صحیح جسمانی تربیت پر ہے۔ آپ کے لیے میرا پیغام یہ ہے کہ جسمانی قوت پیدا کیجئے، ہنگامی یا وقتی گرمی کے لیے نہیں بلکہ پائیدار قوت پیدا کرنے کی خاطر، تاکہ آپ عمر بھر قومی زندگی کے ہر شعبے میں ہمیشہ کے لیے امن و آشتی، بین الاقوامی خیرسگالی اور محنت کا سرچشمہ رہیں۔

کل پاکستان اولمپک کھیلوں کے موقع پر ۲۳ اپریل ۱۹۴۸ء

● پرانے طرزِ تعلیم اور طرزِ حکومت کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اچھے پڑھے لکھے اور تربیت یافتہ کلرک پیدا کیے جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض کلرک دوسروں سے آگے بڑھ گئے اور ایک بلند مقام پر فائز ہو گئے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ مقصد ایسے کلرک حاصل کرنا ہی تھا۔ سول سروس میں زیادہ تر جو انگریز رہتے تھے، ہندوستانیوں کو سول سروس میں داخل کرنے پر بہت بعد میں عمل کیا گیا۔ بہرحال پورا اصول اور خیال یہ تھا کہ ایک خاص قسم کی ذہنیت، ایک نفسیات، ایک مخصوص ذہنی کیفیت پیدا کی جائے۔ جب ایک عام آدمی بی اے یا ایم اے پاس کر لیتا تو بس سرکاری ملازمت ڈھونڈتا پھرتا۔ اگر ملازمت مل گئی تو سمجھ لیا کہ نروان پا لیا۔ اس سے زیادہ بلندیوں کا تصور ہی نہیں کیا گیا۔ میں جانتا ہوں اور آپ سب جانتے ہیں کہ اس کا کیا نتیجہ نکلا ہے۔ عام مشاہدہ یہ ہے کہ ایم اے پاس کی آمدنی ٹیکسی ڈرائیور سے بھی کم ہوتی ہے اور سرکاری ملازمین میں سے بیشتر ایسی پست زندگی بسر کر رہے ہیں کہ ان سے کہیں اچھی ایسے لوگ بسر کرتے ہیں جو پرائیویٹ اداروں میں ادنیٰ ملازمتوں پر کام کرتے ہیں۔

میں چاہتا ہوں کہ اب آپ اس پرانے ڈھرے سے نکلیں، اس ذہنیت کو دور کریں۔ اب آپ آزاد پاکستان میں ہیں۔ حکومت ہزاروں لوگوں کو نہیں لے سکتی۔ یہ ناممکن ہے۔ سرکاری ملازمت حاصل کرنے کی تگ و دو میں ایک طرح کی مقابلہ بازی شروع ہو جاتی ہے جس سے احساسِ کمتری میں مبتلا ہونا ناگزیر ہے۔ حکومت میں صرف کچھ لوگوں کی کھپت ہو سکتی ہے اور جن باقی لوگوں کو کوئی سرکاری ملازمت نہیں ملتی وہ ہمیشہ اپنی مایوسی اور ناکامی کی وجہ سے ایسے لوگوں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں جو حکومت کے خلاف نعرہ بازی کر کے اپنا الو سیدھا کرنا چاہتے ہیں۔

جلسہ تقسیم اسناد ڈھاکہ ۲۴ مارچ ۱۹۴۸ء

● میں چاہتا ہوں کہ اب آپ کی توجہ، آپ کا ذہن، آپ کے مقاصد، آپ کی تمناؤں کا رخ دوسرے راستوں، دوسرے میدانوں، دوسری منزلوں کی طرف ہونا چاہیے جو آپ کے لیے کھلی پڑی ہیں اور رفتہ رفتہ کھلتی جائیں گی۔ دستی کام اور محنت کرنے میں کوئی عار نہیں ہونی چاہیے۔ ہمارے ہاں ٹیکنیکل تربیت کی زبردست گنجائش ہے کیونکہ ہمیں کاریگروں اور ہنرمندوں کی اشد ضرورت ہے۔ آپ معاشیات، بینک کاری، تجارت، امور کاروبار، قانون وغیرہ کی تعلیم حاصل کر سکتے ہیں جس سے کئی امکانات ترقی پیدا ہو گئے ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ نئی صنعتیں قائم ہو رہی ہیں، کارخانے لگ رہے ہیں، نئے بینک، انشورنس کمپنیاں اور نئے تجارتی ادارے کھل رہے ہیں۔ یہ آپ کے سامنے کھلے ہوئے نئے میدان ہیں اور نئے راستے ہیں، منزلوں کی طرف لے جانے والے۔ ان کے متعلق غور کیجئے اور توجہ دیجئے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ سرکاری ملازمت کی نسبت کہیں زیادہ فائدے میں رہیں گے۔ سرکاری ملازمت میں کیا رکھا ہے؟ صبح سے شام تک کلرک کی حیثیت میں گھسے رہنا اور انتہائی تکلیف دہ اور ناگفتہ بہ حالات میں زندگی بسر کرنا۔ اگر آپ تجارت، کاروبار اور صنعت و حرفت کی راہ پر چلیں گے تو آپ بہت زیادہ خوش رہیں گے۔ نہ صرف خوش بلکہ خوشحال بھی، اور خوشی اور خوشحالی کے مزید مواقع ہر وقت آپ کے منتظر رہیں گے۔ اس سے صرف آپ ہی کو فائدہ نہیں پہنچے گا، ملک پاکستان کو بھی فائدہ ہوگا۔

جلسہ تقسیم اسناد ڈھاکہ ۲۴ مارچ ۱۹۴۸ء

● پاکستان حاصل کرنے کی جدوجہد کے دوران میں ہم غیر ملکی حکومت پر نکتہ چینی کیا کرتے تھے، تاکہ اس کی جگہ ہم اپنی مرضی کی حکومت قائم کر سکیں۔ ایسا کرتے وقت ہم نے بہت سی قربانیاں دیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ ہمارے نوجوانوں کی تعلیمی زندگی تباہ ہو گئی۔ لیکن میں یہ کہوں گا کہ آپ نے اپنی جگہ ایسا کردار شاندار طریقے سے انجام دیا۔ اب کہ آپ اپنا نصب العین حاصل کر چکے ہیں، آپ کی اپنی حکومت ہے، آپ کا اپنا ملک ہے جس میں آپ آزاد لوگوں کی حیثیت سے بستے ہیں، تو آپ کی معاشرتی اور معاشی مسائل کے لیے آپ کا نقطۂ نظر اور آپ کی ذمہ داریاں بھی بدل جانی چاہئیں۔ نظم و ضبط کا کھلا احساس، عمدہ کردار، حقیقی اور عمل پر اکسانے والی تعلیم۔ آپ کو چاہیے کہ خود کو پورے دل و دماغ کے ساتھ مطالعہ کے لیے وقف کر دیں، کیونکہ آپ کی پہلی ذمہ داری ہے اپنی ذات کی طرف، اپنے والدین کی طرف اور اپنی مملکت کی طرف۔ آپ کو حکم ماننے کی عادت ڈالنی چاہیے کیونکہ صرف اسی طریقے سے آپ حکم دینا سیکھ سکتے ہیں۔

اسلامیہ کالج پشاور ۱۲ اپریل ۱۹۴۸ء

● میرے نوجوان دوستو! اب تمہیں اس ضروری اور بنیادی تبدیلی کا پورا پورا احساس ہونا چاہیے جو اس خطے میں حال ہی میں ہوئی ہے۔ اب اپنی شخصیت کو محض سرکاری ملازمت کے حصول میں محدود نہ کیجئے جیسا کہ اب تک سب ہی اس کی تمنا کرتے رہے ہیں۔ اب نئے میدان نئے راستے اور نئی منزلیں آپ کی تگ و دو کے منتظر ہیں۔ سائنس، تجارت، بینک، بیمہ، صنعت و حرفت اور فنی تعلیم کے شعبے آپ کی توجہ اور کوشش کے محتاج ہیں۔

اسلامیہ کالج پشاور ۱۲ اپریل ۱۹۴۸ء

● اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ منزل تک پہنچنے کے لیے تمام وسائل کو کام میں لانا پڑے گا۔ منظم طریقے سے مکمل تیاری کرنی پڑے گی۔ میں آپ سے کہوں گا کہ خطابات کے دھارے پر نہ بہہ جائیے۔ محض نعروں کی لپیٹ میں نہ آئیے۔ (طلبہ سے خطاب ۲ مارچ ۱۹۴۱ء)

● تعمیرِ قوم کا پہلا ستون تعلیم ہے۔ تعلیم کے بغیر آپ بالکل ویسی ہی حالت میں ہیں جیسی کہ کل رات اس پنڈال میں اندھیرے میں تھی۔ تعلیم کے ساتھ آپ اس حالت میں ہوں گے جیسے کہ اب دن کے اس چکاچوند اجالے میں ہیں۔ (طلبہ سے خطاب ۲ مارچ ۱۹۴۱ء)

- جب نوعِ انسانی کو ظلم و جور کی چکی میں پیسا جا رہا ہو۔
- جب انسان کو خون سے نہلایا جا رہا ہو
- جب مذہب و اخلاق اور تہذیب و انسانیت کا دیا ٹمٹما رہا ہو
- جب انسان پر انسان کی خدائی مسلط ہو۔
- جب عصمتوں کے آبگینے سرِ بازار پاش پاش ہو رہے ہوں

جب پوری دنیا بدکاریوں کی عفونت سے معمور ہو۔

- جب کفر اور ظلم کی تیرہ شبی مسلط ہو۔

اور

- جب مظلوم و ستم رسیدہ انسانیت جدا جدا ہزار تہذیبوں کے لگائے ہوئے زخموں سے جاں بلب ہو

کیا اس وقت بھی

ہم

پاکستان کے مذہبی رہنما بھی باشعور اور روشن خیال نوجوان

رقص و سرود اور طاؤس و رباب کے ہنگاموں میں مست رہیں گے؟

ے و معشوق جواں سال سے شغل کرتے رہیں گے؟

ش و عشرت کے گیت گاتے رہیں گے؟

نفس کی ہوس میں مشغول ہو کر زندگی کے تمام تر بلند مقاصد کو فراموش کر دیں

ں سرمایہ دارانہ جمہوریت اور روس کی غلام ساز اشتراکیت کا بت تعمیر ہوتے دیکھیں گے اور خاموش رہیں گے؟

- یہ بھول جائیں گے کہ یہ ملک اسلام کی مقدس امانت ہے جس میں مسلم نوجوانوں کی آرزوؤں کو پروان چڑھانا ہے؟

- صرف زرتار آنچلوں کے سایوں کا تعاقب کریں گے۔ نقرئی قہقہوں کو فردوسِ گوش بنائیں گے گیسوؤں کے پیچ و خم میں الجھے رہیں گے؟

نہیں

- ہماری منزل چرخِ نیل فام سے پرے ہے۔
- ہماری دنیا ستاروں سے بھی آگے ہے۔
- پاکستان کا حصول ہماری منزل نہیں —— اس کا پہلا سنگِ میل ہے
- ہمیں اس سرزمین میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے خواب کی تعبیر ڈھونڈنی ہے۔
- ہمیں یہاں ایک نئے نظام کا تجربہ کرنا ہے جو انسانیت کے ظلم و جور فساد اور جنگ سے نجات دلائے۔
- ہمیں یہاں وہ نیا انسان پیدا کرنا ہے جس کے لیے اس کائنات کا ذرہ ذرہ ایک مدت سے چشم براہ ہے۔
- ہمیں اپنی پرانی ذہنیتوں، اپنے سوچنے کے پست پا افتادہ طریقوں اور اپنے قدر و قیمت کے فرسودہ پیمانوں کو یکسر تبدیل کر دینا ہے اور اسلام کی اخلاقی قدروں پر سوسائٹی کی تعمیرِ جدید کرنی ہے۔
- ہمیں ظلم اور جور الحاد اور دہریت کی تاریکی دور کر کے عدل و انصاف اور خدا ترسی و خدا پرستی کی روشنی پھیلانی ہے۔
- انسان پر انسان کی خدائی ختم کر کے خدائے واحد کی حکومت قائم کرنی ہے

اور اس مقصد کے لیے

- ہمیں اسلام کے اصولوں کے محور پر منظم ہو کر پیہم اور مسلسل جد و جہد کرنی ہے۔

گیا

- پاکستانی شاہین کے بازو میں ان بلند فضاؤں میں پرواز کرنے کا دم خم باقی ہے!

باغیوں کے خلاف بہت سرگرم رہا تھا۔ وہ البدر کے غیر معمولی فعال اور مستعد قائدین میں سے تھا۔ اُس کی بہادری میں رضاکار بھارت کی سرزمین میں نکل جاتے تھے۔ رات کے اندھیرے میں دشمن کو سخت نقصان پہنچاتے۔ ان سرگرمیوں کی وجہ سے مکتی باہنی اس نوجوان کے خون کی پیاسی ہو گئی تھی۔ دسمبر کی تمام رات بھارتی فوجیں بھی تھیں۔ اصل ہو گئیں محمد الیاس اپنے ایک دوست عبدالخالق کے ساتھ شہر سے دیہات کی طرف روانہ ہوا۔ دس میل کی مسافت طے کر کے جہاں پہنچے ہی تھے کہ مکتی باہنی نے آ لیا۔ وہاں قریب ہی ایک سکول تھا جس میں بھارتی فوجیوں نے اپنا کیمپ قائم کر لیا تھا۔ الیاس اور خالق اب دو دن کے لئے میں تھے۔ مکتی باہنی نے خالق صاحب کو بھارتی فوجیوں کے حوالے کر دیا جنہوں نے انتہائی شرمناک انداز میں انہیں مارا پیٹا اور سرعام رسوا کر دیا۔ الیاس سے وہ نئے نئے طریقے سے انتقام لیا جاتے تھے۔ چنانچہ اس جری نوجوان کو ایک ٹرک کے ساتھ اس طرح باندھ دیا گیا کہ اُس کا سارا دھڑ ٹرک کو چھوتا تھا۔ اسی حالت میں ٹرک اسٹارٹ کیا گیا اور الیاس کئی میل تک سڑک اور ریت کی کشمکش میں مبتلا رہا۔ ٹرک پر مسلسل گھسٹنے کی وجہ سے اس کا جسم لہولہان ہو چکا تھا اور تمام خون آنکھوں میں جمع ہو گیا تھا۔ کئی دس میل کے فاصلے پر تھا اور ٹرک تیز رفتاری پر دوڑ رہا تھا۔ الیاس کی چیخیں سن کر مکتی باہنی والے قہقہے لگاتے اور کہتے:

"پاکستان کے حامی کو مدد کے لئے پکارو"

یونہی پہنچے ہی الیاس کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔ وہ بالکل بے حس و حرکت پڑا تھا اور تماشائی اس پر ظلم کے نت نئے طریقے آزما رہے تھے۔ جلادوں نے نیم مردہ حالت میں اسے اٹھا کر بٹھایا اور اس کی پشت پر جلتے ہوئے سگریٹ سے "جے بنگلہ" کا نعرہ لکھا اور دو دن تک مسلسل اسی طرح بٹھائے رکھا تاکہ ایک عالم ان کے مظالم کا نظارہ کر لے۔ اس کے بعد الیاس کی دونوں آنکھیں نکال لی گئیں۔ وہ مرغ بسمل کی طرح تڑپتا رہا، مگر اس نے کوئی التجا کی، نہ اپنے حامی پاکستان ہونے پر کسی قسم کی ندامت کا اظہار کیا۔ پھر اُسے گولی مار دی گئی اور اس کی لاش چار دن تک بجلی کے کھمبے کے ساتھ لٹکائے رکھی۔ الیاس کے پانچ بھائی تھے، ان میں سے چار طرح طرح کی اذیتیں دے کر ختم کر دیے گئے۔

الیاس کے ساتھی عبدالخالق کی ابھی زندگی باقی تھی۔ چنانچہ ان کے ایک ہم جماعت نے انہیں درندوں سے بچا لیا۔ وہ انہیں اپنے گاؤں لے گیا۔ ان کے گھر سے دو فاصلے پر دھان کا سب سے بڑا ڈھیر جمع تھا۔ اُس میں عبدالخالق کو چھپا دیا۔ رات کے بارہ بجے انہیں اس ڈھیر سے نکالا جاتا۔ آدھ گھنٹے تک وہ تازہ ہوا کھاتے اور پیٹ کا ایندھن بھرتے اور پھر بوٹ جیسی تاریک اور حبس زدہ جائے پناہ میں چلے جاتے۔ مکتی باہنی والے ان کی تلاش میں کئی بار آئے۔ اس ڈھیر کے پاس سے بھی گزرے، بلکہ ایک دفعہ تو انہوں نے وہاں کئی گھنٹے قیام کیا۔ عبدالخالق پر وہ چند گھنٹے قیامت کے سے گزرے۔ پھر وہ چلے گئے، مگر خالق صاحب کئی ماہ تک فکر کی آغوش ہی میں لیٹے رہے۔

ڈھاکے میں البدر تنظیم نے شہریوں کی جان و مال اور آبرو بچانے کی عظیم الشان کوششیں کیں۔ ان کا ذکر ہم کسی وقت تفصیل سے کریں گے۔ اگر یہ تنظیم بروقت منظم ہو جاتی اور اسے جدید ترین اسلحہ ساز و سامان مل جاتا تو مشرقی پاکستان کا بڑا حصہ اس عذاب سے محفوظ رہتا جس سے وہ ۱۶ دسمبر کے بعد گزر رہا ہے۔ ڈھاکے میں زندگی معمول پر ہے، جس میں پاکستانی فوجیوں کے ساتھ ساتھ البدر کے رضاکاروں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ یہ تنظیم اگر سر سے موجود ہوتی تو مکتی باہنی بہت پہلے ڈھاکے کی اینٹ سے اینٹ بجا چکی ہوتی۔ اس شہر میں البدر کے ڈنگ کا ڈر مصطفیٰ شوکت عمران تھے۔ انہیں کیسی کیسی اذیتیں دے کر شہید کیا گیا، اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ ہم یہاں ان کی ایک کمپنی کے نائب قائد جناب مصطفیٰ کمال کی شہادت کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ انٹر میں دوسرے سال کے طالب علم تھے، پُرجوش اور پُرعزم۔ ۱۶ دسمبر کی قیامت صغریٰ کے بعد اُس نے چند روز کے لیے اپنے آپ کو چھپائے رکھا، پھر تبلیغی جماعت کے ایک گروہ کے ساتھ ڈھاکے سے نکل کھڑا ہوا۔ وہ سب کے سب ایک مضافاتی بستی کی طرف جا رہے تھے کہ سامنے سے نوجوانوں کا ایک گروہ نمودار ہوا۔ وہ جدید اسلحے سے مسلح تھا اور خوشی سے رقص کر رہا تھا۔ مصطفیٰ کمال نے بھانپ لیا کہ مکتی باہنی والے آپہنچے۔ ان کی نظروں سے بچنے کی ممکن کوشش کی مگر اُس کے کالج کے دو لڑکوں نے اُسے پہچان لیا اور چیخ اُٹھے: "وہ ہے مصطفیٰ کمال"۔ تبلیغی افراد کی موجودگی میں مکتی باہنی کے خونخوار لٹیروں نے مصطفیٰ کمال کو اپنی گرفت میں لے لیا اور اس پر انسانیت سوز مظالم ڈھانے شروع کر دیے۔ پہلے اُس کی انگلیاں کاٹیں اور ان سے خون چکا اُسے اپنے چہرے پر مل لیا، پھر اُس کے دونوں ہاتھ کاٹ ڈالے۔ اس کا سینہ چیرنے کے لیے اُسے زمین پر لٹا دیا گیا۔ ایک بدبخت لڑکے نے اُس کی آنکھیں نکالنے کا مشورہ دیا۔ اس پر مکتی باہنی کے ہیں تکرار شروع ہو گئی۔ ادھر مصطفیٰ کمال ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ ایک مسلمان نے ترس کھا کے گولی داغ دی اور یوں نوجوان کی روح قفسِ عنصری سے نجات پا گئی۔

ڈھاکے میں تاؤں کا ایک طالب علم ابوالحسن تھا۔ دُبلا پتلا مگر بلا کا پھرتیلا۔ البدر تنظیم میں بہت سرگرم اور مستعد تھا۔ اس کا گھر شانتی نگر میں واقع تھا۔ اس علاقے میں مکتی باہنی کا بہت زور تھا۔ ۱۶ دسمبر کو وہ البدر کیمپ چھوڑ کر اپنے محلے شانتی نگر میں چلا گیا۔ دراصل ہتھیار ڈالنے کی افواہیں بے دردی سے گشت کرنے لگی تھیں، مگر فوج کے ذمہ دار افسر اس کی تصدیق نہ کرتے تھے۔ پھر سارا کام اتنی جلد بازی میں ہوا کہ فوجی حکام البدر کے کارکنوں کو وقت سے پہلے مطلع بھی نہ کر سکے۔ اسی لیے ہتھیار ڈالنے سے ذرا پہلے البدر کے کیمپ سے رضاکار مختلف سمتوں میں نکل کھڑے ہوئے۔ ابوالحسن اپنے گھر چلا آیا جو دشمنوں کے اندر گھرا ہوا تھا۔ اُس نے اپنے محلے میں قدم رکھا ہی تھا کہ مکتی باہنی والے چیلوں کی طرح جھپٹے اور بھیڑیوں کی طرح نوچنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ ابوالحسن کمزور جسم کا ہے، زیادہ سختی کریں گے تو سب کچھ اُگل دے گا، مگر وہاں معاملہ ہی دوسرا تھا۔ وہ مار مار سے بے ہوش ہوا اور ایک دفعہ تو اُسے مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا گیا، مگر اس کی قوت ارادی پھر حرکت میں آئی۔ اُس کے بازو اس طرح چھیل دیے گئے جس طرح قصائی جانور کا گوشت چھری سے کاٹتا ہے۔ ابوالحسن بہت اہم لڑکا تھا۔ اس کے سینے میں سینکڑوں راز تھے۔ اگر اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نکل جاتا جس سے دشمن اس کے ساتھیوں کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو جاتے تو سینکڑوں کام کے آدمی دھر لیے جاتے۔ وہ ہر ستم ہر سختی برداشت کرتا رہا، پھر اس کی آنکھوں نے اپنے ہاتھ جسم سے جدا ہوتے دیکھے، جسم کے نازک حصوں پر جلن اور سوزش بڑھتی گئی اور اُس نے اپنے مکان کے سامنے انتہائی بےبسی میں جان دے دی۔

محیب الرحمٰن ڈھاکہ یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ اُس نے پاکستان کے تحفظ کی جنگ میں دل و جان سے حصہ لیا تھا۔ پاکستانی فوج نے ہتھیار ڈالے تو وہ فرار ہو کر اپنے آبائی گاؤں مداری پور (ضلع فریدپور) چلا گیا۔ چونکہ اس کے کارہائے نمایاں سے سبھی واقف تھے، اس لیے اُسے مداری پور ہی میں مکتی باہنی نے پکڑ لیا۔ عمر اس کی بیس بائیس سال کی تھی۔ بہت خوبصورت اور بہادر تھا۔ ظالموں نے اس سے بہت بُرا انتقام لیا۔ دونوں رخسار کاٹ دیے اور گلے چیر دیے۔ اس جوان ہمت لڑکے نے یہ سب کچھ بڑے سکون سے برداشت کیا۔ پھر اس کے کان اکھیڑے اور پورے شہر میں گشت کروایا۔ دو روز تک بھوکا رکھا۔ تیسرے روز نمک لگایا اور محیب الرحمٰن کے منہ میں جامن کے بُور سے ٹھونس دیے۔ وہ سارے کے سارے کٹے ہوئے رخساروں میں سے نکل گئے تو وحشی خوشی سے چلائے اور سارا دن یہی کھیل کھیلتے رہے۔ پھر رات کے وقت زخموں پر نمک اور مرچیں چھڑک دیں۔ ہر ظلم کے آغاز پر یہی کہتے: "جے بنگلہ کا نعرہ لگاؤ اور پاکستان کو گالی دو۔" محیب الرحمٰن ہر بار سر ہلا کر اُن کی مرضی کے آگے جھک جانے سے انکار کر دیتا۔ اگلی صبح مداری پور کے چند بھلے لوگوں نے اس ظلم کے خلاف احتجاج کیا۔ دل کتنے ہی پتھر ہوں اور نفرت کا زہریلا مادہ کتنا ہی زیادہ ہو، انسانیت کی رمق اُبھر ہی آتی ہے۔ آپس میں تکرار شروع ہو گئی۔ ادھر محیب الرحمٰن کی حالت غیر ہوئی جا رہی تھی۔ آخر ایک لڑکے نے بندوق سے فائر کر دیا اور محیب ابدی نیند سو گیا۔

مدارس پور میں سترہ سالہ لڑکا جمعیت طلبہ کا رکن تھا۔ اسے مکتی باہنی نے پکڑ لیا اور کچھ پوچھے بغیر ظلم و تشدد کا کوڑا برسانا شروع کر دیا۔ لڑکا باہمت اور جری تھا۔ مار کھا کر نعرۂ تکبیر بلند کرتا اور بلند آواز سے کلمۂ شہادت پڑھتا۔ اس پر مکتی باہنی والے بہت گھبرائے اور ان کے اوسان منتشر ہو گئے۔ جب وہ مار مار کر تھک گئے تو ان کے کمانڈر نے اس لڑکے سے کہا

"اگر تم اعلان کر دو کہ میں نے جو کچھ کیا، غلط کیا اور میرا پاکستان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، تو ہم تمہیں آزاد کر دیں گے۔"

لڑکے نے کراہتی ہوئی آواز میں جواب دیا:

"ظالمو! میری موجودگی میں یہ کیا بک رہے ہو۔ میں خدا کی قسم کھا کے کہتا ہوں میں نے جو کچھ کیا اپنا فرض ادا کیا۔ پاکستان میری روح ہے۔ میری جان ہے۔ میں اسے کیونکر چھوڑ سکتا ہوں۔ ہاں اگر تم میرے ہاتھ پہلے لگ جاتے تو میں تمہیں ضرور ختم کر دیتا۔ ہمارا ایک دوسرے سے صرف دین کا رشتہ ہے جس نے ہمارے دین سے انحراف کیا ہم اس سے لڑیں گے۔"

یہ جواب سن کر ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور انہوں نے دانت پیستے ہوئے کہا:

"ہم تمہیں ختم کرنے والے ہیں، تمہاری کوئی آرزو ہے تو بیان کر دو۔"

"مسلمان کی ایک ہی آرزو ہو سکتی ہے اور وہ ہے شہادت۔ میں اسے لبیک کہتا ہوں۔"

آخری فقرہ ابھی پورا بھی نہ ہوا تھا کہ چار گولیاں اس کے جسم میں داخل ہو گئیں۔

ہم آخر میں مصطفیٰ شوکت عمران کی ابدی زندگی کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کا تعلق نواکھلی سے تھا اور بچپن ہی سے ان کا رجحان دین کی طرف تھا۔ نواکھلی میں علمائے دین ویسے بھی بہت کثرت سے ہیں مگر عجیب بات ہے اسی علاقے میں لادینی قوتوں نے بہت زور پکڑا اور مکتی باہنی تحریک کی جڑیں بہت گہری ہو گئیں۔

عمران کے والد عوامی لیگ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لیے باپ اور بیٹے کے مابین نظریاتی ہم آہنگی نہ تھی۔ عمران ڈھاکہ میڈیکل کالج میں پانچویں سال کے طالب علم تھے۔ بہت ذہین اور سمجھدار۔ ان کے بارے میں عام مشہور تھا کہ امتحان میں نقل کیے بغیر پاس ہوتے ہیں۔ مطالعۂ قرآن کے ساتھ خاص شغف تھا۔ اکتوبر ۱۹۷۱ء کے وسط میں البدر منظم ہوئی تو عمران پاکستان کی بقا کی جنگ میں کود پڑے۔ البدر کے انٹیلی جینس سیکشن سے ان کا تعلق تھا اور فوج کے اعلیٰ افسروں سے نیچے

مراسم تھے۔ میجر جنرل راؤ فرمان علی کا دیا ہوا شناختی کارڈ ان کے پاس تھا۔ ڈھاکہ میں آخری دنوں میں کرفیو لگا اور گھروں کی تلاشی لی گئی تو اس میں عمران بہت نمایاں تھے۔

۱۴ دسمبر کو صبح سے ابھی باقاعدہ ہتھیار ڈالے بھی نہ گئے تھے کہ مکتی باہنی نے البدر کیمپ پر حملہ کر دیا۔ اس وقت عمران وہیں موجود تھے اور اپنے ساتھیوں کو نکالنے میں سرگرمی سے مصروف رہے تھے۔ جب مکتی باہنی کے مسلح رضاکار سر پر آ گئے، تو انہوں نے فرار ہونے کی کوشش کی۔ کوشش کامیاب بھی رہی، مگر ایک گولی نے ان کے ہاتھ کو زخمی کر دیا تھا۔ بچتے بچاتے اپنی بہن کے گھر پہنچے۔ بدقسمتی سے ان کا بہنوئی روس نواز کمیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھتا تھا۔ گھر کے اندر گھٹن اور باہر موت کے بادل۔ چند گھنٹے گھر پر رہے، خون مسلسل بہہ رہا تھا، بہن کو بتائے بغیر گھر سے نکل پڑے۔ البتہ ایک چٹ چھوڑ گئے کہ ہولی فیملی ہسپتال جا رہا ہوں۔ ان کے چلے جانے کے آدھے گھنٹے بعد مکتی باہنی گھر پہنچ گئی۔ انہوں نے کونے کونے کی تلاشی لی، لیکن عمران کہیں نظر نہ آیا۔ مکتی باہنی کے ایک رضاکار کی نظر چٹ پر پڑ گئی۔ وہ فوری طور پر ہسپتال پہنچ گئے۔ زخمی عمران کو بستر سے کھینچا اور پکڑ کر اپنے کیمپ میں لے گئے۔

عمران پر تشدد کی داستان بہت لرزہ خیز اور دردناک ہے۔ ان کا تعلق چونکہ البدر کے شعبہ سراغ رسانی سے تھا، اس لیے مکتی باہنی والے ان سے زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ بلیڈ سے منہ پر جے بنگلہ کا نعرہ کھود دیا گیا اور جسم کے مختلف حصے تپتے ہوئے لوہے سے داغ دیے گئے۔ ظلم کے جواب میں ان کی زبان پر کلمہ طیبہ جاری رہا۔ اذیت کی تاب نہ لا کر عمران بے ہوش ہو جاتے، مکتی باہنی والے ہوش میں آنے کا انتظار کرتے اور جونہی ہوش آتا، تشدد کا عمل جاری ہو جاتا۔ چار دن جاں کنی میں گزر گئے اور جب عمران کی زبان سے اپنے کسی ساتھی کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ نکلا، تو پانچویں روز انہیں گولی مار دی گئی۔

جمال خوں لالہ و گل میں نمایاں ہو گیا

اور میت کو چوراہے میں ایک درخت پر لٹکا دیا ـــ

چاند ستارہ سرنگوں تھا ـــــــــ

مگر چاند ستارے کا بیٹا ـــــــــ

سونہی دھرتی کا ویرا دیپ تھا لہرا رہا تھا ـــــــــ

بقیہ : اسلام کا نظریۂ تعلیم

سلطان محمود غزنوی نے اپنے پایۂ تخت غزنی میں سنہ ۴۱۰ھ (مطابق سنہ ۱۰۱۹ء) میں قائم کیا۔ بقول ابوالقاسم فرشتہ "مسجد سے ملحق ایک عظیم الشان مدرسہ قائم کیا اور اس کے کتب خانے کو نادر الوجود کتب سے آراستہ کیا اور مسجد و مدرسے کے اخراجات کے لئے بہت سے دیہات وقف کئے۔" محمود غزنوی نے اپنی پوری مملکت میں بے شمار مدرسے قائم کئے اور اس کے زیر اثر دوسرے امراء، ارکان دولت نے بھی یہ خدمت انجام دی۔ تاریخ نے محمود غزنوی کو اس کے عسکری حملوں کی وجہ سے تو یاد رکھا ہے لیکن علم کی دنیا میں جو انقلاب آفریں اقدام اس نے کیا اس کا قرار واقعی اعتراف نہیں کیا گیا۔ اسے تاریخ کی ستم ظریفی نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے۔

دوسرا اہم مدرسہ جس نے تاریخ میں اپنا نام پیدا کیا دولت سلجوقیہ کے مشہور وزیر اعظم نظام الملک طوسی (المتوفی ۴۸۵ھ) کا قائم کردہ مدرسہ نظامیہ بغداد ہے جسے امام الحرمینؒ اور امام غزالیؒ جیسے صدر مدرسین حاصل ہوئے اور جس نے تاریخ پر اپنے انمٹ نقوش چھوڑے۔

اس کے بعد مدارس کی ایک رو چل پڑی اور ساری اسلامی قلمرو میں ان کا جال بچھ گیا۔ ان میں ایسے ایسے عظیم الشان مدارس بھی تھے جن کے تحت متعدد مدارس کام کرتے تھے، اور ان کی حیثیت آج کی اصطلاح میں یونیورسٹی کی تھی۔ ان تمام مدارس میں وہی اصول کارفرما تھے جن کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔ مفت عوامی تعلیم کا یہ ایک ایسا نظام تھا جس کی نظیر کسی دوسرے تمدن میں نہیں ملتی۔

—— پروفیسر سعید احمد (سعد یاسیات)

حضرت انسان کی آفرینش سے لے کر آج تک کے عرصے دراز میں ہم جس عہد کو
— عہدِ سعادت —
قرار دیتے ہیں وہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔

اوّل : عہدِ نبوت (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام)

دوم : عہدِ خلافتِ راشدہ

اس "عہدِ سعادت" میں تعلیم کے بارے میں ہمارے بزرگ پروفیسر سعید احمد صاحب نے مختصر مگر جامع مضمون تحریر کیا ہوا ہے تبرکاً ہم ان کا یادگار حصہ یاد دلانے کے لیے مدیر قارئین کر رہے ہیں —

(محور)

عہدِ نبوی ﷺ میں نظامِ تعلیم (۱)

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایامِ جاہلیت کی شاعری کے مطالعے سے عربوں کے حُسنِ ذوق، قادر الکلامی اور فصاحت و بلاغت کا پتا ہمارے سامنے آتا ہے اور ان کی کہاوتوں، ضرب الامثال، خطبوں اور حکایتوں سے ان کی فراست و ظرافت کا ایک دلکش نقشہ نگاہوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے اور یہ بھی کہ عربوں کی زبان میں پڑھنے لکھنے کی چیزوں کے متعدد الفاظ ملتے ہیں، مثلاً قلم، قرطاس، رقم، سطور، کاتب، مکتوب، صحف، زبر، اسفار وغیرہ لیکن اس تمام قابلِ قدر علمی و ادبی سرمایے کے باوصف دورِ جاہلیت میں کسی باقاعدہ تعلیمی نظام کا کھوج لگا سکتے ہیں۔

مستشرقین نے اپنی مخصوص افتادِ طبع اور معین اندازِ تحقیق سے کام لیتے ہوئے مدینے میں یہودیوں کے ایک نیم تعلیمی ادارے "بیت المدراس" کا سراغ لگا لیا اور مکّے کے قریب قبیلہ ہذیل کے ابتدائی نوعیت کے بچوں کے مدرسے کی روایت ڈھونڈ نکالی لیکن یہ ایک تاریخی صداقت اور مسلّم ہے کہ طلوعِ اسلام سے پہلے عربوں کے ہاں نہ باقاعدہ کوئی نظامِ تعلیم و تربیت مروّج تھا اور بعثتِ نبوی سے پہلے وہاں تعلیمی اداروں کا کوئی وجود تھا۔

ہمارے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک بڑا مقصد نہ صرف عربوں کو بلکہ ساری دُنیا کو علم و تمدن کی دولت سے مالا مال کرنا تھا۔ چنانچہ اسی لیے سیّد المرسلین کو اپنے "معلّمِ کتاب و حکمت" ہونے پر بڑا فخر تھا۔ اسی لیے عبد اللہ بن عمرو بن عاص نے ایک دلچسپ واقعہ بیان فرمایا: آنحضرت ﷺ ایک دن مسجدِ نبوی میں تشریف لائے اور صحابہ کرام کے دو حلقے دیکھے، ایک تلاوت و دعا میں مشغول تھا، دوسرا درس و تدریس میں۔ آنحضرت ﷺ نے پہلے ارشاد فرمایا: "دونوں گروہ اچھے کام میں مشغول ہیں"۔ پھر اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا کہہ کر علمی حلقے میں بیٹھ گئے۔

ارشاداتِ نبوی

آئیے ہم آپ کو یہ بتلائیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے علم اور اربابِ علم کی فضیلت کس طرح خود کیا متعین فرمائی ہے۔ اسی طرح علم کے کن مقاصد کو پسندیدہ قرار دیا ہے اور کن مقاصد کو ناپسند ٹھہرایا۔ علم کی فضیلت کے بارے میں فرمایا:

- علم سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ۔ (بیہقی)
- علمِ فرائض سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ۔ (بیہقی)

ہر مسلمان (مرد و زن) پر علم حاصل کرنا فرض ہے۔ (بیہقی)

○ علم حاصل کرنا، اس پر عمل کرنا اور اس کی اشاعت کرنا صدقہ ہے۔

○ ماں کی گود سے قبر کی آغوش تک علم حاصل کرو۔ (مشکوٰۃ)

عالم اور معلّم کے بارے میں ہادیٔ اسلامؐ نے فرمایا:

○ جس سے علم سیکھو اس کی عزت کرو۔ (ترمذی)

○ بے شک انبیاء علماء کے وارث ہیں اور یہ یقین جانو کہ نبیوں نے کسی کو دینار و درہم کا وارث نہیں بنایا، بلکہ صرف علم کا وارث بنایا۔ (ترمذی)

○ خیر سکھانے والے (معلمِ خیر) کے لیے اللہ اور اس کے فرشتے آسمان والے اور زمین والے یہاں تک کہ چیونٹیاں اپنے بلوں اور مچھلیاں تک دعائے رحمت کرتی ہیں۔ (ترمذی)

○ قیامت کے دن تین جماعتیں شفاعت کریں گی: انبیاء، علماء، شہداء (ابنِ ماجہ)

○ عالم اور متعلم دونوں اجر و ثواب میں برابر کے شریک ہیں۔ (ابنِ ماجہ)

طالب علم کی فضیلت بیان کرتے ہوئے سیّد العالمینؐ نے فرمایا:

○ جو علم حاصل کرنے کے لیے گھر سے نکلے وہ اللہ کی راہ (جہاد) میں ہے جب تک لوٹ نہ آئے (ابوداؤد)

○ طالب علم کی راحت کے لیے فرشتے اس کے قدموں میں پر بچھاتے ہیں۔ (ابوداؤد)

○ طالب علم حصولِ علم کی حالت میں مرتا ہے تو شہید مرتا ہے۔ (مشکوٰۃ)

○ جس نے ایک طالب علم کی عزت کی اس نے ستر[۱] شہیدوں کی عزت کی۔ (مشکوٰۃ)

عبادت پر علم کی فضیلت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

○ بلاشبہ عابد پر عالم کی فضیلت ایسی ہے جیسے میری فضیلت تم میں سے ادنیٰ مسلمان پر ہے۔ (ترمذی)

○ جو عالم فرض پڑھ کر لوگوں کو خیر سکھانے کے لیے بیٹھ جاتا ہے، اس کی فضیلت اس عابد پر جو دن کو روزہ رکھتا ہے اور رات کو قیام کرتا ہے ایسی ہے جیسی میری فضیلت تم پر ہے۔ (مشکوٰۃ)

○ علم میں اضافہ کرنا عبادت کی کثرت سے افضل ہے اور دینداری کی جڑ پرہیزگاری (ورع) ہے۔ (بیہقی)

○ شیطان پر ایک ہزار عابدوں کی بجائے ایک عالم بھاری ہے۔ (سیوطی)

علم کے پست مقاصد کے بارے میں آنحضورؐ نے ارشاد فرمایا:

○ علم اس لیے حاصل نہ کرو کہ علماء پر فخر جتاؤ اور مجلس میں اونچی جگہ پر بیٹھو جو کوئی ایسا کرتا ہے اس کے لیے دوزخ ہے

○ جس شخص نے علم اس غرض کے لیے حاصل کیا کہ وہ اس سے علماء سے مناظرہ کرے گا یا کم سمجھوں سے جھگڑے گا یا لوگوں کی توجہ اپنی طرف متوجہ کرے گا اللہ تعالےٰ اس کو آگ میں داخل کرے گا۔

○ جس شخص نے وہ علم سیکھا جس سے خدا کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے لیکن اس غرض سے سیکھا کہ وہ اس سے دنیا کی متاع حاصل کرے گا تو قیامت کے دن اس کو جنت کی خوشبو میسر نہ آئے گی۔

مزید برآں مثبت طور پر علم کے مقاصدِ عالیہ بھی قائد الانبیاءؐ نے خود ہی متعین فرما دیے:

○ جو کوئی میرا قول اس لیے نقل کرے گا کہ اللہ کا دین سربلند ہو، اس کا مقام جنت ہے۔

○ علم سیکھنے کا مقصد رضائے الٰہی کا حصول ہے۔

○ علم حاصل کرو کیونکہ اللہ کے علم کی تحصیل خشیت الٰہی ہے علم کی طلب عبادت ہے اور علم کا مذاکرہ تسبیح

○ اللہ تعالیٰ کو اپنے جس بندے کی بھلائی منظور ہوتی ہے اس میں تین وصف پیدا کر دیتا ہے، دین کا فہم[۲]، دنیا سے بیزاری[۳] اور اپنے عیوب کی پرکھ"

---

[۱] مسند امام احمد بن حنبل ج ۳ ص ۱۳۳ ، [۲] ابوداؤد

فروغِ تعلیم کے لیے عملی اقدامات

عہدِ نبوی میں تعلیم کی اشاعت اور علم کے فروغ کے لیے جو عملی کام ہوا اس کا مختصر خاکہ ہم پیش کرتے ہیں:

دارِ ارقم[1] مکہ میں مسلمانوں کی پہلی درسگاہ تھی یہی وہ مقدس مقام ہے جہاں مسلمان چھپ چھپ کر جمع ہوتے تھے اور عبادت کرتے تھے۔ نبی کریم قرآن پاک کی کوئی آیت یا سورۃ نازل ہوتی تو انہیں پڑھ کر سناتے۔ یہیں حضرت عمر[2] حاضر ہوئے اور اسلام قبول کیا یثرب میں معصب بن عمیرؓ اور عبداللہ بن ام مکتوم ہجرتِ مدینہ سے کچھ پہلے درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے اور ان کی کوششوں سے مدینے میں دین کا نور اور علم کی روشنی پھیلنے لگی جیسے ہی ہجرت کے فوراً بعد سرورِ عالمؐ نے ایک مسجد تعمیر کرائی جو عبادت گاہ ہونے کے علاوہ اسلام کی پہلی عظیم درسگاہ تھی یہیں وہ چبوترہ تھا جو تاریخ اسلام میں صُفّہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جو لوگ تحصیلِ علم کی خاطر یہاں فروکش ہوئے وہ اصحابِ صُفّہ کہلائے۔ ان کی تعلیم و تربیت کی نگرانی معلمِ انسانیت ؐ بذاتِ خود فرماتے تھے[3]۔ مدینہ میں مؤرخینِ اسلام کے بیان کے مطابق نو دوسری مساجد تعمیر ہو چکی تھیں[4] جو عہدِ نبوی میں تعلیم و تدریس کے ذیلی مراکز کا درجہ رکھتی تھیں۔

بچوں کی تعلیم و تربیت

پیغمبرِ اسلامؐ کو مسلمانوں کے بچوں کو علم و عرفان سے بہرہ ور کرنے کا بے حد خیال اور فکر تھا اسی لیے آنحضورؐ نے والدین کو اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کی طرف خصوصی توجہ دلائی۔ اس سلسلے میں چند ارشاداتِ نبویؐ نقل کیے جاتے ہیں:

* اولاد اپنے والدین سے عمدہ تعلیم و تربیت کی مستحق ہے۔"
* اولاد کے لیے والدین کا اچھا تحفہ اچھی تعلیم دلوانا ہے۔"

مرد سے اس کے اہل و عیال کے بارے میں پوچھا جائے گا اور عورت اپنے خاوند کے گھر اور اولاد دونوں کے لیے جواب دہ ہوگی۔

اشاعتِ تعلیم

مسجد نبوی اس دور کی مرکزی درسگاہ تھی جو قبائل اسلام لاتے اسی دارالعلوم کا رُخ کرتے اور دین کی تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے بعد اسلام کی روشنی سے اپنے علاقے کو مستفید کرنے کا عزم و ولولہ لیے لوٹ جاتے۔ مورخینِ اسلام نے ایسے متعدد وفود کا تذکرہ کیا ہے جو اسلام کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے مسجد نبوی میں حاضر ہوئے مثلاً بنی عامر کا وفد بنی تمیم کے قبیلے کے ستر اسی نمائندے۔ جوں جوں اسلامی معاشرہ پھیلتا چلا گیا آنحضورؐ تعلیم و تربیت کے لیے معلمین مختلف علاقوں میں بھیجتے چلے گئے۔ ابن خلدون کے بیان کے مطابق نبی کریمؐ نے معاذ بن جبل کو اہلِ یمن اور حضرموت کے علاقوں کے لیے معلم بنا کر بھیجا اسی طرح صحیح بخاری کی ایک روایت سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ نجران کو دین کی باتیں سکھانے کے لیے عمرو بن حزم کو مامور فرمایا۔ یہ بھی تاریخی طور پر ثابت ہے کہ حضور سرورِ کائنات نے قبائل قارہ و عضل کے لیے چھ معلم مقرر فرمائے تھے۔

نصابِ تعلیم

اس دور کے نصابِ تعلیم کے بارے میں ہمارے پاس تاریخی مواد بہت کم ہے۔ البتہ یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ دینی علوم کے پہلو بہ پہلو رسول اکرمؐ نے بہت سے دوسرے علوم و فنون مثلاً علمِ ریاضی[5]، مبادی طب[6]، علمِ ہیئت[7] یا علمِ فلکیات، علمِ انساب[8]، علمِ تجوید اور فنِ خطاطی جیسے علوم مفیدہ کو سیکھنے کی یا تو اجازت دی یا ان کی تحصیل کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ علاوہ ازیں جسمانی صحت کو بحال رکھنے کے لیے نشانہ بازی، شہسواری، پیراکی اور کشتی کا فن سیکھنے کی اجازت دی۔ اگرچہ ان جملہ مضامین کی بیک وقت تعلیم کا کسی درسگاہ میں بھی انتظام نہ تھا۔

علومِ اضافی کی اہمیت

یہاں یہ بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ نے اپنی حیاتِ طیبہ ہی میں یہ طے فرما دیا تھا کہ مسلمانوں کے نظامِ تعلیم و تدریس میں اوّلیت کن مضامین کو حاصل ہوگی۔ اسی طرح نصابِ تعلیم میں علوم کی اضافی اہمیت (ADDITIONAL IMPORTANCE) کا معاملہ ہمارے یہاں شروع ہی میں طے ہو گیا تھا۔ عبداللہ بن عمرؓ سے روایت

---

[1] مسند امام احمد بن حنبل ج ۳ صہ ۱۳۲ ، [2] ابوداؤد [3] طبرانی [4] سیوطی [5] دیلمی [6] صحیح بخاری [7] ابوداؤد [8] جمع الجوامع (سیوطی)
[9] بحوالہ ابونعیم [10] بحوالہ ابونعیم

ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ اصل علم تین چیزوں کا علم ہے آیت محکمہ، سنت قائمہ اور فریضۂ عادلہ اَلْعِلْمُ ثَلَاثَۃٌ ۔ اٰیَۃٌ مُّحْکَمَۃٌ اَوْ سُنَّۃٌ قَائِمَۃٌ اَوْ فَرِیْضَۃٌ عَادِلَۃٌ وَمَا سِوٰی ذٰلِکَ فَھُوَ فَضْلٌ اس حدیث پاک میں آیت محکمہ سے مراد آیاتِ قرآنی ہیں، سنّت قائمہ کے مفہوم میں حضرتؐ کی احادیث آتی ہیں اور فریضۂ عادلہ سے مراد فقہ یا فرائض دینیہ ہیں۔ ان تینوں علوم میں سے قرآن مجید کے علم کو افضل ترین قرار دیا گیا ہے ارشادِ نبویؐ ہے خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَہٗ (تم میں سے افضل وہ ہے جو قرآن مجید سیکھے اور سکھائے ۔)

تعلیم نسواں

عہد نبوی میں تعلیم کے فروغ کے لیے آنحضرتؐ کی ازواج مطہرات آنحضورؐ کا ہاتھ بٹا رہی تھیں۔ حضرت ام سلمہؓ اور حضرت حفصہؓ دونوں لکھنا پڑھنا جانتی تھیں [1]۔ اور حضرت عائشہؓ تو اپنے وقت کی سب سے بڑی معلمہ تھیں جن کے بارے میں جو لسانِ نبوت سے یہ جملہ جاری ہوا "آدھا علم عائشہ سے حاصل کرو"۔ حضرت عائشہ کے علمی مرتبے کے بارے میں عظیم محدث امام زہری کا خیال ہے:

اگر تمام صحابہؓ کا علم ایک پلڑے میں ہو اور عائشہؓ کا علم دوسرے پلڑے میں رکھ دیا جائے تو عائشہؓ کے علم کا پلڑا بھاری رہے گا۔

لیکن یہ معلوم رہے کہ اسلام نے "مخلوط نظامِ تعلیم" کی روایت کو کسی مرحلے پر نہیں اپنایا۔ آنحضورؐ نے تو عورتوں کو نمازِ جمعہ، نمازِ جنازہ اور جہاد جیسے اہم فرائض سے مستثنیٰ قرار دے دیا ہے تاکہ مرد و زن کا اختلاط نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے اجتماع کے لیے ایک مخصوص دن مقرر فرما دیا اور یہ مدھ کا دن تھا۔ اس بارے میں احتیاط کا یہ عالم تھا کہ مسجد نبوی میں عورتوں کے داخلے کے لیے دروازہ بھی الگ کیا گیا تھا۔ مسجد نبوی کا وہ دروازہ اب تک "بابُ النساء" کے نام سے موسوم ہے۔ امہات المومنینؓ کے علاوہ صحابیات کو بھی علمِ دین سیکھنے کا بے حد شوق تھا۔ ان کے ذوق و شوق کا اندازہ اس روایت سے ہوتا ہے: حضرت ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی کرمؐ کی خدمت میں ایک صحابیہ حاضر ہوئیں اور عرض کیا یا رسول اللہ آپ کی باتیں مردوں نے خوب حاصل کر لی ہیں (اور ہم محروم رہی جاتی ہیں)، لہٰذا اپنی طرف سے ہمارے لیے ایک دن مقرر فرمائیں جب ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوں اور آپ ان معلومات سے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو دی ہیں ہمیں بہرہ مند کریں۔ یہ سن کر آپؐ نے ارشاد فرمایا "اچھا فلاں فلاں روز فلاں مقام پر تم جمع ہو جانا"۔ چنانچہ مقررہ جگہ اور دن پر صحابیات جمع ہو گئیں۔ آنحضرت وہاں تشریف لے گئے اور ان کو اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے علوم میں سے بہت کچھ پہنچایا [2]۔

شاگرد و استاد کے باہمی تعلق کی نوعیت

اس دور میں شاگرد و استاد کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی؟ اس بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ حضور اکرمؐ معلمِ اعلیٰ تھے۔ اکابر صحابہ تعلیم و تربیت کے فریضہ کی انجام دہی میں ان کے معاون تھے۔ معلمین شفیق تھے، رحیم تھے۔ شاگرد مؤدب تھے، فرمانبردار تھے۔ استادوں کو حضورؐ کی نصیحت تھی "علم سکھاؤ اور سختی نہ کرو۔ معلم شفیق سختی کرنے والے استاد سے بہتر ہے" نیز انہیں تاکید کی گئی تھی کہ لوگ تمہارے پاس دور دراز گوشوں سے دین کا فہم حاصل کرنے کے لیے آئیں گے۔ جب وہ تمہارے پاس آئیں تو ان سے اچھا سلوک کرنا۔ ملاسیہ آنحضرتؐ کی درسگاہ سے فیض یافتہ معلمین اپنے مخاطبین کی ذہنی سطح اور استعداد طبع کا خاص خیال رکھتے تھے؛ چنانچہ عبداللہ بن مسعودؓ فرمایا کرتے۔ "لوگو میں ناغہ دے کر وعظ و تلقین کرتا ہوں جیسا کہ نبی کریمؐ ناغہ دے کر وعظ فرماتے تھے اور آپؐ ایسا اس لیے کرتے تھے کہ ہم لوگ اکتا نہ جائیں۔"

مستفیں اور معلمین کو آنحضورؐ نے ہدایت فرما دی تھی کہ لوگوں کے مزاج اور ذہنی سطح کو ملحوظ رکھ کر انہیں تعلیم دینا۔ "کَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰی قَدْرِ عُقُوْلِھِمْ" (لوگوں سے ان کی عقلوں کے مطابق بات چیت کرو۔)

نظامِ تعلیم کے فیض یافتگان

حضرت مسیحؑ کے قول کے مطابق "درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے"۔ اس نظامِ تعلیم کی اثر آفرینی اور افادیت کا اندازہ لگانے کے لیے درسگاہِ نبوت کے فیض یافتہ افراد پر نظر ڈالیے۔

ان میں حضرت سلیمان فارسیؓ اور حضرت ابوذر غفاریؓ جیسے زاہد اور خرقہ پوش تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور علی مرتضیٰؓ جیسے عالم اور فقیہ تھے۔ حضرت عمروؓ بن العاص، خالد بن ولیدؓ جیسے فاتح اور مجاہد تھے۔ ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ جیسے دنیا کے جہاں بان اور ملکوں کے فرمانروا تھے۔ یہاں ہر رنگ اور ہر مذاق کے طالب علم تھے اور مسجد نبوی ایک جامع اور عمومی درسگاہ تھی جہاں ذوق، مناسبتِ طبع اور استعداد کے لحاظ سے سب لوگوں کو تعلیم مل رہی تھی۔

---

[1] ابوداؤد [2] موطا امام مالک

خلافتِ راشدہ میں نظامِ تعلیم

۱۱ھ تا ۴۰ھ

خلفائے راشدینؓ کی مساعیِ جلیلہ

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت بڑا مختصر تھا اور انہیں کئی فتنوں کا سامنا تھا۔ اس لیے ان کی زیادہ تر توجہ مرتد قبائل، منکرینِ زکوٰۃ اور جھوٹے مدعیانِ نبوت کو سرنگوں کرنے کی طرف رہی اور انہیں تعلیم و تدریس کے نظام کی ترقی و ترویج کے لیے فرصت نہ مل سکی؛ تاہم ان کا یہ بڑا احسان تھا کہ انہوں نے قرآن مجید کو جو پہلے متفرق و منتشر نوشتوں کی صورت میں تھا، یکجا مرتب و مدوّن کر کے ہر قسم کی تحریف سے محفوظ کر دیا

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب امیر المومنین بنے تو انہوں نے نظامِ تعلیم و تدریس کی طرف توجہ فرمائی خصوصاً بچوں کی تعلیم پر انہوں نے زور دیا۔
حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مفتوحہ ممالک میں ہر جگہ قرآنِ حکیم کا درس جاری کیا مدینہ منورہ میں چھوٹے چھوٹے بچوں کی تعلیم کے لیے جو مکتب تھے ان کے معلّموں کا وظیفہ یعنی تنخواہ پندرہ درہم مقرر فرمائی[1]

کتاب البیان والتبیین کے مؤلف جاحظ لکھتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بچوں کو ضرب الامثال یاد کرنے اور عمدہ اشعار ازبر کرنے کی تاکید فرمائی تھی۔ مزید برآں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تمام اضلاع میں احکام بھیجے کہ بچوں کو کلامِ پاک لکھنے (کتابت) کا فن شریف سکھایا جائے۔ بچوں کی تعلیم کا ہیں بالعموم مسجدیں تھیں یا پھر گھروں پر انہیں والدین تعلیم و تربیت دیتے تھے۔[2] مسجدوں میں ہی بالغوں کی تعلیم و تربیت کے لیے تعلیمی حلقے بھی قائم تھے جن کی تعداد چار ہزار نو سو کے لگ بھگ ہے۔ ان میں نو سو جامع مساجد تھیں جہاں سے علم و تہذیب کی شعاعیں پھوٹتی تھیں اور اسلامی معاشرے کو منور کر رہی تھیں۔ حضرت عمرؓ نے فوجیوں کے فرائضِ منصبی میں قرآنِ مجید کی تعلیم و تدریس کو شامل کر دیا تھا۔ امیر المومنینؓ ہر سال صوبوں کے حکام اور فوجی افسروں سے حفاظِ قرآن کی فہرست طلب فرماتے تھے حضرت ابو موسیٰؓ نے صوبہ بصرہ سے ایک سال دس ہزار حفاظِ قرآن کی فہرست بھیجی جس پر وہ بہت خوش ہوئے اور ان کا وظیفہ بڑھا دیا۔[3]

ایک فرمان حضرت عمرؓ نے جاری فرمایا کہ۔

"بلادِ اسلامیہ میں سے کوئی شخص بازاروں میں دکان نہیں کھول سکتا، جب تک وہ تجارت کے بارے میں دینی احکام سے آگہی نہ رکھتا ہو۔[4]"

ایسی تدابیر سے حضرت عمرؓ نے پوری مملکت کو علوم سے معمور کر دیا اور رعایا کے فکر و نظر میں عظیم انقلاب برپا کر دیا

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرؓ کی تعلیمی پالیسی کو جوں کا توں رکھا اور اس میں کوئی خاص تبدیلی نہ کی؛ البتہ عالمِ اسلام ان کے احسان و کرم کو فراموش نہیں کر سکتا کہ انہوں نے اپنے دورِ حکومت میں قرآنِ عظیم کی کتابت و قرأت کے اختلافات کو دور کیا اور مصحفِ صدیقی (نسخۃ الامّ) کی مصدقہ نقلیں تیار کروا کے مختلف مراکز میں رکھوا دیں، تاکہ لوگ اپنے اختلافات رفع کر سکیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی جنہیں لسانِ نبوت سے "باب العلم" ہونے کا لقب ملا تھا حضرت عمرؓ کی تعلیمی پالیسی پر عمل پیرا رہے اور چند اضافے فرمائے۔ مثلاً علمِ نحو کی بنیاد انہوں نے رکھی اور اپنے تلمیذِ رشید ابوالاسود دؤلی کو چند اصولی قاعدے بتلا کر علمِ نحو کی تفاصیل مرتب کرنے پر مقرر فرما دیا۔

صحابہ کرامؓ کی مساعیِ جمیلہ

تعلیم کی اشاعت و توسیع میں خلفائے راشدین کے پہلو بہ پہلو دوسرے صحابہ کرامؓ نے نہایت اہم کردار ادا کیا۔ علامہ شبلی کے الفاظ ہیں

'ہزاروں صحابہؓ سرزمینِ عرب سے نکل کر تمام نئے مفتوحہ ملکوں میں پھیل گئے اور بعض نے وہیں سکونت اختیار کر لی۔ محتاط اندازے کے مطابق شام میں دس ہزار، کوفہ میں ایک ہزار، حمص میں پانچ سو، مصر میں ساڑھے تین سو صحابی موجود تھے یہ لوگ جہاں گئے حدیثوں اور عام مذہبی مسائل کا ذخیرہ ساتھ لے گئے[5] اس دور میں عمّالِ حکومت بھی عوام کی تعلیم و تربیت میں خلفائے اربعہ کا ہاتھ بٹا رہے تھے؛ چنانچہ ابو موسیٰ اشعریؓ بصرہ میں عامل

---

[1] سیرت العمرین۔ ابن جوزی [2] معجم البلدان۔ یاقوت حموی [3] الفاروق شبلی نعمانی [4] الفاروق شبلی نعمانی [5] مقالہ مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم (مقالاتِ شبلی)

مقرر ہو کر آئے تو فرمانے لگے: "مجھے عمر فاروقؓ نے تمہارے پاس اس لیے بھیجا ہے کہ تمہیں خدا کی کتاب اور سنتِ رسولؐ کی تعلیم دوں"

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کسی شخص کو گورنر بناتے تو اسے تاکید فرما دیتے :

دیکھو تمہیں میں مسلمانوں کا رہنما اور تربیت دینے والا بنا کر بھیجا ہوں، ان کی تعلیم و تربیت سے غفلت نہ کرنا۔

معلم کا مقام

اس سنہری دور میں استاد کو معاشرے میں بلند مقام حاصل تھا۔ علامہ سیوطی لکھتے ہیں:

"جابر بن عبد اللہ کی بے پناہ عزت و توقیر کی جاتی تھی کیونکہ وہ مسجدِ نبوی میں درس دیتے تھے۔"[1]

حضرت ابو الدرداء دمشق میں درس دینے کے لیے مسجد میں آتے تو ان کے ساتھ ان کے طلباء کا اتنا ہجوم ہوتا تھا جتنا بادشاہ کے ساتھ درباریوں کا۔[2]

"ابو سعید خطبہ دیتے تو سامنے آدمیوں کی صفیں کھڑی ہو جاتیں۔"

ایک صحابیِ رسولؐ حدیث بیان کرتے تو ان کے ارد گرد آدمیوں کا اس قدر ہجوم ہو جاتا کہ انہیں اپنے بالائی منزل پر جا کر حدیث بیان کرنا پڑتی۔

یہ تھا معلم کا مقام اسلامی معاشرے میں اور یہ تھا علم کے لیے ذوق و شوق اس دور میں۔

طلباء سے حُسنِ سلوک

اکابر صحابہ اور معلمین کرام طالبانِ علم کے ساتھ نہایت کشادہ دلی، شفقت اور مروّت سے پیش آتے تھے۔ چنانچہ جب ابو ہارون عبدی حضرت ابو سعید خدریؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے نہایت تپاک سے کہا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارے پاس گوشے گوشے سے بہت سے لوگ علم حاصل کرنے کے لیے آئیں گے، تم ان سے بھلائی کرنا"[3]

حضرت ابو ہریرہؓ کی خدمت عالیہ میں خواجہ حسن بصری حاضر ہوئے تو انہوں نے رئیس التابعین کو بتایا: رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے، میرے بعد تمہارے پاس لوگ تحصیلِ علم کے لیے آئیں گے ان کو مرحبا اور خوش آمدید کہنا اور علم سکھانا۔

یہ چند روایات خلافت راشدہ کے زمانے میں معلم اور شاگرد کے باہمی تعلقات کی خوشگواری اور استواری پر دلالت کرتی ہیں۔

نصابِ تعلیم میں وسعت

جہاں تک اس بابرکت زمانے میں نصابِ تعلیم کا تعلق ہے اس بارے میں ہمارے پاس تاریخی مواد بہت کم ہے، تاہم یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اس دور میں عہدِ نبوی کی نسبت نصابِ تعلیم وسعت پذیر ہو چکا تھا۔ ایک طرف قرآن، حدیث اور فقہ کی تدریس و کتابت پر توجہ دی گئی تو دوسری طرف علمِ انساب، شعر و ادب کی طرف میلان بڑھا اور تیراکی اور شہ سواری کے فنون پر خاص طور پر زور دیا گیا۔ اس ضمن میں کتاب البیان والتبیین کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"حضرت عمرؓ نے تمام اضلاع میں حکم بھجوایا تھا کہ اپنی اولاد کو تیرنا سکھاؤ، شہسواری کی تربیت دو، عمدہ ضرب الامثال یاد کراؤ اور پاکیزہ اشعار یاد کرنے کی تلقین کرو۔"

محدث ابن جوزیؒ لکھتے ہیں:

"ان درسگاہوں میں قرآن مجید کے علاوہ ادب، لغت، شعر و نحو کی تعلیم ہوتی تھی خصوصاً حضرت عمرؓ تاکید فرماتے تھے: اپنی اولاد کو شعر کی تعلیم دو۔ عَلِّمُوْا اَوْلَادَكُمُ الشِّعْرَ فَاِنَّ الشِّعْرَ دِيْوَانُ الْعَرَبِ"[4]

مقاصدِ تعلیم

اس زمانے میں تعلیم کا مقصد وہی تھا جو عہدِ نبوی میں واضح کر دیا گیا تھا اس لیے معلمین کے پیشِ نظر صرف یہی تھا کہ طلباء و عوام کی زندگیاں اسلام کی تعلیمات کے مطابق ڈھل جائیں اور انہیں عقبیٰ میں خدا کی رضا و خوشنودی حاصل ہو۔ اس سلسلے میں صحابہ کرامؓ کے چند اقوال ملاحظہ ہوں:

---

[1] حسن المحاضرۃ از جلال الدین سیوطی [2] تذکرۃ الحفاظ۔ علامہ ذہبی [3] صحیح مسلم [4] ابن جوزی سیرت عمرؓ [5] جامع بیان العلم۔ از علامہ ابن عبد البر

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے "جب کسی عالم کو دیکھو کہ دنیا سے محبت رکھتا ہے تو دین کی بات میں اس کا اعتبار نہ کرو"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی "اے فرزند ریاکاری بحث مباحثے اور فخر و مباہات کے لیے علم نہ سیکھنا"

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں "بہت سی حدیثیں یاد کر لینا علم نہیں علم تو خوف خدا کا دوسرا نام ہے"

المختصر رضائے الٰہی کا حصول مسلمانوں کی سعی و جہد کا منتہائے مقصود اور نظام تعلیم کا نصب العین تھا۔

لازمی وجبری تعلیم کی ابتدا

اس دور میں لازمی تعلیم کے اصول کا بھی سراغ ملتا ہے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابوسفیان نامی ایک شخص کو چند آدمیوں کی جماعت کے ساتھ اس کام پر مامور فرمایا کہ وہ قبائل عرب کا دورہ کریں اور ہر مسلمان کا امتحان لیں جس کو قرآن مجید یاد نہ ہو اس کو سزا دیں۔ کنز العمال میں فاروق اعظمؓ کا یہ ارشاد گرامی درج ہے:

"مسلمانوں کو بقرہ، نساء، مائدہ، حج اور نور سورتیں سیکھنا لازم ہیں کیونکہ ان میں عملی زندگی کے بارے میں ضروری احکام مذکور ہیں"

حفظ وکتابت دونوں پر توجہ

اس دور میں حفظ و روایت کا طریق تعلیم رائج تھا، چنانچہ علامہ شبلی رقمطراز ہیں:

"۲۵ھ تک جب باقاعدہ تصنیف و تالیف شروع نہ ہوئی تھی، جو تعلیم تھی وہ عرب کے سادہ اور نیچرل طرز زندگی کے لیے موزوں تھی۔ علوم وہ تھے جن کو حافظے سے زیادہ تر تعلق تھا۔ بحث طلب مسائل بھی معمولی فہم کی دسترس سے باہر نہ تھے اور طرز تعلیم تو بالکل وہی تھا یعنی سند و روایت جو قدیم زمانے میں رائج تھا"[1]

رفتہ رفتہ املاء تحریر و کتابت کا رواج بڑھنے لگا جس کی ابتدا عہد نبوی میں ہو چکی تھی۔ کتابت قرآن اور کتابت حدیث پر خاص توجہ دی گئی۔ حضرت عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ اور رافع بن خدیج کے بارے میں ٹھوس شہادتیں موجود ہیں کہ انہوں نے احادیث کے صحیفے مرتب کیے اور شہرت دوام پائی۔

مدارج تعلیم

اس دور میں معید مقرر کرنے اور جماعتوں کی درجہ بندی کا سراغ بھی ملتا ہے۔ علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ حضرت ابوالدرداء جامع دمشق میں درس دیتے تھے۔ ان کے گرد تقریباً ۱۶۰۰ طلبہ کا ہجوم ہوتا تھا۔ ان کا انداز تعلیم یہ تھا کہ دس دس طلبہ کی علیحدہ علیحدہ جماعت بنا دیتے تھے۔ ہر جماعت پر ایک نائب یا معید مقرر ہوتا تھا وہ مختلف جماعتوں کے درمیان ٹہلتے رہتے اور طلباء کا سبق بڑے غور سے سنتے رہتے[2]

تنخواہیں دینے کا رواج

اگرچہ قرون اولیٰ میں سے بیشتر معلمین اپنے شاگردوں کی تعلیم و تربیت کا فرض رضائے الٰہی کی رضا جوئی کے لیے بلا معاوضہ انجام دیتے تھے لیکن حالات کے تقاضوں اور عصری مجبوریوں کے باعث تنخواہ دار معلمین کی تقرری کا آغاز اسی زمانے میں ہوا۔ مثلاً ابن جوزی نے سیرت عمرین میں لکھا ہے:

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہر معلم کی تنخواہ پندرہ درہم سرکاری خزانے سے مقرر فرمائی تھی۔ اُدھر طالب علموں کے وظائف STIPENDS اسی زمانے میں پہلے پہل مقرر ہوئے۔ اس جدت کا سہرا حضرت علیؓ چوتھے خلیفہ راشد کے سر ہے بعد کے مسلمان حکمرانوں نے اس مفید روایت کو جاری رکھا اور اسے فروغ دیا"[3]

تعلیم نسواں کا اہتمام

خلفائے راشدین کے دور حکومت میں تعلیم نسواں پر مناسب حد تک توجہ دی گئی۔ حضرت عائشہؓ کا گھر اس تعلیم کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ حضرت فاطمہؓ علم عروض و فن خطابت میں بڑی دستگاہ رکھتی تھیں۔ جناب فاطمہؓ کی صاحبزادیاں زینبؓ و کلثومؓ اور پوتیاں سکینہ، فاطمہ اور صغریٰ سب کی سب زیور علم سے آراستہ تھیں۔ عائشہ بنت طلحہ علم نجوم اور ذوق سخن میں ممتاز تھیں۔ الغرض تعلیمی سرگرمیوں میں خواتین مردوں سے پیچھے نہ تھیں بلکہ[4]

---

[1] مقالات شبلی [2] علامہ ذہبی۔ طبقات القراء [3] کنز العمال [4] خواتین کی تعلیم۔ مولفہ محمد امین زبیری

ڈاکٹر احمد (نبشر)

اسلام کا نظریۂ تعلیم

اسلام میں تعلیم کی اہمیت مسلم ہے۔ تاریخ انسانیت میں یہ منفرد مقام اسلام ہی کو حاصل ہے کہ وہ سراپا علم بن کر آیا اور تعلیمی دنیا میں ایک ہمہ گیر انقلاب کا پیامبر ثابت ہوا۔ اسلامی نقطہ نظر سے انسانیت نے اپنے سفر کا آغاز تاریکی اور جہالت سے نہیں بلکہ علم اور روشنی سے کیا ہے۔ تخلیق آدم کے بعد حق تعالیٰ نے انسان اول کو سب سے پہلے جس چیز سے سرفراز فرمایا وہ علم اسماء تھا۔[1] اسماء کا علم ہی ہے جو انسان کو باقی مخلوق سے ممیز کرتا ہے اور جو قرآن حکیم کے فرمان کے مطابق تمام دوسری مخلوقات پر اس کی برتری قائم کرتا ہے۔[2] علم انسانیت کا ایک خاصہ[3] اور ان اہم ترین عوامل میں سے ہے جو کسی ہدف کے صحت مند ارتقاء اور نشوونما کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں دنیا کے دوسرے نظاموں نے تعلیم کو زیادہ سے زیادہ بہت سی ضرورتوں میں سے ایک ضرورت سمجھا وہاں اسلام نے اسے اوّلین ضرورت قرار دیا۔

اسلام کے سوا دنیا کا کوئی مذہب یا تمدن (CULTURE) ایسا نہیں ہے جس نے تمام انسانوں کی تعلیم کو ایک بنیادی ضرورت قرار دیا ہو۔ یونان اور چین نے غیر معمولی علمی اور تمدنی ترقی کی لیکن وہ بھی تمام انسانوں کی تعلیم کے قائل نہ تھے بلکہ اہل علم کے ایک طبقے کے تابع ہو گئے تھے۔ افلاطون اپنی "جمہوریہ" (REPUBLIC) میں جو اونچے سے اونچا خواب دیکھ سکا اس میں بھی فلاسفہ اور دانش وروں کے ایک مخصوص طبقے ہی کو اس اعتبار سے نوازا گیا ہے۔ اسلام وہ مذہب ہے جس نے تمام انسانوں پر تعلیم کو فرض قرار دیا[4] اور اس فرض کی انجام دہی کو معاشرے کی ایک ذمہ داری بنایا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو پہلی وحی نازل ہوئی وہ علم کے مقام اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں تعلیم و تعلم کی ضرورت و اہمیت ہی کو واضح نہیں کیا گیا بلکہ ذرائع تعلیم —— پڑھنا اور لکھنا —— کی طرف بھی واضح اشارات موجود ہیں

پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ انسان کو خون سے پیدا کیا۔ پڑھ اور تیرا رب کریم ہے۔ وہ جس نے قلم سے علم دیا۔ انسان کو ان چیزوں کی تعلیم دی جن کو وہ نہ جانتا تھا (سورۃ علق، ۱-۵)

قرآن کریم میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کی جو ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں اور آپ کے جو وظائف مقرر کئے گئے ہیں ان میں تلاوت کتاب، تعلیم کتاب و حکمت، تبیین احکام و آیات، تزکیہ نفوس اور تبلیغ و دعوت کو ایک مرکزی مقام حاصل ہے اور یہی وجہ ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا

(میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں)

(۲) تعلیم کیا ہے؟

فکر اور علم کی اسی مسلمہ اہمیت کے پیش نظر یہ انتہائی ضروری ہے کہ ہم تعلیم کی نوعیت اور اس کے اساسی اصولوں کا صحیح فہم حاصل کریں۔

تعلیم صرف تدریس عام ہی کا نام نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعے ایک قوم خود آگہی حاصل کرتی ہے۔ اور یہ عمل اس قوم کو تشکیل دینے والے افراد کے احساس و شعور کو نکھارنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یہ نئی نسل کی وہ تعلیم و تربیت ہے جو زندگی گزارنے کے طریقوں کا شعور دیتی ہے اور اس میں زندگی کے مقاصد و فرائض کا احساس پیدا کرتی ہے۔ تعلیم ہی سے ایک قوم اپنے ثقافتی اور ذہنی ورثے کو آئندہ نسلوں تک پہنچاتی ہے اور ان میں زندگی کے مقاصد سے لگاؤ پیدا کرتی ہے جنہیں اس نے اختیار کیا ہے۔ تعلیم ایک ذہنی، جسمانی اور اخلاقی تربیت ہے اور اس کا مقصد اونچے درجے کے ایسے مہذب باشعور مرد اور عورتیں پیدا کرنا ہے جو اچھے انسانوں کی حیثیت سے اور کسی ریاست کے ذمہ دار شہریوں کی حیثیت سے اپنے فرائض کو انجام دینے کے اہل ہوں ——— ہر دور کے ممتاز ماہرین تعلیم کے نظریات کا مطالعہ اسی تصور تعلیم کا پتہ دیتا ہے۔

لغت کے اعتبار سے تعلیم کا مادہ علم (ع ل م) ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی چیز کا ادراک کرنا۔ اس سے باب تفعیل میں تعلیم آتا ہے۔ تعلیم کے معنی بار بار اور کثرت کے ساتھ خبر دینے کے ہیں۔ حتیٰ کہ متعلم کے ذہن میں اس کا اثر پیدا ہو جائے۔

انگریزی زبان کا لفظ (EDUCATION) لاطینی لفظ بمعنی نکالنا اور (DUCER - DUC) بمعنی رہنمائی سے ماخوذ ہے۔ لغوی طور پر اس کے معنی "معلومات کا جمع کر دینا" اور "مخفی صلاحیتوں کو نکھارنا" ہیں۔ بہر نوع اصلاً یہ لفظ معلومات فراہم کرنے اور متعلم کی مخفی صلاحیتوں کو نکھارنے کے مفہوم میں آتا ہے۔

۱۔ قرآن حکیم، البقرہ ۔ ۳

۲۔ قرآن حکیم، البقرہ ۔ ۲۴۷

۳۔ ("THE STORY OF CIVILISATION" BY W DURRANT VOL I)

۴۔ طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ (حدیث نبوی)

جان اسٹورٹ مل مغرب کے ان مشاہیر میں سے ہے جنہوں نے تعلیم کے مفہوم کو وسعت دینے کی کوشش کی ہے وہ کہتا ہے
"تعلیم صرف ان باتوں ہی کا احاطہ نہیں کرتی جو ہم اپنی فطرت کے کمال سے قریب تر ہونے کی بنا پر وسیع مقصد کی خاطر اپنے لیے کرتے ہیں یا دوسرے ہمارے لیے کرتے ہیں۔ اپنے وسیع تر مفہوم میں اس کی حدود بہت زیادہ ہیں۔ انسانی کردار اور صلاحیت پر پڑنے والے اُن چیزوں کے بالواسطہ اثرات بھی اس کے دائرۂ کار میں شامل ہیں جن کے فوری مقاصد بالکل ہی دوسرے ہوتے ہیں"

جان ملٹن تعلیم کی تعریف یوں کرتا ہے:

"میرے نزدیک مکمل اور شریفانہ تعلیم وہ ہے جو انسان کو بحالت جنگ و امن اپنی اجتماعی و نجی زندگی کے فرائض دیانت، مہارت اور عظمت کے ساتھ ادا کرنے کے لئے تیار کرتی ہے"

تعلیم کا یہ وسیع ترین تصور ہے۔

امریکی فلاسفر جان ڈیوی کے نزدیک تعلیم افراد اور فطرت سے متعلق مساوی طور پر عقلی اور جذباتی رجحانوں کے تشکیل پانے کا عمل ہے۔ ڈاکٹر پارک کا خیال ہے کہ تعلیم مشاہدہ یا مطالعہ سے علم حاصل کرنے اور عادات اختیار کرنے کا عمل یا فن ہے۔ "تعلیم وہ مسلسل عمل ہے جس کے ذریعے نئی نسلوں کی اخلاقی، ذہنی اور جسمانی نشوونما ہوتی ہے اور وہ اپنے عقائد و تصورات اور تہذیب و ثقافت کی اقدار بھی اس سے اخذ کرتے ہیں۔" ماہرین تعلیم اس لفظ سے دو مفہوم لیتے ہیں

وسیع تر مفہوم میں یہ ان تمام طبعی و جمالیاتی، اخلاقی و سماجی اثرات کا احاطہ کرتا ہے جو فرد اور قوم کے طرز زندگی کی تشکیل کرتے ہیں اور محدود مفہوم میں یہ صرف ان اثرات پر حاوی ہے جو اساتذہ کے ذریعے اسکولوں اور کالجوں اور دوسری درسگاہوں میں مرتب ہوتے ہیں

بہرکیف تعلیم ایک ہمہ گیر عمل ہے اور شاگرد کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر اس کا گہرا اثر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک قوم کی بقا کا انحصار ہی اس کی تعلیم پر ہے۔ ایک چینی کہاوت اس بات کی کتنی صحیح عکاسی کرتی ہے۔

"تمہارا منصوبہ اگر سال بھر کے لیے ہے تو فصل کاشت کرو، دس سال کے لیے ہے تو درخت اگاؤ، دائمی ہے تو افراد پیدا کرو"

افراد کی تعمیر صرف تعلیم ہی سے ممکن ہے

(۳) ایک غلط فہمی کا ازالہ

تعلیم کسی قوم کے سماجی نظریات اور ثقافت سے گہرے طور پر مربوط ہوتی ہے۔ [illegible] کسی قوم کا نظام تعلیم اپنے مزاج، مواد اور موضوعات کے اعتبار سے نہ تو نظریاتی رنگ سے خالی ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس میں اتنی معروضیت OBJECTIVITY ممکن ہے کہ اسے اقدار کی گرفت سے آزاد قرار دیا جا سکے۔ لیکن عہد جدید میں (LIFFRALISM) (INDIVIDUALISM) کے علم برداروں نے تعلیمی دنیا میں اس غلط فہمی کو بڑے زور شور سے رائج کرنے کی کوشش کی ہے کہ تعلیم مذہبی اقدار اور معیارات [illegible] کے سلسلے میں، لیکن اسی طرح غیر جانبدار ہو سکتی ہے جس طرح طبیعی علوم۔ اس غلط تصور کی بنا پر تعلیم کو مذہب اور اخلاقی اقدار سے الگ کر دیا گیا اور یہ کہا جانے لگا کہ طالب علم کو اپنی صلاحیت کے مطابق نشوونما پانے کے لیے پوری آزادی ملنی چاہیئے اور اس کی فکر و کردار کو کسی مخصوص سانچے میں ڈھالنے کے لیے کوئی بیرونی دباؤ نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ طریق تعلیم ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں بہت مقبول ہوا اور اس نے دوسرے یورپی ممالک میں بھی خاصی شہرت حاصل کی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بے عقیدہ تعلیم کے نتائج کسی طرح بھی حوصلہ افزا نہیں ہیں۔

بے عقیدہ تعلیم کے نتائج

اگر ہم آزاد اور بے عقیدہ تعلیم کے نتائج کا جائزہ لیں تو مندرجہ ذیل چیزیں سامنے آتی ہیں۔

(الف) "بے عقیدہ" تعلیم طلبہ میں اجتماعی تصورات پیدا کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اور جب کوئی قوم ان اجتماعی تصورات کے شعور سے بے بہرہ ہو جائے جو اسے عمل اور قربانی پر اُبھارتے ہیں تو تاریخ پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ ایسی اقوام جو کسی اجتماعی نظریے کے زندہ شعور سے عاری ہو جائیں اور جنہوں نے کسی اعلیٰ اور برتر نصب العین کے لیے جینا اور مرنا نہ سیکھا ہو وہ تاریخ عالم میں کوئی بڑا کارنامہ تو کیا انجام دیں گی، اپنے وجود تک کو برقرار نہیں رکھ سکتیں۔ تاریخ میں ایسی مثالوں کی کمی نہیں ہے کہ جب کسی قوم نے اپنی منزل کا شعور کھو دیا تو وہ نقش پا کی طرح مٹا دی گئی۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

مرگِ فرد از خشکیِ رودِ حیات
مرگِ قوم از ترکِ مقصودِ حیات

(ب) بے عقیدہ تعلیم نئی نسل کے قلب و روح میں اخلاقی اقدار کو جاگزیں کرنے میں ناکام رہتی ہے۔ اس کا تعلق صرف دماغ کے مطالبات سے ہوتا ہے۔ روح کے مطالبات سے یہ بیگانہ وار ہی گزر جاتی ہے۔ دونوں کی نشوونما دو متضاد سمتوں میں ہوتی ہے جس کا نتیجہ ایک زبردست قومی نقصان کی صورت میں نکلتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علم اس وقت حقیقی دوست اور رہنما کا کام کر سکتا ہے جب اس کا محور دل ہو ورنہ صرف تن پرستی کے چکر میں یہ انسان کے لیے سانپ جیسا خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔

علم را بر تن زنی مارے بود — علم را بر دل زنی یارے بود

(ج) تعلیم کے بارے میں اسی رجحان کا نتیجہ لامرکزیت اور علم کی شعبہ جاتی جزو پرستی کی صورت میں نکلا ہے۔ یہ متعدد تعلیم علم کو ایک ہی محور پر مرتکز کرنے میں ناکام رہی ہے۔ طلبا اپنی زندگی اور اردگرد کی دنیا کو چھوٹی چھوٹی غیر مربوط جزئیات کی شکل میں دیکھتے ہیں وہ علم کی وحدت اور زندگی کی یک رنگی اور مرکزیت کے احساس سے محروم ہی رہ جاتے ہیں۔

(د) اور آخری بات یہ ہے کہ بے مقصد تعلیم ایسے افراد پیدا کرتی ہے جو زندگی کے بنیادی حقائق، واقعی اور روزمرہ مسائل پر کوئی غور نہیں رکھتے عملی زندگی کے بارے میں ان کا علم اس قدر سطحی سادہ خام ہے کہ اس کی کوئی ٹھوس افادیت باقی نہیں رہتی۔ قومی نقطۂ نظر سے بھی یہ تعلیم مقصد سازی حاصل کرنے میں ناکام رہی ہے
ایک امریکی انڈ ہوٹ نے امریکی تعلیم کے بارے میں کہا ہے

"مقاصد کے بجائے تکنیک اور ذرائع سے وابستگی اور فلسفہ، تاریخ اور مذہب کے مطالعے کو حقیقی آزادی سے محروم کر رہی ہے۔"

مشہور اہل علم والٹر لپ مین نے "اس مضطرب دنیا میں تعلیم کی کمی" کے موضوع پر ایک تقریر میں کہا تھا

"سکول اور کالج دنیا میں ایسے افراد بھیجتے رہے ہیں جو اس معاشرے کے تخلیقی اصولوں کو نہیں سمجھ پاتے جس میں انہیں رہنا ہے۔ اسی تعلیمی روایت سے محروم نئے تعلیم یافتہ مغربی افراد اپنے ذہن و جذبات میں مغربی تہذیب کے تصورات، اصول اور بنیادوں کا اور اس کی منطق و استدلال کا کوئی احساس و شعور نہیں رکھتے اگر یہی رہی تو موجودہ تعلیم آخرکار مغربی تہذیب کو تباہ کر دے گی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ تباہ کر رہی ہے"

امریکی تعلیم پر ایک مشہور کی رپورٹ بھی اسی خامی کی نشاندہی کرتی ہے

"طلبا اس زندگی کا کوئی مقصد و مفہوم چاہتے ہیں بیکراں کائنات، اس کی ثقافت اور جب ان کے رہنما انہیں کوئی ٹھوس مفہوم، مقاصد، تصورات نہ دیں تو پھر وہ اپنے لئے حقیر اور فرومایہ مقاصد متعین کر لیتے ہیں۔"

سر والٹر موبرلے نے اپنی کتاب "یونیورسٹی میں بحران" میں جو برطانیہ کے تعلیمی حالات کے مطالعہ پر مشتمل ہے لکھا ہے

"ہم جس الجھن میں گرفتار ہیں وہ یہ ہے کہ ہماری یونیورسٹی میں زیادہ تر طلبہ تعلیم سے فارغ ہو جاتے ہیں مگر اس کا کوئی موقع نہیں آتا ہے کہ وہ حقیقی اہمیت کے عظیم مسائل پر آزادانہ استعمال کریں تعلیمی غیر جانبداری کے زیر اثر وہ موجودہ سیاسی اور سماجی ماحول کے آگے سپر ڈال دیتے اور سوچ بچار کی زحمت نہ اٹھانے کے عادی ہو جاتے ہیں اسی طرح وہ لا مذہب کو بھی تسلیم کر لیتے ہیں اور نہ اس لئے کہ علم کے مختلف اجزا میں منقسم ہونے کی موجودہ صورت حال کی وجہ سے انہیں غیر ارادی حقیقت میں مقصد زندگی کو متعین کرنے کا چیلنج ہی نہیں ملتا۔ ساری تعلیم کے بعد بھی وہ بنیادی طور پر غیر تعلیم یافتہ ہی رہتے ہیں۔"

تعلیم کے پس منظر کے مکمل جائزے کے بعد پروفیسر ہیرلڈ ایچ ٹیٹس لکھتے ہیں۔

"تعلیم نے اپنے آپ کو ماضی کے روحانی ورثے سے الگ کر لیا ہے مگر اس کا کوئی مناسب متبادل دینے میں ناکام رہی ہے نتیجتاً پڑھے لکھے افراد بھی ایقان و ایمان سے، زندگی کی اقدار کے صحیح احساس سے، اور دنیا کے بارے میں کسی با معنی نقطۂ نظر سے عاری ہیں۔"

ان نئے خیالات سے پتہ چلتا ہے کہ مغرب میں بھی بے عقیدہ اور غیر جانبدارانہ تعلیم کا نظریہ دم توڑ رہا ہے اور مغرب کے اکثر ماہرین تعلیم اور علمائے عمرانیات یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ تہذیب و تمدن کی ترقی اور ثقافت کے تحفظ کی راہ میں یہ نظریہ کس قدر نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔

(۴) تعلیم کے اسلامی اصول

(ا) تصور علم۔ اسلام نے جو تصور علم دیا ہے اس میں سب سے بنیادی چیز یہ ہے کہ علم کا سرچشمہ ذات باری تعالیٰ ہے علم اسماء اسی کا دیا ہوا ہے اور انسان کی ہدایت کا علم بھی اسی کی طرف سے ہے۔ حواس اور عقل و تجربہ بڑے اہم ذرائع علم ہیں لیکن وحی سب سے اعلیٰ ذریعہ علم ہے۔ مزید یہ کہ علم کا تعلق محض لوازمات حیات ہی سے نہیں، مقاصد حیات سے بھی ہے اور اول الذکر کو ثانی الذکر کے تابع ہونا چاہیئے یہی وہ تصور ہے جس سے ہمارے نظام تعلیم کا پورا مزاج بنتا ہے۔

اسلام نے علم کا جو تصور دیا ہے اس میں علم اور تربیت دونوں کو یکساں اہمیت دی گئی ہے اور ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیۂ نفس دونوں کو ساتھ ساتھ انجام دینا ضروری ہے یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے مخصوص نظام تعلیم میں تعلیم اور تربیت ساری ایک ہی حقیقت کے دو پہلو سمجھے اور اس کا اظہار علم و فضل کی اصطلاح سے بھی ہوتا ہے جو علم اور نیکی اور اخلاق حسنہ میں بڑھے ہوئے ہونے کے مفہوم کو ادا کرتی ہے

(ب) مقصد تعلیم۔ تعلیم بجائے خود منزل نہیں منزل کے حصول کے لئے ایک ذریعہ ہے۔ حقیقی منزل ان لوگوں کا نظریہ حیات اور تمدن و ثقافت ہے جن کی خدمت اسے کرنی ہے۔ اے۔ این۔ وائٹ ہیڈ نے یہ کہہ کر اس نکتے پر بہت زور دیا ہے کہ "تعلیم کی روح یہ ہے کہ وہ مذہبی ہو۔ اقبال کا خیال بھی یہی تھا کہ اسلام ہماری زندگی اور تعلیم کا مقصد ہونا چاہیئے۔ انہوں نے خواجہ غلام السیدین کو ایک خط میں لکھا تھا

"علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دارومدار حواس پر ہو۔ عام طور پر میں نے علم کا لفظ انہی معنوں میں استعمال کیا ہے اس علم سے وہ طبعی قوت ہاتھ آتی ہے جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہیئے۔ اگر یہ دین کے تحت نہ رہے تو محض شیطنت ہے مسلمان کے لئے لازم ہے کہ علم کو مسلمان کرے۔ بولہب را حیدر کرار کن"

اگر یہ بوسیدہ حسد کر ار بن جائے باوں کہیئے کہ اس کی قوت دین کے تابع ہو جائے تو نوع انسان کے لیے سراپا رحمت ہے"۔

پس تعلیم کا اولین مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ طلبہ میں ان کے مذہب اور نظریہ حیات کی تفہیم و آگہی پیدا کرے۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ زندگی کا مفہوم اور مقصد، دنیا میں انسان کی حیثیت، توحید، رسالت، آخرت، انفرادی اور اجتماعی زندگی پر ان کے اثرات، اخلاقیات کے اسلامی اصول، اسلامی ثقافت کی نوعیت اور ایک مسلمان کے فرائض اور اس کا مشن انہیں سمجھایا جائے۔ انہیں بتایا جانا چاہیے کہ وہ کس طرح اعلیٰ مقاصد کے لیے دنیا کی تمام قوتوں کو استعمال کریں۔ تعلیم کو ایسے افراد پیدا کرنے چاہئیں جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بارے میں اسلامی نظریات پر بھرپور یقین کے حامل ہوں۔ اور ان کے اندر ایک ایسا اسلامی نقطہ نظر پیدا کرنا چاہیئے کہ وہ زندگی کے ہر میدان میں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اپنا راستہ خود بنا سکیں۔

قرآن حکیم کا فرمان ہے کہ اہل علم حق اور سچائی کے گواہ ہیں۔ وہ تعلیم جس کا مقصد اہل علم پیدا کرنا ہو اسے اولیں طور پر اسلام کا علم بخش نظریہ کھنا چاہیئے۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے:

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ

خدا خود شاہد ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتے اور صاحبان علم بھی

(اس حقیقت کے) شاہد ہیں (آل عمران - ۱۸)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لوگوں میں سے درجہ نبوت کے قریب تر اہل علم اور اہل جہاد ہیں۔ اہل علم اس وجہ سے کہ انہوں نے لوگوں کو وہ باتیں بتائیں جو رسول لائے تھے اور اہل جہاد اس وجہ سے کہ انہوں نے پیغمبروں کی لائی ہوئی شریعت پر اپنی تلواروں سے جہاد کیا"۔[1]

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سا مشن ہے جس کے لیے انبیا مبعوث کیے گئے ہیں۔ ایک ایسا مشن جو صاحبان علم کو مقام نبوت سے قریب کرتا ہے۔ قرآن حکیم کے مطابق اسلام کے پیغام کی اشاعت و تبلیغ اور ایک عادلانہ اور صحت مند اجتماعی نظام کا قیام ہے۔ قرآن کہتا ہے

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۙ ﴿۲﴾

وہ (خدا) وہی تو ہے جس نے اُمیوں میں انہی میں سے (محمدؐ کو) پیغمبر بنا کر بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتے اور ان کو پاک کرتے اور (خدا کی) کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں۔ اور اس سے پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں مبتلا تھے۔ (جمعہ - ۲)

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ

ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی ہوئی نشانیاں دے کر بھیجا اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب اور میزان (عدل) نازل کی تاکہ لوگ اعتدال پر قائم رہیں۔ (الحدید - ۲۵)

پس اسلامی سند ست و ثقافت کے پس منظر میں تعلیم کا بنیادی مقصد ان پیغمبرانہ فرائض کی بجا آوری اور انسانوں کو اس مشن اور مقصد کی تعلیم دینا، ان میں اس مذہب کی سچی روح پیدا کرنا اور انہیں ایک مکمل اور صحت مند زندگی کے لیے تیار کرنا ہے۔

یہ مقصد تعلیم کے ہر گوشے میں اسلامی نظریۂ حیات کی روح جاری و ساری کرنے سے حاصل ہو گا۔ نئی کتابوں کی ترتیب و تدوین بھی اسی نقطہ نظر سے کی جائے گی۔ اس کے لیے تمام تعلیمی سرگرمیوں کی تشکیل نو اور ایک ایسے ماحول کی تخلیق بھی کرنا ہو گی جو ان مقاصد کے حصول میں ممد و معاون ثابت ہو۔

(ج) **انفرادیت اور اجتماعیت میں توازن** - تعلیم کا ایک بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ طالب علم کی انفرادیت کے ارتقا کو اہمیت دی جائے۔ اس پر ہمارے سامنے متضاد نظریات ہیں۔ بعض کے نزدیک فرد کا ارتقا بنیادی قدر ہے۔ وہ اجتماعی یا مشترک ذمہ داری کے تصور کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اس کے برعکس ایسے نظریات بھی ہیں جن میں معاشرے کے معیارات سے مطابقت کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے اور فرد کی اپنی شخصیت کے نشوونما پر کوئی زور نہیں دیا گیا۔ یہ دونوں حدیں غلط اور غیر حقیقت پسندانہ ہیں۔ اسلام کی ایک منفرد خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ انفرادیت اور اجتماعیت میں ایک توازن پیدا کرتا ہے۔ اسلام فرد کی اسی ذاتی شخصیت میں یقین رکھتا ہے اور ذاتی طور پر ہی ہر ایک کو خدا کے سامنے ذمہ دار اور جواب دہ ٹھہراتا ہے۔ اسلام فرد کے بنیادی حقوق کی ضمانت دیتا ہے اور کسی کو ان میں مداخلت کی اجازت نہیں دیتا۔ اس کی تعلیمی پالیسی میں فرد کی شخصیت کا مناسب ارتقا اہم ترین مقاصد میں سے ایک ہے۔ یہ اس خیال کا حامی نہیں کہ فرد کو اجتماع یا ریاست میں اپنی انفرادیت کھو دینی چاہیئے۔ قرآن کریم کے مطابق

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۙ

اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے (النجم - ۳۹)

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۭ

بیشک اللہ کسی قوم کی (اچھی) حالت بدل نہیں دیتا جب تک وہ لوگ خود اپنے میں تبدیلی نہیں کر لیتے (الرعد - ۱۱)

---

[1] احیاء العلوم، جلد اول، باب "علم کے بیان میں"۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ

اللہ کسی شخص پر اس کی مقدرت سے بڑھ کر ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا ہر شخص نے جو نیکی کمائی ہے اس کا پھل اس کے لئے اور جو بدی سمیٹی ہے اس کا وبال اسی پر ہے۔ (البقرہ - ۲۸۶)

وَلَنَا اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ

اور ہم کو ہمارے اعمال (کا بدلہ ملے گا) اور تم کو تمہارے اعمال (کا)۔ (البقرہ - ۱۳۹)

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام ایک طالب علم کی انفرادی شخصیت کو نشوونما دینا چاہتا ہے اور اس کی تمام خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرنا چاہتا ہے اور دوسری طرف اسے معاشرے کا ایک ذمہ دار فرد بنانا چاہتا ہے تاکہ وہ اجتماعی زندگی کے وظائف کو بحسن وخوبی انجام دے سکے

(د) علم کی وحدت اور ہم آہنگی - تعلیم کا ایک اور اصول یہ ہے کہ طالب علم کو متوازن اور ہم آہنگ تعلیم حاصل ہو اس میں اتنی قابلیت پیدا ہو جانی چاہئے کہ وہ دنیا کی رنگارنگ بوقلمونیوں کے درمیان زندگی اور کائنات کی وحدت کو دیکھ سکے اسلام راہ وسط کا داعی ہے اور اس کا نصب العین متوازن شخصیت کی تعمیر وارتقا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق فکر و عمل کا توازن مومن کی خصوصیات میں سے ایک ہے اس لئے تعلیم میں یہ بات لازماً پیش نظر رہنا چاہئے کہ اختصاص کے مرحلے میں داخل ہونے سے پہلے طالب علم کو علم کے وسیع پس منظر سے واقفیت حاصل ہو جائے اور زندگی اور اس کے مسائل کے بارے میں وہ ایک متوازن رویہ متعین کرلے

اسلام کی نظر میں علم ایک ہم آہنگ اور باہم مربوط کل ہے۔ اس حقیقت سے ہی ثابت ہوتا ہے کہ قرآن تمام علوم کا سرچشمہ ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جو علم کے ہر متلاشی کا ذہن تشکیل کرے گی اور اس کا سوچنے کا انداز متعین کرے گی خواہ اس کے حصول علم کا میدان کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ یہ چیز قدرتاً ہم آہنگ علم کے تصور کی طرف لے جاتی ہے اس بنیادی نقطے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمان محض علم کو چھوٹے چھوٹے غیر مربوط حصوں میں تقسیم نہیں کریں گے بلکہ کثرت میں وحدت کا رنگ رونما ہو جائے گا اس سے جزو پرستی اور حد سے بڑھی ہوئی شعبہ جاتیت کی خامیاں بھی دور ہو جائیں گی اعلیٰ یہ تصور تعلیم کے اعلیٰ مرحلے پر ہی اختصاصی تعلیم شروع کرنے کے نقطہ نظر سے زیادہ قریب ہے ابتدائی مرحلوں میں تعلیم کو غیر اختصاصی رہنا چاہئے یہ طریقہ نوجوانوں میں وسعت نظر اور علمی دیانت و رواداری کی خوبیاں پیدا کرنے میں بہت اہم حصہ ادا کرے گا

(ھ) تعمیر کردار - تعلیم میں سب سے زیادہ اہمیت طالب علم کے کردار کی تشکیل کو حاصل ہونا چاہئے تعلیم جب تک اچھے کردار تعمیر نہ کرے گی، اپنا حقیقی مقصد بھی حاصل نہ کر پائے گی۔ اسلام میں نیک اعمال اوّلیں اہمیت کے حامل ہیں۔ قرآن پاک میں ایمان اور عمل صالح کی نیک وقت تلقین کی گئی ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بنیادی مشن میں تزکیہ یعنی انسانی زندگی اور روح کی تطہیر شامل ہے اور اسے اولیت حاصل ہے۔

یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ کردار کے بنیادی رجحانات کی اساس زندگی کے ابتدائی دور ہی میں پڑ جاتی ہے اور اسکول اور کالج ایک انسان کے کردار کی تعمیر میں اہم حصہ ادا کر سکتے ہیں یہ کام تعلیم کا ہے کہ وہ انسانی کردار کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دے۔ امام غزالیؒ لکھتے ہیں

"تعلیم کا مقصد یہی نہیں ہونا چاہئے کہ نوجوان ذہن کے علم کی پیاس بجھا دے بلکہ اس کے ساتھ ہی اسے اخلاقی کردار اور اجتماعی زندگی کے اوصاف نکھارنے کا احساس بھی پیدا کرنا چاہئے۔"[1]

ہمارے سامنے انسانی زندگی کا مثالی نمونہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک ہے جیسا کہ قرآن کریم میں بھی ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

رسول اللہ کا ایک عمدہ نمونہ موجود ہے تمہارے لئے (الاحزاب - ۲۱)

تعلیم کے تمام مراحل پر طلبہ کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہؓ کی مثالی زندگیاں پڑھائی جانی چاہئیں اساتذہ کو خود اسی زندگی اور ایسے کردار اور عمل سے طالب علم میں ایک نیک زندگی اختیار کرنے کا جذبہ پیدا کرنا چاہئے اور درسگاہوں کا ماحول بھی ایسا ہونا چاہئے کہ اس سلسلے میں ممد معاون ہو سکے

(و) تکمیل حاجات - اسلام زندگی اور اس کی مسرتوں کو ترک کرنے کا نام نہیں بلکہ وہ ان کی تکمیل کا داعی ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہماری تعلیم کو ہمارے نوجوانوں کو زندگی اور اس کے مطالبات کی تکمیل کے لئے تیار کرنا چاہئے۔ انہیں زندگی گزارنے کے طریقوں کی تربیت دینی چاہئے اور معاشرے کی گوناگوں ضروریات کو پورا کرنے کے لائق بنانا چاہئے۔

اسلام رہبانیت کا مخالف ہے اور چاہتا ہے کہ انسان زندگی کی کشاکش کے درمیان حق و انصاف کے ساتھ ایسی زندگی گزارے قرآن ہمیں دنیا اور آخرت دونوں کے بہترین حصوں کی تعلیم دیتا ہے۔[2] قرآن کریم میں ان لوگوں کو سختی سے خبردار کیا گیا ہے جو اس کی عنایت سے لطف اندوز ہونے سے انکار کرتے ہیں۔

"ان سے کہو کہ کس کے حکم سے تم نے ان نعمتوں سے منہ پھیرا ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کے لئے نکالی

---

۱ - احیاء العلوم

۲ - البقرہ - ۲۰۹

ہیں۔ کھانے پینے کی اور استعمال کی ان چیزوں سے حواس بے ان کے لیئے بنائیں"۔ ۱

اسلام کا رویہ اس قرآنی آیت سے بالکل ظاہر ہے:

كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا ج

کھاؤ پیو مگر حد سے زیادہ اسراف نہ کرو (الاعراف - ۳۱)

اسلام کی نظر میں انسانی محنت اور مشقت نہایت ہی قابل قدر ہے اسلام ہر فرد کو اپنی روزی خود کمانے کے قابل بناتا ہے۔ پس تعلیم کو دیانت دارانہ، منصفانہ اور معقول معاش کے حصول میں ممد و معاون ہونا چاہیئے۔ علاوہ ازیں تعلیم کو معاشرے کی اقتصادی، سماجی، سائنسی اور فنی ضروریات پوری کرنی چاہئیں ان ضروریات کو صرف یہ کہ نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے بلکہ تعلیم کو ان کی تکمیل کے لئے مثبت طور پر کام کرنا چاہیئے۔ پھر تعلیم میں اتنا عملی عنصر ضرور ہونا چاہیئے کہ ہر فرد معاشی استحکام حاصل کر سکے۔

ان مقاصد سے ہم آہنگ نظام تعلیم اسلامی آدرشوں کا ترجمان ہوگا اور بنی آدم کے لیے رحمت ثابت ہوگا۔

(۵) تعلیم کی تاریخی روایت

ہم نے مندرجہ بالا صفحات میں علم اور تعلیم کے بارے میں اسلام کے بنیادی نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں مسلمانوں کا پورا نظام تعلیم اپنی بنیادی اقدار کے حصول کی جدوجہد سے عبارت ہے طریقے مختلف رہے ہیں اصول تعلیم میں بھی تنوع نظر آتا ہے اداروں کی ہیئت بھی بدلتی رہی ہے لیکن بنیادی مقاصد اور مزاج ایک ہی رہا ہے۔

دور نبوی میں تعلیمی روایت - نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ملت اسلامیہ کے سب سے پہلے معلم تھے۔ آپ ہی نے پہلی منظم تعلیم گاہ مدینہ منورہ میں قائم فرمائی۔ صفہ نامی چبوترہ پہلا مدرسہ تھا اور اصحاب صفہ اس کے متعلم تھے اس مدرسے میں ۷۰ اور ۸۰ تک طالب علم تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ دوسرے صحابۂ کبار بھی یہاں معلم کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے تھے اصحاب صفہ میں سے ایک یعنی حضرت معاذ بن جبل مالی امور کے نگران تھے، عطیات کی تقسیم کا کام ان ہی کے سپرد تھا۔ ان متعلمین میں سے مختلف افراد اسلامی حکومت کی مختلف خدمات کے لیے مامور کر دیئے جاتے تھے، اور تعلیم و تبلیغ کے لئے تو خصوصیت سے انہیں اصحاب کو بھیجا جاتا تھا اپنی مالی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے یہ طلبہ خود بھی محنت کرتے اور کماتے، دوسرے اہل ثروت مسلمان بھی ان طلبہ اور ان کے متعلقین کی مقدور بھر مدد کرتے اور خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی براہ راست ان کی مدد فرماتے اس مدرسے نے اسلامی قلمرو میں تعلیم کی جو بنیاد قائم کی اور جو روایت میں پڑی وہی ہماری تعلیمی روایت بن گئی اور وہ روایت یہ تھی:

(ا) اولین چیز دینی تعلیم ہے قرآن اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو نصاب تعلیم کا مرکز و محور ہونا چاہیئے۔

(ب) تعلیم کا مقصد (۱) اچھا مسلمان اور داعی الی الحق بنانا (۲) اور مسلم معاشرے کی ہمہ ضروریات کو پورا کرنا ہے۔

(ج) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم اور مسجد کا تعلق قائم کیا۔ مسجد دینی محور، سیاسی مرکز اور تعلیم گاہ تھی اور اس کے ذریعے طالب علم ایک مخصوص ثقافتی ورثے کے امین ہے۔

(د) متعلمین کے لئے اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے خود محنت مزدوری کرنا، اور مختلف حرفوں کو سیکھنا اور ان سے وابستہ ہونا اچھا اور پسندیدہ قرار پایا

(ھ) تعلیم کی آخری ذمہ داری مسلمان معاشرے اور اسلامی ریاست پر عائد ہوتی ہے اور اسے اس مقصد کے لیے ایسے وسائل استعمال کرنے چاہئیں مسلمانوں کی قومی آمدنی اور بیت المال پر اولین حق زیر تعلیم طلبہ اور ان پر ہونے والے جملہ مصارف کا ہے

ادوار مابعد - حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ بنیادی بیج پڑی اور ان ہی خطوط پر بعد میں ارتقاء ہوا۔ مساجد تعلیم کا مرکز بن گئیں - ہر جگہ حلقہ ہائے درس قرآن و حدیث قائم ہوئے۔ ایک ایک مسجد میں کئی کئی حلقے ہے اور ایک ایک حلقے میں ہزاروں طلبہ شریک ہوتے تھے جو اساتذہ متمول تھے وہ اپنی کفالت آپ کرتے لیکن جو ضرورت مند تھے ان کی کفالت بیت المال کرتا۔ خلفائے راشدین نے باقاعدہ تنخواہیں اور وظیفے مقرر فرمائے اور ہر مسجد ایک مکتب اور ہر میدان ایک تعلیم گاہ بن گیا۔ پہلی چار صدیوں میں تعلیم کا یہی نظام رائج تھا۔ اصطلاحی مدارس نہ ہونے کے باوجود یہ نظام اتنا مستحکم اور ہمہ گیر تھا کہ گھر گھر تعلیم پھیل رہی تھی اور ایک قسم کی بھرپور اور ہمہ گیر تعلیم موجود تھی۔ اسماء الرجال کی کتابوں میں اس دور کے ۵ لاکھ علماء کے مفصل حالات ملتے ہیں۔ اس زمانے کے تعلیمی اداروں میں مرکزی حیثیت مساجد ہی کو حاصل تھی، اور مساجد کے بن تعمیر یہ ان کے اس تعلیمی رول کا خاصا اثر پڑا ہے۔ تینوں سمتوں میں دالانوں کا ہونا اور بڑی تعداد میں حجروں کی موجودگی اس کا ثبوت ہیں۔ اس دور کی اہم تعلیم گاہوں میں سے جو قابل ذکر ہیں اور جو آج بھی موجود ہیں وہ تیونس کی جامع زیتون اور مصر کی جامعہ ازہر ہیں۔ مساجد کے علاوہ خانقاہیں، علماء کے مکانات اور کھلے میدان بھی تعلیم گاہ کی حیثیت رکھتے تھے اور ہر علاقے میں لاکھوں طلبہ کو مفت تعلیم دی جاتی تھی

یہ مسلمانوں کے تعلیمی نظام کا پہلا دور ہے۔ دوسرے دور کا آغاز پانچویں صدی کے اوائل سے ہوتا ہے اس میں مساجد کے علاوہ باقاعدہ مدارس بھی قائم ہوتے اور بڑے وسیع پیمانے پر ہوتے عالباً سب سے پہلا مدرسہ جس کی اپنی عمارت، سرکاری گرانٹ اور وقف املاک برائے عام اخراجات اور مرتبہ نصاب تعلیم وغیرہ تھے۔

---

۱ - الاعراف - ۲۳

(باقی صفحہ ۵۳ پر ملاحظہ فرمائیے)

(ماہر - معاشیات)

ڈگریوں کے ڈسے لوگ

زندگی کی طویل اور پتھریلی سڑک پر چلتے چلتے اب اس کے دونوں پاؤں گھائل ہو چکے تھے اور زندگی کی سنگلاخ سڑک کا کوئی انت نہ تھا دور تک مایوسی کے اندھیرے تھے جن میں سر بلند عمارتیں، دفاتر، بینک اور بار بار چمکتے رہتے حبیب بینک، یونائیٹڈ بینک، آدم جی، کے پی ٹی، ایل ڈی اے، اونچی ٹھوس بلا ناغہ بنگلوں کی لاانتہا قطاریں، آہنی گیٹ پر بندوق لیے وکیل مونچھوں والے چوکیدار اور ان کے سر کے اوپر دیواروں پر NO VACANCY کے بے رنگ اور مایوس کر دینے والے بورڈ جیسے میں اسے شدت کی پیاس محسوس ہوتی اور گہری تھکاوٹ کا احساس رگ رگ میں سرایت کر جاتا وہ نوکری کی تلاش میں تھا اور نوکری نہیں ملتی تھی، وہ انٹرویو کے لیے درخواستیں لکھتا تھا اور درخواستوں کا بیسیوں کوئی جواب نہ آتا۔ وہ انٹرویو دیتا تھا اور انٹرویو کے بعد اسے دوبارہ بلایا نہیں جاتا تھا ریفرنس طلب کیے جاتے تھے اور ضمانت کے لیے پیسے نہیں ہوتے کوئی ٹیلی فون نہیں آتا نہیں تقاضے پر اسے "او کے" کرنے کا پیغام آتا اس کی پچھلی جیب میں اس کی صلاحیتوں اور قابلیتوں کی کاغذی سند تھی اور وہ دن بھر تھک ہار کے بعد رات گئے گھر لوٹتا:

"کیا ہوا نوکری ملی؟"

وہ آنگن میں بچھی ہوئی چوکی پر لیٹ کر آسمان پر پلکیں جھپکاتے تاروں کو دیکھتا رہتا۔

"نوکری کا کیا ہوا ملی یا نہیں؟" ماں جھنجھلا کر پوچھتی اور وہ بس خاموش آسمان کو تکتا رہتا

ہنسی یہ کس ستم کی تھی
مکمل تھا کوئی احساس میٹھا

دیوار کے پیچھے رہنے والی مغلی لڑکی ہر رات یہ نظم پڑھتی لالٹین کی دھیمی دھیمی روشنی میں جھنجھلائی ہوئی آواز گونجتی "میں پاگل ہوں کیا؟ جو کہے جا رہی ہوں نوکری کا کیا؟"

"نہیں ملی، نہیں ملی، نہیں ملی"

یکدم اس کا جی چاہتا کہ پچھلی جیب میں رکھے ہوئے کاغذ کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دے اور انہی دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر لہولہان ہو جائے جن دیواروں کے پیچھے وہ لڑکی نظم پڑھتی ہے اور پھر تین کمروں والے اس مکان میں سسکیاں گونجتی رہتیں اور کئی چہرے افسردہ اور اداس ہو جاتے۔

"مجھے سمجھ سکتا ہے۔ میں اس کی ماں ہوں۔ یہ مجھے سمجھ سکتا ہے"

اور یہ دکھ بھرا جملہ اس کے دل میں درد بن کر لہروں کی طرح قطرہ قطرہ ساری رات ٹپکتا رہتا، وہ اٹھ کر گلی میں نکل جاتا جہاں قطار سے کھلے کے کھلے دور تک چلے گئے تھے اور ملک کی ترقی اور خوشحالی میں پڑوس کے بچے رات گئے تک آنکھ مچولی کھیلتے رہتے یہی آنکھ مچولی دن میں سڑکوں پر کھیلی جاتی۔

"انتخابات کی نئی تاریخ کا اعلان کیا جائے"

"سابق وزیر اعظم نے طیارے کی فروخت پر لاکھوں روپے کمیشن لیا تھا"

"بیروزگاری سے تنگ آکر نوجوان نے خودکشی کرلی"

اور اخبارات کی ان جلی سرخیوں سے دور اس کی آنکھوں میں ان دنوں کی یاد بیدار ہو جاتی، جب وہ یونیورسٹی کے لان میں بیٹھ کر اچھے دنوں کے خواب دیکھتا تھا اور کوئی آواز اس کے اندر سے کہتی تھی "سب بیکار --- یہ سب بے کار اور فضول دن گزار رہے ہیں۔ یہ کچھ سال چلتے ہیں دیواروں کی طرح بھٹکتے جا رہے ہیں اور انہیں بھٹکانے والا ایک دن ایک مقام پر لاکر ایک ایک کو قتل کر دے گا اور کسی کو خبر تک نہ ہوگی۔"

> وہ تھکے ہارے لوگ جو کاغذ کے پرزے جیب میں ڈال کر مستقبل کے دروازے پر دستک دیتے ہیں مگر -- مستقبل کہیں نظر نہیں آتا -- (محمود)

کینٹین، راؤنڈ شاپ، سیڑھیوں اور لائبریری میں بیٹھ کر لڑکے لڑکیاں گپیں ہانکتے رہتے، بے معنی باتوں کے شور میں لیکچرر، پروفیسر اور ڈاکٹرز اپنے گاؤن اور فائلیں سنبھالے کلاسوں میں تقریریں کرتے اور چلے جاتے۔ انتظامیہ کے طلباء میں اپنی میزوں پر چائے کی چسکیاں لیتے اور اداس بیٹھے رہتے ان کے سامنے کوئی آئیڈیل نہیں تھا اور انہیں صرف اپنے اپنے چیک سے دلچسپی تھی جو ہر ماہ کے آخر میں ان کے ہاتھوں میں تھما دیا جاتا۔ اس تعلیم کا مقصد کیا ہے؟ اسے حاصل کرنے والوں کی تقدیر میں کیا لکھا ہے یہ کسی کو معلوم نہ تھا اور یہ کوئی جاننا بھی نہیں چاہتا تھا۔ بہت دور --- ان دیکھی فضاؤں میں اس نسل کے سروں پر بے رحم، بے لگام، پرورش گاری اور بے اطمینانی کی جو گدھ چیلیں اڑتی رہتی ہیں بیروزگاری، نفرت، حقارت، سازشیں، اقربا پروری، رشوت، دھکے، دولت، امیر زادوں اور سیاہ راتوں میں اڑنے والے سیاہ کوّے جن پر اس قوم کی تقدیر کا محافظ کتا ہر دم بھونکتا رہتا۔ ہوائیں اور تیزی سے چلنے لگتیں شیلف پر رکھی ہوئی کتابوں کے ورق الٹنے لگتے، بکھر جاتے۔ اس گھٹن میں کتابیں گر جاتیں، کتابیں بکھر جاتیں، گاؤن پھٹ جاتے گدھ اڑتے رہتے، چیلیں منڈلاتی رہتیں۔

لیکن کوئی نہ سنتا۔ ایکسیڈنٹ، ترقی، بونس، مطالبے، گریجویٹ، سیاست، ڈپلومیسی، عشق و محبت اور منافقت کا شور گونجتا رہتا اور جب یہ شور تھمتا، تو ہر ایک کے ہاتھ میں تعلیم کی سند تھما دی جاتی، ایک ایک کو رخصت کیا جاتا اور پھر یہ مستقبل شہر کی سڑکوں پر اپنے مستقبل کو ڈھونڈنے نکلتے۔ لیکن مستقبل کہیں نہ ملتا، کاروں کے جھنڈ کے جھنڈ گزر جاتے لیکن کسی کار پر ان کا نام نہ لکھا ہوتا۔ کوٹھیوں کی کوٹھیاں قطار اندر قطار کھڑی ہوتیں لیکن کسی کوٹھی کے گیٹ کے پیچھے کھلتے دفتروں کے کمروں میں میزوں اور کرسیوں کا ایک سیلاب ٹھاٹھیں مارتا لیکن کسی دروازے پر ان کے عہدے اور نام کی تختی نہ لگی ہوتی۔ وہ سوچتا رہتا۔

"یہ دن کب تک رہیں گے، یہ دن کب بدلیں گے"؟

لیکن ان کی دعائیں بے اثر رہیں، دوپہر کا گرد آلود اور ہر سال کا پرانا سورج طلوع ہوتا اور چھوٹے انسانوں پر چمکتا رہتا۔ یہی دیوار کے پیچھے نظم پڑھتی رہتی اور ہر رات ماں کی جھنجھلائی ہوئی آواز سن کر اس کا جی یہی چاہتا کہ سند کے کاغذی پرزے کو پھاڑ کر ہوا میں اڑا دے اور انٹرویو والے دفتر کی میزوں پر سر لٹکے بیٹھے کو دھکا دے۔ لیکن وہ چاہتے ہوئے بھی ایسا نہیں کر پاتا تھا کیونکہ تعلیم نے اسے بزدل بنا دیا تھا۔ اس کی فطری جرأت اور بہادری کو چھین کر اس کے کشکول میں چند فرسودہ اور اپاہج خیالات کے سکے ڈال دیے جاتے۔ چند کھوٹے سکے۔

پھر ایسا ہوا کہ اس نے نوکری ڈھونڈنا چھوڑ دی اخبارات میں WANTED کے اشتہارات پھاڑ کر دیے اور تندہی سے ایک کام میں جت گیا اب وہ پریشان نہ رہتا تھا مستقبل کے اندھیروں میں کوٹھی کار اور سکے تھوڑے تھوڑے چمکنے لگے تھے، اب ماں کی جھلاہٹ پر وہ بھڑکتا بھی نہ تھا، بلکہ صرف مسکرا کر چپ ہو جاتا، ہاں کبھی کبھی اس کی آنکھیں سوچ میں ڈوب جاتیں۔ ایک دن اس نے اپنی ماں کے گھٹنے چھو کر کہا کہ وہ جا رہا ہے اس ملک سے دور جہاں امن ہے اور خوشحالی ہے وہ کچھ امن اور خوشحالی اپنے حصے سے بچا کر اسے بھی بھیجے گا اور اب وہ سود سلف کے سامان کے لیے پریشان نہیں رہے گی اور ماں جی جانے کے دھوئیں بھرے شکستہ کمرے میں اپنی ساڑھی کے پلو سے اپنے بہتے ہوئے آنسو خشک نہیں کرے گی۔ میں تیرے امن اور تیری راحت کے لیے یہاں سے جا رہا ہوں، پھر وہ چلا گیا۔

اسی رات ریڈیو سے یہ خبر نشر ہوئی:

"سمندر سے بارہ میل دور غیر قانونی طور پر ملائیشیا جانے والے پاکستانیوں کی لانچ پکڑی گئی۔ بہت سے پاکستانی پکڑے جانے کے خوف سے سمندر میں چھلانگیں لگا دیں اور ڈوب گئے۔"

یہ مضمون نہ تو فحش ہے، نہ بے مقصد، بلکہ لطیف پیرائے میں معاشرے پر زد کی چوٹ لگائی گئی ہے۔ اس کی اصطلاحیں گو کہ "آرٹ دنیا" سے ہی متعلق ہیں (محمود)

کرشن چندر

عجب زمانہ آن لگا ہے۔ آج کل بچے پیدا ہو کر ڈیڈی بعد میں کہتے ہیں دلیپ کمار کہنا پہلے سیکھ جاتے ہیں ماں کا لفظ زبان پر بعد میں آتا ہے اداکاری سب سے پہلے آجاتی ہے اور بہت آسانی سے۔ جو حال گھر کا ہے وہی اسکول کا ہے ایک دفعہ مجھے اسکول میں پڑھانے کا اتفاق ہوا میں نے پوچھا بچو بتاؤ تاج محل کس نے بنوایا؟ جواب ملا مالو بھائی مستری نے۔ میں نے پوچھا مشہور مغل بادشاہوں کے نام گناؤ۔ بولے "مغل اعظم بابر، شاہجہاں پکار اور کے آصف" میں نے پوچھا بمبئی کا جغرافیہ بیان کرو۔ بولے "بمبئی کے مشرق میں چیمبور ہے جہاں راج کپور رہتا ہے۔ شمال میں پالی ہل جہاں دلیپ رہتا ہے مغرب میں وجنتی مالا کا مکان ہے اور جنوب میں جے ٹی ری کا"۔ میں نے اسی دن اسکول سے استعفا دے دیا اور گھر چلا آیا۔

گھر آکر بہت سوچا بہت سوچا آخر سمجھ میں آیا کہ غلطی میری ہے۔ دراصل یہ فلم کا عہد ہے ہندوستان میں صرف پندرہ فی صدی لوگ پڑھے لکھے ہیں لیکن سینما دیکھنے والے سو فی صدی ہیں۔ اس لیے اگر لوگوں کو پڑھے لکھے بنانا ہے تو اس کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ انہیں فلم کے ذریعے سے تعلیم دی جائے۔ یہی سوچ کر میں نے مندرجہ ذیل فلمی قاعدہ لکھا ہے میرا دعویٰ ہے کہ اس کے پڑھنے سے ہر وہ شخص جو پڑھا لکھا نہیں ہے بہت جلد پڑھنا لکھنا سیکھ جاتا ہے اپنے دیش اور اپنے ماں باپ کا نام روشن کر سکتا ہے۔ —— اس قاعدے کی فلم بھی بن سکتی ہے بلکہ اس کے ایک ایک حرف کی فلم بن سکتی ہے جو پروڈیوسر چاہے مصنف کی اجازت حاصل کیے بغیر اس کی فلم بنا سکتا ہے اور اس کے اندر ناچ اور گانے اپنی حیثیت اور حماقت کے مطابق ڈال سکتا ہے۔

لیجیے اب شروع کرتا ہوں۔

بچو!

الف سے اندھیرا ہوتا ہے جو فلم انڈسٹری کے لیے بے حد ضروری ہوتا ہے۔ دنیا کا ہر کام دن کی روشنی میں ہوتا ہے۔ اسکول دن میں کھلتے ہیں کارخانے دن میں چلتے ہیں دفتر دن میں کھلتے ہیں لیکن فلم کا ہر کام اندھیرے میں ہوتا ہے فلم اندھیرے میں بنائی جاتی ہے اندھیرے میں دھوئی جاتی ہے اور اندھیرے میں دکھائی جاتی ہے۔ اس انڈسٹری میں شروع سے آخر تک اندھیرا ہی اندھیرا ہے اس لیے اس انڈسٹری میں کامیاب ہونے کے لیے عقل کا اندھا اور گانٹھ کا پورا ہونا بے حد ضروری ہے۔

تو پیارے بچو! جلدی سے اپنی آنکھیں بند کر لو اور زور سے کہو —— "الف سے اندھیرا"

الف سے آئینہ ہوتا ہے جو ہر فلم کی جان ہوتا ہے۔ فلم کیمرے میں چلتی ہے جو ایک طرح کا آئینہ ہوتا ہے ہیروئن آئینے میں اپنی صورت دیکھتی ہے اور میک اپ کے ذریعے اپنی بدصورتی چھپانے کی کوشش کرتی ہے۔ پروجیکٹر بھی ایک طرح کا آئینہ ہی ہوتا ہے جس میں سے روشنی گزار کر پردے پر پھینکی جاتی ہے۔ پروڈیوسر دراصل ایک طرح کا آئینہ ساز ہوتا ہے جو لاکھوں روپے خرچ کر کے آپ کو سپنے میں اتارنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر کامیاب ہو گیا، تو لاکھوں کے وارے نیارے کر لیتا ہے ورنہ سر جھکا کر کہتا ہے ——

"آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے"

اس لیے بچو، تنگ موہری کی پتلون پہن کر لال رنگ کی بش شرٹ، بالوں کو ماتھے پر گرا لو اور آئینہ دیکھ کر کہو —— "الف سے آئینہ"۔

الف سے انٹرویو

الف سے انٹرویو بھی ہوتا ہے جو ہر فلم کمپنی میں ہوتا ہے۔ انٹرویو کیے بغیر فلم انڈسٹری میں کام کرنا ممکن نہیں لیکن یہ انٹرویو دوسری جگہوں سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ دوسری جگہوں پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ آپ کی عقل کیسی ہے؟ یہاں دیکھا یہ جاتا ہے کہ آپ کی شکل کیسی ہے؟ دوسری جگہوں پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ آپ نے کالج کے کتنے امتحان پاس کیے ہیں یہاں یہ دیکھا جاتا ہے کہ آپ کتنے امتحانوں میں فیل ہوئے ہیں —— اور جو آدمی جس قدر زیادہ فیل ہو چکا ہو گا، اتنا ہی فلم انڈسٹری میں کامیاب ہو گا۔ اسی لیے آپ نے دیکھا ہو گا کہ جو لڑکا اسکول یا کالج میں فیل ہو جاتا ہے فوراً گھر سے بھاگ کر کسی فلم کمپنی میں انٹرویو کرنے کے لیے بمبئی کا رخ کرتا ہے۔ اس لیے بچو تم بھی جلدی سے اپنی کتابیں پھاڑ کر سامان باندھو اور بولو۔ "الف سے انٹرویو"

الف سے اچکدانہ ہوتا ہے جو ہمیشہ بچکدانہ کے ساتھ لگا رہتا ہے جیسے شنکر کے ساتھ جے کشن۔ تم نے مہاتما گاندھی کا نام نہیں سنا ہو گا "اچکدانہ بچکدانہ دانے اوپر دانہ" یہ ایک مشہور فلمی گیت ہے جسے بعض ہونہار بچے بندے ماترم کی جگہ گاتے ہیں اور اسکول کی سالانہ نمائش میں اول انعام پاتے ہیں۔ اس کا مطلب کیا ہے؟ یہ کوئی بچہ مجھے آج تک نہیں سمجھا سکا لیکن اس میں بچوں کا کوئی قصور نہیں ہے دراصل یہ دنیا اتنی ترقی کر گئی ہے اور اس دنیا کے ساتھ ساتھ علم اور سائنس اتنی ترقی کر چکے ہیں کہ ہر بات کا سمجھنا بہت مشکل ہے۔ آپ کسی بچے سے پوچھیے کہ اس نے کلاس میں کتنے نمبر حاصل کیے؟ بڑی مشکل سے بتائے گا۔ لیکن دلیپ کمار کی کار کا نمبر پوچھیے فوراً بتا دے گا —— اس لیے بچو! اگر فلم میں کام کرنا چاہتے ہو تو کسی بات کا مطلب جاننے کی کوشش مت کرو جلدی سے سر ہلا کر کہو —— "الف سے اچکدانہ"

الف سے ایمان داری بھی ہوتی ہے جو آج کل کی دنیا میں صرف فلم کے کھاتے ملتی ہے۔ اسی لیے میں نے ایمان داری کا نام نہیں لیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایمان داری کوئی پہنو تو سے نہیں وہ کوئی میوزک بھی نہیں ہے جسے فلم کے پردے پر دکھایا جا سکے اور آج کل کے بچوں کا یہ دستور ہے کہ جس چیز کو وہ فلم پر نہیں دیکھ سکتے اسے سمجھنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ آج کل بک بات میں ایمانداری ایک بے مطلب سے معنی کھو بیٹھا ہے۔ آنے والی نسلوں سے یہی جو ایمان داری ہے، وہ گویا ایک طرح کا دکھاوا ہی ہے۔ اس لیے بچو! ایمان داری کو بھول جاؤ اور رٹتے رہو کہو —— الف سے ایکٹرا۔

الف سے ادھار ہوتا ہے جس پر اکثر ہم کمپنیوں کا دار و مدار ہوتا ہے۔ یعنی میں کہ ایک فلم کمپنی صرف تین چیزوں کے سہارے چلتی ہے، سٹنگ، اشتہار، ادھار —— ان میں سب سے زیادہ ضروری چیز ادھار ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ادھار محبت کی قینچی ہے۔ مگر وہ فلم کمپنی کی جان ہے۔ اگر کہیں سے ادھار نہ ملے، تو وہ تمام فلم کمپنیوں کی جان نکل جائے۔ گر شوٹنگ کے وقت کپڑے والا کپڑے ادھار نہ دے، تو اکثر ایکٹر لوگ سیٹ پر چڈھی بنیان پہنے گھومتے نظر آئیں۔ اگر کلیں کھانا ادھار نہ دے، تو سارا اسٹاف بھوکا مر جائے۔ اگر اسٹوڈیو والا اسٹوڈیو ادھار نہ دے، تو اسی وقت پیک اپ ہو جائے —— یہاں کہانی ادھار پر آتی ہے۔ سیٹ ادھار پر بنایا جاتا ہے۔ فرنیچر ادھار پر سجایا جاتا ہے۔ ہیروئن کا میک اپ ادھار رقم سے کیمرے کی سپلائی ادھار پر چلتی ہے۔ ہیرو کا گھوڑا، دلہن کا گھونگھٹ، ولن کا ہنٹر، ساجن کا نمدہ کالوں کی لالی، کالوں کی بالی، دلہن کا صندوق، سپاہی کی بندوق، مرغی کا انڈا، جادو کا ڈنڈا سب کچھ ادھار پر ملتا ہے۔ گویا فلم کمپنی کی جو سہارے سانس ادھار ہے۔ آپ سے وہ مجاور وہ افسر سا ہو گا۔ ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ یہ ضرور کسی فلم کمپنی میں کام کرنے والوں کی صورتوں کو دیکھ کر بنایا گیا ہے۔ اس لیے بچو! اگر فلم پروڈیوسر بننا چاہتے ہو، تو ابھی سے ادھار مانگنا شروع کر دو اور بولو ——
"الف سے ادھار"

"الف سے اوٹ پٹانگ"

عام طور پر اوٹ پٹانگ کسی ایسی بات کو کہتے ہیں جس کا کوئی سر پیر نہ ہو جو بالکل بے معنی، بیکار در مہمل ہو —— مگر فلم انڈسٹری میں اس کا مطلب ہے کہانی! —— باقی ہر بات کا فلمی دنیا میں کوئی نہ کوئی مطلب ہوتا ہے کوئی نہ کوئی اصول ہوتا ہے مثال کے طور پر کیمرے کا فلٹر استعمال کرنے کا ایک اصول ہے گھوڑے کو دوڑانے کا ایک طریقہ ہے کیمرے کے ساتھ مائیک کو استعمال کرنے کا ایک مطلب ہے —— لیکن فلمی کہانی کا نہ کوئی اصول ہوتا ہے، نہ طریقہ ہوتا ہے۔ اور اکثر حالتوں میں اس کا مطلب بھی نہیں ہوتا۔

لیکن اس میں نہ قصور کہانی لکھنے والے کا ہے نہ کہانی بنانے والے کا، بلکہ دیکھنے والوں کا ہی کہ صرف اوٹ پٹانگ کہانیاں پسند آتی ہیں یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جو کہانی جتنی زیادہ اوٹ پٹانگ ہو گی اتنی ہی زیادہ لوگوں میں مقبول ہو گی اگر ہیرو قاعدے اور شرافت سے محبت کرے، تو کس کو پسند آتی ہے۔ لیکن اگر وہ ہیروئن کو کمر سے پکڑ کر دو ٹکریاں دے کر اپنے سر پہ اٹھا کر باہر گلی میں نکل آئے اور سڑکوں پر گیت گاتا چلے، تو واہ واہ کے ڈونگرے برس جاتے ہیں اور لوگ سینما کے باہر کیو پہ کیو لگائے کھڑے ہیں مجھے خود ایسی اوٹ پٹانگ کہانیاں سب پسند آتی ہیں جن کا کوئی مطلب نہیں ہوتا لیکن جو پڑھنے میں ہنساتی اور رلاتی چلی جاتی ہیں کیونکہ اندر سے میں بھی ایک بچہ ہوں ننھا سا۔ تمہاری طرح اس طرح آؤ بچو! اوٹ پٹانگ تصویریں دیکھیں اور کہیں —— الف سے اوٹ پٹانگ!

الف سے ان ہونی

الف سے ان ہونی ہوتی ہے اس ہونی کا فلم سے گہرا تعلق ہے۔ ان ہونی وہ ہوتی ہے جو فلم کے سوا اور کہیں نہیں ہوتی۔ ایسی کہانی جو زندگی میں کہیں نہ دکھائی دے ایسے ڈریس جو لوگ کبھی نہیں ایسے مکان جو فلم کے سوا اور کہیں نہیں پائے جاتے ایسے ناچ جو اور کہیں نہیں ناچے جاتے ایسے سپاہی جو ایک تلوار سے ساری فوج کو کاٹ کے پھینک دیتے ہیں۔ اور دوسری ایسی ان ہونی باتیں آپ صرف فلم میں دیکھ سکتے ہیں اور لوگ دراصل اسی لیے فلم دیکھنے جاتے ہیں، کیونکہ یہ ہونی ہے یا ہو سکتی ہے اسے دیکھنے کی چاہ کیسے ہو، اسی لیے ساری فلم ان ہونی سے شروع ہوتی ہے اور ان ہونی پر ختم ہوتی ہے یہ ان ہونی وہ سندر سپنا ہے جو ہر شخص اپنے دل میں چھپائے گھومتا ہے اور جسے وہ صرف فلم کے پردے پر دیکھ سکتا ہے اور محل سے زیادہ سندر سپنے کون دیکھ سکتا ہے اس لیے ان ہونی کو یاد رکھو اور کہو —— الف سے ان ہونی!

الف سے ایکسٹرا

الف سے ایکسٹرا ہوتا ہے اور ہوتی بھی ہے یعنی ایکسٹرا مرد بھی ہوتے ہیں اور عورتیں بھی۔ فلم میں جب کسی محل میں جلسے یا بازار کا سین دکھایا جاتا ہے، تو اس میں چلنے پھرنے والے لوگوں کی اکثریت ایکسٹرا ہوتی ہے —— وہاں بیچنے والا ایکسٹرا ہے اور وہ جو دکان پر کھڑا ہو کر ایک پیسہ کالا کاندی پان کی فرمائش کر رہا ہے وہ بھی ایکسٹرا ہے —— بادشاہ کے دربار میں ایکسٹرا ہوتے ہیں۔ وہ دربان جو لال رنگ کا چوغا پہنے سنہرے رنگ کی موٹھ والی چھڑی ہاتھ میں لیے بادشاہ کے آگے چل رہا ہے اور بلند بانگ لہجے میں چلا رہا ہے باادب باملاحظہ ہوشیار وہ بھی ایکسٹرا ہے کبھی کبھی بادشاہ بھی ایکسٹرا ہوتے ہیں جیسے کہ آج کل اکثر ملکوں میں ہوتے ہیں یعنی سنہری وردی پہنے تخت پر بیٹھے ہیں، مگر مجال نہیں کہ اپنی مرضی سے اپنے جوتے کا تسمہ بھی کھول سکیں!

مجھے آج کل کے بادشاہوں اور فلم کے ایکسٹرا لوگوں کو دیکھ کر بڑی ہمدردی ہوتی ہے مگر دراصل یہ لوگ کسی ہمدردی کے محتاج نہیں ہیں —— فلم کے ایکسٹرا فلمی دنیا میں سب سے کم کماتے ہیں جیسے ہی کسی کو پانچ دن تو کسی کو دس دن کام ملتا ہے۔ باقی دن بیکار گھومتے ہیں کس طرح چلاتے ہیں، یہ بھگوان ہی بہتر جانتا ہے مگر اس پر بھی یہ فلمی دنیا سے الگ نہیں ہو سکتے کسی بیت پر الگ نہیں ہو سکتے۔ اگر یقین نہ آئے تو کسی فلمی ایکسٹرا کو سو روپے مہینے کی نوکری دلا دیجئے، جو دفتر میں پچیس روپے کماتا ہے —— پچاس روپے کی نوکری پیش کر کے دیکھ لیجئے وہ ٹھکرا دے گا۔ کام کو بھی اور آپ کو بھی اسے فلمی دنیا میں پانچ دن کام کر کے باقی پچیس دن بھوکا مرنا منظور ہے مگر وہ کوئی اور کام نہیں کر سکتا ——!

دراصل یہ ایکسٹرا وہ لوگ ہوتے ہیں جو ہیرو یا ہیروئن بننے کی چاہ میں ہزاروں کی تعداد میں اپنے گھر چھوڑ کر، ماں باپ، بہن بھائی چھوڑ کر، بیوی بچے سب چھوڑ کر بمبئی چلے آتے ہیں اور چیونٹیوں کی طرح ایک سیٹ سے دوسرے سیٹ پر دھکیلے جاتے ہیں ان میں سے ہر مرد یا عورت کی آنکھوں میں ایک خواب بسا ہے کبھی وہ ہیرو یا ہیروئن بن جائیں گے اور بدقسمتی سے فلمی دنیا میں چند ایسی مثالیں موجود ہیں کہ کبھی ایک ایکسٹرا دو سال تک ایکسٹرا رہا پھر اچانک ہیرو ہو گیا ایک لڑکی جو پانچ سال تک ایکسٹرا رہی۔ اچانک ہیروئن بن گئی اور اسپاٹ لائٹ میں بیٹھ گئی۔ اسی لیے یہ خواب کسی ایکسٹرا کی آنکھوں سے نہیں ہٹایا جا سکتا ——!

میں ایسے ایک فلمی ایکسٹرا دوست کو جانتا ہوں۔ آج سے دس سال پہلے وہ اپنی دوسری ملازمت چھوڑ کر بمبئی میں ہیرو بننے کے لیے آیا تھا اس کی شکل تو اور ملا دلیپ سے، مگر مال دلیپ کمار جیسے رکھتا ہے اور اس لیے اسے آپ کو کسی طرح دلیپ کمار سے کم نہیں سمجھا فلمی دنیا میں آتے ہی سب سے پہلا کام ملا، وہ لاٹھی اٹھا کر ایک ٹھاکر کے پیچھے چلنے کا تھا۔ دس سال بعد آج بھی اسی طرح لاٹھی اٹھا کر اسٹوڈیو کے دروازے پر کھڑا نظر آتا ہے مگر فلمی دنیا سے باہر نہیں جائے گا ——!

فلم کا ایکسٹرا آج کی دنیا کا ڈان کوئکسوٹ ہے وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار ہے اور اپنی چاہت کا نیزہ ہاتھ میں لیے کسی چمکتی ہوئی بجلی کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔ اسے اس کے حال میں گرفتار رہنے دو اور سبق سیکھو کہ —— الف سے ایکسٹرا!

الف سے ایکٹرا

ایکٹر بمبئی میں دساور سے آتا ہے، پنجاب سے آتا ہے اور یوپی سے آتا ہے اور جنوب سے مہاراشٹر

جدید تعلیم کی تدوینِ نو

پروفیسر محمد قطب (مکہ)

دینیات اسلام کے موجودہ سکولوں اور کالجوں میں جو تعلیم دی جاری ہے اس میں صحیح اسلامی روح کا فقدان ہے۔ اللہ کے قانون کو قائم کرنا اور اسے اس کی حیثیت پر عائد کرنا ایک جامع اور موثر طریقِ تعلیم کا متقاضی ہے۔ ماضی میں مسلمان اس زندگی کی بنیاد اسلام پر رکھتے تھے۔ ماحول و تربیت ان کی رگ رگ میں رچا بسا تھا اور ان کے ہاں اسلامی اخلاق اور اسلامی طرزِ عمل کو فوقیت حاصل تھی۔ دوسرے تو ہمارے ہاں کارِ مروت اور اکرام سکھاتے جو تعلیم ہے۔ اسی طرح کسی ایسے شخص سے ملنا اور اس کے پاس بیٹھنا بھی تعلیم ہے جس کے دل میں خوفِ خدا ہے، پاک ہو، اور جو اپنے عمل میں احکامِ الٰہی کو پیشِ نظر رکھتا ہو۔ مگر صورت اس بات کی ہے کہ اسلامی تعلیم کو عام زندگی میں یا سکول میں صرف کلاس روم کے ایک سبق تک محدود رکھنے کی بجائے اسے ساری زندگی پر پھیلا دیا جائے تاکہ اسلامی عقائد بچوں اور نوجوانوں کے ذہن میں راسخ ہو جائیں۔ لیکن کے لئے یہ ہے کہ اسلامی اصولوں کی روشنی میں جدید مضامین کی ازسرِ نو تدوین کی جائے۔ یہی نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ہمارے گھر اور بازار اسلام کی تربیت گاہیں بن جائیں۔ آج کل کی طرح ہی لاتعلق اسلام رجحانات پیدا کرنے والے نہ رہیں۔

آج کل یہ حالت ہے کہ ہمارے سکولوں اور کالجوں میں اسلامیات کا صرف ایک پیریڈ ہوتا ہے لیکن بالعموم ہمارے سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کا ماحول اسلامی نظر نہیں آتا بلکہ اسے اگر غیر اسلامی کہا جائے تو بجا ہوگا۔ علاوہ ازیں ہم جو مضامین پڑھاتے ہیں اور جس طرح سے پڑھاتے ہیں وہ بالکل یورپی ہے اور یورپ کی دنیا مذہب کی مخالف ہے۔ اگرچہ وہ لیے آپ کو سیکولرزم کے حامی اور مذہب کے بارے میں غیر جانب دار کہتے ہیں۔ یورپ میں تحریک احیائے علم کے بعد سے وہاں سائنس اور مذہب کے درمیان سخت جنگ چلی آ رہی ہے۔ وہ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ مذہب اور سائنس کے درمیان قابلِ نفرت دشمنی ہے۔ اس کی یہ حالت ہے کہ اگر کسی سائنسی مسئلہ میں اللہ تعالیٰ کا ذکر آ جائے تو وہ اسے سخت قابلِ اعتراض کہتے ہیں اور ان کے نزدیک ساری ریسرچ داغدار ہو جاتی ہے۔ (العیاذ باللہ)

بقول ڈارون "اس سے ایک حالت میکانکی حیثیت میں ایک مافوق الفطرت عنصر داخل ہو جاتا ہے" جدید یورپی جاہلیت نے مذہب اور سائنس کو الگ الگ اور دشمن بنا کر رکھا ہے۔ مگر ہم مسلمانوں کا فرض ہے کہ ہم اس بے بنیاد طریقِ تعلیم کو ختم کریں۔ اور اس گمراہ تعلیم سے بچیں جس کے ذریعے نوجوانوں کے ذہن زہر آلود کئے جا رہے ہیں۔ ہمیں اپنے سکولوں اور کالجوں میں سائنس کو مذہب کے معیار اور مفاد کو سامنے رکھے بغیر نہیں پڑھانا چاہیے۔ اب میں مختصر عرض کرتا ہوں کہ ہمارے سکولوں اور کالجوں میں پڑھائے جانے والے موجودہ مضامین کو کیسے ازسرِ نو مدون کرنا چاہیے۔ ہم اپنے سکولوں اور کالجوں میں نظریہ ڈارون بطور ایک مفروضہ یا نظریہ (جسے غلط یا صحیح ثابت کیا جا سکتا ہو) نہیں پڑھاتے بلکہ اسے ایک ثابت شدہ سائنسی حقیقت کے طور پر پڑھاتے ہیں، حالانکہ اس نظریہ کی ابتدا سے اب تک حیثیت نہیں ہو سکی اور تو اور جولین ہکسلے جو ڈارون کا پیروکار اور بڑا حامی ہے اپنی کتاب "انسان جدید دنیا میں" کے دیباچہ میں کہتا ہے کہ بندر اور انسان کا درمیانی فاصلہ اس سے کہیں زیادہ ہے جو چیونٹی اور بندر کے درمیان ہے۔ اس لئے ہم مسلمانوں کو سکولوں اور کالجوں میں نظریہ ڈارون پڑھاتے وقت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ بین الاقوامی یہودیت نے مذہبی عقائد اور اعلیٰ انسانی اقدار کو تباہ کرنے کے لئے نظریہ ڈارون کا مسلسل اور زبردست استعمال کیا ہے۔

ہمارے سکولوں اور کالجوں میں یہ بھی پڑھایا جاتا ہے کہ ماحول انسان کی زندگی کی عادات، روایات، احساسات، افکار اور طرزِ عمل کو بناتا ہے اور یہ بات نظریہ ڈارون ہی کا عکس ہے۔ حالانکہ اس میں بھی کوئی سائنسی ثبوت یا گواہی میسر نہیں۔ ہم تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس شخص کا کوئی مذہبی عقیدہ نہیں وہ آسانی سے ایسے ماحول کا شکار ہو جاتا ہے۔ ماحول اسے اپنا غلام بنا لیتا ہے مگر جس شخص کو صحیح عقیدہ میسر ہو

اور اس کے پاس اللہ کا دیا ہوا قانون موجود ہو جو اس کی زندگی اور طرزِ عمل کو منظم اور متشکل کرتا ہو، اس کی زندگی، عادات، روایات، احساسات، افکار اور طرزِ عمل ماحول کے تابع نہیں ہوتا، بلکہ اس کے عقیدے اور قانون کے تابع ہوتا ہے (یعنی وہ اپنا ماحول خود پیدا کرتا ہے۔)

تاریخِ اسلام کے مطالعے سے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ اسلامی عقائد نے کیسے ایک امت کو جنم دیا جسے اللہ نے بہترین امت فرماتے ہیں یہ الگ بات ہے کہ اب یہ امت اپنے عظیم الشان ماضی سے بالکل کٹ چکی ہے۔

اس میں تاریخ کی طرف آتا ہوں۔ آج کل تاریخ کا مطالعہ جس غلط نگاہ سے کیا جاتا ہے وہ اسلامی نظریہ کے خلاف ہی نہیں بلکہ اس سے متصادم ہے۔ یہ تاریخی نظریہ انسانی ترقی کو مادی اور صنعتی کاموں سے پرکھتا ہے۔ اس کے نتیجہ کے طور پر ہم مختلف تہذیبوں کی تعریف کرتے ہیں جیسے یونانی تہذیب، رومن تہذیب، تہذیبِ بابل، تہذیبِ اسیریا، یا تہذیبِ فراعنہ۔ اسی نظریہ کے تحت ہم موجودہ تہذیب کی بھی تعریف کرتے ہیں اور اسے بہترین اور اعلیٰ ترین قرار دیتے ہیں۔

مگر اسلامی نقطۂ نگاہ سے انسان یا تو بہترین حالت میں ہے (احسن التقویم) اور یا پست ترین حالت میں (اسفل السافلین)۔ جب انسان اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہے اور اس کے مقرر کردہ قوانین پر چلتا ہے تو وہ بہترین حالت میں ہے اور جب وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا اور اس کے قوانین پر عمل نہیں کرتا تو وہ پست ترین خلائق سے ہے۔ تہذیب و تمدن کا مادی پہلو خواہ وہ ترقی یافتہ ہو انسانی ترقی جانچنے کے لئے کوئی معیار نہیں۔ قرآن پاک کئی ایسی اقوام کا ذکر کرتا ہے جنہوں نے زمین پر ایسا کمال حاصل کیا ہوا تھا۔ بڑی بڑی تہذیبوں کی بنیاد رکھی تھی، بڑی بڑی تعمیرات کی تھیں مگر وہ انہیں جاہلیت ہی کی تہذیبیں کہتا ہے کیونکہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتے تھے نہ اس کی بھیجی ہوئی ہدایات کو مانتے تھے۔ ان کے پاس ایسے علوم تھے، جن میں وہ مگن تھے، مگر وہ صداقتِ سائنس کے منکر تھے جس کا مقصد دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی ہے۔

موجودہ سائنس اور ٹیکنالوجی دورِ ترقی کے باوجود تاریخ کا بدترین دورِ جاہلیت ہے کیونکہ اس دور میں انسان کے اندر جو روحانی اور اخلاقی پستی آئی ہے وہ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ انسان کی مادی ترقی محض ثانوی حیثیت رکھتی ہے جب تک اس پر صحیح عقائد اور اعلیٰ اخلاق کی عمارت تعمیر نہ کی جائے، وہ تہذیب قابلِ تعریف قرار نہیں دی جا سکتی۔ کافر بھی مادی تہذیب پیدا کر سکتا ہے اور مومن بھی۔ کافر اپنے مادی وسائل کو شیطانی عزائم پھیلانے میں صرف کرتے ہیں اور مومن ان سے اسلامی عقائد اور اعلیٰ اخلاق قائم کرنے اور پھیلانے کا کام لیتے ہیں۔

سوشیالوجی میں ہم ایک یہودی درخیم کے نظریات پڑھاتے ہیں، جو کہتا ہے کہ مذہب، اخلاقیات، شادی اور خاندان وغیرہ معاشرے کی وحدت کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری نہیں۔ سائیکالوجی میں ہم فرائڈ کے نظریات پڑھاتے ہیں جو مذہب کو انسانی فطرت کا لازمی عنصر ماننے سے انکار کرتا ہے۔ جہاں تک کیمسٹری، فزکس، بیالوجی، اسٹرالوجی، ریاضی، انجینئرنگ اور میڈیسن کا تعلق ہے، ہم اپنے بچوں کو یہ پڑھاتے ہیں کہ نیچر نے اس کائنات کو پیدا کیا ہے اور وہی اس کی رہنمائی کرتی ہے اور وہی اس کا انتظام چلاتی ہے اور جو قوانین فطرت ہیں وہ اٹل، ناقابلِ تبدیل اور مطلق العنان ہیں حالانکہ یورپ نے نیچر کا لفظ اللہ تعالیٰ کی بجائے گھڑا ہے۔ انہوں نے اس طرح ایک ایسا خدا تراشا ہے جو ذمہ داریوں سے مبرا ہے۔ اس خود ساختہ خدا کے ذمے انہوں نے تخلیق، ہدایت اور کائنات کا انتظام چلانے کا کام ڈال دیا۔ بقول ڈارون "نیچر ہر چیز کو تخلیق کرتی ہے اور اس کی تخلیق کی کوئی حد نہیں"۔ سکولوں اور کالجوں میں اپنے بچوں کو اس طرح سے مضامین پڑھانے کے بعد ہم کیسے یہ توقع رکھتے ہیں کہ ہماری نئی پود اسلامی عقائد سے بہرہ ور ہو گی۔ ایک طرف یہ سارے مضامین اور ان کا انداز تعلیم ہے اور دوسری طرف دینیات کا ایک پیریڈ بھلا اس روحانیت کش اور مذہب دشمن ماحول میں کیا کر سکتا ہے۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ اپنے تعلیمی نصابات میں اسلام کو اس کا صحیح مقام دیں تو ہمیں دو کام کرنے ہوں گے۔ ایک یہ کہ ہم مذہبی تعلیم کو صرف رسمی یا روایتی وعظ تک محدود نہ رکھیں۔ دوسرے یہ کہ مندرجہ صدر جملہ مضامین کے نصابات کو اسلامی عقائد کی روشنی میں از سر نو لکھیں۔ جب تک بچوں کے تصورات، انداز فکر، اخلاق اور طرزِ عمل اسلامی نہیں ہوں گے وہ اسلام کے صحیح فرزند نہیں بن سکیں گے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم اپنے تمام نصاب کو وعظ بنا دیں۔ ایسا کرنے سے ہم اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکتے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ رسمی مذہبی وعظ سارے دن میں چند منٹ سے زیادہ کا نہیں ہونا چاہیئے۔ جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے کہ مختلف مضامین کے نصابوں کو از سر نو لکھا جانا چاہیئے۔ مثلاً بیالوجی کی کتابوں میں جہاں کہیں لفظ قدرت آتا ہے وہاں اللہ تعالیٰ لکھ دیں۔ اسی طرح فزکس اور کیمسٹری میں مادے کے خواص بیان کرتے ہوئے ہم اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا ذکر کر سکتے ہیں۔ اسی طرح اسٹرالوجی کا مضمون پڑھاتے ہوئے ہم اس کی وسعت اور نظام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی طرف توجہ دلا سکتے ہیں۔ اس طرح ہم اپنے طالب علموں کے ذہنوں میں اسلامی شعور پیدا کر سکیں گے۔ تاریخ کے بارے میں اوپر لکھ آیا ہوں کہ ہمیں شخصیتوں اور واقعات کا جائزہ لیتے وقت اسلامی معیار کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

اسلامی ہر چیز کا وزن صداقت میزان سے کرتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ حقائق کو تبدیل کر دیا جاتے۔ ہم صرف ان کی قیمت لگانے کا معیار بدلنا چاہتے ہیں۔ ہم انہی شخصیتوں کو عظیم کہیں گے جو اللہ تعالیٰ کے سچے بندے رہیں اور اللہ تعالیٰ ہی کی راہ میں اپنی جانیں دیں۔ جب طالب علم تاریخ، سوشیالوجی، اقتصادیات، سائیکالوجی، لٹریچر اور دیگر مضامین کا مطالعہ اس انداز سے کرے گا تو اس کا ذہن اسلامی سانچے میں ڈھل جائے گا۔ وہ محسوس کرے گا کہ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کے سامنے ہے اور اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت جاگزیں ہو گی اور ساتھ ہی وہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے ترساں رہے گا۔

یورپی سرمایہ دارانہ جمہوریتیں یہ مضامین اپنے نقطۂ نگاہ کو پیش نظر رکھ کر پڑھاتی ہیں اور کمیونسٹ اور سوشلسٹ ممالک یہ مضامین پڑھاتے وقت اپنا نقطۂ نگاہ پیش نظر رکھتے ہیں، مگر افسوس کی بات ہے کہ ہم مسلمانوں کے سکولوں اور کالجوں میں یہ مضامین پڑھاتے وقت اسلامی نقطۂ نگاہ کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اس غلطی کا ازالہ کریں۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آج کل ہم اسلامیات کے کورس پڑھاتے ہیں وہ بالکل بے جان اور روکھے پھیکے ہوتے ہیں حالانکہ اسلام کی روح میں بہت وسعت اور جاذبیت ہے۔ اسلامی اصولِ زندگی کے باوجود زندگی سے معمور ہیں اور آسانی سے ہر ایک کی سمجھ میں آ جاتے ہیں۔ ایسے اصولوں سے اپنی نئی نسل اور باقی دنیا کو محروم رکھنا صرف زیادتی ہی نہیں بلکہ جرم ہے۔

●●

- علامہ اقبالؒ
- لیاقت علی خاں
- فضل الحق
- سر راس مسعود

تعلیمِ نسواں

(تعلیم نسواں کسی بھی ملک کے ترقیاتی پروگرام کا ایک اہم جزو ہے لیکن ہمارے ملک میں تا حال اس بارے میں سوچ سمجھ کر کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا ہے۔ اسلام عورت کو معاشرے میں ایک اہم مقام دیتا ہے اور نظامِ تعلیم کو اس کے لیے تیار کرنا چاہیے۔ موجودہ نظام عورتوں کے لیے بالکل ہی غیر افادی بلکہ مضرت رساں ہے۔
اس موضوع پر ہم علامہ اقبال، سر راس مسعود، مولوی فضل الحق اور لیاقت علی خاں کے خیالات پیش کر رہے ہیں "محور")

علامہ اقبال!

میں کھلے کھلے لفظوں میں اس امر کا اعتراف کروں گا کہ بمصداق آیت کریمہ الرجال قوامون علی النساء میں مرد و عورت کی مساوات مطلق کا حامی نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ قدرت نے ان دونوں کو جدا جدا خدمتیں تفویض کی ہیں اور ان فرائض کی جداگانہ صحیح اور باقاعدہ انجام دہی ہی نوعِ انسان کی صحت اور علاج کے لیے لازمی ہے۔ مغربی دنیا میں جہاں نفسانفسی کا عالم ہے اور غیر معتدل مسابقت نے ایک خاص قسم کی اقتصادی حالت پیدا کر دی ہے، عورتوں کا آزاد کر دینا ایک ایسا تجربہ ہے جو میری دانست میں بجائے کامیاب ہونے کے الٹا نقصان رساں ثابت ہوگا اور نظامِ معاشرت میں اس سے سخت پیچیدگیاں واقع ہو جائیں گی اور عورتوں کی اعلیٰ تعلیم سے افرادِ قوم کی شرح ولادت پر جو نتائج مرتب ہوں گے وہ بھی غالباً ناپسندیدہ ہوں گے۔ مغربی دنیا میں جب عورتوں نے گھر کی چار دیواری سے باہر نکل کر کسبِ معاش کی جدوجہد میں مردوں کا ساتھ دینا شروع کیا تو خیال یہ کیا جاتا تھا کہ ان کی اقتصادی حریت دولت کی پیداوار میں معتد بہ اضافہ کرے گی، لیکن تجربے نے اس خیال کی نفی کر دی اور ثابت کر دیا کہ اس خاندانی وحدت کے رشتہ کو جو کہ نوعِ انسان کی روحانی زندگی کا جزوِ اعظم ہے یہ حریت توڑ دیتی ہے۔

میں اس حقیقت کے اعتراف کے لیے آمادہ ہوں کہ زمانۂ حال میں کسی ملت کا محض مقامی قوتوں کے ذریعے نشوونما پانا محال ہے، لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اگر کسی قوم کے لیے بغرض تکمیلِ صحت اسی تمدنی آب و ہوا کی تبدیلی کے طور پر کسی غیر قوم کے تمدن کے عناصر کا اخذ و جذب کرنا قرینِ مصلحت بلکہ لازمی ہی کیوں نہ ہو، لیکن اگر اطوار کی تقلید میں جلدی اور بے سلیقگی سے کام لیا گیا، تو نظامِ قومی کے اعضائے رئیسہ میں اختلالِ عظیم واقع ہونے کا خطرہ ہوگا۔ اقوام کے تمدن میں ایک پہلو عمومیت کا ہوا کرتا ہے لیکن ان کی معاشرت کی رسموں اور سیاسی دستوروں میں خصوصیت کی شان نظر آتی ہے۔ یہ رسوم اور یہ دستورات ان قوموں کی تاریخی زندگی اور ان کی خاص روایات سے اثر پذیر ہوتی ہیں پس اپنی قوم کی خاص نوعیت، اسلام کی تعلیم اور عالمِ نسواں کے متعلق علم الاعضاء اور علم الحیات کے انکشافات کو مدنظر رکھنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتے کہ مسلمان عورت کو اسلامی معاشرے میں بدستور انہی حدوں کے اندر رہنا چاہیے جو اسلام نے اس کے لیے مقرر کر دی ہے اور جو حد اس کے لیے مقرر کی گئی ہے، اسی لحاظ سے اس کی تعلیم ہونی چاہیے۔

پس اپنی قومی ہستی کے مسلسل بقا کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی عورتوں کو ابتداء میں ٹھیٹھ مذہبی تعلیم دیں جب وہ مذہبی تعلیم سے فارغ ہو چکیں تو ان کو اسلامی علوم، علمی تدبیرِ خانہ داری اور علمِ اصولِ صحت پڑھایا جائے اس سے ان کی دماغی صلاحیتیں اس حد تک نشوونما پائیں گی کہ وہ اپنے شوہروں سے تبادلۂ خیالات کر سکیں گی اور امومت کے وہ فرائض خوش اسلوبی سے انجام دے سکیں گی جو میری رائے میں عورت کے فرائضِ اولیں ہیں۔ تمام وہ مضامین

جو ان کی نسائیت کی نفی کرنے یا اسلام کی حلقہ بگوشی سے انہیں آزاد کرنے والے ہوں، با احتیاط ان کے نصاب تعلیم سے خارج کر دینے چاہئیں۔ لیکن ہمارے نکتہ آموز ابھی تک اندھیرے میں رستہ ٹٹولتے پھرتے ہیں۔ انہوں نے ابھی تک ہماری لڑکیوں کے لیے کوئی خاص نصاب تعلیم متعین و مرتب نہیں کیا اور ان میں سے بعض بزرگواروں کی آنکھیں تو مغربی تصورات کی روشنی میں ایسی چندھیا گئی ہیں کہ وہ ابھی تک اسلام میں جو قومیت کو ایک خاص ذہنی کیفیت یعنی مذہب پر منحصر قرار دیتا ہے اور مغربیت میں جس نے قومیت کو ایک خاص ذہنی کیفیت یعنی مذہب پر منحصر قرار دیتا ہے اور مغربیت میں جس نے قومیت کا محل ایک خارجی سو رایعنی وطن کی بنیاد پر تعمیر کیا ہے، کوئی فرق نہیں سمجھتے۔

ابو القاسم فضل الحق جب وکیل کو قانون کی اور ڈاکٹر کو علمِ ادویہ اور علمِ تشریح کی تعلیم دی جاتی ہے تو وکیل وکیل اور ڈاکٹر ڈاکٹر ہوتا ہے۔ اگر وکالت کے طالب علم کو علمِ ادویہ اور ڈاکٹری کے طالب علم کو قانون پڑھایا جائے گا، تو نہ ڈاکٹر ڈاکٹر ہوگا اور نہ وکیل وکیل۔ اسی اصول پر ہم کو اگر گھر والی کی ضرورت ہے، تو اس گھر والی کو امورِ خانہ داری میں ماہر ہونا چاہیے میرا یہ نظریہ کسی تعصب یا تنگ خیالی پر مبنی نہیں جرمنی، اٹلی اور بعض دیگر مہذب کہلانے والے ملکوں میں جو قانون جاری کیے جا رہے ہیں، ان کا رُخ بھی اسی جانب ہے۔ دانایانِ فرہنگ کئی پشتوں کے تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ عورتوں کا پہلا فرض انتظامِ خانہ داری ہے۔ کیونکہ ان کا یہ تلخ تجربہ ہے کہ عورتوں اور مردوں کو ایک ہی قسم کی تعلیم دینے کا یہ نتیجہ نکلا کہ عورتیں نہ فقط انتظامِ خانہ داری سے نابلد بلکہ اس سے متنفر بھی ہو گئی ہیں۔

لیاقت علی خاں عورتوں کی تعلیم ہماری قومی زندگی کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ مرکزی تعلیمی مشاورتی بورڈ کا خیال ہے کہ اسے کسی علیحدہ مسئلے کی حیثیت دینا مناسب نہیں مگر ہم مسلمان اس خیال سے اتفاق نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ معاشرے میں عورت کے فرائض کے بارے میں مسلمانوں کے تصورات دوسری اقوام کے تصورات سے مختلف ہیں۔

اسلام نے حقوق و فرائض سے متعلق جو احکامات دیے ہیں، وہ مرد عورت دونوں سے متعلق ہیں۔ رسولِ کریمؐ نے مسلمانوں مرد اور عورت دونوں پر تعلیم کا حصول لازمی قرار دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اسلام نے ان دونوں کے لیے جو وظیفۂ حیات مقرر کیا ہے، وہ مختلف ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے باہمی اختلاط اور میل جول کو اسلام پسندیدہ نہیں سمجھتا۔ مذاہبِ عالم میں اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جس نے عورت کو ایک باوقار مقام عطا کیا اسے قانونی حقوق اور انفرادیت بخشی۔ تاریخِ اسلام مسلمان عورتوں کے شاندار کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ اور انہوں نے جس اخلاق بندی، خدمت اور ایثار کا مظاہرہ کیا ہے وہ آج ہمارے لیے روشن مثال کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن انہوں نے جو شاندار کارنامے سرانجام دیے، وہ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے انجام دیے جو اسلام نے ان کے فرائض کے لیے مقرر کر دی ہیں۔ اب جبکہ عورت کے فرائض، وظائف، حقوق اور صلاحیتیں مرد سے مختلف ہیں، تو ظاہر ہے کہ عورتوں کی تعلیم بھی ایک الگ مسئلے کی حیثیت سے لی جائے گی۔ علاوہ ازیں غیر منقسم ہندوستان میں غیر اسلامی رسوم اور تعصبات، توہمات کے رواج اور مردوں کی عدم توجہی کی وجہ سے عورتوں میں تعلیمی پسماندگی ہے اور اس نے بےشمار مشکلات کو جنم دیا ہے۔ ان عوامل کی موجودگی میں ہمارے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم عورتوں میں تعلیم عام کرنے کے لیے ایک مخصوص طریق کار اختیار کریں۔ یہ بات نہایت خوش آئند ہے کہ عام مسلمان عورتوں کی تعلیم کی ضرورت سے آگاہ ہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ایک پڑھی لکھی عورت کسی قوم کے ثقافتی ورثے کی بہترین محافظ اور نئی نسل کی صحتمند نشوونما کی یقینی ضمانت ہے لیکن اس کے ساتھ مسلمان مغربی ممالک کے معاشرتی اور تعلیمی اداروں کی اندھا دھند تقلید پر کبھی بھی تیار نہیں ہو سکتے۔ یہ ضروری ہے کہ چند اچھے پڑھے لکھے مسلمانوں کی ایک کمیٹی عورتوں کی تعلیم کے مسئلے کا جائزہ لے اور ایک ایسی اسکیم تیار کرے جس میں ایک مسلمان عورت کے مخصوص مقام کو قائم رکھتے ہوئے اسے جدید سائنس اور علوم سے مستفید ہونے کے مواقع فراہم ہوں۔

سر راس مسعود چونکہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو خواتین کو کسی قوم کی بہترین روایات کا محافظ تصور کرتے ہیں، اس لیے مجھے ان چند رجحانات سے بڑا دکھ ہوتا ہے جو میں ان خواتین میں پاتا ہوں جنہوں نے وہ تعلیم حاصل کی ہے، جسے غلطی سے مغربی تعلیم کہا جاتا ہے۔ مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح جو تعلیم آج کل ہماری نوجوان لڑکیوں کو دی جا رہی ہے، اس کے باعث وہ لڑکیاں اپنے اس ثقافتی ورثے کو جو انہیں اپنے آباؤ اجداد سے ملا ہے حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگی ہیں اور اس جذبۂ حقارت کا اظہار اس طرح ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے ملک کی زندگی کے طور طریقوں کی بندر کی طرح بھونڈی نقالی کرتی ہیں جو ان میں سے اکثر کو دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوگا۔

●●

سید اسعد گیلانی

اقبال، دارالسلام، تعلیمی اسکیم

علامہ اقبال کی ہمنوائی اور مشورے سے چوہدری نیاز علی خان نے ادارہ دارالسلام ٹرسٹ قائم کیا تھا اس نے دارالسلام کی تعلیمی اسکیم میں علامہ کے نظریات کی بڑی اہمیت تھی۔ ملک میں بے شمار تعلیم گاہیں موجود تھیں جن میں مسلمان بچے دنیوی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ایسی تعلیم کا اس کی بنی کی رتی جو سرف مسلمان بچوں کے لیے ہی موزوں تھیں اور ان میں مسلمان بچوں کو ان کے مذہب اور روایات سے حتی الوسع آگاہ رکھا جاتا تھا، لیکن علامہ کے نزدیک یہ سب کچھ ادھورا اور ناکافی تھا جو نظام تعلیم انگریز نے مرتب کر کے ہندوستان میں رائج کر دیا تھا وہ ذہنی غلامی پیدا کرنے کا ذریعہ تھا۔ اس کے ذریعے علم حاصل نہیں ہوتا تھا بلکہ ایک خاص ذہنیت کی نشوونما پیدا کر کے اسے زندگی کا وظیفہ بنا لیا گیا تھا۔ گویا مروجہ علوم طلبہ انسان کے نزدیک علم محض غلامی میں روٹی کمانے کا ذریعہ اور ذہن کو غیر ملکی آقاؤں کے پاس گروی رکھنے کی صلاحیت پیدا کرنے کا نام تھا۔ ایسے ایک سال میں انہوں نے کہا:

"آج کل تعلیم زیادہ ہے، لیکن علم نہیں ہے، پہلے زمانے میں علم زیادہ تھا اور تعلیم کم تھی۔"[1]

انہوں نے دنیوی تعلیم کے مروجہ طریقے کو مسلمانوں کے لیے خصوصاً ناپسند کیا اور کہا:

"ہر ملک کی تعلیمی سرگرمیاں مختلف ہوتی ہیں لیکن جہاں تک مسلمانوں، ورمسلمان ملکوں کا تعلق ہے خالص دنیوی تعلیم سے ان کے لیے اچھے نتائج برآمد نہیں ہوتے ہیں۔"[2]

وہ مسلمانوں کے نظام تعلیم میں قرآن مجید کی تعلیم کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت آل انڈیا مسلم کانفرنس منعقدہ لاہور میں ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء کو کہا:

"وہ لوگ جنہوں نے تعلیم کا یہ اصل الاصول قائم کیا تھا کہ ہر مسلمان بچہ کی تعلیم کا آغاز کلام مجید کی تعلیم سے ہونا چاہیے وہ ہمارے معاملہ میں ہماری قوم کی ماہیت دور حاضر سے زیادہ ماہر تھے۔"

نوجوانوں کی تعلیم کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ ان کی تعلیمی بنیاد میں دین کے عروج کی سمولت لازم ہے۔ انہوں نے اپنے مقالے میں انجمن حمایت اسلام کے اجلاس میں مسلمانوں کے تعلیمی عزائم پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا:

مسلمان نوجوانوں کی تعلیمی اساس اگر دینی اور اخلاقی ہو تو ان میں سیر چشمی، بلند نظری اور خودداری کے وہ اوصاف حسنہ یقیناً پیدا ہو سکتے ہیں جو اسلامی سیرت کے مایۂ امتیاز ہیں۔[3]

ان کے نزدیک علم کو دین کے ماتحت رکھنے سے ہی حیدری اور فاروقی صفات پیدا ہو سکتی ہیں۔ دین سے خالی علم صرف گولی سکھاتا ہے۔ مشہور ماہر تعلیم جناب سید سلیمان ندوی کے نام اپنے ایک خط میں لکھا:

"علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دارومدار حواس پر ہے۔ عام طور پر میں نے علم کا لفظ انہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس علم سے وہ طبعی قوت ہاتھ آتی ہے جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہیے۔ اگر یہ دین کے ماتحت نہ رہے، تو محض شیطنت ہے، نہ علم۔"

علم حق اول حواس آخر حضور

آخر او می نگنجد در شعور

مسلمان کے لیے لازم ہے کہ وہ علم کو "مسلمان" کرے۔ "بولہب را حیدر کرار کن۔"

"اگر یہ بولہب حیدر کرار بن جائے یا یوں کہیے کہ اس کی قوت دین کے تابع ہو جائے تو نوع انسان کے لیے سراپا رحمت ہے"[4]

علامہ اقبال مسلمانوں کے بارے میں بے حد فکرمند رہتے اور ان کے زوال کے اسباب پر غور کرتے رہتے تھے۔ ایک تقریر میں انہوں نے کہا:

"مسلمانوں کو تعلیم سے زیادہ تربیت کی ضرورت ہے اور یہ اعتبار سے یہ چیز علما کے ذمہ ہے۔"[5]

چنانچہ مسلمانوں کے بے قومی اور دینی تعلیم کا تذکرہ کرتے ہوئے غیروں کے نظام تعلیم کو انہوں نے دینی غلامی سے تعبیر کیا۔

"میرا یہ دعویٰ ہے کہ دنیا کی کسی قوم نے ایسی اعلیٰ اور قابل تقلید مثالیں ایسے افراد میں پیدا نہیں کیں جیسی ہماری قوم نے کیں۔ اب ہم ہمارے نوجوانوں کو دعوا ہی قوم کی سوانح عمری سے ناواقف ہے، مغربی تاریخ کے مشاہیر سے استشہاد کرنا پڑتا ہے چنانچہ عقل اور مادی لحاظات وہ مغربی دنیا کا غلام ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی روح اس صحیح الفہم

---

[1] روزگار فقیر اول صفحہ ۴۰۔ [2] بیان حرف اقبال ۱۹ اکتوبر ۳۴۔ [3] آثار اقبال۔ [4] اوراق گم گشتہ ص ۴۸، ۴۹۔
[5] مقالات صفحہ ۳۱۲۔

جو دوائی کے عرصہ سے جاری ہے جو اپنی قومی تاریخ اور قومی لٹریچر کے مطالعہ سے پیدا ہوتی ہے ہم نے اپنی تعلیمی جدوجہد میں اس حقیقت پر نظر نہیں ڈالی کہ اغیار کے تمدن کو صرف اپنا درس سامنے رکھا ہے تیئیس سن تمدن کا حلقہ بگوش بنالیا ہے یہ وہ حلقہ بگوشی ہے جس کے نتائج کسی دوسرے مذہب کے دائرے میں داخل ہونے سے بڑھ کر خطرناک ہیں" سلہ

ملک میں غیر ملکی طرز کے نظام تعلیم پر تنقید کرتے ہوئے انہوں نے اسی خطبے میں کہا

" ہم اپنی قومیت کے لودے کو اسلامی آب حیات سے نہیں سینچ رہے ہیں اور اس طرح اپنی جماعت میں پکے مسلمانوں کا اضافہ نہیں کر رہے ہیں ہم اپنے درمیان ایک ایسا گروہ پیدا کر رہے ہیں جو کسی اجاری مرکز کے نہ ہونے کے سبب اپنی شخصیت کو کسی دن کھو بیٹھے گا۔" سلہ

اس کے بعد انہوں نے اپنے خطبے کے آخر میں اپنے تصور دارالعلم کا نقشہ پیش کیا

" یہ امر قطعی طور پر ضروری ہے کہ ایک مثالی دارالعلم قائم کیا جائے جس میں مسند نشین اسلامی صدمت ہو اور جس میں قدیم و جدید کی آمیزش نہ ہو بلکہ اس دارے سے ہوتی ہو۔ اس کی مثالی تصویر کھینچنا آسان کام نہیں ہے اس سے اعلیٰ تخیل، زمانہ کے رجحانات کا لطیف احساس اور مسلمانوں کی تاریخ اور مذہب کے مفہوم کی صحیح تعبیر ہی سے بنے گی" سلہ

گویا علامہ اقبال اس نظام تعلیم سے غیر مطمئن تھے جو مسلمانوں کو اطوار علامہ سکھاتا تھا اور انسان کی خودی کو تعلیم کے تیزاب میں ڈھال کر اسے غلامی کے سانچے میں ڈھال لیتا تھا وہ مسلمانوں کے لئے کسی ایسے دارالعلم کی تلاش میں تھے

اسی کے ساتھ ان کے خیال میں مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن کی ضرورت بھی تھی جس کا نقشہ وہ بار بار اپنے خطوط میں شرح کے ساتھ بیان کر چکے تھے اور چاہتے تھے کہ مسلم اکثریت کے علیحدہ اسلامی ماحول کے تصور کو جو ذہنی منصب العین کے طور پر حصول کرنے تک ایسی جدید اسلامی ریاست کے لئے جدید فقہ اسلامی کی تشکیل کا کام بھی ان کے نزدیک سب سے اہم تھا ان کے خیال میں دور حاضر میں مسلمانوں کی سب سے بڑی علمی اور سیاسی ضرورت یہ تھی کہ ان کی قدیم فقہ دور حاضر کی ضروریات کے مطابق جدید صورت میں ڈھل جائے اس کی جدید تقاضوں کو سامنے رکھ کر مدون اور مرتب کیا جائے اسے وضع وار مرتب کرکے عدالتوں میں رائج کیا جائے۔ قابل نفاذ بنایا جائے اور مسلمانوں کے لئے تحقیق و تدوین فقہ جدید کی صورت میں اس ایسا رہبر ہو جائے کہ جس اسلامی مملکت میں بھی قوانین اسلامی کے اجرا کی ضرورت ہو اسے اختیار کر کے وہاں جاری کر دیا جائے اور جس کے ذریعے ایک اسلامی ریاست جدید حالات کے سارے تقاضے پورے کرنے کے قابل ہو جائے۔ چنانچہ اسے ان تعلیمی تصورات کے پس منظر میں وہ مسلمانوں کے لئے ایک جدید فقہ کے کام کو بھی زمانے کی سب سے بڑی ضرورت سمجھتے تھے اور اسی تلاش میں تھے کہ اللہ تعالیٰ غیب سے کوئی سامان پیدا فرمائے جس سے ان کے نزدیک ہندی مسلمانوں کی یہ سب سے اہم ضرورت پوری ہو جائے

تلاش و جستجو کے انہی ایام میں چودھری نیاز علی خاں علامہ اقبال کے پاس جاوید منزل میں تشریف لائے چودھری صاحب نے علامہ سے اپنے ٹرسٹ کا ذکر کیا جو انہوں نے قلعہ جمال پور میں دارالاسلام کے نام سے قائم کرنے کا منصوبہ کیا تھا چودھری صاحب وہاں مسلمانوں کی اصلاح و تربیت اور دینی تعلیم کا انتظام کرنا چاہتے تھے وہ علامہ اقبال سے مناسب ہدایات اور رہنمائی کے خواہش مند تھے

علامہ اقبال نے فرمایا کہ

" دینی مدارس کی تو کمی نہیں بہتر ہوتا کہ آپ اس وقف سے کوئی دوسرا مفید کام لیتے"

چودھری صاحب نے کہا "تو پھر آپ ہی فرمائیے، اس وقف سے کیا کام لیا جائے"

علامہ اقبال نے فرمایا

" میرے نزدیک اس وقت مسلمانوں کی سب سے بڑی ضرورت فقہ اسلامی کی تشکیل جدید ہے بحالت موجودہ ہم روز بروز اسلام سے دور ہٹ رہے ہیں ۔۔۔ وہ سیاسی اور اجتماعی مسائل میں جنہوں نے موجودہ زمانے میں ایک خاص شکل اختیار کر لی ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ علماء ان مسائل کو کھیں اور حالات کو اسلامی تعلیم کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں" سلہ

علامہ اقبال کی اس تحریر کے حوالے سے یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر اس ادارے کو اس مقصد کے لیے وقف بھی کر دیا جائے جو علامہ کے پیش نظر ہے، تو اس ادارے کی سربراہی کے لیے کیا کوئی ایسی شخصیت میسر آسکتی ہے جو اس کام کی منصوبہ بندی کرے ابتدائی خاکہ تیار کرے علامہ سے مشورے کے ساتھ اس سکیم کی تفصیلات طے کرے جوان کے ذہن میں ہے اور پھر ایک مناسب ٹیم تیار کرکے اس عظیم کام کو سرانجام دے جو تدوین فقہ جدید کے عنوان سے علامہ کے پیش نظر تھی

اس پر متعدد شخصیات کا تذکرہ آیا جن میں علامہ محمد اسد جو نو مسلم بھی شامل تھے جو اس وقت ماہنامہ عرفات نامی ایک انگریزی رسالہ نکال رہے تھے اور جو رسالہ مسلمانوں کی علیحدہ ریاست اور اس کے خدوخال نمایاں کرنے میں ایک موثر کردار ادا کر رہا تھا تاہم اس گفتگو میں علامہ کی زبان پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا نام آیا جو اس وقت ماہنامہ ترجمان القرآن کے ذریعے حیدر آباد دکن سے تحریک اسلامی کا فکری آغاز کر رہے تھے اور اسلام کے اس کو تحریک کی صورت میں اٹھانے کے علمبردار تھے

لیکن مولانا مودودی کی دارالاسلام میں آمد سے پہلے وہاں ایک تعلیمی اسکیم جاری تھی جس کے مطابق چودھری نیاز علی خاں صاحب اپنے قائم کردہ ادارے کو چلا رہے تھے اپنے ادارے کے مقاصد بیان کرتے ہوئے انہوں نے مندرجہ ذیل امور کو ادارے کے دائرہ کار میں شامل کیا تھا۔

ا۔ ہندوستان میں ہر ایک مسلمان کے گھر کو جہاں تک ہو سکے دارالاسلام بنا دیا جائے۔ ہر مسلمان کنبے کا سربراہ اپنے کنبے کے سب افراد کو عقائد و اعمال میں شریعت اسلامیہ کے

سلہ سلہ سلہ خطبۂ صدارت مسلم کانفرنس لاہور ۲۱ مارچ ۱۹۳۱ء سلہ اوراق گم گشتہ صفحہ ۸۲

ان اشعار کے "رضاب سارے" میں کہ مولانا حالی کے مں چونکہ مرزا صاحب کو حالی بہت عزیز تھے اس لیے انہوں نے یہ اشعار ازراہِ محبت اپنے دیوان میں شامل کر لیے یہ بھی ممکن ہے یہ اشعار مولانا حالی کے اصرار پر شامل کیے گئے ہوں تاکہ سارے دیوان میں دو شعر تو ایسے ہوں جنہیں ایک عام قاری سمجھ سکے۔

غالب کی غزل جس کا مطلع ہے ؎

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن

اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ یہ دراصل داغ دہلوی کی غزل ہے۔ خاص کر اس غزل کا مقطع تو پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ میں داغ کا ہوں غالب کا نہیں ؎

وصل دشوار اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں　　　ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

داغ کا ایک اور شعر جو خواہ مخواہ دیوانِ غالب میں در آیا ہے یہ ہے ؎

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے　　　کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

اور اس شعر کا خالق تو میر تقی میر کے سوا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا ؎

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام　　　قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

دیوانِ غالب میں کتابت کی غلطیوں کا ذکر کرتے وقت ڈاکٹر بائع نے چند حیرت انگیز انکشافات کیے ہیں ان کی رائے میں غالب کے کئی اشعار محض کاتب کی غلط شماری سے لشترکی بجائے شعر بن کے رہ گئے ہیں بائع صاحب نے مشتے از خروارے کے مصداق پانچ اشعار منتخب کیے ہیں جو اگر صحیح صورت میں لکھے جاتے تو بیت الغزل کہلاتے ؎

(شعرِ غالب)	کوئی صورت نظر نہیں آتی	یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
(کاتب)	کوئی امید بر نہیں آتی	کوئی صورت نظر نہیں آتی
(شعرِ غالب)	دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا	جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں
(کاتب)	دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا	میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کیے
(شعرِ غالب)	اسد بسمل ہے کس انداز کا، قاتل سے کہتا ہے	عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو
(کاتب)	اسد بسمل ہے کس انداز کا، قاتل سے کہتا ہے	تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر
(شعرِ غالب)	لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے	ہاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
(کاتب)	لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے	یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں
(شعرِ غالب)	اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا	مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر
(کاتب)	اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا	لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

ڈاکٹر بائع کی ریسرچ میں ایک مقام ایسا بھی آیا ہے جہاں تحقیق تحقیق نہیں رہی، الہام بن گئی ہے سالہا سال کی دماغ سوزی کے بعد انہوں نے اُس ستم پیشہ ڈومنی کا نام ڈھونڈ نکالا ہے جس پر غالب مرتے تھے اور جسے انہوں نے عمر بھر کے لیے "ناز" رکھا تھا ڈاکٹر صاحب کی دانست میں اس کا نام "ناز" تھا۔ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں انہوں نے غالب کے چند اشعار پیش کیے ہیں ؎

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی　　　سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

(نوٹ، غالب نے نثر میں اپنی محبوبہ کو "ستم پیشہ" کا لقب دیا تھا، اس شعر میں اسے "ستم ظریف" کہہ کر یاد کیا ہے۔

چند اور مثالیں ملاحظہ فرمائیے ؎

ہماری سادگی تھی التفاتِ "ناز" پر مرنا　　　ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی

●

اک نوبہارِ "ناز" کو تاکے ہے پھر نگاہ　　　چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

●

دشنۂ غمزہ جاں ستاں ناوکِ "ناز" بے پناہ

●

وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اتر جائے　　　نگاہِ "ناز" کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے

ڈاکٹر بائع کے خیال میں جس محبوبہ کی وفات پر مرزا نے اپنا مشہور مرثیہ لکھا تھا وہ "ناز" ہی تھی جیسا کہ ان کے اس شعر سے ظاہر ہے ؎

گلفشانی ہائے "ناز" جلوہ کو کیا ہو گیا　　　خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

آپ نے ڈاکٹر بائع کے تمہیدی مقالہ سے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائے۔ آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ فنِ تحقیق میں ان کا کیا مقام ہے اب بھی اگر مرزا غالب یہ شکایت کریں کہ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا، تو چاہے آپ غالب کے طرفدار ہی کیوں نہ ہوں، آپ محسوس کریں گے کہ مرزا صاحب ڈاکٹر بائع کے ساتھ بے انصافی کر رہے ہیں اور ان کا شکوہ نہ صرف بے جا ہے، بلکہ بے بنیاد بھی ہے!!

●●

لارڈ برٹرنڈ رسل (لندن)

اشتراکی نظامِ تعلیم

اشتراکی نظریہ کو سمجھنے کے سلسلے میں روس میں نظام تعلیم کی موجودہ حالت پر غور ہو جاتا ہے لیکن یہ بھی ملاحظہ رہے فیصلہ کن ہے بس کیونکہ وہ ہمارے مقصود سے بہت دور ہے، لہذا ہمارے مقصد کے لئے اس چیز پر غور کرنا کہ حکومت روس کی توقعات اور ارادے کیا ہیں، مرحیرت سے کہیں زیادہ ضروری ہے کہ اس نے تاحال کیا کچھ کیا ہے جو کچھ اس وقت تک ہوا ہے اس کی حیثیت لازمی طور پر عارضی ہے۔ آغاز انقلاب میں روسیوں کی اکثریت ناخواندہ تھی اور کسانوں کی دہشت جو آبادی کا اسی فی صدی تھے، ہمہ وقت حکومت پر مسلط تھی۔ سرمایہ، مدارس اور استادوں کی کمی سب سے بڑی رکاوٹیں تھیں جن میں ان سب دقتوں کے باوجود اتنا کام ہو چکا ہے جو اس امر کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے کہ مکمل ہونے کے بعد یہ نظام تعلیم کس قسم کا ہوگا۔ اس لئے ہم سب سے پہلے اس چیز پر غور کریں گے کہ اس وقت تعلیم کے بارے میں کیا کچھ کیا جا رہا ہے پھر تعلیم کے مستقبل کے مطلوب کو جانچنے کی کوشش کریں گے۔

ماسکو کی دوسری سرکاری یونیورسٹی کے صدر البرٹ پی۔ پنکوس (Albert P Pinkevitch) کی کتاب "جمہوریۂ روس میں جدید تعلیم" میں، کم و بیش ایک سرکاری بیان کی حیثیت ہے۔ اس کتاب کو تعلیمی نظام اور اس کے موجودہ مقاصد کے بارے میں مستند سمجھنا چاہئے۔ اگر ہم یہ دیکھ کر حیران ہوں کہ اس میں کتنی باتیں ایسی ہیں جو مغربی ممالک کی موجودہ صورت حال سے متعلق ہیں لڑکوں کو لکھنا پڑھنا اور حساب سکھانا ایک ایسا فنی کام ہے جو اقتصادی نظام سے جداگانہ ہے۔ یہی حال جسمانی صحت کا سوال بھی ایک غیر نزاعی مسئلہ ہے، لیکن ان امور کے علاوہ وہاں سکاؤٹنگ، اخلاق، مدرسہ سکھانے اور بچوں میں حکومت سے وفاداری پیدا کرنے کا نظام بھی رائج ہے جو انگلستان اور امریکہ کے رائج الوقت نظام سے بہت مشابہ ہے اور غیر مانوس اشتمالی امدادی تحریر میں امریکی صدر جامعہ کے مانوس نقطہ نظر کی روح جھلکتی دکھائی دیتی ہے، مثلاً ان پرانے طریقوں کی صدائے بازگشت کے باوجود بہت کچھ ایسا بھی موجود ہے اور جو کچھ نیا ہے وہ بہت ہی اہم ہے۔ ملاحظہ تمام اشتمالیوں نے اس امر سے تعلق پر واضح طور سے زور دیا ہے جو تعلیم اور سماج میں پایا جاتا ہے اور جس پر مصنف نے گذشتہ میں زور دیا جا چکا ہے۔ پنکوس نے مغربی سرمایہ پرست ملکوں کے مدارس کے متعلق لینن کی کتاب سے ایک پیرا نقل کیا ہے

"ملک میں متوسط طبقے کی حکومت جس قدر زیادہ جمہوری ہو گی وہ اسی قدر زیادہ بے باکانہ طریقے سے یہ دھوکا دے گی کہ درس گاہیں سیاست سے آزاد ہو کر ساری قوم کی خدمت کر سکتی ہیں، لیکن حقیقتاً یہ مدارس متوسط طبقے کے ہاتھ میں جماعتی برتری کا آلۂ کار بنے رہتے ہیں ان مدارس کی رگ رگ میں ذات پات کی روح ہمیشہ جاری وساری رہی ہے اور ان کا مقصد یہی رہا ہے کہ سرمایہ داروں کو اطاعت گذار غلام اور کارآمد مزدور مہیا کرتے رہے"

ایک اشتمالی حکومت میں مدرسہ عوام کے ہاتھوں میں جماعتی برتری کا ایک آلہ ہے اور وہاں اس اخلاقی تعلیم کے سوا کچھ نہیں جو مزدوروں کو جماعتی کشمکش میں مفید ہو سکے۔ لینن کا پھر حوالہ دیا گیا ہے

"ہم ایسے ضابطہ اخلاق سے انکار کرتے ہیں جو کسی غیر انسانی یا غیر جماعتی تصور پر مبنی ہو اور ہم ایسے اخلاق کو مکر و فریب سمجھتے ہیں جس کا مقصد سرمایہ داروں اور زمین داروں کی خاطر مزدوروں اور کسانوں کے ذہنوں کو مسدود کرنا ہو۔ ہم کہتے ہیں کہ ہمارا ضابطہ اخلاق جماعتی کشمکش میں مکمل طور پر عوامی مقاصد کے تابع ہے۔"

اس کا نتیجہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب عوام کو ایسی مکمل فتح حاصل ہو جائے کہ کسی قسم کی جماعتی کشمکش باقی نہ رہے تو پھر اخلاقیات کا نام ہی اٹھ جائے گا، لیکن پنکوس کا خیال ہے کہ ایسے حالات میں ایک زیادہ قطعی ضابطہ اخلاق طاری ہو گا، جیسا کہ وہ کہتا ہے

"سوویٹ روس میں عام تعلیم و تربیت کا مقصد یہ ہے کہ ایک تندرست، مضبوط، سرگرم، دلیر، آزادی سے سوچنے اور عمل کرنے والے انسان کے نشوونما میں ہر طرح سے امداد دی جائے جو معاشرتی حالات کے تمام پہلوؤں سے پورے طور پر آشنا ہو، عوامی مقاصد کے پیدا کرنے اور ان مقاصد کی حفاظت کے لئے اور اسی طرح سے آخری تجزیے میں تمام انسانیت کے مفاد کے لئے لڑنے مرنے کے لئے تیار رہے۔"

اس پیرے میں صرف عوام کے ہی ذکر کو حذف کر دیجئے۔ ایک مکمل ضابطۂ اخلاق صاف نظر آتا ہے جس میں کوئی چیز امتیازی طور پر اشتمالی نہیں لیکن جمہوری دور میں پروپیگنڈے کو بڑا کام کرنا ہے۔ اس دور میں گویا مقصد یہ ہے کہ نوجوانوں کو عوامی فلسفے کا معتقد بنایا جائے

پنکوس تسلیم کرتا ہے کہ تعمیر کردار کے زاویۂ نگاہ سے لڑکیوں اور لڑکوں کا ساتھ رہنا معقول طور پر زندگی کے بہت ہی اہم حصے ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ بعض اداروں میں بچوں کی دیکھ بھال کی جاتی جو محض خاندان کی خاطر نہیں بلکہ ایک ایسی اشتراکی حکومت پیدا کرنے کے لئے بھی ہو جس میں عورت ذلیل، پست اور غیر مستحق محنت سے آزاد ہو کر مرد کے دوش بدوش اپنا مقام حاصل کر لے

تاریخِ انسانیت میں اسلام کو ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ وہ سراپا علم بن کر آیا اور تعلیمی دنیا میں ایک ہمہ گیر انقلاب کا پیامبر ثابت ہوا۔ اسلامی نقطۂ نظر سے انسانیت نے اپنے سفر کا آغاز تاریکی و جہالت سے نہیں، علم اور روشنی سے کیا ہے۔ تخلیقِ آدم کے بعد خالق نے انسانِ اوّل کو سب سے پہلے جس چیز سے سرفراز فرمایا وہ علم اسماء ہی ہے اور علم ہی وہ قوت ہے جس کی بنا پر کائنات کی دوسری تمام مخلوقات پر انسان کو فوقیت حاصل ہے۔

علم اور تعلیم کے باب میں اسلام کی تعلیمات، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور آپ کی قائم کردہ روایات کی روشنی میں مسلمانوں کی تعلیمی خدمات کے مطالعہ سے تعلیم کی دنیا میں اسلام کا جو مخصوص کارنامہ نظر آتا ہے اس کے چند بنیادی پہلو یہ ہیں

(ا) علم اشیا کی تعلیم سے انسان کے دنیوی سفر کے آغاز سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی اوّلین ضرورت علم ہے اور انسان کو انسان بنانے والی چیز تعلیم ہے۔

(ب) علم کا صحیح تصور یہ ہے کہ اس کا حقیقی سرچشمہ رب السمٰوٰت والارض کی ذات ہے۔ حقیقتِ اشیاء کا علم بھی اور ہدایت و ضلالت کا علم بھی اسی کا دیا ہوا ہے۔ حواس اور عقل و تجربہ بڑے اہم ذرائع علم ہیں لیکن وحی سب سے اعلیٰ سرچشمۂ علم ہے۔ پھر یہ کہ علم کا تعلق محض لوازماتِ حیات ہی سے نہیں، مقاصدِ حیات سے بھی ہے اور یہی زیادہ اہم ہے۔ اس سے اسلامی تعلیم کا جو مزاج تشکیل پاتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں علمِ دین کی تعلیم، رب کی معرفت اور الہامی اصولِ ہدایت کی روشنی میں فرد اور تمدن کی صورت گری کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔

(ج) اسلام نے تعلیم کو بہت سی ضرورتوں میں سے ایک ضرورت نہیں، تمام انسانوں کی اوّلین اور بنیادی ضرورت (BASIC NFCESSITY) قرار دیا ہے۔ اسلام کے علاوہ، دنیا کا کوئی مذہب یا تمدن ایسا نہیں ہے جس نے تمام انسانوں کی تعلیم کو ایک بنیادی ضرورت قرار دیا ہو حتیٰ کہ یونان اور چین بھی جو اپنی علمی ترقیات کی وجہ سے غیر معمولی شہرت کے حامل ہیں، اس کے قائل نہ تھے۔ یہ اسلام ہی ہے جس نے عام اور ہر شخص کی تعلیم (UNIVERSAL EDUCATION) کا تصور پیش کیا۔

(د) ایک طرف اسلام نے تعلیم کو ایک بنیادی ضرورت قرار دیا تو دوسری طرف اس کو حاصل کرنے کی ذمہ داری فرد اور معاشرہ دونوں پر عائد کی۔ اسلام کا یہ اصول ہے کہ جو چیز سب پر فرض ہو، وہ اس کی فراہمی کی اوّلین ذمہ داری فرد پر اور آخری ذمہ داری معاشرہ اور ریاست پر عائد کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نماز، حج اور زکوٰۃ کا نظام اسلامی ریاست کے وظائف میں شامل ہے۔ تعلیم کے سلسلے میں جو حضورؐ نے جو روایت قائم کی، وہ اصحابِ صفہ کی درس گاہ میں نظر آتی ہے۔ اصحابِ صفہ میں سے کچھ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے خود بھی تگ و دو کرتے تھے، پھر مسلمانوں کے اہلِ ثروت ان کی ضرورتوں کو پورا کرتے تھے، دل کھول کر عطیات و وظائف دیتے تھے اور حضور اکرمؐ خود ان کی ضروریات پوری فرماتے تھے بلکہ جب تک ان کے کھانے کا بندوبست نہ ہو جاتا آپؐ کھانا تناول نہ فرماتے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کی پوری تاریخ میں تعلیم ہمیشہ مفت رہی ہے۔

(ہ) مسلمانوں کے نظام میں علم اور تربیت ہمیشہ ساتھ ساتھ رہے ہیں اور یہ بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تتبع ہی میں تھا کہ بحیثیت معلم کے جہاں آپ تعلیم کتاب و حکمت کی ذمہ داریاں ادا فرماتے وہیں تزکیہ نفس کا کام بھی انجام دیتے۔ ہمارے تعلیمی نظام کا مخصوص مزاج ان دونوں عناصر کے حسین امتزاج سے تشکیل پایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود عرفِ عام میں اس مزاج کا اظہار "علم و فضل" کی اصطلاح سے ہوا ہے جو علم اور نیکی میں بڑھے ہوتے ہونے کو ظاہر کرتی ہے۔

(و) ایک اور اہم چیز تعلیم اور مسجد کا باہمی تعلق ہے۔ تعلیم کا دینی مزاج اس بات کا مقتضی تھا کہ دینی زندگی کے محور مسجد سے اس کو مربوط کیا جاتا۔ مسجد نبوی میں پہلی تعلیم گاہ کے قیام نے اس روایت کو قائم کر دیا اور بعد میں مسلمانوں کی پوری تاریخ میں اس روایت کو فروغ دیا گیا اور اس کے ذریعے طلبہ کی زندگیاں ہمارے مخصوص ثقافتی نظام کے سانچے میں ڈھلتی چلی گئیں۔

یہ ہے ہماری مخصوص نظریاتی اور تاریخی روایت۔ پہلی چار صدیوں میں باقاعدہ مدارس کا نظام موجود نہ تھا لیکن تعلیم و تعلم کے لاکھوں حلقے اسی نہج پر کام کر

رہے ہیں۔ جو صحن کی تعلیم گاہیں قائم ہوتی تھیں۔ مساجد تعلیم کا مرکز تھیں اور علماء نے درس قرآن و حدیث تعلیم کا ذریعہ۔ ایک ایک درس میں ہزاروں طلبہ شریک ہوتے تھے۔ خود حکومت ان اساتذہ کو معقول وظائف دیتی تھی تاکہ وہ یکسوئی سے کام کر سکتے تھے۔ اصطلاحی مدارس نہ ہونے کے باوجود یہ نظام اتنا مستحکم اور ہمہ گیر تھا کہ علم گھر گھر پھیل رہی تھی اور ہر سطح پر، وہاں کی ضرورت کے مطابق سلسلہ تعلیم قائم تھا جس کے ذریعے زندگی کے ہر شعبہ کے ماہرین تیار ہوتے تھے۔ اس نظام کی کامیابی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ جس تہذیب و تمدن نے اتنے بڑے کارکن فراہم کر کے دے رکھا تھا۔ وہ بجلی کی سی سرعت کے ساتھ ترقی کر رہا تھا ایک طرف چار سو سال میں دنیا کی عظیم ترین سلطنت قائم ہو گئی تھی اور دوسری طرف اہل علم کی یہ افراط تھی کہ اسماء الرجال کی کتابوں میں اس دور کے جن علماء کا تذکرہ ملتا ہے ان کی تعداد ۵ لاکھ سے زیادہ ہے۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جن کے علم کا لوہا مانا جا چکا تھا۔ اس دور کی اہم تعلیم گاہوں میں سے جو اب تک موجود ہیں اور اپنا ایک مخصوص مقام رکھتی ہیں، مسجد الحرام (مکہ مکرمہ) اور مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ تونس کی جامع زیتون اور مصر کی جامع ازہر ہیں۔

مسلمانوں کے تعلیمی نظام کا پہلا دور ہے۔ دوسرے دور کا آغاز پانچویں صدی کے اوائل سے ہوتا ہے۔ اس میں مساجد کے علاوہ بڑے پیمانے پر مدارس قائم ہوتے اور ان کا جال پوری اسلامی قلمرو میں بچھ گیا۔ سب سے پہلا مدرسہ ۴۱۰ھ میں سلطان محمود غزنوی نے غزنی میں قائم کیا جس کی اپنی عمارت، سرکاری گرانٹ، وقف املاک برائے عام مرحہ جات اور نصاب تعلیم وغیرہ تھے۔ دوسرا اہم مدرسہ دولت سلجوقیہ کے مشہور وزیر اعظم نظام الملک طوسی (المتوفی ۴۸۵ھ) کا قائم کردہ مدرسہ نظامیہ بغداد ہے جسے امام الحرمین اور امام غزالی جیسے صدر مدرسین حاصل ہوتے۔ یہ مدارس اسلامی مملکت کے طول و عرض میں پھیلے ہوتے تھے اور ان کی تعداد کا اندازہ کرنا ممکن ہے

پاک و ہند میں مسلمانوں کا تعلیمی نظام

برصغیر پاک و ہند میں اسلام کی دعوت، دورِ رسالت اور عہد خلافت راشدہ میں پہنچ چکی تھی، پھر ولید کے عہد میں محمد بن قاسم کے ہاتھوں سندھ اور اس کا ملحقہ علاقہ فتح ہوا اور اسلامی ریاست قائم ہوئی۔ اسلامی تعلیم کا آغاز اسی زمانے میں ہو گیا تھا اور سندھ کے پرانے لٹریچر اور ثقافت کے مطالعہ سے اس کے نقوش آج بھی نظر آتے ہیں

مسلمانوں کی باقاعدہ حکومت کا آغاز شہاب الدین غوری کے عہد سے ہوا جو اپنے معتمد علیہ غلام قطب الدین ایبک کو یہاں حکمران مقرر کر کے واپس چلا گیا۔ قطب الدین ایبک سے بہادر شاہ ظفر تک تقریباً ساڑھے سات سو سال مسلمان یہاں حکمران رہے۔ اس زمانے کے تعلیمی نظام اور اس کے نشوونما اور ارتقاء سے حسب ذیل کات سامنے آتے ہیں:

حصولِ علم دینی فریضہ

(الف) تعلیم کا جو دینی مزاج قرنِ اول میں تشکیل پایا تھا، بڑی حد تک قائم رہا۔ پورا تعلیمی نظام دینی تعلیم اور دینی موضوعات کے گرد گھومتا تھا۔ تعلیم کو ایک عبادت تصور کیا گیا اور اہل علم نے مدرسین کو اپنا ایک دینی فرض سمجھا گویا کہ علم کی زکوٰۃ ہے جسے برابر نکالا جاتا رہا۔

مسجد کی حیثیت

(ب) گو اول روز سے یہاں باقاعدہ مدارس کا انتظام کیا گیا لیکن مدارس کے علاوہ دوسرے موثر تعلیمی مراکز بھی موجود تھے۔ ابتدائی تعلیم اور لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام گھروں پر تھا۔ مساجد اور ان میں قائم شدہ مکاتب تعلیم کا سب سے بڑا مرکز تھے۔ اہل علم کے مکانات اور کتب خانے اعلیٰ تعلیم کے مراکز کا درجہ رکھتے تھے جہاں بڑے پیمانے پر تعلیمی مجالس بھی منعقد ہوتی تھیں۔

تصورِ تعلیم

(ج) تصور تعلیم محدود نہیں بلکہ وسیع اور ہمہ گیر تھا۔ سب سے بنیادی اہمیت دینی تعلیم کو حاصل تھی جس کی روح کو باقی تمام تعلیمی سلسلوں میں بھی سمو دیا گیا تھا۔ صنعتی تعلیم کا انتظام کارخانوں میں تھا۔ تجارتی تعلیم کے الگ ادارے تھے جنہیں مہاجنی اسکول کہا جاتا تھا۔ فنون سپہ گری کے لئے بے شمار تربیتی ادارے قائم تھے۔ کتابت، خطاطی، طغریٰ نویسی، فن کوزہ گری، فن تعمیر، ان سب کے باقاعدہ مکتب بھی تھے اور ان فن کے گرد طالبان کا ہجوم الگ رہتا تھا۔

خود عام دینی مدارس میں جو نصاب تعلیم مروج تھا اس میں خالص دینی علوم کے علاوہ ہندسہ، جغرافیہ، منطق، تاریخ، طب اور ریاضیات کی تعلیم کا انتظام تھا

مفت تعلیم

(د) اس پورے دور میں بڑے پیمانے پر تعلیمی سہولتیں فراہم کی (UNIVERSAL EDUCATION) فراہم کی گئی۔ سلطان محمد تغلق کے زمانے میں صرف دہلی میں ایک ہزار اسلامی مدارس قائم تھے اور ان میں ایسے مدارس بھی تھے جن کی حیثیت آج کی یونیورسٹیوں کے برابر تھی۔ عہد اورنگ زیب کا مشہور سیاح الیگزینڈر ہیملٹن سندھ کے بارے میں لکھتا ہے کہ صرف ٹھٹھہ میں چار سو مدارس تھے۔ یہ کیفیت ایک شہر کی نہیں ہر ہر شہر کی تھی۔ ایک علاقہ کی نہیں، ہر ہر علاقے کی تھی اور مسلمانوں کے کسی ایک دور کی نہیں، پورے دور حکمرانی کی تھی۔

فطری انداز کے مطابق

(ہ) مسلمانوں کا نظام تعلیم عوامی بھی تھا اور آزاد بھی۔ حکومت تعلیم کے فروغ کے لئے بے پناہ رقم خرچ کرتی تھی۔ لیکن کسی زمانے میں بھی تعلیمی نظام حکومت کے تابع نہ تھا۔ تعلیمی اداروں کی ضروریات فراہم کرنے کے لئے اور ذہین و طباع طلبہ کو وظائف دینے کے مناسب کے لئے منتخب کرنے کے لئے صدر الصدور کا عہدہ سلاطین دہلی اور سلاطین مغلیہ کے دور میں ضرور موجود تھا، لیکن اس کا کوئی کنٹرول اداروں پر یا نصاب تعلیم پر نہ تھا۔ وہ مدارس جو حکومت کی گرانٹ سے چل رہے تھے، وہ بھی اندرونی نظام میں کلی طور پر آزاد تھے۔ ہر مدرسہ اپنے انتظام، اپنے نصاب، طلبہ کے بارے میں پالیسی، علوم کی تخصیص، ہر بارے میں آزاد تھا۔ اور تعجب یہ ہے کہ اس کے باوجود نظام تعلیم میں مشرق سے مغرب تک غیر معمولی ہم آہنگی اور باہم مطابقت پائی جاتی تھی جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ہماری اسلامی قدروں کی گرفت معاشرہ پر اتنی مضبوط تھی کہ فطری انداز میں تعلیم میں یگانگت و یک رنگی پیدا ہو گئی، دنیا کے کسی دوسرے تمدن میں ایسی تعلیمی آزادی کی مثال نہیں ملتی۔

استاد کی حیثیت

(و) اس نظام تعلیم کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ پورے نظام کا محور استاد تھا۔ اور تعلیم کا پورا مزاج استاد کا بنایا ہوا تھا استاد اور طالب علم میں گہرا قلبی ربط پایا جاتا تھا۔

ارباب حکومت کی دلچسپی

(ز) ایک طرف تعلیم فضا مکمل آزاد تھی اور دوسری طرف حکومت کی سرپرستی کا یہ عالم تھا کہ تعلیم کو سب تمام دیگر کاموں سے زیادہ اہم سمجھتی تھی۔ ارباب حکومت تعلیم کو تجارت نہ سمجھتے تھے اور نہ اسے حزا بار تصور کرتے تھے بلکہ دنیا اور آخرت دونوں کو سنوارنے کا ایک موثر

پس منظر کے بعد اب ہم مسلمانوں کی تعلیمی تحریکات میں سے چند نمایاں تحریکات کا تعارف کرائیں گے۔

مسلمانوں کی تعلیمی تحریکات

مسلمانوں کی تعلیمی تحریک میں چار رجحان زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔

انگریزی حکومت سے عدم تعاون — سرکاری تعلیمی نظام سے کلی انقطاع و عدم تعاون اور پرانے تعلیمی نظام کے تحفظ کی کوشش۔ اس کا نمائندہ ہے دارالعلوم دیوبند۔

جزوی ترمیمات کے ساتھ نظام کو جاری رکھنا — دوسرا رجحان نئی تعلیم کو مکتب نظام کے تعم البدل کے طور پر قبول کرنا اور جزوی ترمیمات کے ساتھ اسے مسلمانوں میں فروغ دینا۔ اس کا نمائندہ ہے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ۔

دونوں سے عدم اطمینان — تیسرا رجحان علی گڑھ اور دیوبند دونوں سے عدم اطمینان کی پیداوار ہے۔ اور اس کی نمائندگی ندوۃ العلماء لکھنؤ کرتا ہے۔

تینوں سے بائیکاٹ — چوتھا رجحان ان تینوں تحریکات کو ملکی، مذہبی، قومی اور ملی ضروریات کے سلسلے میں ناکام محسوس کرتے ہوئے تعلیم کو قومی رنگ میں رنگنے کا خواہاں۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد رونما ہوا۔ اس کا نمائندہ جامعہ ملیہ دہلی ہے۔

اب ہم ان میں سے ہر رجحان کے نمائندہ ادارے کا تاریخی و تنقیدی مطالعہ کریں گے۔

(۱) دارالعلوم دیوبند

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی پاک و ہند کی گذشتہ تین سو سالہ تاریخ میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ مسلم حکومت کے آخری دور کا یہ مجدد زندگی کے ہر میدان میں اسلام کے احیاء و اشاعت کی ایسی موثر کوشش کرتا ہے کہ بعد کی تاریخ کے ہر مرحلے پر شاہ ولی اللہ کی چھاپ موجود ہے۔ ان کی تجدیدی کوششوں کا ایک اہم حصہ سید احمد شہیدؒ کی تحریک مجاہدین تھی۔ اس تحریک کی ناکامی کے بعد علماء ہند نے ۱۸۵۷ء کے معرکہ میں شرکت کر کے ایک آخری بازی کھیلی لیکن بدقسمتی سے یہ کوشش بھی کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کے بعد تحریک دو بڑے حصوں میں بٹ گئی۔ ایک گروہ نے معاندت اور مدافعت کی وہی روش قائم رکھی اور اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں کی بنا پر برطانوی اقتدار کے لیے مسلسل دردِ سر بنا رہا۔ اس تحریک کے باقی ماندہ چند لوگوں نے کام کا ایک دوسرا لائحہ عمل بنایا اور وہ یہ تھا کہ تعلیم کے ذریعے علوم اسلامی اور ثقافت ملی کو محفوظ کر لیا جائے۔ دارالعلوم دیوبند انہی حضرات کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ مولانا محمود الحسنؒ اس مدرسہ کے بارے میں بالکل صاف الفاظ میں ارشاد فرماتے ہیں۔

"جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے۔"

دیوبند کا مدرسہ ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء کو مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے ہاتھوں قائم ہوا جو مولانا مملوک علیؒ کے شاگرد تھے اور مولانا مملوک علیؒ ایک طرف شاہ ولی اللہ کے تعلیمی مکتب فکر کے پروردہ تھے اور دوسری طرف سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے باقی ماندہ لوگوں میں سے تھے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب اس مدرسہ کے پہلے سربراہ تھے۔ ۹ سال مدرسہ بالکل ابتدائی حالت میں رہا۔ ۱۸۷۶ء میں نئی تعمیرات کے بعد آہستہ آہستہ ایک بڑے دارالعلوم اور علمی مرکز میں تبدیل ہو گیا۔ یہ قابل ذکر ہے کہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن اس کے پہلے طالب علم تھے۔

دیوبند کی خصوصیات یہ ہیں

(۱) اس ادارہ کا اصل مقصد دینی تعلیم کے ایک مرکز کا قیام تھا جس نظر یہ تھا کہ اس وقت جبکہ پورے ہندوستان میں مسلمانوں کا تعلیمی نظام تباہ و برباد کیا جا رہا ہے قدیم بنیادوں پر ایک متبادل نظام قائم کر دیا جائے۔ دارالعلوم دیوبند کی حیثیت ایک مدرسہ کی نہیں، ایک تحریک کی تھی اور تاریخ نے ثابت کیا کہ ہوا بھی ایسا ہی۔

آخری دور میں مسلمانوں کے نظام تعلیم میں تین نمایاں روایتیں ملتی ہیں۔ ایک دہلی کی جس میں شاہ ولی اللہ کے زیر اثر، قرآن و حدیث کی تعلیم کو مرکزی مقام حاصل تھا۔ دوسری فرنگی محل کی، جو درس نظامی کا اصل گہوارہ تھا اور جہاں فقہ اصول اور معقولات کو بنیادی اہمیت حاصل تھی اور تیسری خیر آبادی جہاں کلام کو غلبہ حاصل تھا۔ دیوبند میں نظام تعلیم کی بنیاد درس نظامیہ کو بنایا گیا لیکن اوّلین دور میں اس کا مزاج دہلی کی روایت سے قریب تر تھا، بعد میں فقہ اور کلام دونوں کی طرف رجحان بڑھا اور ایک حیثیت سے یہ مدرسہ تینوں روایتوں کا جامع ہو گیا۔ یہاں کا تعلیمی کورس ۹ سال کا تھا۔

دیوبند کے پورے نظام تعلیم پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گو اصل مقصد دینی تعلیم کا تحفظ ہی تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ طلبہ میں ذہنی وسعت اور معیشت کی آزادی پیدا کرنے کے لیے چند دوسری چیزوں کو بھی تعلیم کے ساتھ وابستہ کیا گیا۔ مثلاً علم طب ایک ضمنی مضمون کی حیثیت سے شامل نصاب کیا گیا۔ اس کے علاوہ خوشخطی کو ایک مضمون بنایا گیا۔ مختلف حرفوں کی ابتدائی تعلیم کا بھی بندوبست کیا گیا مثلاً جلد سازی، کپڑا بننا اور سینا وغیرہ۔ افسوس ہے کہ تعلیم کا یہ پہلو بعد از زمانہ کے ساتھ ساتھ ترقی نہ پا سکا اور نہ کوئی وجہ نہ تھی کہ دیوبند کا تعلیمی نظام مسلمانان ہند کی تعلیمی اور معاشی ضرورتیں پوری نہ کر پاتا۔ ابتدا میں مدرسہ کا فکر میں وسعت نظر آتی ہے لیکن حالات کی مجبوری کی بنا پر وہ مدرسہ کی سرگرمیوں کو بہت محدود رکھتے تھے۔ لیکن بعد کے لوگ فکر کے تعین جانتے ہیں اور ان حدود

تعلیمی صلاحیتوں کے لئے موت کا پیغام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پرانی تعلیم رنگ آلود ہو کر رہ گئی ہے اور اس صیقل کا دور دور بھی پتہ نہیں جو اس زنگ کو دور کر سکے۔

(الف) مولانا قاسم نانوتویؒ نے اپنی ایک تقریر میں یہ فرمایا تھا کہ ہماری خواہش یہ ہے کہ دیوبند کی تعلیم کی تکمیل کے بعد طلبہ جدید تعلیم بھی حاصل کریں اور اس طرح علوم عاصرہ سے واقفیت ہو اور وقت کی ضرورت پوری ہو سکے۔ دیوبند کے مداحین اس بات کو بار بار پیش کر کے ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ان کی تعلیمی تحریک میں دور حاضر کے تقاضوں کا پورا احساس موجود تھا لیکن تاریخ شاہد ہے کہ مولانا مرحوم کے اس ارشاد کا کوئی اثر دیوبند نے قبول نہ کیا اور نہ ہی کوشش کی گئی کہ دیوبند کے فارغ التحصیل طلبہ کو علوم جدیدہ سے آراستہ کر کے علمی جامعیت پیدا کی جاتی۔ اس ارشاد گرامی کی حیثیت ایک مقدس خواہش سے زیادہ اور جو آج بھی ایسی جس کا آنے والوں نے احترام نہ کیا۔ حد تو یہ ہے کہ دیوبند میں انگریزی کی تعلیم تک کے لئے کوئی گنجائش نہ رکھی گئی تاکہ کم از کم دنیا کی طرف کچھ کھڑکیاں تو کھلیں۔ اس میدان میں دیوبند کی ناکامی اس کے انقلابی مشن کو مجروح کرنے کا باعث بنی ورنہ کیا بعید تھا کہ دیوبند مسلمانوں کی صدیوں کی اصلاحی نشاۃ ثانیہ کا حقیقی مرکز بن جاتا۔

(ج) اصولی حیثیت سے تو تعلیم و تربیت کو مساوی اہمیت دی گئی لیکن عملاً تربیت کا پہلو کمزور رہا اور طلبہ میں ایک ظاہر پرستی پیدا ہوئی۔ چونکہ نصاب تعلیم کے غیر فطری ہونے کا فطری تقاضا تھا لیکن دوسری مساعی سے اس کی کو بڑی حد تک دور کیا جا سکتا تھا، جو نہ کیا گیا اور اس کا سب سے نقصان دہ نتیجہ یہ نکلا کہ دیوبند سے وہ انقلابی روح کمزور پڑ گئی جو ابتداء اس ادارہ کے پس منظر بھی اور جو اسلام کی امتیازی خصوصیت ہے۔

(د) ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ متحدہ قومیت کے لئے دیوبند کا ایک موڑ چند سال کا ایک تاریخی سانحہ ہے اور ہم جیسے طلباء کے لئے تاریخ کے لئے ایک معمہ ہے۔ شکر ہے کہ اس فکر کا توڑ دیوبند ہی سے ہوا اور مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحبان نے اسلامی قومیت کے تصور کو دلائل کی قوت اور ایمان کی حرارت کے ساتھ پیش کیا اور مسلمانان ہند کی صحیح اور بر وقت رہنمائی کی۔

لیکن ان تمام کمزوریوں کے باوجود دیوبند کی تعلیمی تحریک نے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی ضرورت کو پورا کیا اور اسلامی علوم اور روایات کو طوفان کے تھپیڑوں میں پڑ کر نکلا اور آج بھی دینی مدارس کی شکل میں یہ عظیم خدمت جاری ہے۔ دیوبند کے نظام نے اپنی حد تک امت کے مزاج کو بگڑ جانے سے بچایا ہے اور انگریز حکمرانوں اور مغربی تہذیب کے معاملے میں مفاہمت و مصالحت کے بجائے مقاومت اور ٹکراؤ کا علم بلند کیا ہے۔ اس وقت جب کہ انگریزوں کی کاسہ لیسی میں نجات کی راہ تلاش کی جا رہی تھی دیوبند نے معمولی وسائل کے ساتھ ایک آزاد محاذ کھولا اور مسلمانوں کو اس سیلاب سے ایک حد تک بچایا جس کی رو میں وہ آ رہے تھے۔ دیوبند کا یہ کارنامہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس کی بنا پر وہ تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ زندہ رہے گا۔

(ب) علی گڑھ

دیوبند کی تعلیمی تحریک مقاطعہ اور مقاومت کے رجحان کی نمائندہ ہے اس کے بالمقابل علی گڑھ کی تعلیمی تحریک مصالحت و مفاہمت کی مظہر ہے۔

۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد مسلمانوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ انگریز ان کے پرانے تعلیمی نظام کو مٹانے کے درپے ہیں۔ دوسری طرف مشنری تعلیمی ادارے بڑی سرعت کے ساتھ تعلیم کے پردے میں عیسائیت کا پرچار کر رہے ہیں اور سرکار سے منظور شدہ ہوئی گوریوں کے ذریعے مسلمانوں کی دینی عقائد کو مجروح کر رہے ہیں جو نیا تعلیمی نظام قائم کیا گیا تھا اور جسے سرعت کے ساتھ فروغ دیا جا رہا تھا وہ مذہبی تعلیم اور مذہبی روح سے یکسر عاری تھا۔ اور ہندوستان کی نئی نسلوں کو لادینیت اور مغربیت کے رنگ میں رنگ رہا تھا۔ مزید یہ بات بھی واضح ہو گئی تھی کہ اس نئی تعلیم سے ہندو بڑھ چڑھ کر فائدہ اٹھا رہا ہے اور بہ حسب العموم انگریزوں کا منظور نظر بن کر ساڑھے سات سو سالہ دور غلامی کا حساب چکانا چاہ رہا ہے۔ اسی زمانہ میں ہندوؤں کی اصلاحی تحریکات ابھریں اور انہوں نے ہندوؤں میں یہ جذبہ پیدا کیا کہ وہ بھی مسلمانوں پر ایک بالاتر قوم کی حیثیت سے غالب ہو سکتے ہیں۔ آریہ سماجی تحریک نے کھل کر اسلام اور پیغمبر اسلامؐ پر حملے کئے اور ہندوستان کی تاریخ میں غالباً پہلی مرتبہ ہندوؤں نے شدھی کی تحریک چلائی اس زمانہ میں ہندو مسلم مخالفت بلکہ منافرت کا بیج بو دیا گیا اور یہ بات بڑی حد تک واضح ہو گئی کہ ان دونوں قوموں کو جداگانہ طور پر اپنی سیاسی قسمت بنانا ہو گی۔ مسلمانوں کے بارے میں انگریزوں کی پالیسی ظالمانہ اور منتقمانہ تھی وہ صرف ان کے نظام تعلیم ہی کو ختم نہ کر رہے تھے بلکہ پورے تہذیب و تمدن کو مٹا دینا چاہتے تھے اور ان کی کوشش تھی کہ سیاسی، معاشی اور اخلاقی حیثیت سے مسلمانوں کی کمر توڑ دیں۔ روزگار کے تمام دروازے مسلمانوں کے لئے بند کر دیئے گئے تھے۔ ان کے پرانے نظام تعلیم کا ہر لحاظ سے معاشی اور انتظامی نظام سے منقطع کر دیا گیا تھا اور روزگار کی کنجیاں نئی تعلیم کو دے دی گئی تھیں۔ ان حالات میں ایک راستہ تو ان لوگوں نے نکالا جنہوں نے نامساعد سے نامساعد حالات میں بھی اپنے ماضی کے نظام سے رشتہ کاٹنا گوارا نہ کیا۔ لیکن کچھ دوسرے حضرات نے صورت حال پر اس نقطہ نظر سے غور کیا کہ مسلمان اپنے آپ کو انگریزوں سے لڑ کر نہیں بلکہ مل کر بچا سکتے ہیں۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ چونکہ مسلمانوں کو ایک ساتھ کئی دشمنوں سے نمٹنا ہے اس لئے یہ لڑائی بیک وقت نہیں لڑی جا سکتی، نیز ۱۸۵۷ء کے معرکہ کے بعد مسلمانوں میں یہ دم خم بھی نہیں ہے کہ وہ اس وقت کی مادی طاقت کے مقابل بر طویل مدت تک کوئی لڑائی لڑ سکیں۔ بلکہ ان حالات میں لڑائی کے طرز پر سوچنا مسلمانوں کے لئے شدید خطرات کا حامل ہے۔ ان کے لئے سیدھا راستہ یہ ہے کہ وہ انگریزوں سے وفاداری کا تعلق قائم کریں، انگریزی تعلیم حاصل کریں اور ملازمتوں میں اپنے لئے گنجائش پیدا کریں۔ ان حالات میں وہ اپنے کو بدلے بغیر چل نہیں سکتے

چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

اس نئے رجحان کے سب سے بڑے علمبردار سر سید احمد خاں تھے۔ سر سید کا تعلق بالائی متوسط طبقہ سے تھا انہوں نے اپنی ساری عمر برطانیہ کی ملازمت میں گذار دی۔

لیکن اس زمانہ میں بھی وہ مسلمانوں کے مسائل پر غور کرتے رہے اور ان کے نقطہ نظر کو خواہ وہ کتنے ہی دبے الفاظ اور خوشامدانہ انداز میں کیوں نہ پیش کرتے
ان کی کتاب "اسباب بغاوت ہند" نے خاص نام پیدا کیا اور دوسری کتاب "وفادار ہندوستانی" زیادہ مقبولیت حاصل نہ کر سکی۔ سیاسی حیثیت سے سرسید اس
بات کے قائل تھے کہ مسلمانوں کو انگریزوں کے ساتھ کامل وفاداری کی روش اختیار کرنا چاہیے اور جہاد و مقابلہ کا ہر تصور ختم کر دینا چاہیے۔ مسلمانوں کی ترقی کا
راز وہ صرف نئی تعلیم ہی میں نہیں، نئی تہذیب کے قبول کرنے میں مضمر پاتے تھے اور اس سے بڑھ کر ان دونوں کاموں کو انجام دینے کے لئے وہ ضروری سمجھتے
تھے کہ معاشرتی اور مذہبی معاملوں میں بھی بنیادی تبدیلیاں ضروری ہیں۔ مذہب کی انھوں نے ایک نئی تفسیر کی داغ بیل ڈالی جو اسلام میں ایک نو معتزلی تحریک
کے مترادف تھی اور جس میں انھوں نے کوشش کی کہ اسلام کی ان تمام تعلیمات کو جو مغربی تہذیب سے متصادم تھیں، تاویل کی مدد سے ختم کر کے ان سے ہم آہنگ کر دیں اور
معاشرت میں بھی مسلمان مغربی طور طریقوں کو اس درجہ اختیار کریں کہ انگریزوں کے ساتھ اس کے طریقے پر زندگی گزار سکیں۔ ان کے ذہن کا اندازہ ان کی اس تحریر
سے کیا جا سکتا ہے جو ان کی متعدد تحریروں میں سے ایک ہے۔

"ترکوں کا عام لباس مع ٹوپیوں کے بالکل یورپین ہے۔ سب نے زمین پر بیٹھنا بالکل چھوڑ دیا ہے، میز کرسی پر بیٹھتے ہیں، چھری کانٹے سے کھاتے ہیں۔
ان کے مکان کی آراستگی و طرز، بالکل یورپین ہے۔ جب ترک اپنی ہمسایہ قوموں فرنچ اور انگریزوں میں مل کر بیٹھتے ہیں تو ہم کو نہیں معلوم ہوتے ہیں۔ امید ہے
روز بروز درست ہوتے جائیں گے۔ پس ہندوستان کے مسلمانوں سے بھی ہم یہی چاہتے ہیں کہ ہم اپنے تعصبات اور خیالات خام کو چھوڑ دیں اور درستی و شائستگی
میں قدم اٹھائیں"۔ [9]

اور یہ اس ترقی اور شائستگی کی طرف پیش قدمی تھی کہ عیسائیوں کے ذبیحہ کو جائز قرار دیا، کھڑے ہو کر پیشاب کرنے اور ڈاڑھی منڈانے کا جواز فراہم کیا حتیٰ کہ بائیبل
کو غیر محرف ثابت کرنے کی کوشش کی۔

ہمارے پیش نظر یہاں سرسید کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینا نہیں، ہم یہاں یہ باتیں صرف اس لئے بیان کر رہے ہیں کہ وہ ذہن سامنے آ سکے جو اس نئی تحریک کی
پشت پر کام کر رہا تھا۔

تعلیم سے سرسید کی دلچسپی دیرینہ تھی۔ انھوں نے اپنی ملازمت کے زمانے میں غازی آباد میں ایک اسکول قائم کرنے کی کوشش کی۔ پھر اسی طرح بنارس میں انھوں
نے اپنی تعلیمی سرگرمیوں کو جاری رکھا۔ ان کی خواہش تھی کہ کسی ایک جگہ مرکز بنا کر مسلمانوں کی تعلیم کا ایک بڑا ادارہ قائم کریں اور اس کے لئے انھوں نے بالآخر علی گڑھ
کو منتخب کیا جہاں حکومت نے برائے کنٹونمنٹ ایریا میں ایک زمین سرسید کو دی جہاں ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو مدرسہ قائم کیا گیا۔

سرسید نے انگریزوں کے تعلیمی نظام کو قبول تو ضرور کیا لیکن نظری طور پر اس کی چند خامیاں بھی بیان کیں جن کے وہ قائل تھے، یہ ہیں:

(الف) یہ مسلمانوں کی مخصوص ضروریات کو پورا نہیں کرتا۔
(ب) ناظم تعلیمات کی گرفت بہت سخت اور اس کا طریقہ آمرانہ ہے۔
(ج) تعلیم کا نظام ہندوستانیوں کے لئے مشکل ہے۔
(د) تعلیمی کتب میں ایسا مواد بھی ہے جو اسلام کے خلاف ہے۔[1]

یہ تھی سرسید کی تنقید انگریزوں کے نظام تعلیم پر۔ اب ہم یہ دیکھیں گے کہ خود سرسید نے علی گڑھ میں جس نظام کا آغاز کیا اس کی کیا خصوصیات تھیں۔

(۱) علی گڑھ انگریزوں کے تعلیمی نظام اور اس کی ہیئت کو قبول کر کے اس کے اندر مسلمانوں کی تعلیم کے لئے گنجائش پیدا کرنے کی کوشش تھی۔ یہاں یہ کوشش نہیں
کی گئی کہ مسلمانوں کی ضرورت کے مطابق نیا نظام بنایا جائے بلکہ یہ سوچا گیا کہ انگریزوں کے بنائے ہوئے نظام میں مسلمانوں کے لئے پاؤں رکھنے کی جگہ
فراہم کر لی جائے۔ مغربیت علی گڑھ کے مزاج کا ایک جزو بن گئی اور علی گڑھ نے جو ساخت بنائی وہ تتبع اور مصالحت کے ایسے رجحانات کا آئینہ دار ہے۔ اس میں ایک
طرف مغربی تعلیم کو جس ڈھنگ سے لیا گیا اور اس تعلیم کے مزاج کو بھی نئے سانچوں میں نہ ڈھالا گیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس میں مسلمانیت کا اضافہ کرنے کے
لئے دینیات کا ایک پرچہ رکھا گیا اور ہوسٹل میں نماز، روزے اور دوسرے شعائر اسلامی کے لئے سہولتیں دی گئیں۔ متضاد عناصر کے اس امتزاج کو خود اس ادارہ کا اولین
نام بالکل صحیح طور پر پیش کرتا ہے یعنی اینگلو محمڈن اورینٹل کالج۔

(۲) یہ کالج رہائشی بنیادوں پر قائم کیا گیا اور اس حیثیت سے اس کا ایک ہمہ گیر ماحول اور مخصوص مزاج بن سکا۔

(۳) یہ تعلیمی ادارہ مسلمانوں میں عام تعلیم UNIVESAL EDUCATION پھیلانے کے لئے نہیں بلکہ متوسط طبقہ کے بچوں کی تعلیم کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ تعلیم کے لئے
فیس کا طریقہ رائج کیا گیا اور رہائشی ہونے کی وجہ سے صرف وہی لوگ اپنے بچوں کو بھیج سکتے تھے جو مصارف تعلیم کا گراں بار اٹھا سکتے تھے۔ گویا
FILTERATION THEORY کا یہ MUSLIM VERSION تھا۔ اس حیثیت سے مسلمانوں کے اب تک کے نظام تعلیم سے ایک بنیادی انحراف بھی تھا۔

(۴) اس ادارہ میں اس بات کی کوشش بھی کی گئی کہ انگریز پرنسپل اور انگریز اساتذہ رکھے جائیں جن کا اصل مقصد تو شاید انگریزوں کی وفاداری اور حب مغرب پیدا

---

[1] اسے تاریخ کی ستم ظریفی نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے کہ انگریزوں کے نظام تعلیم پر تو سرسید مرحوم کو یہ اعتراض ہے کہ کتب میں اسلام کے خلاف مواد ہے، لیکن
خود انھوں نے سب سے پہلے جس کتاب کو ترجمہ کے لئے منتخب کیا، اور ان کی سوسائٹی نے اسے شائع کیا وہ الفنسٹن کی تاریخ ہند تھی اور اصل کتاب میں دشمن
اسلام مصنف نے جہاں حضور کے بارے میں "نعوذ باللہ پیغمبر باطل" کا لفظ لکھا تھا سرسید نے بھی بلا کم و کاست لفظاً اسی طرح ترجمہ کر دیا۔

کا موقع دیا تھا لیکن عملاً اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز اساتذہ کی گرفت کالج پر مضبوط تر ہوتی گئی اور مغربیت کی رو طلبہ میں سرعت سے سرایت کرتی چلی گئی
سرسید کی بڑی خواہش تھی کہ اس ادارہ کو ایک یونیورسٹی بنائیں لیکن اپنی زندگی میں وہ یہ کام نہ کر سکے۔ ان کی وفات کے وقت کالج مالی بحران سے دوچار تھا ۵
ہزار کا قرض تھا۔ طلبہ کی تعداد بہت کم ہو گئی تھی اور یہ کشتی ہچکولے کھاتی نظر آتی تھی لیکن محسن الملک، نواب مہدی علی خان نے ادارہ کو بڑی قربانیوں اور
جانفشانیوں سے چلایا اور اس میں دوبارہ زندگی کی نئی لہر دوڑا دی۔ اس کے بعد نواب وقار الملک نے باگ ڈور سنبھالی اور بالآخر ۱۹۲۱ء میں کالج مسلم
یونیورسٹی میں بدل گیا۔ علی گڑھ کی داستان میں پاک و ہند کے مسلمانوں کی ۹ سالہ تاریخ کا عکس نظر آتا ہے۔ اس ایک ادارہ نے جو کچھ کیا اسے بلاشبہ انقلابی کہا
جاسکتا ہے۔

یہ ادارہ ایک تعلیمی تحریک کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا اور اس کے برابر اسی خطوط پر مسلمانوں کے تعلیمی ادارے قائم ہوتے گئے۔ علی گڑھ نے ادبی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی میدان پر نہایت اہم اثرات ڈالے۔ ہم اب علی گڑھ کے تاریخی رول کا ایک تنقیدی جائزہ لینے کی کوشش کریں گے۔

(۱) اگر مسلمانوں کو ایک اصولی جماعت کی حیثیت سے نہیں، بلکہ محض ایک قوم کی حیثیت سے لیا جائے تو علی گڑھ ان کے عہد زوال کا سب سے بڑا [illegible] ہے۔ سرسید نے مسلمانوں کو اس ہاری ہوئی قوم کی مایوسی سے نجات کے لئے سب سے صحیح ملک سیاست محض اس کو سمجھا ہے جو اس کو بچانے میں عزت و عظمت کی کتنی بڑی قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔ اس حیثیت سے علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں کے تعلقات انگریزوں سے استوار کرائے۔ بے اعتمادی کی فضا دور کی، انگریزوں کی غلط فہمیاں دور کیں، کچھ باہمی رسوخ دی کہ عام مسلمانوں کے تحفظ ہم کئے، ان میں تسلیم کی جو ڈالی اور اس طرح جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے کم از کم تھوڑی دور ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلنے لگے۔

(۲) معاشی حیثیت سے مسلمانوں کے لئے ملازمتوں کے حصول اور روزگار کے دوسرے مواقع کے حصول میں علی گڑھ کا بڑا حصہ ہے۔ مسلمانوں کے لئے معاشی ترقی کے دروازے بالکل بند ہو چکے تھے وہ اس نئی تعلیم کی وجہ سے پھر ایک حد تک کھل گئے اور اس نے مسلمانوں کو دوبارہ قدم جمانے کا موقع دیا۔

(۳) علی گڑھ ایک نئی ادبی تحریک کا بانی ہے جس کی سب سے بڑی خصوصیت آسان اور عام فہم اسلوب بیان ہے۔ اردو ادب کا یہ آہنگ بڑی حد تک علی گڑھ کا مرہون منت ہے اور یہ اس کی عظیم ترین خدمات میں سے ایک ہے۔

(۴) علی گڑھ نے بیسویں صدی میں اور خصوصاً پہلی جنگ کے بعد ایک سیاسی کردار بھی ادا کیا اور وہ یہ تھا کہ علی گڑھ اس کے قائم کرنے والوں اور چلانے والوں کی خواہشات کے علی الرغم مسلمانوں کی نئی سیاسی بیداری کا مرکز بن گیا اور اس کا سب سے دلچسپ اور تاریخی پہلو یہ ہے کہ آخری دور میں مسلم قومیت اور دو قومی نظریہ کی تحریک کا گہوارہ علی گڑھ تھا۔ اس طرح جو ادارہ انگریزوں سے قرب و مفاہمت کے جذبے سے قائم ہوا تھا، وہی انگریزوں کے اقتدار پر آخری ضرب لگانے کا ذریعہ بنا۔

(۵) مسلمانوں کی گذشتہ ۵ سال کی نئی قیادت بڑی حد تک علی گڑھ نے فراہم کی۔

یہ ہیں وہ چیزیں جو علی گڑھ کے تاریخی کارنامے کو ظاہر کرتی ہیں۔ اب ہم تصویر کے دوسرے رخ پر نگاہ ڈالیں گے

(الف) علی گڑھ کے قیام اور اس کے ارتقاء میں تعلیمی فکر کے مقابلے میں سیاسی فکر نمایاں نظر آتی ہے۔ بجائے اس کے کہ مسلمانوں کے دین اور ان کی مخصوص ثقافت کی روشنی میں کوئی تعلیمی لائحہ عمل تیار کیا جاتا، ہندوؤں سے مسابقت کے جذبہ کے تحت ایک ایسی آسان اور پٹی ہوئی راہ اختیار کی گئی جس کا نہ کوئی تعلق مسلمانوں کی تعلیمی روایت سے تھا اور نہ وہ ان کی تاریخ کے مخصوص تقاضوں کو پورا کرتی تھی۔ علی گڑھ نے انگریزی تعلیم ہی کے نہیں، مغربی تہذیب و تمدن کے دروازے بھی چوپٹ کھول دیے اور مسلمانوں کو اپنی تاریخ کے شدید ترین ذہنی اور تمدنی بحران سے دوچار ہونا پڑا اور اکبر کی زبان سے بے ساختہ نکل پڑا۔

ابتدا کی جناب سید نے — جن کے کالج کا اتنا نام ہوا
انتہا یونیورسٹی پر ہوئی — قوم کا کام اب تمام ہوا

(ب) علی گڑھ نے دو متضاد عناصر کو ایک ساتھ جمع کرنے کی کوشش کی یعنی مغربی تہذیب اور اسلام اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ مغربی تہذیب ہی مسلمانوں کو پوری حاصل ہوئی اور نہ اسلام ہی پورے طور پر ان کو حاصل ہوا اور قوم میں وہ سب سے بڑا روگ پیدا ہوا جسے ہم تضاد اور نفاق سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہ بیک وقت دو متضاد سمتوں میں جانے والی کشتیوں میں سواری کرنے کے مترادف تھا اور اس کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا ؎

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم — نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے[1]

(ج) علی گڑھ نے دینیات کے ایک پرچہ کو اسلامی تعلیم کے مترادف قرار دے کر اسلامی تصور تعلیم کو ختم کر دیا۔ پھر تعلیم کو ایک سے تجارت بنا کر مسلمانوں کی تمام روایات کو مجروح کیا۔ پھر تعلیم کو اعلیٰ طبقہ تک محدود کر کے مسلمانوں کے اس مخصوص کارنامے کو بھی ملیامیٹ کیا جو تعلیم کے باب میں ان کا بے نظیر کارنامہ تھا یعنی عام تعلیم (UNIVERSAL EDUCATION) اس طرح علی گڑھ سے جو یہ تصور یا نئی روایت ابھری وہ مسلمانوں کے لئے بالکل اجنبی تھی۔ یہ روایت مسلمانوں پر مسلط تو ہو گئی لیکن مسلمانوں کے مزاج نے آج تک اُسے قبول نہیں کیا ہے اور اسی نے اس کش مکش کو جنم دیا ہے جو آج ہمارے نظام تعلیم کی روح کو کھائے

---

[1] موج کوثر صفحہ ۲۴۳

(۵) علی گڑھ نے بظاہر تو اسلام کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا لیکن دراصل اپنی روح اور اپنے پروگرام کے اعتبار سے مادیت اور دنیا پرستی کو اس نے اپنا اصل مقصود ضرور بنایا۔ تعلیم کا پورا نظام اس طرح تشکیل پایا کہ طالب علم اسلام کے مزاج اور زندگی کی اصل قدروں سے کم سے کم بیگانہ ہو گئے اور ان کا واحد نصب العین دنیا کا حصول، معاشی مسابقت میں اپنے لئے ایک مقام کی تلاش اور زیادہ صاف الفاظ میں سرکاری ملازمت ہو گیا۔ علی گڑھ کے اس مزاج کا اظہار اس تقریر میں بھی ہوتا ہے جو سید محمود نے ندوہ میں کی تھی اور جس میں کہا تھا

"ہمارے دو کام ہیں۔ دین و دنیا۔ ہم نے دنیا کی ترقی کا کام اپنے ذمہ لیا ہے اور ندوہ دین کا کام دے رہا ہے اس لئے ہمیں اس کے مقصد سے پورا اتفاق ہے۔"

درحقیقت ہے کہ انہیں یہ خیال بھی نہ آیا کہ اسلام دین و دنیا کی ایسی ثنویت کا قائل نہیں ہے جس میں ایک گروہ دین کا اجارہ لے لے اور دوسرا دنیا کا۔ اسلام تو دونوں کے ایسے امتزاج کا قائل ہے کہ

"تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری"

(۶) علی گڑھ کا ایک بڑا ہی اہم پہلو سرکاری ملازمت کو حتی الامکان مقصود بنانا ہے۔ یہ حصر بڑے دور رس نتائج کا حامل ہوا۔ مسلمانوں نے اپنی تاریخ میں ہمیشہ تجارت، زراعت اور حرفہ کو بنیادی اہمیت دی اور اس طرح ایک آزاد معاشی پوزیشن ان کو حاصل رہی۔ ہندوستان کے نئے حالات میں مسلمانوں کے معاشی استحکام کے لئے ان ہی راہوں پر ان کی ترقی ضروری تھی، لیکن علی گڑھ نے مسلمانوں کی تمام توجہات کو سرکاری ملازمت پر مرکوز کر دیا گویا سکالرز کے دل کی آرزو بر آئی۔ انگریز یہ چاہتا تھا کہ مسلمان معاش کے آزاد ذرائع سے کٹ کر ان کی ملازمتوں کا محتاج ہو جائے اور علی گڑھ نے مسلمانوں میں یہی ذہن پیدا کیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ عام مسلمان کلرکی کے پیچھے اور ان کا ذہین ترین عنصر ڈپٹی کلکٹری کے پیچھے مارا مارا پھر رہا تھا اور اس سے اونچا کوئی مقام ان کے تصور میں نہ آتا تھا۔ تاریخ کی ستم ظریفی ہے کہ اس کا تجربہ خود سرسید مرحوم کو بھی ہوا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے صاحبزادے قوم کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیں، لیکن صاحبزادے کی نظریں سرکار کی ملازمت پر رہیں
اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ مسلمان ہندوستان میں انگریزوں کی معاشی گرفت سے اپنے آپ کو آزاد نہ کر سکے اور ملک میں بعد میں جو بھی معاشی ترقی ہوئی وہ بڑی حد تک ہندوؤں کے ہاتھوں ہوئی۔

(۷) ہم یہ بات بھی بڑے افسوس سے کہتے ہیں کہ علی گڑھ نے جو علمی معیار قائم کیا وہ بھی سطحی اور پست تھا۔ چند استثنائی ناموں کو چھوڑ کر یہاں فکر یہ رہی کہ زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو ڈگریاں دی جائیں۔ خواہ یہ کام کیسے ہی خلوص سے کیا گیا ہو اور خواہ اس کے پیچھے مسلمانوں کی ہمدردی کا کیسا ہی جذبہ کیوں نہ کارفرما ہو۔ اس کا نتیجہ علم کی موت تھا۔ شروع میں سرسید مرحوم کے ذہن میں ضرور تھا کہ علی گڑھ ایک علمی مرکز ہو۔ اور انہوں نے اپنے طور پر یہ کام انجام بھی دیا لیکن چونکہ دینی علوم پر خود ان کی نگاہ زیادہ گہری نہ تھی۔ اس لئے خود انہوں نے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائیں اور جس نئے علم الکلام کا انہوں نے آغاز کیا اس نے مغرب کی قدروں کو اسلام میں تلاش کرنے اور مغربی افکار کو اسلامی اصطلاحات میں بیان کرنے کی آسان راہ کھول دی۔ لیکن تحقیق اور کد و کاوش کی زیادہ ضرورت نہ رہی۔ بہرحال جو کچھ علمی معیار سرسید نے باقی رکھا تھا علی گڑھ کی نئی نسل اور نوجوان اس کی کم سے کم حدوں کو بھی نہ چھو سکی۔ ہم اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں کرتے کہ تقسیم ملک تک علی گڑھ کے اساتذہ اور طلبہ نے کوئی ایک بھی درجہ اول کی علمی اور تحقیقی کتاب پیش نہیں کی۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنی خود نوشت "آشفتہ بیانی میری" میں اس اعتراض کا جواب دینے کی کوشش کی ہے لیکن بڑی جستجو کے بعد علی گڑھ کے لوگوں کی تصنیفات و تالیفات کی جو فہرست وہ پیش کر سکے ہیں اس میں علی گڑھ کے ان نامور افراد کی کوئی ایسی کتاب نہیں ملتی جس کا علمی سکہ مانا جاتا ہو۔ ادب اور اسلوب بیان کے میدان میں تو علی گڑھ کا قابل قدر کارنامہ ضرور موجود ہے لیکن علم و تحقیق کا صفحہ سادہ ہے۔ اس کا نقصان صرف یہی نہیں ہوا کہ مسلمانوں میں تحقیق کی روایات باقی نہ رہ سکیں بلکہ علی گڑھ تحریک کے زیر اثر تعلیم پانے والوں پر اس کا عام اثر ان کی ذہنی سطح پست ہونے کی صورت میں رونما ہوا۔ صحافیانہ علم کو علم کی معراج سمجھا جانے لگا اور کتابی سطروں سے بڑھ کر علمی مباحثوں میں اظہار رائے کا چلن ہو گیا۔ مسلمانوں میں سہل انگاری پیدا ہوئی اور کامیابی کے لئے شارٹ کٹ نکالنا عام ہو گیا۔ پھر اس کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ ذات کی قدر و قیمت کا احساس کمزور سے کمزور تر ہونے لگا اور ثقافتی زندگی کا رنگ بھی بدل گیا اور بقول شیخ محمد اکرام

"اساتذہ کا وقت عزیز ڈرائنگ روم کی ترتیب، جوش معاشرتی، ضیافت پارٹی، کلب پارٹی، ٹگ پارٹی اور ان پارٹی پارٹی کی نذر ہونے لگا"

الغرض یہ سب کچھ اس تقلیدی رجحان کا فطری نتیجہ تھا جو علی گڑھ نے اختیار کیا تھا۔ اندھی تقلید جہاں ہو، تخلیقی صلاحیت کے سرچشموں کو خشک کر دیتی ہے اور فکر و نظر پر آکاس بیل کی طرح چھا جاتی ہے۔

(۸) علی گڑھ کی پوری تاریخ اور اس کے نامور فرزندوں کے مطالعے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ علی گڑھ ایثار و قربانی کی کوئی اونچی مثال قائم نہ کر سکا۔ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ علی گڑھ کے لوگوں میں علی گڑھ سے محبت پائی جاتی ہے اور دوسروں کے مقابلے میں علی گڑھ برادری کا خاصا گہرا احساس ان میں موجود ہے لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ میں اساتذہ اور طلبہ دونوں جانب سے علم کی بارگاہ میں خلوص و ایثار اور قربانی کی جو مثالیں پیش کی جاتی رہی ہیں اس کی نظیریں علی گڑھ میں بس خال خال ہی ملتی ہیں۔ اس کی وجہ اعلیٰ مقاصد سے تعلیم کو کاٹ دینا اور سب سے بڑھ کر تعلیم اور کردار سازی کے رشتہ کو منقطع کر دینا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک لمبا دور علی گڑھ پر ایسا ذہنی بزدلی کا گذرا ہے اور ملک کی قومی زندگی میں علی گڑھ کے لوگوں نے شرکت کرنے اور مسلمانوں کی قسمت اور سرنوشت کو سنوارنے سے احتراز کیا بلکہ ایسی افسوسناک مثالیں بھی ملتی ہیں کہ جب محسن الملک نے اردو تحریک کے سلسلہ میں حکومت کے

دہ کے خلاف ایک بڑے دور نظر آتی اور علی گڑھ کے لئے سرکاری امداد خطرے میں پڑتی نظر آتی تو سارا الزام محسن الملک پر ڈالا جانے لگا اور سید محمود صاحب نے سر انٹونی میکڈانلڈ کو ایک خط لکھا جس میں یہ تک لکھ ڈالا کہ

"کالج کے اصلی ہی خواہوں کے لیے یہ امر سخت رنج و افسوس کا باعث ہوگا کہ میرے والد سر سید مرحوم کی وفات کے بعد بہت جلد کالج کے معاملات کی نوبت جس کو پولیٹیکل ایجی ٹیشن سے محفوظ رکھنے کے واسطے انہوں نے ساری عمر کوشش کی تھی کیونکہ وہ خالص خیراتی اور تعلیمی انسٹی ٹیوشن تھا۔ ادنیٰ پارٹی پالیٹکس تک پہنچ گئی۔"

یہی وہ ذہن تھا کہ جس کی وجہ سے جب علی جوہر جیسے علی گڑھ کے سپوت کو خود ارباب علی گڑھ کے مد مقابل کھڑا ہونا پڑا۔ مولانا محمد علی ہی کے سلسلے کی ایک اور مثال میں علی گڑھ کی سرکار پرستی کی ذہنیت بالکل بے نقاب نظر آتی ہے۔ انگلستان سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد مولانا محمد علی نے اسے کو عام سا ہی پایا۔ ہر علی گڑھ میں مدرس کے لئے میں کہا لیکن چونکہ محمد علی کو حکومت ناپسند کرتی تھی اس لئے انہیں جگہ نہ دیا گیا جس کا اعتراف خود محسن الملک نے ان الفاظ میں کیا کہ "لیکن وہ جیسے انگلش اسٹاف اس درس گاہ کی تعلیم و تربیت کا جوہر سمجھتا تھا، محمد علی میں موجود نہ تھی اس لئے مارلیس صاحب کی سخت مخالفت سے درخواست مسترد ہوئی"

(موج کوثر صفحہ ۱۴۶-۱۴۷)

یہ ایک منفرد واقعہ نہیں، اس دور کے علی گڑھ کے ذہن کا عکاس ہے

(ح) کچھ مراسلات تو علی گڑھ کے تعلیمی مزاج کی نشاندہی اور کچھ اور کا اضافہ یورپین اسٹاف کی موجودگی نے کر دیا۔ سر سید مرحوم کا اصرار تھا کہ یورپین اسٹاف ضرور رکھا جائے اس پر دوسرے صاحب نظر ٹرسٹیوں نے اعتراض بھی کیا لیکن ان کی ایک نہ چلی اور اس جبر کا اثر یہ ہوا کہ علی گڑھ کی معاشرت پر سراسر مغربیت کا رنگ غالب آ گیا

(ط) ایک اور قابل ذکر چیز یہ ہے کہ چند استثنائی ادوار کو چھوڑ کر بحیثیت مجموعی علی گڑھ اسلام کے بین الاقوامی رنگ سے محروم رہا۔ ہندوستانی مسلمان شروع ہی سے اسلامی عالمگیریت کے علمبردار رہے ہیں اور یہ چنگاری علی گڑھ کے نوخیز طلبہ کے سینوں میں موجود رہی ہے لیکن جن لوگوں کے ہاتھوں میں علی گڑھ کی زمام کار تھی انہوں نے ترکی کے علاوہ اسلامی بین الاقوامیت کے کسی جذبے کو پروان نہ چڑھایا لیکن چونکہ یہ احساس ہر مسلمان کے رگ و پے میں موجود ہے اس لئے شعوری کوشش کے باوجود اس جذبہ کو ختم نہ کیا جا سکا۔

یہ ہیں وہ اہم پہلو جن کی بنا پر علی گڑھ کی تعلیمی تحریک اسلامی قومی اور ملی نقطہ نظر سے ایک کامیاب تحریک نہ رہی۔ اس کے نتائج بحیثیت مجموعی ناکام رہے اس نے جو خدمات انجام دیں ہم اس کے منکر نہیں، لیکن ایک بے لاگ مبصر کی حیثیت سے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ آج ہندو پاکستان کے مسلمانوں کو جو فکری، تہذیبی اور تعلیمی مشکلات اور الجھنیں درپیش ہیں اور اس وقت ہم جس ثقافتی بحران سے دوچار ہیں وہ بڑی حد تک علی گڑھ اور اس کے ذہن کی پیداوار ہے مسلمانوں میں تعلیم کا تناسب تو ضرور بڑھ گیا ہے لیکن جس مقصد کے لئے تعلیم دی جاتی ہے، وہ پامال ہو گیا ہے آج خواہش کے باوجود صحیح خطوط پر تعلیمی تشکیل جدید کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تعلیم کا ذہنی مزاج ہے جو علی گڑھ اور مغربی تعلیم کا پیدا کردہ ہے اور ہم نے علی گڑھ کی تحریک پر اتنی مفصل گفتگو اسی لئے ضروری سمجھی کہ تشکیل نو ان اصل خرابیوں کے احساس کے بغیر ممکن نہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ علی گڑھ بالکل ناکام رہا لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ جو نظام علی گڑھ نے جنم دیا اسلامی نقطہ نظر سے اور مسلمانوں کی تعلیمی اور ثقافتی روایات کے نقطہ نظر سے وہ نہ صرف غیر تسلی بخش بلکہ مضر اور نقصان دہ رہا ہے۔ شکر ہے کہ آخری زمانہ میں اس کا احساس خود ارباب علی گڑھ کو بھی ہو چلا تھا، جس کا اندازہ مندرجہ ذیل بیانات سے ہو سکتا ہے۔

مولانا محمد علی اپنے ایک خط میں نواب محسن الملک کو ان کی اور علی گڑھ کی روش پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"مگر جو راستہ آپ نے لیا ہے وہ آپ کو منزل مقصود تک ہرگز نہ پہنچائے گا"

عزم سفر کعبہ در رو در مشرق — اے راہرو دشت منزل بسیار

یہ کعبہ کی راہ نہیں ہے، یہ ترکستان کا راستہ ہے۔ یہ غلطی آپ کے دل کی نہیں آپ کے دماغ کی ہے"

محمد علی کی علی گڑھ سے مایوسی ہی تھی جس نے انہیں جامعہ ملیہ قائم کرنے کی ترغیب دی جس کے پہلے وائس چانسلر وہ خود تھے۔

نواب وقار الملک سر سید کی پالیسی سے سخت غیر مطمئن تھے، اس کا اندازہ خود اس خط سے کیجئے جو سر سید نے ان کے نام لکھا ہے اور جس میں وہ لکھتے ہیں "جن امور کو آپ تصور کرتے ہیں کہ قومی کالج کے لئے مبارک فال نہیں، ہم انہیں امور کو کالج کے لئے مبارک فال سمجھتے ہیں پس اس کا کوئی علاج نہیں ہے، اور عرض کرنا یہ ہے کہ جو خدا کو منظور ہے، ہوگا"

پھر جب ان کے اپنے صاحبزادے مسٹر محمد احمد علی گڑھ کی تعلیم کے بعد ولایت سے میم لائے اور گھر واپس آنے کی بجائے بنگلور جا کر مقیم ہوئے تو اس ذاتی تجربہ کے بعد انہیں اور بھی شدید صدمہ ہوا اور انہوں نے نئی تعلیم کے تلخ نتائج کو بچشم سر دیکھ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ علی گڑھ کے سربراہ ہونے کے باوجود انہوں نے اپنے دوسرے بیٹے کو ندوہ بھیجا

نواب وقار الملک جو علی گڑھ کے معماروں میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں اس سے اس قدر بددل ہو گئے کہ ۱۹۱۲ء میں انہوں نے جامعہ کی صدا کار اسکیم میں کی اور ایک نئی تعلیمی حکمت عملی کی ضرورت کا اظہار کیا

شبلی نعمانی کی علی گڑھ سے بے اطمینانی اور مایوسی ایک کھلی ہوئی چیز ہے ۱۸۹۳ء میں ایک خط میں انہوں نے لکھا۔

"معلوم ہوا کہ انگریزی خواں قوم نہایت مہمل فرقہ ہے۔ مذہب کو جانے دو، خیالات کی وسعت، سچی آزادی، بلند ہمتی، ترقی کا جوش نام کو نہیں۔ یہاں

میں چیزوں کا ذکر نہیں آتا اس حال کو شیطونوں کی ماتم گاہ ہے۔"
آخری عمر میں ۱۹۰۴ کے ایک خط میں لکھتے ہیں ۔
"علمی سطح بہت گر چکی اور انگریزی تعلیم جہل کے برابر رہ گئی ۔"
جو سرسید کے سب سے بڑے مداح تھے، ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔
حالی "چھبیس[٢٦] برس کے تجربہ سے ان کو اس قدر ضرور معلوم ہو گیا ہو گا کہ انگریزی زبان بھی ایسی تعلیم ہو سکتی ہے جو دیسی زبان کی تعلیم سے بھی زیادہ نکمی، فضول اور اصلی لیاقت پیدا کرنے سے قاصر ہو۔"
مولانا حالی کا تذکرہ کرتے ہوئے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں ۔
"جدید تعلیم کے بڑے حامی تھے اور اس کی اشاعت و تبلیغ میں مقدور بھر کوشش کرتے رہے لیکن آخر عمر میں ہمارے کالجوں کے طلبہ کو دیکھ کر انہیں کسی قدر مایوسی ہونے لگی تھی"
اور آخر میں خود علی گڑھ کے بانی سر سید کے ایک خط سے اقتباس پیش کرتے ہیں جو اس باب میں حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے ۱۸۹۰ کے ایک خط میں لکھتے ہیں
"تعجب یہ ہے کہ جو تعلیم پاتے جاتے ہیں اور جن سے قومی بھلائی کی امید تھی وہ خود مسلطان اور بدترین قوم ہوتے جاتے ہیں "

علی گڑھ ہماری قومی تاریخ کا ایک اہم باب ہے آج ہم اس پوزیشن میں ضرور ہیں کہ گذشتہ ۹۰ سال کے پس منظر میں رونما ہونے والے واقعات اور تحریکات کا بلا لاگ جائزہ لے کر ایک رائے قائم کریں جس میں جن مجبوریوں اور مسائل میں علی گڑھ تحریک کا آغاز ہوا اور حالات کے دباؤ نے اس کا جو مزاج بنایا اس سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بظاہر یہ روش کسی بھی سورت کھ کر اختیار کی گئی ہو لیکن جس کی نگاہ پچھلے سو سال کی تاریخ پر ہے دیکھتا ہے کہ ایک اڑی ہوئی روح کے شکستہ دل اور شکستہ سمت کمانڈر کی مجبوریاں اس کے پس پشت کارفرما تھیں نتائج پر ہمیں کتنا بھی افسوس ہو لیکن علی گڑھ کے بانی اور اس کے رفقاء کار کے اخلاص میں ہمیں کوئی شک نہیں اور ان کی مجبوریوں کا ہمیں پورا احساس ہے۔

ایک اور قابل غور پہلو ہے کہ خواہ علی گڑھ تحریک سے اتفاق کیا جائے یا اختلاف، مسلمانان ہند و پاکستان کی تاریخ کے جدید دور پر اس ادارہ کے جو اثرات پڑے ہیں وہ غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں، ان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے، کہ تعلیم کے ذریعہ فکر و نظر، سیرت و کردار اور اخلاق و معاشرت میں کیسی غیر معمولی، دور رس اور انقلابی تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔ اکبر نے سچ کہا تھا۔

دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

یہ علی گڑھ ہی کا اثر ہے کہ ہندوستانی مسلمان اسلامی قومیت اور مسلم قومیت کے لطیف فرق کو محسوس نہ کر سکے اور گذشتہ ۴۰ سالہ سیاست میں جو ژولیدہ فکری رہی ہے وہ نئی تعلیم ہی کے اثرات کی پیدا کردہ ہے نیز آج پوری زندگی کو اسلام کے رنگ میں رنگنے میں جو مشکلات حائل ہیں وہ بھی اسی ذہن کی پیداوار ہیں اور بہت سے ماہرین تعلیم اسلامی تصور تعلیم اور اسلامی نظام تعلیم کو سمجھ نہیں پا رہے ہیں اور محض چند سالوں کے لئے دینیات کی تعلیم کو اسلامی تعلیم کے مترادف سمجھ رہے ہیں، وہ بھی اسی مخصوص ذہن کی پیداوار ہے اگر ہمیں نظام تعلیم میں اسلامی بنیادوں پر ایک ہمہ گیر انقلاب لانا ہے تو ذہنوں سے علی گڑھ کے ماڈل کو ہٹانا ہو گا اور تعلیم کا ایک ایسا نظام تعمیر کرنا ہو گا جو اسلامی مقاصد، اسلامی اصول اور اسلامی مزاج کا آئینہ دار ہو۔

(ج) **ندوۃ العلماء (لکھنؤ)** جدید و قدیم کی کشمکش نے بہت سے ذہنوں کو یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ دور میں ان دونوں میں سے ہر ایک حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے ناکافی ہے اور وقت کی سب بڑی ضرورت جدید و قدیم کا امتزاج ہے ندوہ قدیم نظام تعلیم کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی ایک کوشش کا نام ہے۔

اپریل ۱۸۹۴ء میں مدرسہ فیض عام کانپور میں علماء کی ایک کانفرنس ہوئی جس میں تعلیمی مسائل کا جائزہ لے کر یہ طے کیا گیا کہ مسلمانوں کی سب بڑی تعلیمی ضرورت پرانے نظام تعلیم کی اصلاح ہے شروع میں تو یہ کوشش کی گئی کہ تمام اسلامی مدارس ایک نئے نصاب پر متفق ہو جائیں لیکن جب اس میں کامیابی کا امکان زیادہ نظر نہ آیا تو کم از کم ایک ایسا مرکز قائم کر دیا جائے تاکہ جہاں نئی اصلاحات کو روبہ کار لایا جا سکے۔ اسی مقصد کے لئے ۱۸۹۸ء میں لکھنؤ میں ندوۃ العلماء قائم ہوا ندوہ کے بانیوں میں شبلی نعمانی، مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی، مولانا ابو الخیر جو شاہ عبدالعزیز کے مدرسہ فکر سے تعلق رکھتے تھے مولانا عبدالحق دہلوی صاحب تفسیر حقانی وغیرہ ہم شامل تھے ندوہ جلد ہی ایک مرکز بن گیا اور اس کی مقاصد کی اشاعت کے لئے ایک ماہنامہ بھی "الندوہ" کے نام سے جاری کیا گیا ندوۃ العلماء کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

(۱) ندوہ کی اولین خصوصیت پرانے نظام تعلیم کی اصلاح ہے اور یہ اس کا سب سے اہم کارنامہ ہے۔ پرانے نصاب تعلیم میں جو علوم مقصود اصلی ہیں ان کی کتابیں بہت کم اور جو علوم بالواسطہ مقصود ہیں ان کی کتابیں کثرت سے پڑھی جاتی تھیں ندوہ نے اس کمی کو نئے نصاب میں دور کرنے کی کوشش کی اور وہ اس طرح کہ تفسیر، عقائد، اور شریعت کے اسرار و حکم کو نصاب میں ایک اہم جگہ دی۔ ادب اور فن بلاغت کے ساتھ زیادہ اعتنا کیا نیز یہ کہ فلسفۂ جدید اور انگریزی زبان کو شامل نصاب کیا صرف و نحو کے مقابلہ میں ادب و انشاء کو زیادہ اہمیت دی اور عربی بول چال کی طرف بھی توجہ دی۔ اس طرح ایک نیا نصاب وجود میں آیا جس میں قدیم کے عدم توازن کو دور کرنے کی کوشش کی گئی اور قدیم کے ساتھ ساتھ جدید کی گنجائش بھی پیدا کی گئی

ملے یہ سارے اقتباسات موج کوثر سے لئے گئے ہیں۔

(۲) پرانی روایات کو قائم رکھتے ہوئے ندوہ نے تعلیم کے ساتھ تربیت کا ضروری اہتمام کیا۔ طلبہ کے لئے اقامت گاہ بنائی گئی اور استاد اور طالب علم کے پرانے رشتے کو بحال کرنے کی کوشش کی گئی۔

(۳) علماء کے باہمی نزاع اور اختلافی مسائل میں، جن کی وجہ سے افتراق کی حد تک انتشار تھا، اختلافی مسائل میں توسع اور اعتدال کی راہ تلاش کرنے کی کوشش کی گئی۔ عام مسلمانوں کی اصلاح و فلاح اور ان کے معاملات سے دلچسپی بھی پیش نظر رہی۔

(۴) ایک اہم خصوصیت علوم دینیہ کے علاوہ عملی صنائع کی تعلیم بھی ہے گو اس پہلو سے عملاً زیادہ ترقی نہ ہو سکی لیکن تعلیم کا یہ وسیع تصور سامنے ضرور رہا۔

(۵) ندوہ عملاً بھی جدید اور قدیم تعلیم یافتہ لوگوں کے درمیان پل بنا۔ ایک طرف قدیم علماء کا اجتماع اس میں ہوا اور دوسری طرف شبلی کے ذریعے علی گڑھ اور جدید لوگوں سے فیض یاب ہوا۔

(۶) ندوہ کا ایک اور قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ وہ علمی و تعلیمی حیثیت سے عالم اسلام سے مربوط رہا۔ مصر کے علماء سے بلاواسطہ استفادہ کیا گیا۔ عرب علماء کو تدریس کے لئے بلایا گیا۔ ندوہ کے اہل قلم سارے عالم اسلام کے ادبی رسائل سے استفادہ بھی کرتے رہے اور ان میں لکھتے بھی رہے۔ آج تک ندوہ یہ رسم قائم کئے ہوئے ہے۔

(۷) ندوہ تعلیم کے ساتھ علم و تحقیق کی روایت کا بھی امین رہا۔ ندوہ کا ملت کو سب سے بڑا علمی عطیہ جناب سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی ہے جو اس دور کے چوٹی کے علماء میں سے تھے۔ اس کے علاوہ بھی ندوہ نے سینکڑوں اہل علم قوم کو دئے اور سچی بات یہ ہے کہ دارالمصنفین اعظم گڑھ نے جو عظیم خدمت علوم اسلامی، خصوصاً اسلامی تمدن و تاریخ کے میدانوں میں کی ہے وہ ندوۃ العلماء ہی کی وجہ سے ممکن ہوئی، اس لئے کہ ندوہ ہی کے نامور افراد نے اس ادارے کو سیراب کیا۔

(۸) گو ندوہ نے مختلف ذرائع سے مالی اعانت وصول کی اور اس بارے میں اس کا مسلک دیوبند سے مختلف رہا لیکن بحیثیت مجموعی ندوہ نے اپنی آزادی کو کسی قیمت پر قربان نہ کیا اور انگریزوں کے معاملے میں اس کا رویہ بڑی حد تک آزادانہ رہا، بلکہ ایک دور تو ایسا بھی گزرا جب وہ سرکار برطانیہ کے عتاب کا نشانہ بنا رہا۔ ایک زمانہ میں حکومت نے ۵۰۰ روپے ماہانہ کی گرانٹ بھی دی لیکن عدم تعاون کی تحریک کے زمانے میں ندوہ نے گرانٹ لینے سے انکار کر دیا۔ اس طرح ندوہ کا سیاسی رول بڑی حد تک آزادانہ اور ملی عزائم و توقعات سے ہم آہنگ تھا۔

ندوہ کی یہ خصوصیات اور اس کا یہ کارنامہ ہماری تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے اور یہ بات نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ تحریک اسلامی کو جو مردان کار ملے ان میں دیوبند کے مقابلے میں ندوہ کے تیار کردہ افراد زیادہ ہیں، لیکن بحیثیت مجموعی قومی زندگی کے دھارے کو موڑنے میں ندوہ کوئی موثر اور محسوس حصہ ادا نہ کر سکا اور غالباً اس کی وجوہ یہ ہیں:-

(الف) ندوہ قدیم و جدید کے امتزاج کی ایک کوشش ضرور ہے لیکن اس کی بہترین اور مناسب ترین کوشش نہیں، ہم اگر ندوہ کے ان ناقدین سے اتفاق نہ بھی کریں جو یہ کہتے ہیں کہ ندوہ کی مثال آدھا تیتر اور آدھا بٹیر کی ہو، نہ تیتر رہا، اور نہ بٹیر۔ ([illegible]) تاہم اس سے انکار مشکل ہے کہ جس نوعیت کی تخلیقی و انقلابی جدوجہد کی ضرورت تھی وہ ندوہ نہ کر سکا۔ ندوہ کی پوری تاریخ میں ایک ٹھہراؤ اور انقلابیت کی بجائے ایک سکونی کیفیت ہے۔

(ب) ندوہ نے نصاب کی حد تک نئے اور پرانے عناصر میں کچھ مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن زندگی کے رُخ کو موڑنے کے لئے پورے فکر اور تمدن و تہذیب کے پورے نظام کا جو نیا تصور ابھرنا چاہیئے تھا اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ جدید تعلیم کے پیچھے ایک پورا تہذیبی نظام موجود تھا۔ پرانی تعلیم کے پیچھے بھی زندگی کا ایک مخصوص تصور پایا جاتا تھا۔ لیکن قدیم و جدید کے امتزاج کی جو کوشش ہو رہی تھی اس کی فکری و فلسفیانہ بنیادیں موجود نہ تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تعلیم ایک خاص فکر و تہذیب کی نمائندہ اور ایک انقلابی تحریک کی ہراول ہونے کے بجائے اس پورے ماحول میں ایک اجنبی سی چیز تھی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تعلیم معاشرہ پر کوئی غیر معمولی ہمہ گیر اثر نہ ڈال سکی، اور تحریک اسلامی میں ندوہ کے تیار کردہ افراد کے لئے کشش کا راز بھی یہی ہے کہ اس تحریک نے فکر و نظر اور تہذیب و تمدن کا وہ انقلابی تصور دیا جو اس نوعیت کی تعلیم کے خلاء کو پُر کر رہی تھی۔

(ج) ندوہ کی تعلیم میں یہ بات پوری طرح ملحوظ نہ رہی کہ اس کے تیار کردہ افراد زندگی کے ایک شعبے میں نہیں بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں نفوذ کر سکیں۔ اس لئے ندوہ نے کچھ علماء و معلم تو ضرور دیئے لیکن ایسے افراد تیار نہ کئے جو زندگی کے ہر میدان میں اپنا مقام پیدا کریں۔

(د) ندوہ نے جدید تعلیم کا اضافہ تو ضرور کیا لیکن اس کا حصہ اتنا کم تھا کہ ندوہ کے طلبہ کی رسائی مغربی علوم کے اصل مآخذ تک نہ ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ نہ وہ مغرب سے پورا استفادہ کر سکے اور نہ مغرب کے صحیح تنقیح کا معاملہ کر سکے۔

ندوہ ایک سنگلاخ زمین پر ایک نئی کوشش کے مترادف ہے۔ قدیم و جدید کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں ندوہ نے روشنی کی ایک ہلکی سی شمع روشن کی، جو ان ہیبت ناک تاریکیوں کا سینہ تو نہ چیر سکی لیکن اس نے ان کے خلاف کچھ نشانات احتجاج کو ضرور وجود بخشا۔

---

(۵) جامعہ ملیہ

پرانی تعلیم کو نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش ندوہ ہے تو نئی تعلیم میں پرانی تعلیم کی کچھ خصوصیات کو زندہ کرنے کی سعی جامعہ ہے۔

تحریک عدم تعاون نے ہندوستان میں قومی تعلیم کی تحریک کو جنم دیا۔ شروع میں قومی تعلیم کی کوششیں بڑی حد تک ہندوؤں کے زیر قیادت ہوئیں اور جن مسلمان طلبہ نے انگریزوں کے تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ کیا وہ بھی ان ہی نئے قومی تعلیمی اداروں میں داخل ہو گئے، لیکن چونکہ مسلمان ذہن ایک غیر اسلامی نظام تعلیم سے کبھی بھی اپنے کو ہم آہنگ نہ کر سکا اس لئے شدت سے یہ احساس پیدا ہوا کہ قومی تعلیم کے معاملے میں مسلمانوں کی ملی تعلیم کا انتظام ہو۔ فطری طور پر نگاہیں علی گڑھ کی طرف اٹھیں اور یہ مطالبہ کیا گیا کہ سرکاری گرانٹ کو مسترد کر کے اسے ملی بنیادوں پر از سر نو منظم کیا جائے۔ یہ گویا علی گڑھ کے لئے ناقابل ہضم تھی پر جوش طلبہ جب ارباب علی گڑھ سے مایوس ہو گئے تو انہوں نے علی گڑھ

کو چھوڑ کر علی گڑھ ہی میں ایک نیا تعلیمی ادارہ قائم کیا۔ یہ تھی جامعہ ملیہ اسلامیہ جو ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی کی سرکردگی میں قائم ہوئی اور جس کا سنگ بنیاد شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے رکھا۔ ابتدائی زمانہ میں جامعہ اور علی گڑھ کی کشمکش جاری رہی لیکن ۱۹۲۵ء میں جامعہ کے دہلی منتقل ہو جانے سے یہ کشمکش سرد پڑ گئی اور دونوں ادارے اپنا مخصوص کردار ادا کرنے لگے۔

جامعہ کی خصوصیات یہ ہیں

(۱) جامعہ نے سیکولر تعلیم کو بنیادی طور پر غلط قرار دیا۔ اسی طرح سیکولر تعلیم میں محض دینیات کے اضافہ کو بھی ناکافی کہا۔ اس کے بانیوں نے یہ تصور دیا کہ تعلیم کو علوم جدیدہ اور دین کا جامع ہونا چاہیے اور طالب علم کو بیک وقت دونوں میں مہارت حاصل ہونی چاہیے۔ اس کے لئے دین کی معمولی تعلیم کا تقریباً ہر مرحلہ پر انتظام کیا گیا۔ قرآن پاک اور سیرت نبویؐ کے مطالعہ کو جزو نصاب بنایا۔ عربی کی تعلیم کو لازمی قرار دیا گیا اور علوم اسلامی میں اختصاصی تعلیم کی گنجائش پیدا کی گئی۔

(۲) انگریزی کے بجائے جامعہ نے اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا۔ یہ صحیح ہے کہ اس بات میں اولیت کا شرف جامعہ عثمانیہ کو حاصل ہے جس نے ۱۹۱۸ء میں اردو کو یہ حیثیت دے دی تھی لیکن جامعہ کا کارنامہ بھی کچھ کم اہم نہیں۔ خصوصیت سے اس لئے کہ جامعہ عثمانیہ کا ادارہ بڑی حد تک حیدرآباد دکن تک ہی محدود رہا جب کہ جامعہ کی حیثیت ملک گیر تھی۔ یہ اقدام ایک انقلابی اقدام تھا اور اگر اس روش کو مسلمانوں کے تمام تعلیمی ادارے اختیار کر لیتے تو آج ہماری کیفیت بڑی مختلف ہوتی۔

(۳) جامعہ کی ایک اور خصوصیت صنعت و حرفت کی تعلیم ہے۔ جامعہ مسلمانوں کا جدید تعلیم کا وہ واحد ادارہ ہے جس نے تعلیم کا رشتہ ملازمت سے کاٹ کر معیشت کے گوناگوں تقاضوں سے جوڑا اور حرفی تعلیم کے ذریعے معاش کے آزاد ذرائع کا بندوبست کیا۔ اس طرح وقت کے ایک اہم تقاضے کو بھی پورا کیا گیا اور مسلمانوں کے پرانے اور ہمہ گیر و وسیع تصور تعلیم کو از سر نو زندہ بھی کیا گیا۔ پھر اس کا سیاسی اثر یہ ہوا کہ اس کے تعلیم یافتہ افراد انگریزوں کی حکومت کے دست نگر نہ رہے اور ان میں آزادی پسندی کا جذبہ پروان چڑھا۔

(۴) جامعہ نے تعلیمی ماحول میں بڑی سادگی قائم کی۔ اساتذہ اور طلبہ سب کی زندگی قناعت کا نمونہ تھی۔ مصارف تعلیم بہت ہی کم رکھے گئے اور معیار زندگی کو سادہ اور عوام کی زندگیوں سے قریب تر رکھا گیا۔ یہ تعلیمی ماحول میں اسلامی روایات کے قیام کی کوشش بھی کی گئی۔

(۵) جامعہ نے ایثار و قربانی کا بھی اعلیٰ نمونہ قائم کیا۔ خصوصاً جامعہ کے اساتذہ نے اسی اسپرٹ کا مظاہرہ کیا جو مسلمان معلمین تاریخ میں ہمیشہ کرتے رہے ہیں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ صلاحیت کے اساتذہ نے نہایت معمولی مشاہروں پر خدمات انجام دیں اور اعلیٰ مقاصد کے لئے قربانی کی عمدہ مثالیں قائم کیں۔

(۶) جامعہ میں طلبہ اور اساتذہ کے تعلقات گھریلو تھے اور جامعہ نے کردار سازی کو بھی ایک اہم مقصد کی حیثیت سے اپنے سامنے رکھا۔

(۷) جامعہ کی علمی روایات زیادہ صحت مند اور امید افزا ہیں۔ جامعہ کے اساتذہ نے اپنی علمی زندگی کو برقرار رکھا اور تحقیق و تصنیف کے میدانوں میں برابر داد دیتے رہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب، مولانا اسلم جیراجپوری وغیرہم کی تصانیف علمی دنیا میں اپنا مقام رکھتی ہیں۔

(۸) جامعہ مختلف حیثیتوں سے ایک بڑا کامیاب تجربہ رہا لیکن یہ بھی قومی زندگی پر اپنے ہمہ گیر اثرات نہ ڈال سکی اور اس کی وجہ حکومت کی طرف سے مکمل عدم تعاون، اور وہ مشکلات ہیں جو ہر نئی راہ نکالنے والوں کو ایک مدت تک پیش آتی ہیں۔ جس حیثیت سے جامعہ کا کردار ذہنی پریشانی کا باعث ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جامعہ نے ایک وقت اسلامی اخوت اور متحدہ قومیت کا راگ الاپا اور ان میں جو بنیادی تضاد ہے اسے آخر تک بھی نہ محسوس کیا۔ جامعہ کانگریس کے ساتھ اس درجہ منسوب ہو گئی تھی کہ مسلمان اپنی آزاد قومیت کے احساس اور اس کو منوانے کی جدوجہد کے دوران اس ادارہ کو اپنا نہیں سکے اور نہ اس کا پیغام ان کی رگ و پے میں اتر سکا۔ ہماری نگاہ میں یہ جامعہ کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو نہ راستے کی مشکلات اس کے قدم روکتیں اور نہ حکومت کی مخالفت اس کے لئے سنگ راہ ثابت ہوتی۔ فکر و نظر کا یہ تناقض اس کی پیش قدمی میں حائل ہوا اور یہ تجربہ اپنے صحیح رنگ میں نہ ہو سکا۔ یہ بھی جامعہ کی بدقسمتی ہے کہ اسلامیات کا شعبہ بڑی مدت تک ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں رہا جس کے علم و فضل کے بارے میں تو ہم کچھ نہیں کہنا چاہتے لیکن جس کے عقائد و تصورات امت کے تصورات سے مختلف تھے اور انکار حدیث کی بنا پر مسلمان قوم ان کے خیالات سے ابا کرتی تھی۔

حرف آخر

گزشتہ صفحات میں ہم ہند و پاکستان میں مسلمانوں کے تعلیمی نظام، جدید تعلیم کا آغاز اور اس کا تاریخی ارتقاء، اور مسلمانوں کی تعلیمی تحریکات کا جائزہ لے چکے ہیں۔ اب ہم بحیثیت مجموعی، انگریزوں کی آمد سے لے کر تقسیم ملک تک کے بارے میں چند باتیں پیش کریں گے۔

(۱) ہماری بے لاگ رائے یہ ہے کہ انگریزوں کو اس ملک کی تعلیم سے کوئی حقیقی دلچسپی نہ تھی۔ انہوں نے یہاں کے صحت مند اور ترقی پذیر نظام تعلیم کو ختم کیا اور نیا نظام قائم کیا جس میں نہ ملک کی ضروریات کا خیال رکھا گیا اور نہ ہی اعلیٰ تعلیمی مقاصد کے تحت اسے پروان چڑھایا گیا۔ لارڈ ہیسٹنگز اور ڈنکن (Duncan) یہی کہتے رہے کہ تعلیم کو متحارب سیاسی گروہوں کے درمیان ربط و مصالحت کا رول ادا کرنا چاہیے۔ ۱۸۱۳ء کے چارٹر میں مشرقی ادب کے احیاء اور مقامی اہل علم کی حوصلہ افزائی کا ذکر کیا گیا۔ لیکن ۱۸۵۴ء کی یادداشت میں اس تصور کو بھی مٹا دیا گیا اور صاف صاف یہ بات ملحوظ رکھی گئی کہ صرف مغربی فنون اور مغربی سائنس اور مغربی فلسفہ و ادب کی ترویج کی جائے۔ حد یہ ہے کہ ۱۸۸۲ء کے تعلیمی کمیشن نے مقاصد تعلیم کی نوعیت کی کسی چیز کا ذکر تک نہیں کیا اور بیسویں صدی کے آغاز میں لارڈ کرزن یہی چلاتے رہے کہ تعلیم کو دراصل ہندوستانی ذہن کی فطری خامیوں کو درست کرنے کا کام سرانجام دینا چاہیے۔ گویا کسی دور میں بھی اور کسی سطح پر بھی ہندوستان کے مسائل پر غور نہ کیا گیا، نہ یہاں کی تعلیمی ضروریات کا جائزہ لیا گیا اور نہ ہی مغربی تصورات تعلیم کی روشنی ہی میں مقاصد تعلیم پر کوئی توجہ صرف کی گئی۔ اس کے تقاضے میں جو کچھ کیا گیا وہ یہ ہے کہ تعلیم کو فلسفہ حیات، مقاصد تعلیم، اخلاقی اقدار اور حقائق زندگی سے کاٹ کر محض تمدنی خوشہ چینیوں اور ادنیٰ ملازمتوں کی

کرنل محمد خان

یہ نہ تھی ہماری قسمت....

یہ کالج کے دنوں کا واقعہ ہے ایک دن ہماری کلاس یعنی ایم اے فائنل کے لڑکوں میں خبر مشہور ہو گئی کہ ہمارے ایک منحنی سے ہم جماعت مولوی عبدالرحمٰن کو ایک ایف اے کی طالبہ کی ٹیوشن مل گئی ہے خبر یا ٹیوشن کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ لڑکی کی وجہ سے تھا کیونکہ افواہ کی رو سے لڑکی حسین ہی نہ تھی بلکہ بچپن پانچ سال اپنے بیرسٹر باپ کے ساتھ ولایت رہ کر آئی تھی جس کی کوئی ایسی ادا نہ تھی جو لے ماد نہ ہو انگریزی فر فر بولتی تھی اور کلاس میں اپنے پروفیسروں کے کان بھی کترتی تھی صرف اردو میں کمزور تھی یہ کمزوری بھی اس لئے تھی اور انگریزی کے زور سے کسی قدر چھپالی تھی اور باقی مادہ کمی کو پورا کرنے کے لئے ٹیوشن کا اہتمام کیا گیا تھا۔

لڑکی کے کوائف سن کر مولوی عبدالرحمان کے ہم جماعت یعنی ہم لوگ رشک و حسد سے چور ہونے لگے کئی ایک نے مولوی صاحب کی داڑھی کے متعلق نازیبا باتیں بھی کہیں اور میاں میں ان جانوروں کا ذکر لے آئے جن کی ٹھوڑی کے نیچے بال ہوتے ہیں لیکن اس تمام غیبت کے باوجود مولوی عبدالرحمٰن کی داڑھی کا ایک بال بھی بیکا نہ ہوا کیونکہ سر دار کی لتاڑ سے آپ کے جو بال بیکا ہونے تھے ہو چکے تھے اور جو باقی رہ گئے تھے لطاہر پکے تھے چنانچہ اکثر حاسدوں نے مولوی عبدالرحمٰن پر داڑھی سمیت زوال سائی ہم نے حال پر تو قابو رکھا لیکن اندر جانے ہم بھی دراصل حاسد تھے ہمیں قسمت سے اصل شکایت تو یہ تھی کہ اس ٹیوشن کے لئے ہم کیوں نہیں چنے گئے یعنی ہم کہ سرخ و سپید بانکے نکرے چھوٹے جوان رعنا تھے اور بیرسٹر صاحب کے گھر میں یوں لگے جیسے رابرٹ ٹیلر کرلیو ڑ رکھ لیا ہو لیکن قرعہ پڑا تو وہ بھی مولوی عبدالرحمٰن کے نام جو ایسی موٹی چادر کی عینک میں یوں نظر آتے تھے جیسے شیشوں کے پیچھے سے اژدہا جھانک رہا ہو ہمیں اس لڑکی کے لیے ٹیوٹر چننے والوں پر سخت غصہ آیا۔ مولوی عبدالرحمٰن کو کسی لڑکے کا ٹیوٹر چن لیا جاتا، تو ہمیں قطعاً کوئی شکایت نہ ہوتی، لیکن ایک لڑکی کے لئے ان کا انتخاب قسمت کی سخت غلطی تھی، لیکن مصیبت یہ ہے کہ قسمت قدرت کی غلطیاں تسلیم نہیں کرتی۔ ہاں ہم کبھی کبھی ان سے کے سر دیکھ لیتی ہے اور یہ سے بھی مولوی صاحب ہمیں کوئی دوسو سر پیچھے چھوڑ گئے تھے بہر حال بہر کم سہی، ہمارے دل کے ارمان اتنے کم نہ تھے اگر ہمارے سروں کے ساتھ ہماری حسرتوں کا شمار بھی کم کیا جاتا، تو انگریزی میں ہم ڈگری اولیٰ پوزیشن حاصل کرتے اور یہ ٹیوشن بھی، کیونکہ ہمارا ایک ارمان ایسی ہی پیاری سی ٹیوشن کا بھی تھا لیکن دل کے ارمانوں کا قدردان نہیں کو نہ ملا، فرہاد کو نہ ملا، رانجھے کو نہ ملا، ہمیں کیونکر ملتا؟ چنانچہ بامر مجبوری ہم رشک اور حسد کو بھی پی گئے اور ایک دن سامنے سے آتے ہوئے مولوی عبدالرحمٰن ملے، تو انہیں مبارک باد پیش کر دی۔

مولوی صاحب نے حسد کے طوفان میں مبارک باد کی آواز سنی، تو ہمیں بیچے سے لگا سا بولے۔

" ساری کلاس میں ایک تم شریف لڑکے ہو ؛ میں نے جلدی بیچے ملکہ داڑھی سے الگ ہو کر کہا۔

" اور آپ شریف بھی ہیں اور قابل بھی یہ ٹیوشن آپ ہی کا حق تھا "

مولوی عبدالرحمٰن نے اپنی زندگی میں یوں تحسین کے پھول برستے نہ دیکھے تھے چنانچہ ایک دفعہ پھر مجھے سینے سے لگانے کی ناکام کوشش کی۔ اُدھر میں کچھ لڑکی کے متعلق جاننا چاہتا تھا سیدھے پوچھا۔

" مولوی صاحب۔ لڑکی کیسی ہے ؟"

" بڑے دولت مند باپ کی بیٹی ہے اس کا ایک بنگلہ ہے۔ دو کاریں ہیں تین نوکر "

مجھے باپ کے اعداد و شمار میں دلچسپی نہ تھی اس لیے بات کاٹتے ہوئے بولا

مولانا باپ نہیں، لڑکی کیسی ہے ؟

اور لفظ لڑکی پر زور دے کر اسے خوب اجاگر کیا مولانا کسی قدر حیرانی سے بولے۔

" تمہارا مطلب کیا ہے ؟"

مطلب یہ کہ لڑکی خوبصورت ہے۔

یوں دن دہاڑے لڑکی کی خوبصورتی کے متعلق سوال سن کر مولانا کے کان سرخ ہو گئے۔ بولے۔

" بھئی مجھے معلوم نہیں میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا "

" دیکھا نہیں ؛ پڑھاتے وقت آپ اپنی شاگردہ کے رو برو بیٹھتے ہیں یا پشت پھیر کر ؟"

نہیں، یہ بات نہیں بیٹھتا تو سامنے ہی ہوں مگر میں نے کبھی آنکھ نہیں اٹھائی "

" کیوں نہیں اٹھائی ؟"

بڑی بات ہے "

لیکن آنکھ جھکا کر اس کے پاؤں تو دیکھتے رہتے ہوں گے یہ کیسی بات ہے "؟

" پاؤں میں تو وہ چپل پہنتی ہے "۔

یہ کہہ کر مولوی صاحب ہماری سادگی پر مسکرانے میں لگے۔

مولوی صاحب ! آپ بے شک نیک آدمی ہیں "۔

" آپ بھی تو ہیں

" چار لفظوں کا جملہ مولوی صاحب نے اسی انداز سے ادا کیا جیسے میک

کے ڈی سی کے اشتہار میں ایک سچ کتابت "بیلا عمل توبہ" اور رخصت ہونے سے پہلے آپ نے بالکل بچگانہ طور پر تیسری بار ناکام کوشش کی جی ہاں ہمیں بیٹے، یعنی داڑھی سے لگانے کی۔

لیکن اب مولوی صاحب کی اور ہماری دوستی پکی ہو گئی تھی ہر صبح مولوی صاحب سے گرسنہ شام کے سبق کی بابت مشرح اور غیر دلچسپ روداد سنتے لڑکی نے جاری کی قسمت پر آنسو بہائے، لیکن جی کڑا کر کے مولوی صاحب کو داد دیتے اور مولوی صاحب ہمیں دعا دے کر رخصت ہو جاتے۔

ایک روز مولوی صاحب خلاف معمول ذرا پریشان حال نظر آئے۔ وجہ پوچھی تو بولے۔

"گاؤں سے اطلاع آئی ہے کہ ماں بیمار ہے ساں کی عبادت بھی لازم ہے اور ٹیوشن میں ناغہ ہوا، تو بیرسٹر صاحب ناراض ہو جائیں گے" میں نے کہا۔

"ناراض کیوں ہوں گے؟ آخر مجبوری ہے۔ آپ بیرسٹر صاحب سے بات کر لیں"

"کل ہی کہتے تھے سالانہ امتحان میں صرف دس دن باقی ہیں اور رضیہ اردو میں بدستور کمزور ہے"

تو کیا ان کا خیال ہے کہ رضیہ کی اردو کی کمزوری رفع نہ ہوئی، تو دشمن ملک پر حملہ کر دے گا؟"

مولوی صاحب ہمارا سوال ٹال گئے۔ غالباً سمجھ ہی نہ سکے اور بولے۔

"بیرسٹر صاحب کہتے ہیں کہ اگر جانا لازم ہے، تو اپنی جگہ کوئی موزوں آدمی دے کر جاؤ اب میں موزوں آدمی کہاں سے لاؤں؟"

معاً ہمیں خیال آیا کہ ہم آدمی بھی ہیں ـــ اور موزوں بھی کہ اور خوبیوں کے علاوہ ہماری اردو بھی خاصی رواں ہے، لیکن یہ ہمارا خیال تھا سوال یہ تھا کہ کیا یہی خیال مولوی عبدالرحمٰن اور بیرسٹر صاحب کو بھی آ سکتا تھا؟ ملا عوض اسی حماقت پیش کرنا، تو شان کے خلاف تھا چنانچہ بڑے داس کا ایک بار مقام کر ہم نے کہا

"ہاں ـــ موزوں آدمی ملنا واقعی مشکل ہے۔ البتہ ناممکن نہیں"۔

مولانا بولے بس ایک ہی صورت ہے

"مثلاً ـــــــــ؟"

"مثلاً یہ کہ اگر آپ برا نہ سمجھیں، تو آپ دو روز میری جگہ پڑھا آئیں"

یہ تو وہی بات ہوئی کہ دعا منہ سے نکلی نہیں اور اجابت نے دروازہ آ کھٹکھٹایا، لیکن ہماری مسرت سے کہیں زیادہ ہماری حیرت تھی ہمارے منہ سے کسی قدر اضطراری نکلا

"میں یعنی میں خود پڑھا آؤں؟"

"جی ہاں ـــ آپ خود"

"مولانا آپ کی ذرہ نوازی ہے اور انکار کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن یہ تو بتائیں کہ کیا بیرسٹر صاحب بھی اتنے ہی ذرہ نواز ہیں؟"

"میں نے بیرسٹر صاحب سے آپ کا ذکر کیا تھا وہ آپ کو دیکھنا چاہتے ہیں آج شام میرے ساتھ چلیے گا"۔

یہ وہی کہانیوں والی بات ہوئی ـــ کہ شہزادی سامنے محل میں منتظر کر رہی ہے لیکن اس تک پہنچنے کے لیے شہزادے کو فقط ایک اژدہا اور دو تین بلائیں ہلاک کرنے کی ضرورت ہے بلکہ ان دونوں مہموں کی نسبت، ایک بیرسٹر کو راضی کرنا زیادہ دشوار تھا پھر مولوی عبدالرحمٰن رخصت ہونے لگے، تو یک لخت بولے۔

"ہاں ایک بات، اگر آپ برا نہ مانیں؟" "ارشاد"

"کیا ہی اچھا ہو اگر آپ سوٹ کی جگہ اچکن پہن کر آئیں"

"لیکن میرے پاس اچکن تو ہے نہیں"

"کہیں سے مانگ نہیں سکتے؟"

"مولانا مانگ تو سکتا ہوں پھر آپ کہیں گے کہ ایک داڑھی بھی لا ٹکاؤ"

"داڑھی نہیں، ٹوپی

قبلہ میں بیرسٹر صاحب کے گھر لڑکی کو پڑھانے جاؤں گا کہ جمعہ پڑھنے"۔

"بات یہ ہے کہ اچکن اور ٹوپی میں آدمی ذرا شریف دکھائی دیتا ہے"

اب مولوی عبدالرحمٰن سے کیا بحث کرتے ہم نے بڑے بڑے انگریزوں کو اچکن اور ٹوپی پہنے دیکھا تھا ـــ بہرحال انہیں یقین دلایا کہ ان کی خاطر ـــ جو دراصل اپنی ہی خاطر تھی ـــ اچکن اور ٹوپی کا انتظام کر لیں گے اور آخر ایک مانگے تانگے کی اچھی ڈھیلی سی اچکن اور تنگ سی ٹوپی پیدا کر لی۔

شام بیرسٹر صاحب کے دولت کدہ پر پہنچے مولوی صاحب کی نگاہیں دولت کدے سے سو گز ادھر ہی جھک گئیں اور انہی کے پیرا ٹھنے کا نام نہ لیا مولوی صاحب نے ہمیں بھی تلقین کی کہ نظریں اٹھانے سے پرہیز کریں، لیکن ہم سے کوشش کے باوجود یہ سرکشی جاری رہی بیرسٹر صاحب کے روبرو ہوئے، تو مولوی صاحب نے ہمارا تعارف کرایا جواب میں بیرسٹر صاحب نے بظاہر تو ہماری مزاج پرسی کی، لیکن حقیقت میں ہمارا معائنہ کرنے لگے جو کسی معائنے سے بہت کچھ ملتا جلتا تھا یعنی ہمیں تو سب الٹ پلٹ کر دیکھا لیکن خود بہت اکھڑے بیٹھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہر زاویے سے ہماری ٹوٹی لگا کر ہمارے دل کی صحیح کیفیت سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں آخر غالباً ہماری اچکن ٹوپی سے متاثر ہو کر فرمایا۔

لڑکا شریف سی لگتا ہے"

پھر مولوی صاحب کو چھٹی دے دی اور ہمیں رضیہ تک پہنچا آئے،

رضیہ ہماری توقع سے زیادہ حسین تھی پہلی نگاہ میں ہی محسوس ہوا کہ ہمارا دل ـــ ہمارے ہاتھ سے نکل کر اس کے پاس چلا گیا ہے یہی وجہ تھی کہ پہلا سوال بھی ادھر ہی سے آیا۔

"تو آپ ہیں ہمارے نئے نویلے ٹیوٹر؟"

اب اس طرح سوال کا صحیح جواب تو یہ تھا کہ "تو آپ ہیں ہماری نئی نویلی شاگرد؟" لیکن یہی بات ہے حسن کی سرکار میں ایک لمحے کے لیے ہماری شوخی نے سر جھکا دیا اور ہمارے منہ سے ایک بے حال سا جواب نکلا۔

"جی ہاں، بیا تو ہوں، ٹیوٹر نہیں ہوں مولوی صاحب کی جگہ آیا ہوں"

"اس سے آپ کی ٹیوٹری میں کیا فرق پڑتا ہے؟"

"یہی کہ عارضی ہوں"

"تو عارضی ٹیوٹر صاحب ہمیں ذرا اس مصیبت سے نجات دلا دیں۔ رضیہ نے اشارہ دیوان غالب کی طرف تھا میں نے متعجب ہو کر پوچھا۔

"آپ دیوان غالب کو مصیبت کہتی ہیں؟"

"جی ہاں ـ اور خود غالب کو بھی"

"میں پوچھ سکتا ہوں، غالب پر یہ عتاب کیوں؟"

"آپ ذرا آسان اردو بولیے، عتاب کسے کہتے ہیں"

"عتاب غصے کو کہتے ہیں"

"غصہ، ہاں غصہ اس لیے کہ غالب صاحب کا لکھا تو شاید وہ خود بھی نہیں سمجھ

"پھر جناب نے پورا دیوان کیوں لکھ مارا؟"

"اس لیے کہ لوگ پڑھ کر لذت اور سرور حاصل کریں۔"

"نہیں جناب اس لیے کہ ہر سال سینکڑوں لڑکیاں اور میں فیل ہوں۔"

"میری دلچسپی فقط ایک لڑکی میں ہے۔ فرمائیں آپ کا سبق کس غزل پر ہے؟"

جواب میں رضیہ نے ایک غزل کے پہلے مصرع پر انگلی رکھ دی لیکن منہ سے کچھ نہ بولی۔ میں نے دیکھا، تو غالب کی مشہور غزل تھی ؎

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا

میں نے کہا، "یہ تو بڑی لاجواب غزل ہے، ذرا پڑھیے تو۔"

رضیہ بولی "میرا خیال ہے آپ ہی پڑھیں۔ میرے پڑھنے سے اس کی لطافت پر اثر پڑے گا۔"

مجھے محسوس ہوا کہ ولایت کی پڑھی ہوئی رضیہ باتونی بھی ہے اور ذہین بھی، لیکن پڑھنے میں غالباً عاری ہے۔ کہا،

"میرے پڑھنے سے آپ کا بھلا نہ ہوگا۔ آپ ہی پڑھیں کہ تلفظ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔"

رضیہ نے پڑھنا شروع کیا اور بیچ بیچ میں جیسے بیل گاڑی کا پہیہ پھنس جاتا ہے۔

"یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصل"

میں نے ٹوک کر کہا۔

"یہ وصل نہیں، وصال ہے۔ وصل کے معنی بھی یہی ہوتے ہیں۔"

رضیہ نے ہمیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ہم مسکرائے اور ہمارا جواب سنے بغیر رضیہ بولی۔

"اچھا وصال ہی، وصال کے معنی کیا ہوتے ہیں؟"

وصال کے معنی ہوتے ہیں ملاقات، محبوب سے ملاقات۔ آپ پھر مصرع پڑھیں۔

"یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا۔"

"یہ وصال یار نہیں، وصالِ یار ہے، اضافت ہے۔"

"اضافت کیا ہوتی ہے، کہاں ہوتی ہے؟"

"یہ جو چھوٹی سی زیر نظر آ رہی ہے نا آپ کو اسی کو اضافت کہتے ہیں۔"

"یہ سیدھا سادا 'وصال یار' کیوں نہیں لکھ دیتے؟"

"اس لیے کہ وہ علما کے نزدیک غلط ہے" ہم نے کسی قدر رعب سے کہا۔

"علما کا وصال سے کیا تعلق ہے؟"

"علما کا تعلق وصال سے نہیں، زبان سے ہے۔"

"اچھا جانے دیں علما کو، شعر کا مطلب کیا ہوا؟"

"شاعر کہتا ہے کہ یہ میری قسمت میں ہی نہ تھا کہ یار سے وصال ہوتا۔"

"قسمت کو تو یونہی درمیان میں گھسیٹ لایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بے چارے کا وصال نہ ہو سکا۔"

"جی ہاں، کچھ ایسی ہی بات ہے۔"

"کیا وجہ؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"کیوں نہیں کہہ سکتے، آپ ٹیوٹر ہیں۔"

"شاعر خود خاموش ہے۔"

"تو شاعر نے وجہ نہیں بتائی، مگر یہ خوشخبری سنا دی ہے کہ وصال میں فیل ہو گئے۔"

"جی ہاں، فی الحال تو یہی ہے، آگے پڑھیں۔"

رضیہ نے اگلا مصرع پڑھا اور ٹھیک پڑھا۔

"اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا۔"

"شاباش! آپ نے ٹھیک پڑھا ہے۔"

"اس شاباش کو تو میں بعد میں فریم کرواؤں گی، اس وقت ذرا شعر کے پورے معنی بتا دیں" ہم نے رضیہ کا طنز برداشت کرتے ہوئے کہا۔

"مطلب صاف ہے۔ غالب کہتا ہے قسمت میں وصال لکھا ہی نہ تھا، چنانچہ اب مرنے کو تیار ہوں، لیکن اگر جیتا بھی رہتا، تو وصال کے انتظار میں ہی عمر کٹ جاتی۔"

"توبہ اللہ!"

"غالب اتنے ہی گئے گزرے تھے؟"

"گئے گزرے نہیں تو، غالب ایک عظیم شاعر تھے۔"

"شاعر تو جیسے تھے سو تھے، لیکن محبت کے معاملے میں گھسیارے ہی تھے!"

"لاحول ولا قوۃ، آپ غالب کو گھسیارہ کہتی ہیں۔ وہ نجم الدولہ تھے۔"

"شاہ دولہ ہوں گے (چھوٹے سر اور چھوٹے قد کے فاتر العقل لوگ جنہیں ایک بزرگ کی نسبت سے شاہ دولہ یا شاہ دولہ کے چوہے کہتے ہیں) بیچارے وصال کو ترستے رہے!"

"محترمہ شاعری میں فرضی باتیں ہوتی ہیں۔ غالب نے شعر لکھا ہے، عدالت میں حلفیہ بیان نہیں دیا۔"

"وکیل صفائی صاحب، آپ ہر طرح سے بھی دلچسپ نظر آتے ہیں۔ یہ فرمائیں کہ آپ کے غالب صاحب کی شادی بھی ہوئی یا نہ؟"

"ہوئی تھی۔"

"کسی بوڑھی کھوسٹ سے ہوئی ہوگی!"

"نواب زادی تھی اور بوڑھی بھی نہیں تھی، لیکن یہ خود بوڑھے ہی تھے۔"

"میں نہ کہتی تھی کہ کچھ ضرور تھی۔"

"لیکن محترمہ آپ کا پرچہ غالب کی شادی پر نہیں، غالب کی شاعری پر ہوگا۔"

"شاعر کو شاعری سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔"

"لیکن اگر آپ نے امتحان سے پہلے دیوان ختم کرنا ہے تو جلدی کرنا پڑے گا۔"

"مجھے امتحان کی فکر نہیں۔ پہلے غالب کا فیصلہ ہونا چاہیے۔"

"بہت اچھا، تو فرمائیں، غالب نے کیا قصور کیا ہے؟"

"غالب نے اوٹ پٹانگ شعر لکھ کر لوگوں کو الو بنا لیا ہے۔"

"محترمہ الو تو شاعر یا لیلیٰ پر مرنے والے، اور غالب کے چاہنے والوں میں تو اچھے اچھے لوگ ہیں مثلاً"

"آپ اچھے لوگوں کی فکر نہ کریں۔ ویسے میں نے آپ کو ان بزرگوں میں شامل نہیں کیا۔"

"مجھ پر یہ عنایت کیوں؟ میں تو غالب پرست ہوں۔"

"آپ کی جگہ اصلی ٹیوٹر نے رکھی ہے۔"

"تو مولوی عبدالرحمٰن کو آپ الو سمجھتی ہیں؟"

"غالباً ان کا اپنا بھی یہی خیال ہے۔"

"محترمہ، ٹیوٹر اور الو؟"

"جی ہاں وہ تہہ دل سے حد ہیں۔"

"اور ہم ...؟"

"آپ کی اور بات ہے۔"

"ہماری کہاں سے؟"
"بس آپ چند نہیں۔"
"بڑی رعایت کی آپ نے ہمیں۔"
"تو آپ سامنے ملنا چاہتے ہیں کیا؟"
"ہم یہیں ہی تو ہیں۔"
"تو پھر سیر کریں پہاڑوں کی پیالوں پر"
"اور اگر یہاں آنا چاہیں تو؟"
"تو براہ مہربانی برخوردار جگہ بدل کر آئیں۔"

ساتھ ہی رضیہ نے ہماری ٹوپی سے لے کر ایکس کے پچھلے سرے تک دیکھا اور بے اختیار ہنس دی لیکن اسے میں ساتھ والے کمرے سے ماسٹر صاحب کی آواز آئی۔

"بیٹی رضیہ آپ کی ٹیوشن کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ اب آیئے ماسٹر جلیں۔"
"تو جا رہی ہوں ماسٹر صاحب خدا حافظ۔"
"گویا آپ کا مطلب ہے کل نہ آؤں؟"
"اب اتنے جا رہی رہتے کل آئیے پرسوں آئیے اور آتے ہی رہیے۔"
"پرسوں تو مولوی صاحب آ جائیں گے۔"
"اللہ ان کی والدہ کو دو دن ٹھہر کر تشفی دے دے گا۔"

اتنے میں ماسٹر صاحب کی بجائے ان کا چہرہ نمودار ہوا اور میں نے آہستہ سے خدا حافظ کہہ کر رخصت لی۔

دوسرے روز ہم کپڑے بدل کر پڑھانے گئے سبق تو دوسرے شعر سے سب آگے نہ پڑھا لیکن ٹیوشن مکمل طور پر کامیاب رہی تیسرے دن مولوی صاحب آ گئے

اور ہمیں دوستوں نے آگھیرا کہ دو روزہ ٹیوشن کی روداد سناؤ ہم نے روداد سنائی تو اس پر ہماری کلاس کے ایک مسخرے لطیف نے ساری کلاس کو مخاطب کرتے ہوئے بلند آواز سے کہا۔

"خاموش اور سنیے میرا ستاروں کا علم کہتا ہے کہ ایک سال کے اندر اندر ہمارے ہم جماعت کی شادی ہو جائے گی۔ بتاؤ اس کی دلہن کا کیا نام ہو گا؟"

تمام کلاس نے لطیف کے ساتھ ہم زبان ہو کر کہا۔

"رضیہ"

اور یہ کہہ کر مجھے کندھوں پر اٹھا لیا اور اودھم مچایا

قاری محترم - کیا آپ کو بھی میرے ہم جماعتوں سے اتفاق ہے؟ سنیے۔ اگلے سال رضیہ سچ مچ دلہن تو بنی لیکن ہماری نہیں، مولوی عبدالرحمٰن کی۔ حادثہ یہ ہوا کہ ٹیوشن کے بعد مولوی عبدالرحمٰن اور ہم سی ایس پی کے مقابلے کے امتحان میں شریک ہوئے اور مولوی صاحب یہاں بھی ہمیں دو سو نمبر پیچھے چھوڑ گئے۔ اس کامیابی کے بعد ان کے لیے رضیہ سے شادی میں ایک ہی رکاوٹ تھی اور وہ مولانا نے بڑی خوشی سے پہلے نائی کے ہاتھوں دور کرا دی۔ خوشی سے اس لیے کہ بقول مولوی صاحب ایک دن انہوں نے کالی آنکھ سے رضیہ کو دیکھ لیا تھا اور دل میں عہد کر لیا تھا کہ داڑھی کی چق ہے، یہ لوٹ و قلم تیسرے میں۔ اُدھر ماسٹر صاحب تو مولوی عبدالرحمٰن کے نام کے ساتھ ہی سی ایس پی دیکھ کر اس قربانی پر بھی مصر رہے۔ رہے ہم تو جوں ہی مولوی صاحب اپنی دلہن کو لے کر رخصت ہوئے، ہم پروانہ ہوتے ہم دیوانِ غالب کھول کر ایک لاجواب غزل الاپنے لگے

کہ " یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا " **

دورانِ تعلیم، سیاست میں حصہ لینے کے آپ کس قدر حامی ہیں؟

حامی ہوں یہ قدرتی بات ہے (فرح نزہت، فارمیسی)

دورانِ تعلیم صرف محبت کی سیاست ہو (نثار بخاری، زوالوجی)

سیاست میں مت حصہ لو (فرمان علی، زوالوجی)

تعمیری سیاست میں بھرپور حصہ لینا چاہیے (رئیس ساجد، سوشیالوجی)

مشوارم کے حامد کی حد تک (الیاس شیخ، زوالوجی)

اس حد تک کہ تعلیم متاثر نہ ہو (مرزا ارشد، اردو)

تعلیم و سیاست کا تعلق چولی دامن کا ساتھ (خالد حسن، فلسفہ)

قومی مسائل میں بھرپور سیاست میں حصہ لینا چاہیے (محمد اسلم، ریحانی)

میں بالکل مخالف ہوں (عتیق الحسن، سیاسیات)

جمہوریت کے اصل ہیں اربابِ سیاست (قاسم عباس، تاریخ)

سیاست میں ضرور حصہ لینا چاہیے (مسعود احمد، ...)

کبھی حامی ہوا کرتا تھا (شوکت رانا، فارمیسی)

جس سے پڑھائی کا نقصان نہ ہو (وقار احمد، فزکس)

جائز حد تک (اکرم راہی، فارمیسی)

طلبہ سیاست میں بھرپور حصہ لیا جائے (شاہد چودھری، عربی)

باصلاحیت ووٹر کی حد تک (محبوب خان، انگریزی)

تعلیم بھی صحت مند سیاست ہے (جاوید اقبال، ہیلی کالج)

سیاست شجرِ ممنوعہ نہیں (حسیب احمد، ہیلی کالج)

لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ (ظفر اقبال، ایم بی اے)

جس قدر لسی کے (محمد اقبال، اکنامکس)

حامی نہیں البتہ پرجوش مبلغ ہیں (خالد منصور، کیمیکل)

اکبر الٰہ آبادی اور نظامِ تعلیم

شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

توپ کھسکی پروفیسر پہنچے
جب بسولا ہٹا تو رندا ہے

یہ طفلِ ناداں، غریقِ غفلت، ہوائے ذلت میں تن رہے ہیں
سمجھ نہیں ہے، نظر نہیں ہے، بنائے جاتے ہیں بن رہے ہیں

علم

علم وہ خوب ہے جو حسنِ عمل تک پہنچے
ذوقِ قد خوب کہ جو رازِ ازل تک پہنچے

انسان سے یا بہت سے دلوں کو ہلا سکے
یا کوئی شئے مفید خلائق بنا سکے
ہم تو اسی کو علم سمجھتے ہیں کام کا
پڑھنے کو مستعد ہیں جو کوئی پڑھا سکے

اک علم تو ہے بُت بننے کا، اِک علم ہے حق پر مٹنے کا
اِس علم کی سب دیتے ہیں سند اُس علم میں ماہر کون کرے

تعلیم

طاقت وہ ہے با اثر جو سلطانی ہے
اُس جا ہے چمک جہاں زرافشانی ہے
تعلیم وہ خوب ہے جو سکھلاتے ہنر
اچھی ہے وہ تربیت جو روحانی ہے

تعلیم و تربیت کا ہے اختلاف ہرجا
جو کورس ایک کا ہے وہ اور کا نہیں

دینی طریق کو اب سمجھتے ہیں اک تماشا
کالج کے کورس پر ہم گرتے ہیں بے تحاشا

مقاصد تعلیم

حاصل کرو علم ، طبع کو تیز کرو
باتیں جو بُری ہیں ان سے پرہیز کرو
قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبر
اس میں کیا ہے کہ نقلِ انگریز کرو

❋

تکمیل میں ان علوم کے ہو مصروف
نیچر کی جو طاقتوں کو کر دیں مکشوف
لیکن تم سے کیا امید ہو کہ تمھیں
عہدہ مطلوب ہے وطن ہے مالوف

❋

کون کہتا ہے کہ علم نہ پڑھ عقل نہ سیکھ
کون کہتا ہے نہ کر حسرتِ لندن پیدا
بس یہ کہتا ہوں کہ ملت کے معالی کو نہ بھول
راہِ قومی کا تو خود ہی نہ ہو رہزن پیدا

❋

جب علم ہی عاشقِ دنیا ہو پھر کون بتائے راہِ خدا
جب خضر اقامت پر ہوں فدا تائیدِ مسافر کون کرے

❋

نئی تعلیم میں تقوے کا وہ اکرام کہاں
ناز بے حد ہیں مگر غیرتِ اسلام کہاں

❋

ہم میں وہ خوبی و نکوئی نہ رہی
پاکیزگی و خجستہ خوئی نہ رہی
تعلیم جدید سے ہوا کیا حاصل
ہاں کفر کے ساتھ جنگجوئی نہ رہی

❋

تم شوق سے کالج میں پھلو پارک میں پھولو
جائز ہے غباروں میں اُڑو چرخ پہ جھولو
بس اک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

❋

کالج و ٹیچر و حکام ہمہ در کارند
تا تو پاسے بکف آری و کنی عہدہ پُری
طاعتِ حق بھی مگر شرط ہے روٹی جو ملے
شیخ سعدی نے کہا ہے کہ بغفلت نخوری

❋

مسجد نے کہا میرا فسانہ بھی ہے اک چیز
کالج نے پکارا کہ زمانہ بھی ہے اک چیز

❋

یہ بات تو کھری ہے ہرگز نہیں ہے کھوٹی
عربی میں نظم ملت بی۔اے میں صرف روٹی

❋

ہاں علی گڑھ کی بھی تم تشبیہ لو
اک معزز پیٹ تم اس کو کہو
پیٹ ہے سب پر مقدم اے عزیز
گو کہ فکرِ آخرت ہے اصل چیز

❋

صیاد ہنر دکھلائے اگر تعلیم سے سب کچھ ممکن ہے
بلبل کے لیے کیا مشکل اُڑ بھی نہ سکے اور خوش بھی رہے

جدید نظامِ تعلیم

شیخ مرحوم کا قول اب بھی مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

❁

طفلِ ناداں غریقِ غفلت ہو کے ذلت میں تن رہے ہیں
سمجھ نہیں ہے نظر نہیں ہے بنائے جاتے ہیں بن رہے ہیں

❁

علوم ان کے، زباں ان کی، پریس ان کے، لغات اُن کے
ہماری زندگی کے سارے اجزا اُدھر پہ ہیں ہات اُن کے

❁

افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی
یوں قتل سے بچوں کے، وہ بدنام نہ ہوتا

❁

توپ کھسکی پروفیسر پہنچے
جب بسولا ہٹا تو رندا ہے

❁

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری
جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری

❁

نئی تہذیب میں بھی مذہبی تعلیم شامل ہے
مگر یونہی کہ گویا آبِ زمزم مے میں داخل ہے

❁

اغیار کے عمل کو ہوں گے کچھ اور میداں
ہم کو تو اب فلک نے کالج پہ رکھ لیا ہے

❁

چھوڑ لٹریچر کو اپنی ہسٹری کو [illegible]
شیخ و مسجد [illegible]
چار دن کی زندگی ہے کوفت [illegible]
کھا ڈبل روٹی کلرکی کر خوشی سے [illegible]

سند مجھ کو ملی تو جل گئے واعظ کہنے لگے
خری کی ہو گئی تکمیل باقی صرف لدنا ہے

❁

طفلِ دل محوِ طلسمِ رنگ کالج ہو گیا
ذہن کو تپ آ گئی مذہب کو فالج ہو گیا

❁

ہم کیا کہیں احباب کیا کارِ نمایاں کر گئے
بی اے ہوئے نوکر ہوئے پنشن ملی پھر مر گئے

❁

تعلیم جنہوں نے پائی ہے وہ یہ تو نہیں ہیں بے حس ہیں
دعوے جو ہیں رسم و مذہب کے سب ان کے یہاں سے ڈسمس ہیں

❁

مسٹر لفتلی کو عقبے میں سزا کیسی ملی
سرِ تیغ اس کی نامناسب ہے بلی جیسی ملی
اس نے بھی لیکن ادب سے کر دیا یہ التماس
چارہ کیا تھا اے خدا۔ تعلیم ہی ایسی ملی

❁

باپ ماں سے شیخ سے اللہ سے کیا ان کو کام
ڈاکٹر جنوا گئے تعلیم دی سرکار نے

❁

پڑھ کر انگریزی میں دانا ہو گیا
کم کا مطلب ہی کمانا ہو گیا

❁

راہِ مغرب میں یہ لڑکے لُٹ گئے
واں نہ پہنچے اور [illegible]

مرزا غریب چُپ ہیں اُن کی کتاب ردّی
بُدّھو اکڑ رہے ہیں صاحب نے یہ کہا ہے

*

کالج سے جنہیں امیدیں ہیں مذہب کو بھلا کیا مانیں گے
مغرب کو تو پہچانا ہی نہیں قبلے کو وہ کیا پہچانیں گے

*

طفلِ مکتب کہ سخن ہا زِ زباں می گوید
شکوہ کم کن کہ چنیں گفتۂ چناں می گوید
طبع اُو فونوگراف است و گردش سبقش
آں چہ بستند بروں نقش ہماں می گوید

*

ہم ایسی کل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

*

کالج میں کسی نے کل یہ نغمہ گایا
قومی خصلت کا سر سے اُٹھا سایہ
کہتے تھے وَلد کو لوگ سِرٌّ لابیہ
سِرٌّ للماسٹر کا اب وقت آیا

*

دلوں پہ مارتے جاتے ہیں چھاپہ شیکسپیئر
پڑھو گے حضرتِ سعدیؒ کی بوستاں کب تک

*

سعادت روح کی کس بات میں ہے آپ کیا جانیں
کہ کالج میں کوئی اس بات کا ماہر نہیں ہوتا

*

سیاہ کرنا دلوں کا اسے ہے کیا مشکل
تمہارا علم لگاتا ہے آفتاب میں داغ

*

کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں آدمی آدمی بناتے ہیں
جستجو ہم کو آدمی کی ہے وہ کتابیں عبث منگاتے ہیں

*

کہاں جہنم و جنت، کہاں عذاب و ثواب
دل اب تو رہتے ہیں کالج کے فیل پاس کے ساتھ

*

خوشی سے شیخ کالج سوئے مسجد اب نہیں چلتا
جہاں روٹی نہیں چلتی وہاں مذہب نہیں چلتا

*

مسجدیں سنسان ہیں اور کالجوں میں دھوم ہے
مسئلہ قومی ترقی کا مجھے معلوم ہے

*

تعلیم ہے لڑکوں کی کہ اِک دامِ بلا ہے
اے کاش کہ اس عہد میں ہم باپ نہ ہوتے

*

حکام پہ بم کے گولے ہیں اور مولویوں پہ گالی ہے
کالج نے یہ کیسے سانچوں میں لڑکوں کی طبیعت ڈھالی ہے

*

علی گڑھ کو شرف بخشا ہے اقبالِ نصاریٰ نے
کہ جو مسلم اُٹھا شوقِ ترقی میں یہیں آیا

*

وعظ کالج میں جو کہہ آتے ہیں اکبر اکثر
کیا یہ گرتی ہوئی دیوار کو تھام آتے ہیں

*

نہ علمِ دیں ہے کہ راہِ خدا کے ہوں ہادی
نہ توپچی ہیں کہ زد میں رہے بھر آبادی
گریجوئیٹ ہیں، کھاتے ہیں اور تنتے ہیں
بناتے اپنوں کو ہیں، دشمنوں سے بنتے ہیں

*

مذہب سے بے خبر ہیں، ہے ترک ان سے عربی
اسکول کی گرامر رٹنے میں عمر گذری
ہو ابن کا سبق ق اور بنت کا سبق قی
اس وقت میں کہوں گا تقوے کی ہے ترقی

*

ظاہر ہوئی کیشِ دکالج کی اک لکیر
آخر اسی لکیر کے سب ہو گئے فقیر

❦

کہتے ہیں لڑکے بھی مگر کالج سے فرصت ہے کہاں
یہ ساری باتیں اک طرف اور پاس ہونا اک طرف

❦

یہ ان کا کورس کیا کم ہے کہ میں بھی کچھ کہوں ان سے
مری جانب سے بس کالج کے لڑکوں کو دعا کہیے

❦

نغمۂ قومی کا مطرب آج کل ہے ہر بستی
تال ہے ذکرِ ترقی سم ہے یونیورسٹی
دین کی الفت دل سے ان کے یوں ہی گر مٹی
مسلم اُٹھ جائیں گے رہ جائے گی یونیورسٹی

❦

بزرگانِ ملت نے کی ہے توجہ
کمی پر رہیں گے نہ عالم نہ عابد
ترقی دب ہو گی اب روز افزوں
علی گڑھ کا کالج ہے لندن کی مسجد

❦

دیکھ آئے قوم سنتے تھے جیسے
چند لڑکے ہیں مشن اسکول کے
بار آور پارک میں یہ ہوں گے کیا
گملوں ہی پر رہ گئے ہیں پھول کے

❦

مسجد کا ہے خیال نہ پروائے حج ہے
جو کچھ ہے اب تو کالج و ٹیچر میں خرچ ہے

❦

قدیم تعلیم

یہ اتنی گوشمالی طفلِ مکتب کی نہیں اچھی
زبان آتی ہے اس کو سچ ہے لیکن کان جاتا ہے

❦

مغرب کے مرشدوں سے تو پڑھ چکا بہت کچھ
پیرانِ مشرقی سے اب فیض کی نظر لے

❦

کچہریوں میں ہے پرسش گریجویٹوں کی
سڑک پہ مانگ ہے قلیوں کی اور ملیٹوں کی
یہیں ہے تو بس علمِ دین و تقوے کی
خرابی ہے تو فقط شیخ جی کے بیٹوں کی

❦

اساتذہ

نہیں اہلِ یقیں جب وہ تو یہ کیا مذہبی ہوں گے
اثر پڑتا ہے شاگردوں پہ استادوں کے باطن کا

❦

ذی علم و متقی ہوں جو ہوں ان کے منتظم
استاد اچھے ہوں مگر استاد جی نہ ہوں

❦

ماسٹر صاحب کا علم اس وقت گو ہے نیک نام
اہلِ دانش میں مگر میرا فزوں ہے احترام
بات بالکل صاف ہے پیچیدگی کچھ بھی نہیں
میں ہوں سعدیؒ کا بھتیجا وہ ہیں ملٹن کے غلام

❦
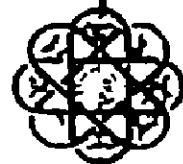
تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر
خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش میں جب بیگانہ تھی
اب ہے شمعِ انجمن پہلے چراغِ خانہ تھی

کالج بنا عمارتِ فخر النسا بنی
شکرِ خدا کہ مل گئے آخر بنا بنی
بے پردگی کی ہو نہ یہ در پردہ اک بنا
جن کو یہ ڈر ہے ان کی تو جانوں پہ آبنی
لیکن نگاہِ نبض شناسانِ وقت میں
امراضِ قوم کے لیے عمدہ دوا بنی

مناسب ہے نئی تعلیمِ نسواں
یہی راہ آپ اب بے ردّ و کد لیں
سمجھ لیں لاکھ باتوں کی اک بات
میاں بدلے تو بیبیاں کیوں نہ بدلیں

تعلیمِ دختراں سے یہ امید ہے ضرور
ناچے دلہن خوشی سے خود اپنی برات میں

کر لیا بی بی نے ان کی انٹرنس اس سال پاس
والدہ صاحبہ تو ہیں خاموش لیکن خوش ہیں ساس

مغربی علم و ہنر تو خوب ہے اکبر مگر
اپنی اس تعلیم پر ہم آفریں کیوں کر کریں

لڑکے نئے طریق کی جانب جو کھنچ گئے
بوڑھوں کی آہ جانبِ چرخِ کہن گئی

تہذیبِ قدیم کے جب امکان تھے چست
ملکی حالات سب رہے صاف و درست
تعلیمِ جدید نے کیا فتنہ بپا
اے بادِ صبا ! ایں ہمہ آوردۂ تست

انگلش سے نماز اور وظیفہ رخصت
کالج سے امامِ ابو حنیفہ رخصت

میں پریشاں ہے مرسُو آپ بی اے ہیں کہ ایف اے ہیں
یہ ہے جب رنگ دنیا کا تو سیکھیں علم دیں کیوں کر

نئے گملوں میں پڑ کر پھول جانا
خدا اور آنحضرت کو بھول جانا
بہت بے جا ہے یہ واللہ، اکبر
ذرا سن لو تو پھر اسکول جانا

اِک پیر نے تہذیب سے لڑکے کو اُبھارا
اِک پیر نے تعلیم سے لڑکی کو سنوارا
پتلون میں وہ تن گیا یہ سایے میں پھیلی
پاجامہ غرض یہ ہے کہ دونوں نے اُتارا
کچھ جوڑ تو ان میں کے ہوئے ہال میں رقصاں
باقی جو تھے گھر ان کا تھا افلاس کا مارا
بیڑا وہ بہت کیمپ میں یہ بن گئیں آیا
بی بی نہ رہیں جب تو میاں پن بھی سدھارا
دونوں جب ملتے ہیں گاتے ہیں یہ مصرعہ
آغاز سے بدتر ہے سر انجام ہمارا

تعلیم کی خرابی سے ہو گئی بالآخر
شوہر پرست بی بی پبلک پسند لیڈی

تعلیم عورتوں کو بھی دینی ضرور ہے
لڑکی جو بے پڑھی ہو تو وہ بے شعور ہے
لیکن ضرور ہے کہ مناسب ہو تربیت
جس سے برادری میں بڑھے قدر و منزلت
آزادیاں مزاج میں آئیں نہ تمکنت
ہو وہ طریق جس میں ہو نیکی و مصلحت
ہر چند ہو علومِ ضروری کی عالمہ
شوہر کی ہو مرید تو بچوں کی خادمہ
عصیاں سے محترز ہو خدا سے ڈرا کرے
اور حسنِ عاقبت کی ہمیشہ دعا کرے
تعلیم خوب ہو تو نہ آئے گی دام میں
خالق سے لَو لگائے گی وہ اپنے کام میں
لندن کے بھی رسالوں میں کس نے سہی پڑھا
مطلع سے رکھنا چاہیے لیڈی کو سلسلہ
پبلک میں کیا ضرور کہ جا کر تنی رہو
تقلید مغربی پہ عبث کیوں ٹھنی رہو
داتا نے دھن دیا ہے تو دل سے غنی رہو
پڑھ لکھ کے اپنے گھر ہی میں دیوی بنی رہو
مشرق کی چال ڈھال کا معمول اور ہے
مغرب کے ناز و رقص کا اسکول اور ہے

امام غزالی کا تصورِ تعلیم

حسن نواز تارڑ
(صحافت)

عالم کے لیے مناسب ہے کہ وہ علمی مسائل کا مطالعہ کرتا رہے۔ اس کا ذہن علم سے کٹ کر نہ رہ جائے۔ علم بہت مشکل سے حاصل ہوتا ہے لیکن ذرا سی غفلت سے بہت جلد ذہن سے نکل جاتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "علم کی مصیبت نسیان ہے"۔ صاحبِ ایمان کے لیے تحصیلِ علم جس قدر ضروری ہے اسی قدر اس پر عمل کرنا بھی لازمی ہے۔ بزرگوں نے تکمیلِ علم کے چار مرحلے بیان کیے ہیں:

(۱) طالب علمی کا دور (۲) مکمل عالم ہو جانے کا دور (۳) حاصل کردہ علم سے خود فائدہ اٹھانے کا دور یعنی اپنے علم پر پہلے خود عامل ہونا (۴) علم کو دوسروں تک پہنچانے کا دور۔

عالم باعمل کی مثال ایسی ہے جیسے سورج کہ خود بھی روشن ہے اور دوسری چیزوں کو بھی روشن کرتا ہے اور عالم بے عمل ایسا ہے جیسے چاقو چھری تیز کرنے کی سان کہ اوروں کو تیز اور دھار دار کاٹنے کے قابل بناتی ہے مگر خود کاٹ نہیں سکتی۔ وہاں مدد اور مدد ہی ہے۔ تم دوسروں کو بھلائی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔ دوسروں کی تو اصلاح کرتے ہو اور اپنی اصلاح سے غفلت برتتے ہو۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا: كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ ۔ اللہ کی نظر میں یہ بات بڑی ہی بھاری ہے کہ جو کچھ تم کہتے ہو اس پر خود عمل پیرا نہیں ہوتے، گویا تمہارا اپنا عمل تمہارے قول کی تردید کر دیتا ہے۔ قول و عمل کا یہ تضاد تو عمر طالب علموں پر بری طرح اثر انداز ہوتا ہے، چنانچہ ان کے اندر منافقت اور دو رنگی جنم لیتی ہے۔

حدیث میں ہے قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب اس عالم کو دیا جائے گا جس کو اللہ نے اس کے علم سے فائدہ حاصل کرنے سے محروم رکھا۔

ایک شخص نے ابو ہریرہؓ سے عرض کیا: میں علم حاصل کرنا چاہتا ہوں، مگر ڈر ہے کہ شاید عمل نہ کر سکوں۔

فرمایا: تو پھر تیرے لیے علم نہ سیکھنا بہتر ہے۔

حضرت ابو درداءؓ نے فرمایا: ایک مرتبہ خرابی ہے اس شخص کے لیے جو علم حاصل نہیں کرتا اور سات مرتبہ خرابی ہے اس شخص کے لیے جو علم تو حاصل کرتا ہے اگر اس پر عمل پیرا نہیں ہوتا۔

عالم سے جب کوئی بات پوچھی جائے، تو علم نہ ہونے کی صورت میں غلط سلط بتا کر پوچھنے والے کو گمراہ کرنے کے بجائے بلا تکلف کہہ دے "میں نہیں جانتا"۔

طالب علم کے آداب

طالب علم سب سے پہلے اپنے اُستاد کو سلام کرے۔ اس کے سامنے بات چیت کم کرے۔ استاد کھڑا ہو، تو وہ بھی کھڑا ہو جائے۔ استاد جب خطاب کر رہا ہو، تو نہ ہنسے نہ مسکرائے۔ اگر وہ گھر جا رہا ہو، تو جب تک گھر نہ پہنچ جائے راستے میں اس سے کوئی بات نہ پوچھے۔ استاد کے سامنے نہ بولنے کا مقصد یہ ہے کہ شاگرد ہمہ تن گوش اور یکسو ہو کر استاد کی بات سنے اور اس سے اچھی طرح استفادہ کرے۔ بزرگوں نے کہا ہے، انسان استاد کے سامنے اس نرم زمین کے مانند ہو جائے جس میں بارش کو قبول کرنے کی پوری صلاحیت ہوتی ہے۔ ادھر مینہ برستا ہے ادھر وہ سارے پانی کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔

اُستاد کے سامنے عجز و انکسار کا پیکر بن کر بیٹھے۔ اُستاد کا دل سے احترام کرے، اس کے مزاج اور وقار کو ملحوظ رکھے۔ اپنے آپ کو بیمار جانے اور اُستاد کو طبیبِ حاذق۔ حضرت علیؓ کا ارشاد ہے: شاگرد پر استاد کا حق یہ ہے کہ اس کے بھید کو نہ کھولے، اس کے سامنے کسی کی غیبت نہ کرے، اس کی لغزش کی تاک میں نہ رہے اور اگر لغزش ہو بھی جائے تو اس کو معذور جانے، اس سے آگے بڑھ کر نہ بیٹھے اور اگر اسے کوئی حاجت پیش آئے، تو اس کی حاجت روائی میں سب سے سبقت لے جانے کی کوشش کرے۔

معلم کے آداب

پہلے استاد خود اپنی اصلاح کرے، کیونکہ طالب علم اس کے کردار سے متاثر ہوں گے۔ اچھا کردار ہوگا، تو یہی روش اختیار کریں گے، بد عملی کو اپنائے گا، تو طالب علم بھی اس کے نشانِ قدم پر چلیں گے۔ شاگردوں کو ادب سکھانے کے لیے استاد کا خود بھی با ادب ہونا ضروری ہے۔ ان کے سامنے وقار کو ملحوظ رکھے اور کسی سے ہنسی مذاق نہ کرے، ورنہ وہ گستاخ اور بے حجاب ہو جائیں گے۔ وقت بے وقت مار پیٹ سے کام نہ لے، طالب علم سدھرنے کے بجائے اور بگڑ جائیں گے۔ شاگردوں کے عملیات سے پرہیز کرے۔ انہیں ایک دوسرے کی جاسوسی کرنے اور لڑنے لڑانے سے روکے۔ انہیں غیبت اور بدگوئی کا عادی نہ بننے دے۔ خود بھی جھوٹ، چغل خوری، تکبر اور غرور سے دامن بچائے اور اپنے شاگردوں کے دل میں بھی ان کی نفرت پیدا کرے، اخلاقی تربیت کی طرف خصوصی توجہ دے۔

پاکستان کا وفادار ساتھی

الطاف حسن قریشی

عبدالمالک شہیدؒ

پاکستان سے جوانوں کی سرحدوں سے نکل کر حقیقتوں کی طرف سفر کر رہا تھا اس وقت اسلامیہ کالج لاہور کے سترہ سالہ طالب علم عبدالمالک نے اپنا خون سحر میں گوندھا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے لالہ و گل مہکنے لگے، درخت سایہ دار ہوئے اور پاکستان خون ٹپک اور خوش رنگ پھول کی طرح شاخِ زندگی پر نمودار رہا اور کروڑوں مسلمانوں کے بے مثل قربانی کے نتیجے میں ایک ولولہ تازہ عطا کر گیا۔

عبدالمالک، پاکستان کے سفر کا سب سے مضبوط اور سب سے زیادہ وفادار ساتھی رہا۔ اس کی طرف کسی نے میلی آنکھ سے دیکھا تو کوئی نہ کوئی عبدالمالک سر بکف نکل آیا اور خون کے اجالوں سے خطروں کے سائے دور کر دیئے اور یوں حب الوطنی کا ایک معیار ابھر آیا اور ابھرتا ہی رہا اور ابھرتے ہی قیامت کی خبر لاتے رہے اور پاکستان کا سفر کشمکش اور تصادم کا سفر بن گیا کبھی اہل دعا غالب آ گئے اور کبھی اہل نظریات کھا گئے۔ بگڑتے والوں کے سمجھداروں میں اور لیڈروں کی طبیعتوں میں اور شکست و ریخت کی اندھیاروں میں عبدالمالک کا عزم، اس کی استقامت اس کا دیوار پر اور اس کے جوان خون مسکراہٹ، جھلملاتے اور گنگناتے اور سرخی خون سے وطن کے نام و در تحریر کرتے رہے

آج ہم یہی داستانِ سرفروشی اور حقایق خودنگی بیان کرتے ہیں۔

پاکستان کے اندر سب پہلے سے، پاکستان ہی کے خلاف طوفان اٹھنے لگا تھا وہ لادینی اور وابستہ آگی عناصر جو اسلام کو اس کی نظریاتی، اس کی تاریخ اور اس کے شکوہ حکمرانی سے محروم کر دینا چاہتے تھے مسلم لیگ کی عدیم المثال مقبولیت کے پیش نظر اس میں شامل ہو گئے اور جب اقتدار کی کنجیاں ان کے ہاتھ میں آئیں تو پہلے دبے دبے اور پھر کھلم کھلا لادینی نظام کی باتیں کرنے لگے اقتدار سے وابستہ رہ کر اس عنصر نے اپنے لیے کام کرنے کی بنیادیں بھی قائم کر لیں اور حکومت کے اندر تعلقات کا جال بھی بچھا دیا۔

اسلام کے انقلابی تصور حیات اور اس کے مکمل نظامِ زندگی کے خلاف، بغاوت کے آثار سب سے پہلے مشرقی پاکستان میں عوامی رنگ میں ظاہر ہوئے، عوامی مسلم لیگ کے نام سے "مسلم" کا لفظ نکالنے کی کامیاب کوشش اسی بارے میں ہوئی۔ ایک مؤثر طبقہ دین اور سیاست کی علیحدگی کا تصور بلند کر رہا تھا۔ یہ وہی سیکولر تصور تھا جس کے خلاف علامہ اقبالؒ اور سید مودودی نے زبردست فکری جہاد کیا تھا۔ یہ فکری جہاد بدقسمتی سے بنگلہ زبان میں منتقل نہ ہو سکا اور مشرقی پاکستان کا تعلیم یافتہ طبقہ اسلام کے عالمگیر تصورات اور اس کے سیاسی، معاشی اور اخلاقی نظام کے فلسفے اور مبادیات سے آگاہ نہ ہو سکا۔ وہاں اسلام دینی مدرسوں کے علماء اور روحانی پیشواؤں کے ذریعے پھیلا تھا جنہوں نے اپنے اخلاق حسنہ کی تاثیر اور قوت سے دل تو مسخر کر لیے مگر ذہنوں کو وافر غذا فراہم نہ کر سکے، چنانچہ یہ بھی دل پر عقل کا غلبہ ہونے لگا۔ دین کا شعوری ڈھانچہ تبدیل ہو گیا اور سیاسی اور اقتصادی زندگی میں مغربی تصورات در آئے اور تہذیبی اور ثقافتی میدانوں میں ہندوانہ نقش و نگار پھیلتے چلے گئے

مشرقی پاکستان کے نوجوانوں میں اسلام سے جو عوامل بیگانگی کا باعث ہوئے اور جن عوامل سے ان کا تعلق منقطع ہو گیا، اس وقت مقصود نہیں مگر سب سے نمایاں سبب اسلامی لٹریچر کی کمیابی ہے۔ رونق تھی وہاں کی فکری اور جذباتی زمین بہت زرخیز تھی اور آج بھی بڑی زرخیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں جہاں صحت مند بیج پڑ گیا، وہاں ایسے ایسے شاہکار پیدا ہوئے جن کے عشق طاہرہ نے اسلامی تاریخ کا سب سے اجلا دور تازہ کر دیا اور وہاں جو اسلامی انقلاب کے تقاضوں سے آشنا ہو گئے، وہ اسی کے ہو رہے اور ایسی ساری جوانی جہاں صلاحیتیں رضائے الٰہی کو نظر نہ دیا۔ مدارس میں بیٹھ کر زبردست ثقافتی یلغار کے آگے اسلامی قدروں اور روایتوں کے چراغ اسی لیے جلتے رہے کہ ایسے دیوانوں کا جیتا جاگتا خون شامل رہا۔

ڈھاکہ یونیورسٹی ایک عرصے سے بنگلہ قومیت اور لادینیت کی آماجگاہ بن گئی تھی اسلامی ذہن رکھنے والے اساتذہ سمٹتے اور رکتے چلے گئے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ اسلام جو خود کو خدا کے سوا کسی سے ڈر نہیں سکھاتا اور جس کے مسلک میں بے ہمتی، بے چارگی اور بے بسی حرام کے دائرے میں آتی ہے، اسی دین کے دانشور شیدائی پاکستان میں بے حوصلہ، ڈرپوک اور بزدل کیوں ہیں۔ مغربی پاکستان میں تو پھر بھی اہل علم نے کسی جرأت اور شجاعت کا اظہار کیا، مگر مشرقی پاکستان میں میسر فرزانوں کو دیوانگی سے محروم پایا اور وہ احباب جو دنیا بھر کی لذت سے آگاہ نہیں اور زندگی کا محض مادہ پرستانہ نقطہ نظر رکھتے ہیں تعصب سے بے دھڑک کام کرتے ہیں اور بے لگام رہتے ہیں۔

ڈھاکہ یونیورسٹی میں جب بنگلہ قومیت در و دیوار سے پھٹنے لگی اور اسلامی ذہن پر کاری ضربیں پڑنے لگیں اور پاکستانی تاریخ اور پاکستانی تحریک نگاہ کو کانٹا ثابت کیا گیا تو نوجوان طلبہ کا ایک طبقہ غیرت و حمیت سے سرشار میدان عمل میں کود پڑا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ ملک میں دوسری بار مارشل لاء نافذ ہو چکا تھا اور یحییٰ خان نئی اصلاحات کا بار بار ذکر کر رہے تھے جن کے سہارے گیارہ برس پہلے ایوب خان صاحب نے اپنی مسندِ اقتدار سجائی تھی۔ ایئر مارشل نور خان تعلیمی سفارشات کا اعلان کر چکے تھے۔ ان میں بعض باتیں بہت اچھی تھیں مگر ان کی پرداخت سرکاری لٹ سے کسی طرح کم نہ تھی۔ غالباً یہی خاں یہی چاہتے تھے کہ تعلیمی تجاویز اتنی معیاری محکم اور انقلابی ہوں کہ ہر فرد پاؤں تلے سے زمین نکلتی ہوئی محسوس کرے اور ایک زلزلہ سا آ جائے اور پھر

کچھ دیر کی گہما گہمی کے بعد ساری باتیں دفن کر دی جاتیں۔

اس تاریخی واقعے سے ہی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایئر مارشل نور خان تعلیمی تجاویز کا اعلان کرنے کے بعد جس تیز رفتاری سے ڈھاکہ پہنچے اور یونیورسٹی اور کالجوں کے اساتذہ اور طلبا سے مختلف ادارے میں ملے۔ ان میں عوامی لیگ یعنی لادینیت اور چھ نکات کا نقطہ نظر جاری و ساری تھا۔ یہ بڑے دکھ کی بات ہے کہ یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد نے اسلامی ذہن رکھنے والے طلبا کو ایک فاصلے پر رکھا اور انہیں ایئر مارشل نور خان کے قریب نہ آنے دیا۔ مگر اس پر یونیورسٹی میں ہنگامہ اٹھا اور پہلی بار لادینی قوتوں نے محسوس کیا کہ وہ جن کو بے دم سمجھتے تھے ان میں ابھی دم خم باقی ہے۔ بلکہ ان ہنگاموں کے نتیجے میں مسلم قومیت پر یقین رکھنے والے طلبا ہی ایئر مارشل نور خان سے ملے اور انہیں اپنے احساسات اور مطالبات سے پورے وزن کے ساتھ آگاہ کیا۔ طلبا نے سلیقے سے اپنے مطالبات لکھے ہوئے تھے اور ان کے حق میں سنجیدہ دلائل اور باوقار دلائل دیے گئے تھے۔ نوجوان طلبا کی شائستگی، حب الوطنی کے جذبے سے ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جناب نور خان بہت متاثر ہوئے مگر اکثریت کا ذہن وہ نظر انداز نہ کر سکے اور ہماری اطلاعات کے مطابق طلبا سے چھ نکات کے عملی امکانات اور مضمرات پر ذرا کھل کر باتیں کرتے رہے۔ ہو سکتا ہے اس بات کا مقصد حقیقی مسائل کو سمجھنا اور ان کا حل تلاش کرنا ہو مگر طلبا پر اس کا یہ اثر مرتب ہوا کہ انہوں نے اسے مرکزی حکومت کی شکست پر محمول کیا چنانچہ ان کے حوصلے بڑھے اور انہوں نے مارشل لا کی موجودگی میں اسلام کے احساساتی قلعے پر آخری ضرب لگانے کا پروگرام بنایا۔

فیصلہ کن لمحات قریب آ رہے تھے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں تعلیمی تجاویز پر مذاکرے کا اہتمام ہوا اس کے لیے ۱۲ اگست کی تاریخ مقرر ہوئی یعنی اس تاریخ سے صرف دو دن پہلے جب پاکستان وجود میں آیا تھا۔ اخبارات میں مذاکرے کی خبر شائع ہوئی کہ میرے سینے میں نامعلوم سا اضطراب ابھرنے لگا۔ میں یونیورسٹی کی فضا سے پوری طرح باخبر تھا۔ میری چھٹی حس نے خبردار کیا۔ آتش فشاں پھٹنے والا ہے۔ یہ اہتمام ہمارا نہیں۔ بندگی کی بہار لوٹنے کا بہانہ ہے۔ سخت بے چینی کے عالم میں شعور و آگہی کے کانٹے چبھتا رہا اور پھر وہی ہوا جو اپنا مقدر بن چکا تھا۔

۱۲ اگست ۱۹۶۹ء کو ڈھاکہ یونیورسٹی میں بہت بڑا فیصلہ ہونے والا تھا۔ ایک ایسا فیصلہ جو مشرقی پاکستان کا مقدر قرار پایا۔ بات یہ طے ہونی تھی آئندہ ملک کا تعلیمی نظام اسلامی خطوط پر مرتب کیا جائے یا اسے سرتاپا لادینی بنا دیا جائے۔ نظامِ تعلیم اگر ایک بار سیکولر قرار پا جاتا ہے، پھر اسلامی دستور، اسلامی ریاست اور اسلامی معاشرے کی تمام امیدیں اور آرزوئیں جھاگ کی طرح بیٹھ جاتی ہیں۔

یونیورسٹی کے اسی مذاکرے میں مشرقی پاکستان کی بڑی بڑی سیاسی جماعتیں کھل دلچسپی لے رہی تھیں۔ بعد کے شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ غیر ملکی طاقتیں بھی اس مذاکرے کو سیاسی سرو بیٹر سمجھتی تھیں اور انہوں نے اپنے اپنے زاویوں سے نتائج کی راہیں تیار کی تھیں۔

اس مذاکرے میں سینکڑوں طلبا، اساتذہ پس منظر میں غیر معمولی طور پر مستعد تھے۔ وہ مسلمان طلبا جو برسوں سے اسلام کا مذاق اڑتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ اب خود اسلام کا گلا دبانے کے لیے پوری طرح تیار ہو کر آئے تھے۔ فضا آتشی جو گوارا اور زہریلی تھی کہ اس میں صحت مند آدمی کے لیے سانس لینا دوبھر ہو گیا تھا۔ اسلامی ذہن رکھنے والے طلبا کو بتا دیا گیا تھا کہ معرکہ کربلا دوبارہ پیدا ہونے والا ہے۔!

اس روز یونیورسٹی میں ہزاروں طلبہ امڈ آئے تھے۔ تلواروں کی دھاریں اور خنجروں کی تیز انیاں چمک رہی تھیں۔ آنکھوں میں نفرتوں کے انگارے دہک رہے تھے۔ سانپوں اور اژدہوں کی پھنکار بہت قریب سے سنائی دے رہی تھی۔ نگاہوں کے سہارے حرکت میں آ چکے تھے اور اسی مذاکرہ شروع ہو رہا تھا۔

اور پھر وہ مذاکرہ شروع ہوا جس میں اسلامی جمعیت طلبہ کے نمائندوں کو تقریر کرنے کی اجازت نہ تھی۔ ایک بیس سالہ طالب علم شمس الضحیٰ (سوشلسٹ لیڈر جہانگیر دینگ (EPSL) کے رہنما) نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔

- "ہم اسلامیات کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتے، ہمیں لادینی نظامِ تعلیم چاہیے"

اس پر غیرت عمرؓ کے وارث۔ عبدالمالک نے اٹھ کر کہا۔

- "یہ ہمارے دلوں کی آواز نہیں ہم تو زندہ ہی اسلامی نظامِ تعلیم کے لیے ہیں"

اس اعلانِ حق پر یونیورسٹی کی فضا یکسر بدل گئی۔ ایمان کی والہانہ کیفیتیں بے تاب ہو گئیں، لادینی قوتیں حالات کا رخ دیکھ کر پیچھے ہٹ گئیں اور جب عبدالمالک اپنے چند رفیقوں کے ساتھ یونیورسٹی سے باہر نکلا، تو گھات میں بیٹھی ہوئی لادینی قوتوں نے پیچھے سے حملہ کر دیا۔ عبدالمالک کے سر پر لوہے کی سلاخ سے کاری ضرب لگی، خون کا فوارہ پھوٹا اور حق کی شہادت دے گیا۔ اسے ہسپتال میں لے جایا گیا، مگر ڈاکٹر نے سیاسی تعصب کی بنا پر طبی امداد دینے سے انکار کر دیا۔ عبدالمالک کا خون بہتا رہا، بہتا رہا اور پھر وہ منجمد ہو گیا بالکل اسی طرح جس طرح ہم بہتے ہی منجمد ہیں۔

قاتلوں کے محافظ تماشا دیکھتے رہے، بے جان اور بے غیرت مارشل لا اور ٹھٹھر گیا۔ وہ راکھلس بنگیں اور شبیں گئیں دن کی روشنی میں پتھروں سے کچلے ہوئے معصوم عبدالمالک کی حالت دکرنکس اہر کا روقیموں کے آگے سرنگوں ہوتی۔ وہ افسر اور وہ جوان، جو حق بر جیب سادھے رہے ایسی عزت اور غیرت کی رسوائی کا منظر ہے، بے حس اور بے رحم اور سنگ دل قیادت وطن کے کوڑوں کی زد میں ہے اور جس دن تاریخ اس سے کب تک انتقام لیتی رہے گی عبدالمالک کی شہادت پر اگر اہلِ درد جاگ اٹھتے، اہلِ دل آگے بڑھتے اور قاتلوں اور انصاف حرکت میں آتا، تو پاکستان کا وجود مبدل نہ ہونے والے زخم سے بڑی حد تک محفوظ رہتا۔ قوم نے اس وقت جس کھلنڈرے پن کا مظاہرہ کیا اور عبدالمالک کے زخم کو اپنا زخم نہ سمجھا اور بہنے والے خون سے کوئی تعلق نہ رکھا اس کا انجام سب کے سامنے ہے۔ الم ناک انجام جس سے تاریخ بھی لرز اٹھی ہے اور فطرت کا توازن بگڑ گیا ہے

مشرقی پاکستان میں عبدالمالک نے اپنے خون سے لادینیت کے سیلاب کے آگے دیوار کھڑی کر دی تھی۔ اس نے اس نظریے اور عقیدے اور قلعے کے لیے جان دی جو دونوں بازوؤں کے درمیان محبت اور یگانگت کا حقیقی رشتہ استوار کر سکتا تھا۔ مگر بے رحم انسانوں نے اس ایثار کا مذاق اڑایا۔ سیاسی پھبتیاں کسیں۔ خون آشام حملے کیے اور پھر ان حملوں کی زد میں وہ مارک بھی آ گیا جو دونوں بازوؤں کو یکجا رکھے ہوئے تھا۔

پاکستان کا وجود منتشر ہو گیا، اس کا سفر بکھر گیا اور صفیں ڈوب ڈوب کر ابھرتی رہیں۔

***

آخری خطاب

(یہ وہ یادگار تقریر ہے جو عبدالمالک شہید (طالب علم بائیوکیمسٹری آنرز ڈھاکہ یونیورسٹی، ناظم اسلامی جمعیتِ طلبہ ڈھاکہ) نے "نئی تعلیمی فارمولا" پر نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن (NIPA) کے منعقد کردہ مجلس مذاکرہ میں (اگست ۱۹۶۹ء ڈھاکہ) کی، جس کے چند روز بعد قوم پرست کمیونسٹوں نے عبدالمالک کو یونیورسٹی کیمپس میں شہید کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ تقریر (NIPA) کے ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے مرتب کی گئی ہے۔ مدیر)

صدرِ محترم

اس وقت یہاں نئی تعلیمی تجاویز کی نظریاتی بنیادوں پر گفتگو ہو رہی ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ جن حضرات نے یہاں اس مذاکرہ میں حصہ لیا ان میں سے اکثر نے اصل موضوع سے ہٹتے ہوئے بہت سی غیر ضروری باتوں کو بھی چھیڑنے سے گریز نہیں کیا اور کچھ دانشور حضرات نے لفظ ثقافت پر گفتگو فرماتے ہوئے۔ ثقافت سے "یکساں ثقافت" SINGLE CULTURAL PATTERN مراد لیا ہے حالانکہ یہ سوچنا چاہیے تھا کہ مشترک ثقافتی اقدار کے معانی کبھی بھی "یکساں ثقافت" کے نہیں ہوتے۔

جہاں "یہ یکساں ثقافت" غیر فطری انداز میں معاشرے پر ٹھونسی جاتی ہے جس کی ایک واضح مثال سوویٹ روس کا معاشرہ ہے جہاں تمام ثقافتی اقدار کو مسمار کر کے ایک "یکساں ثقافت" تشکیل دی گئی ہم بغیر کسی لگ لپیٹ کے یہ واضح کرتے ہیں یہ طریقہ غیر فطری ہے اور ہم اس طرز فکر اور طرز عمل کے مخالف ہیں۔! ہمارا مطمح نظر اس پاکستان میں مشترک ثقافتی اقدار میں ثقافت کے نام پر ایک غیر فطری معاشرہ اور ایک غیر فطری نظام ہرگز ہرگز نہیں۔

اور جہاں تک آج کی مجلسِ مذاکرہ کے اس موضوع "کہ فی الحقیقت تعلیم کا مقصد کیا ہے؟" کا تعلق ہے اس سلسلہ میں میں کسی اور طرف جانے کے بجائے عظیم شاعر ملٹن (MILLTON) کی صرف ایک بات کی جانب اشارہ کروں گا۔ اس نے کہا تھا:

"EDUCATION IS THE HARMONIOUS DEVELOPMENT OF BODY, MIND AND SOUL"

یہ جسم، یہ دماغ اور یہ روح کی متوازن ترقی (HARMONIOUS DEVELOPMENT) کسی نظریہ یا کسی آدرش کے بغیر کیسے ممکن ہے؟ یہ ہے وہ سوال جو میں ان حضراتِ گرامی سے پوچھنا چاہتا ہوں جو نظامِ تعلیم کو ٹھوس اور ہمہ گیر بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے نظریاتی بنیادوں کی اہمیت سے انکاری ہیں۔

پھر اگلی بات جو آپ حضرات کے سامنے کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ملٹن کے اس قول کو سامنے رکھتے ہوئے ایک زندہ قوم کے پیشِ نظر تعلیم کا مقصد یہی ہونا چاہیے کہ وہ فرد میں صحیح امتزاج جو نسلی نفرتوں سے پاک ملی تشخص پیدا کرے، مزید یہ کہ اس کی صحیح تشکیل کے ذریعہ ایک قومی فکر کا احیا ہو۔ پھر طلبہ کی ذہنی، جسمانی، اخلاقی اور روحانی تربیت اس طرح کی جائے کہ وہ اپنی آئندہ نسلوں کے لیے ایک مضبوط مشترکہ ثقافتی ورثہ اور اساسی نظریاتی بنیاد فراہم کر سکیں تاکہ اس رواں دواں زندگی میں روز افزوں برسات میں اگنے والے برساتی پودوں کے طرح کی اکاس بیل اس مشترکہ ورثہ کو متاثر نہ کر سکے، بلکہ اپنی کمزور بنیاد کے سبب اس کا حصہ بنتے ہوئے اپنے وجود کا خاتمہ کرنے ہی میں بھلا سمجھے۔

جو لوگ سیکولر یا لادینی نظامِ تعلیم کے خواہاں ہیں انہیں چاہیے کہ وہ عقل و خرد کی آنکھوں سے رات کے اندھیرے میں نہیں دن کے اجالے میں۔ مغربی سماج کی طرف دیکھیں۔ جہاں آزاد نظامِ تعلیم رائج کیا گیا اور جس کے متعلق وہیں کا مشہور فلاسفر اور ماہرِ تعلیم خود ہی بول اٹھا کہ

"تین ' سم کی ترقی اہم ہے۔ علم اور تکنیک میں ترقی' انسان کی سماجی حیثیت میں ترقی۔ اور روحانیت و اخلاق میں ترقی۔ اور یہ آخری ترقی سب سے اہم۔ بنیادی اور ضروری ہے۔" !!

اس کے علاوہ مغرب کے مشہور و معروف دانشور مسٹر البرٹ شویزر (ALBERT SHAWAZAR) نے اپنی کتاب (TEACHING OF REVERACE FOR LIFE) میں اس بے دین، بے قید نظامِ تعلیم کو ایک نظریہ (آئیڈیالوجی) کے تحت استوار کرنے کا شعور دیتے ہوئے کہا ہے۔

"ہمارے اس دور کو روحانی اقدار کے احیاء کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کے لیے ایک نئی تحریک نشاۃِ ثانیہ (RENAISSANCE MOVEMENT) کی ضرورت ہے۔ ایسی نشاۃِ ثانیہ جس میں حضرتِ انسان نے یہ دریافت کر لیا ہو اور تمام ٹھوکریں کھانے کے بعد صدقِ دل سے یہ حقیقت تسلیم کر لی ہو کہ۔ اخلاقی عمل اور روحانی اقدار ہی دنیا کی سب سے اونچی۔ سب سے عظیم صداقتیں ہیں اور انہی کے ذریعہ۔ کرب و ابتلاء میں ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپتی ہوئی انسانیت کی نجات ممکن ہے۔"

اس روحانی شاہراہ کے علاوہ انسانیت کی نجات کا کوئی اور راستہ ممکن نہیں! یہ بات مسٹر البرٹ نے جس قدر صاف اور بے لاگ پیرایے میں بیان کی ہے اس پر میں سمجھتا ہوں کہ یہاں اب اس سلسلہ پر مزید کوئی بات زیرِ بحث لانے کی گنجائش باقی نہیں رہی کیونکہ "جدت" کی عینک لگا کر معذرت خواہانہ انداز میں دلائل کی تلاش میں نکلنے والے متجددین کے سامنے۔ نام نہاد جدید۔ بے دین۔ مادہ پرست اور بے قید نظامِ تعلیم کے پروردہ عالم نے خود ہی ڈنکے کی چوٹ یہ اعترافِ حقیقت کیا اور مروجہ نظامِ تعلیم کی قلعی کھول کے رکھ دی ہے۔!

ہماری بدقسمتی ہے کہ ظہورِ پاکستان سے لے کر آج تک یہاں ایک بے دین' بے روح حتیٰ کہ خالص قومی بنیادوں سے عاری نظامِ تعلیم رائج ہے اور اسی نظامِ تعلیم کا یہ اثر ہے کہ اس نے آج یہاں ہمارے ہاں (MACULLAY'S BRAIN CHILDREN) (BROWN ENGLISHMEN) اتنی تعداد میں پیدا کر دیے ہیں جنہیں ہم سیکولر نظامِ تعلیم کی مالا جپتے ہوئے دیکھتے اور سنتے ہیں'

ہمیں بہرحال یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اس نظامِ تعلیم کو آج سے ڈیڑھ سو سال قبل جب یہاں نافذ کیا گیا اور پھر جب یہ نظامِ تعلیم مسلمانوں کو سعید آقاؤں کی خواہش کے مطابق پوری طرح سانچے میں ڈھالنے میں کامیاب نہ ہو سکا تو تاجِ برطانیہ نے اس خلا کا جائزہ لینے کے لیے سر ولیم ہنٹر (W HUNTER) کو مقرر کیا' جس نے اپنی رپورٹ میں کہا؛

" THE TRUTH IS THAT OUR SISTEM OF PUBLIC INSTRUCTION IS OPPOSED TO THE TRADITION UNSUITED TO THE REQUIREMENT AND HATEFUIL TO THE RELIGION OF MUSSALMAANS"

جو دوست سوال کرتے ہیں کہ اسلامی آئیڈیالوجی کیا چیز ہے؟" میں انہیں نہایت ادب سے کہوں گا کہ آپ براہِ کرم اس قدر بیگانگی کی بات کرنے کے بجائے ذرا سی تکلیف فرمالیں اور اسلامی نظریہ' اسلامی تاریخ کا جائزہ لیں' مطالعہ کریں' تنقیدی مطالعہ کریں پھر جو سوال کریں کہ تاڑ اسلامی نظریہ کیا ہے؟ جہاں اسلامی آئیڈیالوجی پر جس ثقافتی اقدار اور جس معاشرے اور سماج کی تعمیر کی گئی تھی وہاں یہ سرخ جنت روس کی مانند یکساں ثقافت جبراً مسلط نہیں کی گئی تھی' بلکہ مشترکہ سماجی اقدار کا نفاذ اور عملی ارتقاء مثبت رویوں کے ذریعہ معرضِ ظہور میں آیا۔ اسی لیے تو ہم کہتے ہیں کہ اس معاملہ میں غیروں کی طرف دیکھ کر الٹی زقندیں لگانے کے بجائے اپنے روشن ماضی' درخشاں ورثے کو تسلیم کریں اور اس کا نفاذ کریں' نہ کہ غلط معاملات طے کرنے کے لیے خوفناک سراب کی جانب لپکیں۔!

اگلی گزارش یہ ہے کہ پاکستان جس مقصد کے لیے حاصل ہوا ہے اس مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے شیرِ بنگال اے کے فضل الحق نے مسلم لیگ پٹنہ کے اجلاس میں ١٩٣٨ء کو فرمایا تھا کہ

"ہم (پاکستان میں) ایک اسلامی نظامِ تعلیم رائج کرنا چاہتے ہیں۔!"

یہی وہ . ... !"

(تقریر ادھوری چھوڑنا پڑی چونکہ وقت ختم ہو گیا تھا)

***

- پروفیسر حمید احمد خاں (سابق وائس چانسلر جامعہ پنجاب)
- جسٹس اے آر کارنیلیس۔

ذریعہ تعلیم ؟

حمید احمد خاں
سابق وائس چانسلر جامعہ پنجاب

حقیقت ہے انگریزی زبان کی تحصیل و تدریس پر زندگی کا ایک بڑا حصہ صرف کیا ہے اور سچ پوچھئے تو میرا معاش انگریزی زبان سے وابستہ ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود میری دیانتدارانہ رائے ہے کہ پاکستان میں جس قدر جلد ہم اردو زبان کو قومی زبان کا درجہ دیں گے اتنا ہی زیادہ ہمارے لئے بہتر اور سودمند ہوگا۔ اردو کو جلد از جلد صحیح معنوں میں قومی زبان کی حیثیت سے اپنا لینے میں بے شمار فوائد مضمر ہیں۔ سب سے پہلا اور بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ اس زبان کے ذریعے کم از کم مغربی پاکستان کے مختلف حصوں کے درمیان وحدت و یگانگت قائم کی جا سکتی ہے۔ پھر اردو زبان کی ایک بین الاقوامی حیثیت بھی ہے جو ہندوستان کے مسلمانوں کو ہمارے ساتھ وابستہ رکھنے میں نہایت اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی صورت میں معیار تعلیم یقیناً بہتر ہو جائے گا۔ اب تک صورتحال یہ ہے کہ طلبا بغیر سوچے سمجھے انگریزی کے فقرے رٹتے ہیں اور یہیں امتحان کی کاپیوں میں نقل کر دیتے ہیں اپنے تجربے کی بنا پر میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ اگر طلبا کو اردو زبان میں اپنے مافی الضمیر ادا کرنے کا موقع دیا جائے تو وہ مہارت، ذہانت اور معقولیت کے ساتھ سوالوں کے جوابات دے سکیں گے۔ انگریزی کی بجائے اردو زبان کو رائج کرانے کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ہم اس ذہنی غلامی سے آزاد ہو جائیں گے جس میں ایک صدی سے مبتلا ہیں جب تک ہم صرف انگریزی کتابوں کے ذریعے سے علم حاصل کرتے رہیں گے اس وقت تک ہم آزادی کے ساتھ سوچنے کے قابل نہیں ہو سکیں گے ہمارے لئے ان تصورات اور معتقدات سے شعوری یا غیر شعوری طور پر اثر قبول نہ کرنا قریباً ناممکن ہے، جو انگریزی کتابوں اور انگریزی تمدن میں سرایت کئے ہوئے ہیں خواہ بعض صورتوں میں یہ تصورات ہماری ملی روایات سے متصادم کیوں نہ ہوں۔ میکالے نے جب برصغیر میں انگریزی زبان کو ذریعہ تدریس بنانے کی سفارش کی تھی تو اس نے اس سفارش کے مقصد کو پیش کرتے ہوئے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ "اس طریقے سے ہم ہندوستانیوں میں سے انگریز ذہن تیار کر سکیں گے"۔ تاریخ نے ثابت کر دیا ہے کہ اس کا اندازہ بالکل درست تھا انگریزی ذریعہ تعلیم نے نہ صرف ہمارے ذہنوں کو ایک خاص سانچے میں ڈھالا ہے بلکہ ہم اس احساس کمتری میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ علوم و فنون کے سارے سرچشمے صرف یورپ میں ہیں۔ آپ اندازہ کیجئے کہ جو قوم اس قسم کے احساس کمتری کا شکار ہو وہ تحقیق و تخلیق کے میدان میں کب کوئی قدم اٹھا سکتی ہے

اردو زبان کی افادیت و اہمیت اتنی واضح ہے کہ اب کسی کو اس کے خلاف کھلم کھلا کچھ کہنے کی جرأت نہیں تاہم اردو زبان کو تدریسی اور دفتری زبان بنانے کے سلسلے کے معاملات پر چوٹ پڑتی ہے وہ مختلف حیلے بہانوں سے اردو زبان کا راستہ روکنے کی کوشش کر رہا ہے مجھے یہ بات کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اونچے سرکاری افسران یہ محسوس کرتے ہیں کہ اگر اردو زبان کو دفتری زبان بنا لیا گیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ان کے ماتحت کلرک ان سے زیادہ بہتر اردو لکھ سکیں گے اور یہ بات افسران کی اہمیت اور ان کے تفوق کے حق میں نہایت ہی مہلک ثابت ہوگی موجودہ نظام تعلیم بنایا ہی اس اصول پر گیا ہے کہ ہر سال ایک سو کے قریب سی۔ ایس۔ پی آفیسر تیار ہوتے رہیں اور لاکھوں کی تعداد میں ایسے کلرک پیدا ہوں جو غلط انگریزی لکھیں تاکہ ان کے افسران ان کی غلطیوں کی اصلاح کر کے اپنے علمی تفوق کا رعب قائم رکھ سکیں۔

اس راہ کی دوسری بڑی رکاوٹ ہمارے اساتذہ ہیں جنہوں نے انگریزی زبان میں تعلیم حاصل کی، انگریزی زبان میں پرورش پائی، جنہیں وہ ہر سال طلبا کو لکھوا دیتے ہیں۔ انگریزی زبان میں تدریس کے باعث کوئی طالب علم کسی استاد سے کسی علمی یا تحقیقی موضوع پر کوئی سوال نہیں کر سکتا، کیونکہ اول تو وہ بات کو سمجھ ہی نہیں پاتا ہے اور اگر کچھ بھی رہا ہو تو اسے سوال کرنے میں یہ خدشہ حائل رہتا ہے کہ کہیں وہ غلط انگریزی استعمال کر کے پوری جماعت کے لئے مضحکہ نہ بن جائے۔ یہ تمام باتیں اساتذہ کو محنت و ریاضت سے بچائے رکھتی ہیں۔ لیکن اگر اردو ذریعہ تعلیم بن جائے تو سب سے پہلے تو خود استاد کو اپنا موضوع اچھی طرح سمجھنا پڑے گا پھر اسے اردو میں سمجھانے کے لئے اور بھی زیادہ محنت کرنا پڑے گی اور سب سے زیادہ نازک صورت حال کا سامنا اسے اس وقت کرنا ہوگا جب کوئی ذہین طالب علم سوال کر بیٹھے۔ ظاہر ہے کہ ذریعہ تعلیم کی تبدیلی مسلسل ریاضت و مشقت کا تقاضا کرتی ہے اور محنت و مشقت سے جی چرانا ہماری پوری قوم کا خاصہ ہو گیا ہے

عام طور پر یہ بات اعتبار کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ اس زبان میں درسی کتابیں موجود نہیں اور اس میں ہر موضوع کے مفاہیم و مطالب کے اظہار کی صلاحیت نہیں ہے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اردو زبان میں ہر طرح کے علوم کو بآسانی ادا کیا جا سکتا ہے درسی کتابوں کی کمی کی شکایت بھی کچھ زیادہ وزن نہیں رکھتی۔ اول تو درسی کتابوں کی تصنیف و تالیف کا کام شروع ہو چکا ہے اور مانگ کے بڑھ جانے کے ساتھ ساتھ کام کی رفتار خود بخود تیز ہو جائے گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ درسی کتابوں کی فی الفور ضرورت نہیں اگر اساتذہ اردو میں تدریس کا کام شروع کر دیں تو طلبا انگریزی میں لکھی ہوئی کتابوں سے از خود استفادہ کر لیں گے اور چند ہی سالوں کے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں معیاری درسی کتابیں تیار ہو جائیں گی

یہ تمام باتیں اتنی صاف اور واضح ہیں کہ اوسط ذہن کا آدمی بھی انہیں سمجھ لیتا ہے لیکن جب "عالی دماغ" حضرات ان حقائق سے پہلو تہی کرتے ہیں تو پھر عوام ان کی نیتوں پر شک کرنے لگتے ہیں۔ اور بعض اوقات تو مجھے بھی شبہ ہونے لگتا ہے۔

اے۔ آر۔ کارنیلیس

آپ کے نظامِ تعلیم میں بنیادی نقص یہ ہے کہ اب بھی اردو زبان کو صرف ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ کسی زبان میں چند مضمون لکھوا دینے سے وہ زبان نہیں آتی۔ زبان اسی وقت آسکتی ہے جب اس میں اور دوسرے مضامین بھی پڑھائے جائیں۔ جب تک اردو زبان کو ذریعہ تعلیم نہیں بنایا جائے گا موجودہ صورتِ حال میں کچھ زیادہ تبدیلی نہیں آئے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ (HUMANITIES) علومِ انسانی بڑی آسانی سے اردو زبان میں پڑھائے جاسکتے ہیں۔ انگلستان میں انگریزی کے ساتھ فرانسیسی زبان بھی پڑھائی جاتی ہے، لیکن فرانسیسی زبان کی حیثیت وہاں ثانوی زبان کی ہے۔ یہ حیثیت پاکستان میں انگریزی زبان کو حاصل ہونی چاہیئے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم ابھی تک انگریزی زبان سے کیوں چمٹے ہوئے ہیں۔ آپ لوگوں کو غیر ملکی زبان میں علوم و فنون پڑھنے میں جو دقت پیش آتی ہوگی اس کا اندازہ میں اپنی ذات سے کرتا ہوں۔ مجھے اردو زبان پڑھنے میں اتنی ہی دقت ہوتی ہے کہ جتنے وقت میں اردو کا ایک صفحہ پڑھتا ہوں انگریزی کے چھ صفحے پڑھ سکتا ہوں۔ مجھے اس حقیقت کا بھی احساس ہے کہ غیر مادری زبان میں انسان اپنا مافی الضمیر صحیح روح کے ساتھ بیان نہیں کرسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ انگریزی زبان میں مضامین پڑھتے ہیں تو آپ اصطلاحیں اور فقرے کے فقرے مفہوم کو سمجھے بغیر رٹ لیتے ہیں۔ آپ ایسا اس لئے کرتے ہیں کہ آپ نہ مفہوم سمجھ رہے ہوتے ہیں اور نہ سمجھنے پر قدرت رکھتے ہیں۔

زبان کا خیالات کی تشکیل میں کوئی حصہ نہیں، لیکن ہر زبان کا لفظ اپنا ایک تاریخی اور تہذیبی پس منظر رکھتا ہے۔ جب آپ کسی زبان کا کوئی لفظ استعمال کرتے ہیں تو غیر شعوری طور پر اس لفظ کا پس منظر بھی جذب کر لیتے ہیں۔ یہ پس منظر آپ کے ذہن کو خاص خطوط پر ڈھالتا رہتا ہے اور بالآخر آپ اس رنگ میں رنگے جاتے ہیں جو اس زبان کا تہذیبی اور فکری رنگ ہوتا ہے۔

چند اقتباسات

"انگریزی ذریعہ تعلیم، شاگرد اور استاد دونوں پر شدید نصابی بوجھ ڈالتا ہے۔ الفاظ کو سمجھ دیتا ہے، بے سمجھے رٹ لینے کی ہمت افزائی کرتا ہے تعلیم کے عمل کو بے جان اور میکانکی بنا دیتا ہے اور دوسرے مضامین کے مطالعہ کے لئے بہت کم وقت چھوڑتا ہے۔"

"ہم دیکھتے ہیں کہ انگریزی مدرسوں میں کافی لیاقت لڑکوں کو نہیں آتی۔ ایک مشکل ان کو غیر زبان سیکھنا۔ دوسری مشکل غیر زبان میں علوم کا سیکھنا ہونا ہے اس بات پر اکثر بحث ہوتی ہے کہ کیوں سرکاری مدرسوں میں لیاقت کامل نہیں ہوتی۔

. . . اور کیوں وہ تعلیم انگلستان کے کالجوں کے برابر نہیں ہے؟ پس میری رائے میں اس کا سبب یہی ہے کہ انگلستان میں تعلیم ان ہی لوگوں کی زبان میں ہوتی ہے اور تمام علوم و فنون ان ہی کی زبان میں ہیں اور ہر وقت اور ہر محل پر ان کو اپنے علم کی ترقی کا موقع ہوتا ہے۔ برخلاف ہندوستان کے کہ ان کو دوسری زبان پر قادر ہونے تک تمام وقت تحصیل علوم و فنون کا گزر جاتا ہے۔"

"سر سید احمد خاں"

دو چیزیں یاد رکھنا چاہئے کہ ایک غیر ملکی زبان ذریعہ تعلیم ہونا ہمارے طالب علموں پر بہت بھاری بوجھ ڈال دیتا ہے۔ زبان کے بیچ ہر قدم پر ایک شدید قسم کی رکاوٹ بنتا ہے اور ان کے سمجھنے اور جذب کرنے کی قوت کو گھٹا دیتا ہے۔ بہ کسی مضمون کی مبادیات کو سمجھے، یا کسی بات کی تشریح پوچھنے کے بجائے زبان کی باریکیوں ہی میں اٹک جاتے ہیں۔ انہیں سب سے پہلے زبان کو سمجھنے کے مرحلے سے گزرنا ہوتا ہے اور اس کے بعد پھر اصل سبق کا نمبر آتا ہے۔ انہیں سبق کے ہر فقرے کو اپنی مادری زبان میں ترجمہ کرنے کے پرمشقت عمل سے گزرنا ہوتا ہے۔ ان کا دماغ کچھ سمجھ نہیں پاتا اور سطحی معلومات کا ڈھیر بن کر رہ جاتا ہے۔

ریاضی کو اردو زبان میں پڑھنے کی وجہ سے اس پر میری گرفت بہت مضبوط تھی، کیونکہ غیر مادری زبان مفہوم کی تہ تک پہنچنے میں مانع تھی۔ میری اپنی زندگی کا تجربہ ہے کہ اردو زبان صلاحیتوں کو جلا دیتی ہے اور بعض مضمون کو سمجھنے کی قوت زیادہ کرتی ہے۔ آپ دور کیوں جاتے ہیں اپنے ملک کے مختلف علمی اداروں کے تجربے سے یہ بات اور بھی واضح ہو جائے گی۔

ہمارے ملک میں پبلک اسکول کتنے لمبے عرصے سے کام کر رہے ہیں کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ان اداروں نے ایسے افراد پیدا کئے ہیں جو تخلیقی ذہن رکھتے ہوں اور انہوں نے تحقیق یا علمی میدانوں میں کوئی قابل ذکر کام کیا ہو؟ مجھے یقین ہے کہ ان اداروں میں یہ صلاحیت اس لئے پیدا نہیں ہوتی کہ وہاں غیر ملکی زبان کا خول چڑھا ہوا ہے اور یہ خول شخصیتوں کو ایک خاص ڈھانچے میں تو ڈھال سکتا ہے لیکن اس میں گہرائی اور انفرادیت پیدا نہیں کر سکتا۔ انہیں لوگوں نے کچھ کام کیا ہے جو عام سکولوں میں پڑھے اپنے ہی ماحول سے وابستہ رہے اور اپنی ہی زبان کو اظہار کا ذریعہ بنایا۔ ان پبلک اسکولوں میں آپ کو ولولے کہاں سے ملیں گے

کاش اس فرقہ زہاد سے اٹھتا نہ کوئی   کچھ ہوئے بھی تو یہی رندِ قدح خوار ہوئے

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی

نسانیہ) اوریا مقبول جان

لی ایلی ـ لما شبقتنی

جلتے بجھتے اسم اسرار ات کے سایے تلے لمبے بالوں والے نوجوان نے
د ی ا ل ایس ڈی) کا کیپسول منہ میں رکھا اور چلنے لگا۔
تاروں کی سڑک پہ روشنیوں کی لکیروں کے درمیان ایک خوانچہ فروش بچے
نے پار کرنے کی کوشش کی، لیکن لمبی کار کی ہیڈ لائٹ کے آگے اس کا خون
آن میں سا گیا۔
اگلی پچھلی گدی پہ بیٹھی ہوئی لڑکیوں نے اپنے سینوں سے شالیں سرکائیں۔
کڑے لے سرد پاستم کے آدمی نے اپنے پیلے دانت باہر نکالے کار کی ہیڈ
کی روشنیاں تیز ہو گئیں۔
کلب کے باہر لوگوں کا ہجوم آرکسٹرا کی دھن پہ رقص رہا تھا۔ بدلتی ہوئی عورت
ر رہا تھا جو مارکیٹ پہ دوں میں وصد لائی نظر آ رہی تھی۔
دستکاری سکوں سے پیارے ریشموں میں ملبوس لڑکیاں ہاتھوں میں سارے
کے اٹھائے پکڑے سکیں۔
نوجوان زندگی سے بیزار لے تو جھی سے چلتا گیا۔
سیدھی پچھلی سڑک پہ چلتے چلتے وہ شہر سے بہت دور نکل آیا، جہاں مٹی
کی سڑک گزرے ہوئے قدموں کے نشان سنا رہی تھی۔
سامنے دریا کی لہروں کے ساتھ ساتھ معبد کے سنہری کلس کے سائے میں۔
زرد گیروی ساڑھی میں ملبوس صندلیں شانوں پہ آبنوسی بال بکھیرے اس
ف آئی۔
کون ہو تم؟ نوجوان نے پوچھا
دیوداسی!
میرے پاس آنے کا مقصد؟
میں معبد کے بڑے پجاری کا پیغام سنانے آئی ہوں کہ۔
سکون کی آشا چاہتے ہو تو آؤ میرے چرنوں میں پوتر ماحول کے باسی بن
کر اپنی جنسی بجھاؤ گے!
لیکن یہ پیغام سناتے ہوئے تمہاری آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں ۔۔ سمجھ
آؤ یہاں سے بھاگ چلیں۔
بھاگتے بھاگتے ان کے پاؤں سوج چکے تھے تھکن سے چور، وہ ایک جگہ گر گئے۔
معبد کا بڑا پجاری جس کا سینہ سنگ سیاہ اور کاسۂ سر پیتل کا تھا، اپنے
حواریوں سمیت ان کی طرف بڑھا اس کی ہمسفر اسے دیکھتے ہی سجدہ ریز ہو گئی۔
نوجوان کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے گئے۔
تمام رات ارد گرد کے چھوٹے پجاری اور معبد کی سیوا کرنے والے بڑے بڑے
مختلف اوقات میں گستاخ دیوداسی کو اس کے احکام سے ناجبر کرتے رہے۔
صبح ہونے تک اس کا سر تیہ اور گلاب میں گندھا جسم نیلا پڑ چکا تھا۔
نوجوان ساری رات رسیاں کھولنے میں مصروف رہا اور صبح ہونے تک وہ ایک
صحرا نوردہ قافلے کا ہمراہی بن چکا تھا۔
۔ قافلے والے سکوں ڈھونڈنے گھر بار چھوڑ کر نکلے تھے۔
چاندی کی جھانجھروں اور زیورات سے لدی پھندی عورت اسے اس وقت دیوداسی
سے بھی خوبصورت لگی۔

— ۰ —

سب کی زبانیں خشک ہو چکی تھیں آسمان سے آگ برس رہی تھی۔ دھوپ
میں اسے اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی اس نے اپنے خشک گلے کو لعاب سے تر کیا
اور مسکرانے کی کوشش کی ۔ قافلے والے اس کی اس حرکت پر طنزیہ مسکرائے۔
اسے وہ لوگ دولت زندگی میں اپنے آپ سے کہیں آگے نظر آئے۔
لوگوں میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں سالار کے مدتبر بیٹے نے اپنے باپ کی داڑھی
پکڑی اور پوچھا بتاؤ ہم منزل پر کب پہنچیں گے۔
سالار راستہ بھول چکا ہے اس کی یادداشت جواب دے چکی ہے ۔ جھانجھروں والی
لڑکی نے اپنے باپ سے کہا۔ لوگوں نے اس کی تائید کی۔
اگلے دن سب میں آیا سالار بدل دیا گیا ۔ اب ہم منزل کے قریب جلد پہنچیں گے
نئے سالار نے صندل کی صراحی میں سے کسی کو ایک قطرہ بھی پینے کے لیے نہ دیا۔
کچھ دن سالار کے خلاف کھسر پھسر رہی پھر سب نے یک زبان ہو کر کہا، اٹھو
اور درختوں کے سایہ دار جھنڈ تک پہنچنے کی خود کوشش کرو۔
جھانجھروں والی لڑکی نے نقاب اتار کر پیچھے رکھا اور اونٹ کی باگ تیزی سے
کھینچی ۔ اپنے میروں پہ ٹیلیں ساتے ہوئے مردوں اور عورتوں کے نعروں سے یا علی مدد
اور رام رام کی صدائیں ٹکرا رہی تھیں۔
نوجوان نے بچے کھچے ڈ ی ا ل ایس ڈی کے کیپسول کو ریت پر دے مارا
اور ان کے پیچھے چل نکلا
سفر کرتے کرتے وہ بہت دور نکل آئے سامنے صحرائی پرندوں کے غول اڑتے
نظر آ رہے تھے۔
ان کی آنکھوں میں منزل پا لینے کی چمک عیاں تھی ۔ لیکن وہ تھوڑی ہی دیر بعد
تیز اور تند آندھیوں کی لپیٹ میں پکار رہے تھے۔
"ایلی، ایلی، لما شبقتنی"
اور نوجوان ریت پر گرے کیپسول کی تلاش میں واپس جا رہا تھا۔

محمد رئیس

ہندو استاد :

مُسلم طالب علم

ستمبر ۱۹۴۳ کے دوران میٹرک فائنل کی تعلیم حاصل کرتے ہوئے بھائی جان محمد شریف مرحوم کا مری سے تبادلہ ہو گیا۔ چونکہ میں وہاں زیر تعلیم تھا، کفالت کا مسئلہ پیدا ہونے پر واپس اپنے ہی شہر حافظ آباد آنا ہوا۔ والد بزرگوار انتہائی پابند صوم و صلوٰۃ مسلمان اور مجلس احرار کے حامی تھے۔ وہ مجھے داخلہ دلوانے کے لیے آریہ سماج ہائی سکول لے کر گئے۔ جہاں کا ہیڈ ماسٹر دینا ناتھ تھا۔ اُس نے مجھے دیکھتے ہی اُلٹے سیدھے سوالات شروع کر دیئے۔ پڑھائی سے اکتاہٹ پیدا کرنے کی غیر محسوس انداز میں کوشش بھی کی اور والد صاحب سے کہا کہ دس پندرہ روز انتظار کریں پھر بتلا دوں گا۔ وہ گھر چلے گئے اور میں باقاعدگی سے اسکول آتا رہا۔ اسی اثنا میں اکتوبر آ گیا اور جب ہم نے پوچھا کہ "داخلہ کیا ہے؟" تو ہوا یوں کہ اُس نے نہایت کھردرے لہجے میں کہا "میاں اس اسکول میں کسی مسلمان طالب علم کے لیے کوئی جگہ نہیں"۔ یہ جواب سن کر غصہ تو بہت آیا، مگر کیا ہو سکتا تھا۔ ہر طرف سماج پر ہندو ہی ہندو چھائے ہوئے تھے۔ یہ سب کچھ جانتے کے باوجود کہ والد صاحب کانگرس کے حامی ہیں اور وہ انہیں اس حیثیت سے جانتا بھی تھا۔ مگر اس نے سیاسی وابستگی پر دھرم کے تعصب کو ترجیح دی۔ گھریلو معاشی مجبوریوں اور کارپردازانِ تعلیم کی اس بے رُخی کے نتیجہ میں میرا دل فی الواقع تعلیم سے اکھڑ رہا تھا، لیکن والد صاحب کا اصرار تھا کہ تمہیں ضرور پڑھاؤں گا چاہے کتنی ہی معاشی دقت ہو۔ اسی عزم پختہ کے ساتھ وہ مجھے گورنمنٹ ہائی اسکول میں لے کر پہنچ گئے۔ جہاں حسنِ اتفاق سے ہیڈ ماسٹر ایک نومسلم تھے جنہوں نے سکھ مت سے اسلام قبول کرتے ہوئے محبوب الٰہی کا نام اختیار کیا تھا۔ سخت نرم دل اور نیک نام شخصیت تھے۔ انہوں نے داخل کرنے کا وعدہ تو کر لیا، لیکن کہا کہ اس وقت تک داخلہ ممکن نہیں جب تک دسویں کلاس کا انچارج ماسٹر کوشل سفارش نہ کر دے۔ کوشل بذات خود کانگریس کا پرجوش کارکن تھا اور دل میں مسلمانوں کے خلاف انتہائی تعصب رکھتا تھا۔ کلاس روم میں ریاضی پڑھاتا اور اسکول ٹائم کے بعد اسکول بورڈنگ کی سپرنٹنڈنٹ شپ چلاتا۔ اب آپ اس بات سے اندازہ لگائیں کہ گورنمنٹ کے اسکول میں میرا داخلہ روکنے کے لیے اس نے کس قدر گھٹیا حرکت کی۔

ریاضی کا ٹیسٹ لیا۔ خدا کے فضل سے پانچ میں سے چار سوال بالکل ٹھیک تھے لیکن اس نے ہیڈ ماسٹر صاحب کو بتلایا کہ "یہ لڑکا غبی ہے اور نصاب کچھ نہیں جانتا۔" ہیڈ ماسٹر نے فوراً مجھے طلب کیا اور خصوصی اختیارات استعمال کرتے ہوئے اس سے ٹیسٹ والا پرچہ حاصل کیا۔ درحقیقت معاملہ وہی تھا یعنی پانچ میں سے چار سوال صحیح ـــ !! یہ تعصب اور بددیانتی دیکھ کر ہیڈ ماسٹر صاحب نے اپنے احساسات کا اظہار چہرے کے تاثرات سے دیتے ہوئے مجھے داخل کر لیا۔ اب کوشل نے بورڈنگ میں داخلہ دینے کو اپنی عزت کا مسئلہ بنا لیا، لیکن وہ بھی مسئلہ حل ہو گیا ـــ !

جب نتیجہ آیا تو کلاس میں بہترین پوزیشن حاصل کرنے والے پانچ لڑکوں میں سے ایک تھا۔ اسی طرح میرا کلاس فیلو امرناتھ ایک ہندو تھا جو تعلیم میں بھی بہت پیچھے، انگریزی میں کمزور اور جسمانی اعتبار سے نحیف تھا۔ اس کے برعکس اپنا کام صبح سویرے ورزش کرنا اور ڈسپلن تھا جس سے صحت بھی اچھی تھی اور قد بھی اس سے بہت زیادہ اچھا۔ میٹرک کے بعد والد گرامی نے پھر ایک ہندو پر اعتبار کرتے ہوئے امرناتھ کے والد کو کہا کہ "ریٹ کو بھرتی کروا دو۔" وہ امرناتھ اور مجھے لے کر ریکروٹنگ آفیسر کے پاس گیا۔ یہ آفیسر بھی ہندو ہی تھا۔ انٹرویو ہوا۔ پہلا ہوا امرناتھ کا انٹرویو، بقول اس کے ادھر کچھ انٹرویو کے بعد اس کی جسمانی حالت کی شعر افراسٹ دیکھ کر اندازہ ہوا کہ رجوع دار گئے۔ اکھڑے ہوئے ہیں شاید آپ کو اس بات پر اعتبار نہ آئے کہ وہیں کھڑے کھڑے ہم دونوں گپ شپ کر رہے تھے کہ امرناتھ کا والد باہر آیا ـــ جاتے اور بڑی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھا اور کہا "یار چکا ہو یا تیوں دی ٹوپی ایچ مکھ لیا گیا ہے میرا پتر، لیفٹیننٹ بھرتی ہو گیا اے تے توں حوالدار۔ جاتی ایں ناموں"۔ میں اس کا منہ تکتا رہ گیا کہ یہ کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ کیا ہم مسلمان بالکل ہی کھلونا ہیں ہندو سماج کے ہاتھوں ـــ یہ سوچتا ہوا میں ریکروٹنگ آفیسر کے پاس گیا اور کہا سر! میرے سر انٹرویو اور تعلیم و صحت اُس سے بہتر ـــ اُس نے فوراً میری بات کاٹتے ہوئے کہا "مسٹر! تم سچ کہتے ہو ہاں، لیکن کیا خیال ہے ملازمت کرنی ہے یا ـــ پھر مسکراتے ہوئے تھپکا دے کر کہا "جاؤ" ـــ میں اپنا سا منہ لے کر باہر آ گیا ـــ اور سوچتا رہا کہ ہمارا رہبر کتنا گہرا ـــ کتنا روادار ـــ اور کتنا تیز ہے ـــ !! آج یہ سوچ کر خوشیاں ہوتی ہیں کہ اگر پاکستان نہ بنتا تو ہندو یقیناً ہر دور میں اپنی قابلیت کی بنا پر نہیں، مکاری و عیاری کی بنا پر مسلمانوں کا حشر کر چکا ہوتا۔

یمین، احسن اور اس کے ساتھی مہمن سنگھ ایک جنگل میں دیکھ رہے تھے کہ ان پر گولیاں چلانے والے ہلاک ہو کر یا کسی اور کی گولیوں کی زد میں ہیں اور اب خود کو بچانے کے لیے ادھر ادھر بھاگنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر یوں محسوس ہو رہا تھا کہ مکتی باہنی کے گھیرے کو پوری طرح گھیرے میں لیا جا چکا ہے اور انہیں بھاگنے کے لیے کوئی سمت نظر نہیں آتی۔ پہلے تو کیپٹن سمجھ رہا تھا کہ پاک فوج کا کوئی دستہ مدد کو آ پہنچا، مگر جب مکتی باہنی کو گھیرے میں لے لیا گیا، تو وہ سخت حیران تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ یہاں مکتی باہنی کو گھیرے میں لینا فوج کے لیے ممکن نہیں تھا، کیونکہ فوج اس علاقے سے بالکل ناواقف تھی اور اس کام کے لیے اس علاقے کے دشوار گزار راستوں اور اس خوفناک جنگل کے چپے چپے سے واقف ہونا لازمی تھا۔ وہ ابھی معمے کو حل کرنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ ایک طرف سے نعرۂ تکبیر بلند ہوا اور پھر پاکستان زندہ باد کے نعروں سے پورا جنگل گونج اٹھا اور اس کے ساتھ ہی چاروں طرف سے مکتی باہنی پر زوردار حملہ ہو چکا تھا۔ مکتی باہنی اپنے بچاؤ کی ناکام کوشش کرتے ہوئے پیچھے ہٹ رہی تھی اور جس طرح اس سے پروگرام آ رہی تھی۔ اب کیپٹن نے اپنے ساتھیوں کو دوبارہ فائرنگ کرنے کا حکم دیا۔ ان سے رہی سہی کسر بھی نکل گئی اور تخریب پسند گاجر مولی کی طرح کٹنے لگے اور چند ہی منٹوں میں انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ یہ تقریباً ۲ افراد تھے جن میں سے ۳ ہلاک یا زخمی ہو چکے تھے۔ کیپٹن اور اس کے ساتھی جب انہیں حراست میں لینے کے لیے آگے بڑھے تو دوسری طرف سے کچھ لوگ بھی انہیں گرفتار کرنے کے لیے آ چکے تھے اور ابھی تک پاکستان زندہ باد کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ کیپٹن احسن تخریب پسندوں کی بجائے اسی کی طرف بڑھا۔ دوسری طرف سے ایک بائیس برس کا طالب علم تقریباً بھاگتا ہوا آیا اور پھر دونوں نے ایک دوسرے کو گلے لگا لیا۔

دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

نوجوان نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کیپٹن کو بتایا کہ اس کا نام خالد ہے اور وہ "البدر" کی اس کمپنی کا کمانڈر ہے اور کشور گنج کا رہنے والا ہے۔ اس نے اس مہم کے بارے میں کیپٹن کے استفسار پر بتایا کہ انہیں جب یہ معلوم ہوا کہ پاک فوج کا ایک دستہ اس جنگل میں تخریب پسندوں سے پاک کرنے کے لیے آپریشن کے لیے جا رہا ہے، تو یہ سوچتے ہوئے کہ پاک فوج اس جنگل سے بالکل ناواقف ہے اور یہاں مکتی باہنی کی طاقت بھی کافی زیادہ ہے، اس نے اپنی کمپنی کے ہمراہ جنگل میں داخل ہو کر مکتی باہنی پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور جہاں پہنچے، یہ معلوم ہوا کہ پاک فوج کا دستہ گھیرے میں آ چکا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ سب نے دیکھ لیا۔

کیپٹن احسان اور خالد اب گہرے دوست بن چکے تھے۔ اکثر تخریب پسندوں کے خلاف پاک فوج اور البدر کے مشترکہ آپریشن جاری تھے۔

ایک روز جب کیپٹن نے خالد سے کہا کہ اس علاقے میں مکتی باہنی کا لیڈر کوئی بڑا خطرناک آدمی ہے، وہ کئی کارروائیوں کی قیادت کر چکا ہے۔ اسے پکڑنے کے لیے کچھ کرنا چاہیے، تو خالد نے اسے بتایا کہ وہ اسے پکڑنے کے لیے کئی بار مختلف جگہوں پر چھاپے مار چکا ہے اور آج بھی اس سلسلے میں وہ کشور گنج جا رہا ہے اور امید ہے کہ یہ چھاپہ کامیاب رہے گا۔ کیپٹن کے پوچھنے پر کہ وہ چھاپہ کن اطلاعات کی بنیاد پر مار رہا ہے، خالد خاموش ہو گیا اور پھر کیپٹن کے اصرار پر اس نے صرف یہ کہا کہ تمام اطلاعات کہہ نہیں سکتا۔ کیپٹن نے پوچھا کہ وہ چھاپے میں کتنے آدمی ساتھ لے کر جا رہا ہے، تو اس نے کہا کہ میں اور میرے دوست ماجد اور سلیم ہی کافی ہیں۔ کیپٹن کچھ کہنا چاہتا تھا مگر وہ ان تینوں کی دلیری اور وطن پرستی کا پہلے ہی قائل ہو چکا تھا اس لیے خاموش رہا۔

رات کے تقریباً ۱۱ بجے ہوں گے کہ خالد، ماجد اور سلیم کیپٹن کے پاس پہنچ گئے۔ کیپٹن نے دیکھا کہ ایک چوتھا آدمی بھی ان کے ساتھ ہے اور ان کی گرفت میں ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ چھاپہ کامیاب رہا ہے اور مکتی باہنی کا مقامی لیڈر گرفتار ہو چکا ہے۔ کیپٹن کے پوچھنے سے پہلے ہی ماجد نے اس کی تصدیق کر دی اور پھر کیپٹن اس لیڈر سے مختلف قسم کے سوالات پوچھنے لگا، مگر وہ کسی قسم کی معلومات فراہم کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ یہ دیکھ کر کیپٹن نے اپنی ریوالور کی نالی اس کے سینے پر رکھ دی، مگر اس نے کہا:

"کیپٹن صاحب! میں آپ کا دشمن ہی سہی، مگر خالد کا بھائی تو ہوں، کیا مجھے بھی گولی مار دو گے؟"

اور کیپٹن سناٹے میں آ گیا۔

اس نے تقریباً چیختے ہوئے اس سے پوچھا کہ "تم کیا کہہ رہے ہو؟"

اس نے دوبارہ یہی کہا کہ "میں خالد کا بھائی ہوں۔"

کیپٹن نے خالد کی طرف دیکھا، تو اس کی آنکھیں پرنم تھیں اور اس نے کہا:

"ہاں، واقعی یہ میرا بھائی ہے۔ ہمارا باپ عوامی لیگ کا مقامی رہنما ہے، ہم دو بھائی ہیں اور میرا یہ بھائی مکتی باہنی کا لیڈر ہے۔"

کیپٹن نے یہ سن کر اپنی ریوالور زمین پر پھینک دی اور کہا:

"اگر یہ ایک مجاہد کا بھائی ہے، تو اسے گولی مارنا میرے بس کی بات نہیں۔"

اور پھر ... ریوالور خالد کے ہاتھ میں تھی۔

اس نے اپنے بھائی سے مخاطب ہو کر کہا "تم اگرچہ میرے بھائی ہو، مگر اس وقت معاملہ پاکستان کی سالمیت کا ہے۔ پاکستان جو کہ اسلام کا ایک قلعہ ہے اور جس کی حیثیت ایک مسجد کی سی ہے۔ اگر تم اس مسجد کو نقصان پہنچانے سے باز آنے کا وعدہ کرو تو تمہیں چھوڑ دیا جائے گا ورنہ یہاں بدر کی تاریخ دہرائی جائے گی اور اس مسجد کی حفاظت کرنے میں کوئی خونی رشتہ میری راہ میں حائل نہیں ہو سکے گا۔"

اس کا بھائی اب بھی خاموش تھا۔ شاید وہ ہندوؤں اور علیحدگی پسندوں کے دیے ہوئے نام نہاد آزادی کے نعرے سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھا اور پھر اپنے بھائی کے جملوں کی صداقت پر بھی شاید اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ اس کا بھائی تھا۔

مگر ... پھر گولی اس کے سینے سے پار ہو چکی تھی۔

ایک تخریب پسند زمین پر ڈھیر ہو چکا تھا اور اس کا مجاہد بھائی عزم و استقامت کی تصویر بنا اس کے پاس کھڑا تھا ... اور ... پھر ... وہ آنکھوں میں آنسو لیے کیپٹن احسن سے لپٹ گیا جو کہ خود اس سارے منظر کو دیکھ کر رو پڑا تھا۔

نومبر کے وسط میں کیپٹن احسن کو ڈھاکہ جانا پڑا اور جب اس نے خالد سے بھی ساتھ چلنے پر اصرار کیا، تو اس نے اپنے ونگ کمانڈر سے دو ہفتے کے لیے کیپٹن کے ساتھ جانے کی اجازت لے لی۔

۲۲ نومبر کو بھارت نے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا اور دوسری طرف مکتی باہنی کی تخریبی کارروائیاں بھی شدت اختیار کر گئیں۔ کیپٹن احسن کو نارائن گنج بھیج دیا گیا۔ خالد نے یہاں پہنچ کر بھی اپنے نارائن گنج کے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ملک دشمنوں کے خلاف کارروائیاں جاری رکھیں۔

نارائن گنج سے تقریباً دس میل دور کیمپ چوہر میں جو کہ دریائے میگھنا میں کئی میل تک پھیلا ہوا ایک

حدیدہ سے ایک بٹالین ناسی کا سمت بڑھا ہو رہی تھی تاہم تھا کہ یہ اس پورے علاقے میں کشتی ناسی کا مرکز سمجھا
تھا جس کی وجہ سے ڈھاکہ اور چاندپور کے درمیان آنے جانے والی ٹیمیں غیر محفوظ ہو گئی تھیں۔ چنانچہ ۲۸ نومبر کو
کیپٹن احسن کو پاک فوج کے ایک دستے کے علاوہ السدرز کے ۳۰ رضاکاروں کے ساتھ مل کر آپریشن کا
حکم ملا۔ ان رضاکاروں میں ایک پلاٹون مارل کالج کی تھی جس میں خالد بھی شامل تھا اور ایک کیپٹن اسی قسم
کے ہیلے ڈھاکہ سے آئی تھی جس کا کمانڈر احمد تھا۔

حملے کے دوران کیپٹن نے محسوس کیا کہ اتنی طاقت کے ساتھ یہاں قبضہ کرنا مشکل ہے، اس لیے
اس نے کوشش کی کہ اس کے خیال میں چونکہ مزید فوج کمک کے بغیر یہاں قبضہ کرنا ممکن نظر نہیں آتا تھا اس
لیے فی الحال حملے کو روک دیا جائے، مگر احمد اور خالد نے لڑتے رہنے پر اصرار کیا اور حملہ جاری رکھا ... پھر
کیپٹن نے دور سے منظر بھی دیکھا جب خالد تقریباً ننگے ہوئے کشتی ناسی کے مرکزی مورچے کے قریب پہنچ چکا تھا
اور ... ایک دستی بم سے پہلے قبضہ ہو گئے

خالد وہاں اپنی مشکل کر کے واپس آچکا تھا

احمد اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ دشمن کے اتنا قریب جا کر گولیاں برسا رہا تھا کہ دشمن بھی ٹھٹکتے ہیں۔ آئیا
مگر اسے بھی جب احمد پوری طرح دشمن کی زد میں تھا، وہ برابر آگے بڑھ رہا تھا وہ پاک سرزمین کے ایک
ایک انچ کو ملک دشمنوں سے پاک کر دینا چاہتا تھا ... اور پھر ... ایک سنسناتی ہوئی گولی اس کے سر
میں لگی اور وہ اپنی حقیقی منزل کو پا گیا۔ اس کے دو ساتھی اسی حال میں چل پر رکھ کر بسہولت کو واپس لے آئے

اب ایک بار پھر کیپٹن احسن نے حملہ روکنے کی تجویز پیش کی، مگر اب جب کہ ان کے کمانڈر کے جسم
سے رستا ہوا گرم گرم خون السدرز کے مجاہدوں کی آنکھوں کے سامنے تھا، انہوں نے انتہائی سختی کے ساتھ
اس تجویز کو رد کر دیا اور نعرہ تکبیر بلند کرتے ہوئے دشمن پر ٹوٹ پڑے ... اور پھر تھوڑی ہی دیر
میں لوہاگھپ چر ملک دشمنوں سے پاک ہو چکا تھا

دوسرے روز خالد میمن سنگھ کے لیے روانہ ہو گیا

۳ دسمبر کو مغربی محاذ پر بھی جنگ چھڑ گئی اور اس کے ساتھ ہی کیپٹن احسن کو واپس میمن سنگھ بھیجے
کا حکم ملا

مشرقی محاذ پر ایئر فورس نہ ہونے کے باوجود پاک فوج انتہائی دلیری کے ساتھ لڑ رہی تھی
اور دشمن انتہائی کوششوں اور زبردست جانی نقصان اٹھانے کے باوجود سرحدوں سے کچھ زیادہ آگے
نہ بڑھ سکا تھا اور پھر دشمن نے ... دیکھتے ہوئے کہ پاک فوج کی پہلی دفاعی لائن کو بھی توڑنا اس کے
بس کی بات نہیں، پاک فوج کے عقب میں چھاتہ بردار فوج اتارنی شروع کر دی۔ صورتِ حال اگرچہ
بڑی نازک تھی مگر فوجیوں کے حوصلے اب بھی بلند تھے۔

اور پھر

۱۶ دسمبر کی صبح جب کیپٹن احسن نے خالد کو بتایا کہ پاک فوج ہتھیار ڈال رہی ہے، اور
اس نے ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ اسے مذاق سمجھ رہا تھا، مگر جب کیپٹن نے اسے بتایا کہ واقعی یہ حقیقت
ہے، تو اس پر گویا قیامت گزر گئی۔ اس کی آنکھیں پتھرا گئیں اور وہ لڑکھڑا گیا۔ کیپٹن نے اسے سہارا
دیا، اسے پانی پلایا اور جب وہ ہوش میں آیا، تو اس نے آنکھیں کیپٹن کے چہرے پر گاڑ دیں۔ کیپٹن
نے اسے بتایا کہ فوج کو یہ سب بتایا گیا تھی، مگر اسے انسانی کا حکم دیا گیا۔ خالد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ
سرخ ہو چکا تھا۔ اس نے کہا:

"کس نے حکم دیا ہے؟"

کیپٹن نے کہا "غالباً یحییٰ خان کا حکم ہے۔"

خالد گرجا "یحییٰ خان کا حکم ماننے والو! تمہیں بابائے قوم کا وہ حکم یاد نہیں۔

"اگر کبھی پاکستان کی حفاظت کے لیے تمہیں جنگ کرنا پڑے تو پہاڑوں میں لڑنا، جنگلوں میں
لڑنا، دریاؤں میں لڑنا، میدانوں میں لڑنا، آخر دم تک لڑنا اور کسی صورت میں دشمن کے سامنے ہتھیار
نہ ڈالنا۔"

کیپٹن احسن خاموش تھا اور خالد کی صدا سسکی بھرائی ہوئی اور گونج رہی تھی

"دشمن کے سامنے ہتھیار ڈالنے والو! تم صرف پاکستان سے نہیں بلکہ پورے عالم اسلام سے غداری
کر رہے ہو، تم اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ سے غداری کر رہے ہو، اسلام کے اس قلعے کی حفاظت
کرتے ہوئے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہانے کے بجائے دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال دینے والو!
تم محمد عربی کو کیا منہ دکھاؤ گے؟"

خالد واپس جانے کے لیے مڑا، تو کیپٹن نے اسے روکتے ہوئے آہستہ سے کہا کہ اب جب
کہ فوج ہتھیار ڈال رہی ہے، السدرز کا لڑتے رہنا عقلمندی نہیں ہے، اس لیے مناسب یہ ہے کہ ...

ابھی کیپٹن نے اتنا ہی کہا تھا کہ خالد کا ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر پڑا۔

"خاموش!" خالد گرجا "دیکھو! سلطان ٹیپو کیا کہہ رہا ہے: شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی
سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔" پھر وہ تیزی سے باہر نکل گیا اور کیپٹن احسن پُرنم آنکھوں سے اسے دُور
تک جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

**

کیپٹن احسن جنگی قیدی ہو گیا

بقیہ: کیڈٹ کالجز

اگر کوئی فرد بیرونی ماحول سے قطع نظر کر کے ان کیڈٹ کالجوں سے موجودہ نظام کو برقرار رکھ کر اصلاحِ احوال
کی ظاہر سوچتا ہے تو یہ ایک مبہم اور ناممکن بات ہے۔ جب تک رائج الوقت نظام کو جڑ سے
اکھاڑ نہیں پھینکا جائے گا اور اسلامی نظام تعلیم کو عام ملک میں رواج دینے کی سنجیدہ کوششیں نہیں کی
جائیں گی، اس وقت تک اصلاحات کی کوشش کرنا جڑوں کے بجائے پتوں کو پانی دینے کے
مترادف ہوگا

کیڈٹ کالجوں کی سکیم بذاتِ خود بہت اچھی ہے اور اسلام کی نگرانی کے تحت ان سے بہت
مفید کام لیے جا سکتے ہیں، مگر بیرونی اصلاح بہت لازمی ہے اور کوئی بھی تدبیر اس وقت تک کارگر ثابت
نہیں ہو سکتی جب تک تمام ماحول اس کے ساتھ ہم آہنگ نہ ہو۔ بس ان اداروں کے موجودہ ماحول
کا جائزہ لے کر بے جا پابندیاں ختم کر دی جائیں اور طلبہ کی ذہنی، جسمانی، اخلاقی اور تعلیمی تربیت
میں اس اصول سے کام لیا جائے کہ جب تک کسی پابندی کے پیچھے دلیل اور حکمت نہ ہو تب
تک جبر کے ذریعے تربیت لاحاصل ہے۔ اگر ان اداروں کو واقعی ذہین لوگوں کے لیے
کھولنا ہے، تو موجودہ نظام تعلیم کو ختم کر دینا ہوگا اور جب طلبہ ایک ایسے نظام تعلیم کے تحت
پڑھیں گے جہاں مقابلہ مساوی سطح پر ہو، تب صحیح طریقے سے مختلف طلبہ کو پرکھا جا سکے گا
جب ایسے طلبہ کو داخل کیا جائے تو ان کی تعلیم بالکل مفت ہونی چاہیے۔ واضح رہے کہ تعلیم مفت
کرنے کا مطلب ہم ... ٹیوشن فیس ختم کر دینا نہیں

انحطاط کے اس دور میں باقی کالجوں کی نسبت کیڈٹ کالج اب بھی غنیمت ہیں۔ اس لیے
مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تحریکِ اسلامی سے وابستہ افراد اگر اپنے چھوٹوں کو ان اداروں میں بھیجنا
چاہتے ہوں، تو اس کے ساتھ وہ ان تمام خامیوں کو مدنظر رکھیں اور اپنے بچوں یا چھوٹے بھائیوں
کو اخلاق و کردار کے اسلحہ سے لیس کریں۔ ان میں احساسِ خودی کو بیدار کریں، تنقید و محاسبہ کا مادہ
ابھاریں اور ملک کی سیاسی صورتِ حال اور عالمی حالات کے متعلق ان کو لٹریچر پڑھوائیں اور بحث
مباحثہ میں ان کی حوصلہ افزائی کریں۔ تحریکِ اسلامی کے لٹریچر کی ایک کتاب کیڈٹ کالج کے
پانچ سالہ تربیت سے کہیں افضل و برتر ہے۔ اس لیے ان طلبہ کو اس لٹریچر سے روشناس کرائیں
تاکہ ان کا ضمیر نیکی اور بدی میں تمیز کر سکے۔ ان تدابیر کو ملحوظ رکھتے ہوئے امید ہے کہ طلبہ پر ان
کے منفی اثرات نہیں پڑیں گے۔

**

(قلمی مذاکرہ)

پاکستان کے معروف ادیبوں کو اس نمبر کے لیے درج ذیل سوالنامہ بھیجا گیا۔ جس کے جوابات مندرج ہیں۔

1. طالب علم کے لیے اچھے تخلیقی ادب کو سمجھنے کی خاطر آپ کون سی اکائیاں کون سی بنیادیں مہیا کرنا پسند کریں گے؟
2. درسگاہوں میں پڑھائے جانے والے ادب کے انتخاب، تدوین اور ترتیب سے آپ کس قدر مطمئن ہیں؟
3. تفریحی ادب، تعمیری ادب، تخریبی ادب، تینوں میں فرق؟
4. ادب میں فحاشی اور بے مقصدیت کے کون سے سانچے ہیں کہ جن کے جانے سے صاف ستھرا ادب تشکیل پا سکے؟
5. کیا اچھا ادیب بننے کے لیے ضروری ہے کہ وہ ملحد ہو؟
6. نصاب تعلیم کو نظریۂ پاکستان سے ہم آہنگ کرنا آپ کے نزدیک خیال خام یا عملی بات؟

ماہر القادری (کراچی)

طالب علم کو تخلیقی ادب اور تعمیری ادب کو سمجھنے کے لیے ایسی کتابیں پڑھنی چاہئیں جو صحیح افکار کی ترجمان ہوں اور رسائل و جرائد میں صحت پائی جاتی ہو، جسے "ترقی پسند ادب" یا "جدیدیت" کہا جاتا ہے اس میں بڑی کمزوریاں اور گمراہیاں ہیں۔ ایسی کتابیں مہیا کیجیے۔ "ادب عالیہ" طالب علم کے ذہن و فکر اور شعور کی تربیت و تہذیب کرتا ہے، سب سے بڑی چیز ذہن و فکر کا سلجھاؤ ہے۔

(۲) درسگاہوں میں پڑھائے جانے والے ادب کے انتخاب کے بارے میں راقم الحروف پوری طرح مطمئن نہیں ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس انتخاب میں ناہمواری ملتی ہے، غلطی —— سستی بھی، جسے عروض کی اصطلاح میں "ہشت گربہ" کہتے ہیں۔ میرے دو تین برس پہلے بچوں کے نصاب کی کتاب میں ناظر کے بارے میں پڑھایا گیا، وہ "کال" بھی ہوتی ہے حالانکہ کال کی جگہ "آدمی" لکھا جانا چاہیے تھا۔ اس بات کو تقریباً ۴۰ برس ہو رہے ہیں۔ کراچی یونیورسٹی کے بی اے کے اردو نصاب میں میر تقی میر کی وہ غزلیں دی گئیں جو انتہائی پست اور سطحی تھیں۔ اب سے پچاس برس پہلے انگریز کے زمانہ میں میٹرک اور انٹرنس کا جو اردو نصاب تھا، اس میں ایک بھی عاشقانہ غزل نہ تھی۔ درسی کتابوں میں بھی کئی برس سے سیاست داخل ہو گئی ہے۔ مثلاً سندھ یونیورسٹی کے نصاب میں مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے والد کو "بڑے آدمی" کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ یونیورسٹیوں کے نصاب کی تدوین میں بھی سفارشیں چلتی ہیں اور صورت حال کچھ "تخمیس ماہی" کی سی پیدا ہو گئی ہے۔

(۳) تفریحی ادب اس ادب کا نام ہے جس میں تفریح و انبساط کے عناصر و عوامل جائز حدود میں پائے جاتے ہیں۔ تفریح زیادہ شوخ ہو جائے تو "پھکڑپن" بن جاتی ہے۔ تفریحی ادب دل و دماغ کی تفریح کے لیے بہت ضروری ہے۔ کوئی آدمی کتنا ہی سنجیدہ کیوں نہ ہو، اس کا دل بھی لطائف و ظرائف سے لطف لینے، مسکرانے اور ہنسنے کو چاہتا ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام سے خوش

شیخِ مکتب ہے اک عمارت گر — جس کی صنعت ہے روحِ انسانی
نکتۂ دل پذیر تیرے لیے — کہہ گیا ہے حکیمِ قاآنی
"پیشِ خورشید برمکش دیوار
خواہی از صحنِ خانہ نورانی"

تصورِ علم

علم از سامانِ حفظِ زندگی است — علم از اسبابِ تقویمِ خودی است
علم و فن از پیش خیزانِ حیات — علم و فن از خانہ زادانِ حیات

وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیمؑ — کیا ہے جس کو خدا نے دلِ نظر کا ندیم
زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک — دلیلِ کم نظری قصۂ جدید و قدیم
چمن میں تربیتِ غنچہ ہو نہیں سکتی — نہیں ہے قطرۂ شبنم اگر شریکِ نسیم
وہ علم کم بصری، جس میں ہم کنار نہیں
تجلیاتِ کلیم و مشاہداتِ حکیم

تربیت

زندگی کچھ اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے — زندگی سوزِ جگر ہے علم ہے سوزِ دماغ
علم میں دولت بھی ہے قدرت بھی ہے لذت بھی ہے — ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ
اہلِ دانش عام ہیں کم یاب ہیں اہلِ نظر — کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ
شیخِ مکتب کے طریقوں سے کشادِ دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک
نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

مکتبوں میں کہیں رعنائیِ افکار بھی ہے؟
خانقاہوں میں کہیں لذتِ اسرار بھی ہے؟

بُرہے افکار سے ان مدرسہ والوں کا ضمیر
خوب و ناخوب کی اس دور میں ہے کس کو تمیز
چاہیے خانۂ دل کی کوئی منزل خالی
شاید آجائے کہیں سے کوئی مہمانِ عزیز

اُٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک
نہ زندگی نہ محبت نہ مسرت نہ نگاہ

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لَآ اِلٰہ اِلّا اللہ

مغربی تعلیم اور اس کے نتائج

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم — ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا — کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

آہ مکتب کا جوانِ گرم خوں — ساحرِ افرنگ کا صیدِ زبوں

یہ مدرسہ، یہ کھیل، یہ غوغائے روارو — اس عیشِ فراواں میں ہے ہر لحظہ غمِ نو
وہ علم نہیں زہر ہے احرار کے حق میں — جس علم کا حاصل ہے جہاں میں دو کفِ جو

پڑھ لیے میں نے علومِ شرق و غرب
روح میں باقی ہے اب تک درد و کرب

مجھے وہ بھی دن کہ خدمتِ استاد کے عوض — دل چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجیے
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق — کہتا ہے ماسٹر سے کہ بل پیش کیجیے

دیکھیے چلتی ہے مشرق کی تجارت کب تک — شیشۂ دیں کے عوض جام و سبو لیتا ہے
ہے مداوائے جنوں نشترِ تعلیمِ جدید — میرا سرجن رگِ ملت سے لہو لیتا ہے

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر — لبِ خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم — کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما — لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

"تخمِ دیگر بکف آریم و بکاریم ز نو
کانچہ کشتیم ز خجلت نتواں کرد درو"

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی — ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدِنظر — وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

پاک و ہند کے تعلیمی ادارے

اقبال یہاں نام نہ لے علمِ خودی کا — موزوں نہیں مکتب کے لیے ایسے مقالات
بہتر ہے کہ بیچارے ممولوں کی نظر سے — پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات
محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی
موسیقی و صورت گری و علمِ نباتات

مسلمان طالب علم سے

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے — قبض کی روح تری دے کے تجھے فکرِ معاش
دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا — زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوقِ خراش
اس جنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا — جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش
فیضِ فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا — جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہِ خفاش
مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو
خلوتِ کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

مرحلہ در مرحلہ

(مقالہ نگار نے اس مضمون میں نظام تعلیم کو اسلامی بنیادوں پر اٹھانے کے لئے اور اس کے نفاذ کا عملی نقشہ کار واضح کیا ہے ——————— محمود)

اگر ہمیں اپنے موجودہ نظام تعلیم کی اصلاح کرنی ہے تو ہمیں ایک انقلابی قدم اٹھانا پڑے گا۔ درحقیقت اب یہ ناگزیر ہو چکا ہے کہ وہ دونوں نظام تعلیم ختم کر دئے جائیں جو اب تک ہمارے ہاں رائج رہے ہیں۔ پرانا مذہبی نظام تعلیم بھی ختم کیا جائے اور یہ موجودہ نظام تعلیم بھی جو انگریز کی رہنمائی میں قائم ہوا تھا۔ ان دونوں کی جگہ ہمیں ایک نیا نظام تعلیم بنانا چاہیئے جو ان کے نقائص سے پاک ہو اور ہماری ان ضرورتوں کو پورا کر سکے جو ہمیں ایک مسلمان قوم اور ایک آزاد قوم اور ایک ترقی کی خواہش مند قوم کی حیثیت سے اس وقت لاحق ہیں۔ اسی نظام تعلیم کا نقشہ اور اس کے قائم کرنے کا طریقہ میں یہاں پیش کر رہا ہوں۔

مقصد کا تعین

اس نئے نظام تعلیم کی تشکیل میں اولین چیز جسے ہم کو سب سے پہلے طے کرنا چاہیئے یہ ہے کہ ہمارے پیش نظر تعلیم کا مقصد کیا ہے؟ جن لوگوں کے نزدیک تعلیم کا مقصد بس علم حاصل کرنا ہے وہ کہتے ہیں کہ لوگوں کو بالکل غیر جانبدار تعلیم دی جانی چاہیئے تاکہ وہ زندگی کے مسائل اور معاملات اور حقائق کا بالکل معروضی مطالعہ (OBJECTIVE STUDY) کریں اور آزادانہ نتائج اخذ کر سکیں لیکن میں کہتا ہوں کہ اس طرح کا معروضی مطالعہ صرف فوٹو کیمرے کیا کرتے ہیں، انسان نہیں کر سکتے۔ انسان آنکھوں کے پیچھے ایک دماغ بھی رکھتا ہے جو بہرحال ایک نقطۂ نظر رکھتا ہے۔ زندگی میں اپنا مقصد رکھتا ہے اور وہ جو کچھ بھی دیکھتا ہے جو کچھ بھی سنتا ہے اور جو کچھ بھی معلومات حاصل کرتا ہے اسے اپنی اس فکر کے سانچے میں ڈھالتا جاتا ہے جو اس کے اندر بنیادی طور پر موجود ہوتی ہے۔ پھر اسی فکر کی بنیاد پر اس کا وہ نظام زندگی قائم ہوتا ہے جس کو ہم اس کا کلچر کہتے ہیں۔ اب اگر ہم ایک کلچر رکھتے ہیں اور ہم ایک ایسی قوم ہیں جس کے اپنے کچھ عقائد ہیں جس کا اپنا ایک نظریۂ زندگی ہے جس کا اپنا ایک نصب العین ہے جو اپنی زندگی کے کچھ اصول رکھتی ہے تو لازماً ہمیں اپنی نسلوں کو اس غرض کے لئے تیار کرنا چاہیئے کہ وہ ہمارے اس کلچر کو سمجھیں، اس کی قدر کریں، اس کو زندہ رکھیں اور آگے اسے اس کی اصلی بنیادوں پر ترقی دیں۔ دنیا کی ہر قوم اسی غرض کے لئے اپنا مستقل نظام تعلیم قائم کیا کرتی ہے۔ مجھے کوئی قوم ایسی معلوم نہیں ہوتی جس نے اپنا نظام تعلیم خالص لادینی بنیادوں پر قائم کیا ہو جو اپنی نسلوں کو بے رنگ تعلیم دیتی ہو اور اپنے ہاں ایسے غیر جانبدار نوجوان پرورش کیا کرتی ہو جو تعلیم سے فارغ ہو کر آزادی کے ساتھ یہ فیصلہ کریں کہ انہیں اپنی قومی تہذیب کی پیروی کرنی ہے یا کسی تہذیب کی۔ اسی طرح مجھے ایسی بھی کوئی آزاد قوم معلوم نہیں جو دوسروں سے ان کا نظام تعلیم جوں کا توں لے لیتی ہو اور اپنی تہذیب کا کوئی رنگ اس میں شامل کئے بغیر اسی کے سانچے میں اپنی نسلوں کو ڈھالتی جاتی ہو۔ رہی یہ بات کہ کوئی قوم اپنے لئے دوسروں کا تجویز کردہ ایک ایسا نظام تعلیم اختیار کرے جو اس کے نوجوانوں کی نگاہ میں اس قوم اور اس کے مذہب، اس کی تہذیب، اس کی تاریخ، ہر چیز کو ذلیل و خوار کر کے رکھ دے اور ان کے دل و دماغ پر انہی لوگوں کے تصورات و نظریات کا نقشہ لگا دے جنہوں نے اس کے لئے یہ نظام تجویز کیا ہے تو میرے نزدیک یہ ایسی چیز ہے جس کا ارتکاب کوئی صاحب عقل قوم بحالت ہوش و حواس نہیں کر سکتی۔ یہ حماقت اگر پہلے ہم کمزوری اور بے بسی کی وجہ سے کر رہے تھے تو اب آزاد ہونے کے بعد اسے حسب سابق جاری رکھنے کے لئے کوئی معنی نہیں۔ اب تو نظام زندگی ہمارے اختیار میں ہے۔ اب لازماً ہمارے پیش نظر تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہم ایسے افراد تیار کریں جو ہماری قومی تہذیب کو اور ہماری قومی تہذیب ہمارے دین کے سوا اور کیا ہے؟ لہذا ہمارے دین کو اچھی طرح سمجھتے ہوں۔ اس پر سچے دل سے ایمان رکھتے ہوں، اس کے اصول کو جانتے ہوں اور ان کے برحق ہونے کا یقین رکھتے ہوں۔ اس کے مطابق مضبوط سیرت اور عامل اعتقاد اخلاق رکھتے ہوں اور اس قابلیت کے مالک ہوں کہ ہماری اجتماعی زندگی کے پورے کارخانے کو ہماری اس تہذیب کے اصولوں پر چلا سکیں اور مزید ترقی دے سکیں۔

سکھائے جائیں اس کے اندر جھوٹ سے، دھوکے اور فریب سے، خود غرضی اور نفس پرستی، چوری اور جعل سازی سے، بددیانتی اور خیانت سے، شراب اور سود
اور قمار بازی سے، ظلم اور بے انصافی اور لوگوں کے حق مارنے سے سخت نفرت دلوں میں بٹھائی جائے اور بچوں کے اندر ایک ایسی رائے عام
پیدا کرنے کی کوشش کی جائے کہ جس شخص میں بھی وہ اخلاقی برائیوں کا اثر پایا جائے اس کو بری نگاہ سے دیکھیں اور اس کے متعلق برے خیالات کا اظہار کریں
یہاں تک کہ اس درسگاہوں سے فارغ ہو کر اگر آگے کوئی شخص ایسا نکلے جو ان برائیوں میں مبتلا ہو تو اس کے اپنے ساتھی اس کو لعنت ملامت کرنے والے ہوں نہ کہ
واہ واہ کرنے اور نہ حوصلہ بڑھانے والے۔ اسی طرح ہم یہ چاہتے ہیں کہ وہ نیکیاں جن کو اسلام انسان کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے ان کو دریافت کر کے بیان کیا جائے ان کی
طرف رغبت دلائی جائے ان کی تعریف کی جائے، ان کے اچھے نتائج تاریخ سے مثال نکال کر بتائے جائیں اور عقل سے ان کے فائدے سمجھائے جائیں کہ یہ نیکیاں
حقیقت میں انسانیت کے لئے مطلوب ہیں اور انسانیت کی بھلائی انہی کے اندر ہے۔ بچوں کو دلنشین طریقے سے بتایا جائے کہ وہ اصلی خوبیاں کیا ہیں جو ایک
انسان کے اندر ہونی چاہئیں اور ایک بھلا آدمی کیسا ہوا کرتا ہے۔ اس میں ان کو صداقت اور دیانت کا، امانت اور پاس عہد کا، عدل و انصاف اور حق شناسی کا، ہمدردی
اور اخوت کا، ایثار اور قربانی کا، فرض شناسی اور پابندی حدود کا، اکل حلال اور ترک حرام کا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کھلے اور چھپے ہر حال میں خدا سے ڈرتے ہوئے
کام کرنے کا سبق دیا جائے اور عملی تربیت سے بھی اس امر کی کوشش کی جائے کہ بچوں میں یہ اوصاف نشوونما پائیں۔

سوم یہ کہ ابتدائی تعلیم میں ہی اسلام کے بنیادی حقوق اور ایمانیات بچوں کے ذہن نشین کرا دئے جائیں۔ اس کے لئے اگر دینیات کے ایک الگ کورس
کی ضرورت محسوس ہو تو بنایا جا سکتا ہے لیکن بہرحال صرف اسی ایک کورس پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ ان ایمانیات کو دوسرے تمام مضامین میں بھی روح تعلیم کی
حیثیت سے پھیلا دیا جائے۔ ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ ہر مسلمان بچے کے دل میں توحید کا عقیدہ، رسالت کا عقیدہ، آخرت کا عقیدہ، قرآن کے برحق ہونے
کا عقیدہ، شرک اور کفر اور دہریت کے باطل ہونے کا عقیدہ پوری قوت کے ساتھ بٹھا دیا جائے اور یہ تلقین ایسے طریقے سے ہونی چاہئے کہ بچہ یہ محسوس
کرے کہ یہ کچھ دعوے اور کچھ تحکمات ہیں جو اس سے منوائے جا رہے ہیں، بلکہ اسے یہ محسوس ہو کہ یہی کائنات کی معقول ترین حقیقتیں ہیں ان کا جاننا اور ماننا
انسان کے لئے ضروری ہے اور ان کو مانے بغیر آدمی کی زندگی درست نہیں ہو سکتی۔

چہارم یہ کہ بچے کو اسلامی زندگی بسر کرنے کے طریقے بتائے جائیں اور اس سلسلے میں وہ تمام فقہی مسائل بیان کر دئے جائیں جو ایک مسلمان لڑکے اور
لڑکی کو معلوم ہونے چاہئیں۔ طہارت و پاکیزگی کے احکام، وضو کے مسائل، نماز اور روزے کے طریقے، حرام اور حلال کے ابتدائی حدود، معاشرتی زندگی کے بنیادی
اطوار، یہ وہ چیزیں ہیں جو ہر مسلمان بچے کو معلوم ہونی چاہئیں۔ ان کو صرف بیان ہی نہ کیا جائے بلکہ ایسے طریقے سے ذہن نشین کیا جائے جس سے بچے یہ محسوس
کریں کہ ہمارے لئے یہی احکام ہونے چاہئیں۔ یہ احکام بالکل برحق ہیں اور ہم کو ایک صاف ستھری اور پاکیزہ زندگی بسر کرنے کے لئے ان احکام کا پابند ہونا چاہئے۔

ثانوی تعلیم: اس کے بعد ہائی سکول کی تعلیم کو لیجئے۔ اس مرحلے میں سب سے پہلی چیز جسے میں ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ عربی زبان کو
بطور لازمی زبان پڑھایا جائے۔ اسلام کا اصل ماخذ سارے کے سارے عربی زبان میں ہیں۔ قرآن عربی میں ہے، حدیث عربی میں
ہے، ابتدائی صدیوں کے فقہا اور علماء نے جتنا کام کیا ہے وہ سب عربی میں ہے، اسلامی تاریخ کے اصل ماخذ بھی عربی زبان ہی میں ہیں۔ کوئی شخص اسلام
کی سپرٹ پوری طرح سے نہیں سمجھ سکتا اور نہ اس میں اسلامی ذہنیت اچھی طرح پیدا ہو سکتی ہے جب تک کہ وہ قرآن کو براہ راست اس کی اپنی زبان
میں نہ پڑھے۔ محض ترجموں سے کام نہیں چلتا۔ اگرچہ ہم چاہتے ہیں کہ ترجمے بھی پھیلیں تاکہ ہمارے عوام الناس کم از کم یہ جان لیں کہ ہمارا خدا ہمیں کیا
حکم دیتا ہے لیکن ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں میں کوئی ایسا نہیں ہونا چاہئے جو عربی زبان سے ناواقف ہو۔ اس لئے ہم عربی کو بطور ایک لازمی مضمون کے شامل
کرنا چاہتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ ایک شخص جب ہائی سکول سے فارغ ہو کر نکلے تو اس کو اس قدر عربی آنی ہو کہ وہ ایک سادہ عربی عبارت کو صحیح پڑھ اور سمجھ
سکے۔ ثانوی تعلیم کا دوسرا مضمون قرآن مجید ہونا چاہئے جس سے کم از کم دو پارے ہر میٹرک پاس طالب علم اچھی طرح سمجھ کر پڑھ چکا ہو۔ وقت بچانے کے
لئے ایسا کیا جا سکتا ہے کہ ہائی سکول کے آخری مرحلوں میں عربی زبان قرآن کے ذریعہ پڑھائی جائے۔

تیسرا لازمی مضمون اسلامی عقائد کا ہونا چاہئے جس میں طلبا کو نہ صرف ایمانیات کی تفصیل سے آگاہ کیا جائے بلکہ انہیں یہ بھی بتایا جائے کہ ہمارے پاس
ان عقائد کے دلائل کیا ہیں۔ انسان کو ان کی ضرورت کیا ہے۔ انسان کی عملی زندگی سے ان کا ربط کیا ہے۔ ان کے ماننے یا نہ ماننے کے کیا اثرات انسانی زندگی
پر مترتب ہوتے ہیں اور ان عقائد پر ایمان لانے کے اخلاقی اور عملی تقاضے کیا ہیں۔ یہ امور ایسے طریقے سے طلبہ کے ذہن نشین کئے جائیں کہ وہ محض آپ دادا
کے مذہبی عقائد ہونے کی حیثیت سے ان کو نہ مانیں بلکہ یہ ان کی اپنی رائے بن جائیں۔

اسلامی عقائد کے ساتھ ساتھ اسلامی اخلاقیات کو بھی ابتدائی تعلیم کی بہ نسبت ثانوی تعلیم میں زیادہ تفصیل اور تشریح کے ساتھ ساتھ بیان کیا جائے
اور تاریخ سے نظیریں پیش کر کے یہ بات ذہن نشین کی جائے کہ اسلام کے یہ اخلاقیات محض خیالی اصول اور کتابی نظریے نہیں ہیں بلکہ عمل میں لانے کے لئے
ہیں اور فی الواقع اس سیرت و کردار کی ایک ایسی رائے عام پیدا کرنے کی کوشش کی جائے کہ اسلام جن اوصاف کی مذمت کرتا ہے طلبہ خود ان اوصاف کو
برا سمجھیں اور اپنی سوسائٹی میں ان صفات کے لوگوں کو ابھرنے نہ دیں اور اسلام جن اوصاف کو مقصود اور مطلوب قرار دیتا ہے ان کو وہ خود پسند کریں،
انہیں اپنے اندر نشوونما دیں اور ان کی سوسائٹی میں انہی اوصاف کے لوگوں کی ہمت افزائی ہو۔

میٹرک کے معیار تک پہنچتے پہنچتے ایک بچہ جوان ہو چکا ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں اس کو اسلامی زندگی کے متعلق ابتدائی تعلیم کی بہ نسبت زیادہ تفصیلی احکام
جاننے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں اس کو شخصی اور رواتی زندگی، خاندانی زندگی اور تمدن و معاشرت اور لین دین وغیرہ کے متعلق ان عام ضروری احکام سے

(۲) علوم قرآن جن میں پہلے اصول تفسیر اور فن تفسیر کے مختلف اسکولوں کی خصوصیات سے طلباء کو آشنا کیا جائے اور پھر قرآن مجید کا تحقیقی مطالعہ کرایا جائے۔

(۳) علوم حدیث، جن میں اصول حدیث، تاریخ علم حدیث اور فن جرح و تعدیل پڑھانے کے بعد حدیث کی اصل کتابیں ایسے طریقے سے پڑھائی جائیں کہ طلبہ ایک طرف خود احادیث کو پرکھنے اور ان کی صحت و سقم کے متعلق رائے قائم کرنے کے قابل ہو جائیں اور دوسری طرف حدیث کے متفرق ذخیرے پر ان کو عبور حاصل ہو جائے۔

(۴) فقہ، جس کی تعلیم لاء کالجوں کی تعلیم فقہ سے ذرا مختلف ہو۔ یہاں صرف اتنا کافی ہے کہ طلبہ کو اصولِ فقہ، تاریخ علم فقہ، مذاہب فقہ کی امتیازی خصوصیات اور قرآن و حدیث کے نصوص سے استنباط احکام کے طریقے اسی طرح سکھائے جائیں۔

(۵) علم العقائد، علم کلام اور تاریخ علم کلام، جسے اس طریقے سے پڑھایا جائے کہ طلبہ اس علم کی حقیقت سے واقف ہو جائیں اور متکلمین اسلام کے پورے کام پر ان کو جامع نظر حاصل ہو جائے۔

(۶) تقابل ادیان جس میں دنیا کے تمام بڑے بڑے مذاہب کی تعلیمات سے ان کی امتیازی خصوصیات سے اور ان کی تاریخ سے طلبہ کو آشنا کیا جائے۔

اس علم سے جو لوگ فارغ ہوں، مجھے اس سے کوئی بحث نہیں کہ آپ ان کی ڈگری کا نام کیا رکھیں مگر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے ہاں آئندہ انہی لوگوں کو "علمائے دین" کہا جانا چاہئے جو اس ڈگری کو حاصل کریں اور ان کے لئے ان تمام اعلیٰ ملازمتوں کے دروازے کھلے ہونے چاہئیں جو دوسرے مضامین کے ایم اے اور پی ایچ ڈی حضرات کو مل سکتی ہیں۔

لازمی تدابیر یہ ہے میرے نزدیک اس نظام تعلیم کا نقشہ جو موجودہ مذہبی تعلیم اور دنیوی تعلیم کے نظام کو ختم کر کے اس ملک میں قائم ہونا چاہئے۔ مگر اصلاحِ حال ساری کوشش لاحاصل رہے گی جب تک کہ مذکورہ بالا اصلاحات کے ساتھ ساتھ چند دوسرے اقدامات بھی نہ کئے جائیں۔

سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہم اپنی تعلیمی پالیسی کی باگیں ایسے لوگوں کے ہاتھ میں دیں جو اسلامی فکر رکھتے ہوں، اسلامی نظام تعلیم کو جانتے ہوں اور اسے قائم کرنا چاہتے بھی ہوں۔ یہ کام اگر ہو سکتا ہے تو ایسے ہی لوگوں کے ہاتھوں ہو سکتا ہے، نہ کہ ان لوگوں کے ہاتھوں جو نہ اسلام کو جانتے ہوں نہ اس کے نظام تعلیم کو اور نہ اس کے قیام کی کوئی خواہش ہی دل میں رکھتے ہوں۔ اس طرح کے لوگ اگر زمام کار پر قابض رہیں اور پھر ہم رات دن کی چیخ و پکار سے دباؤ ڈال ڈال کر ان سے یہ کام زبردستی کراتے رہیں تو نادل نخواستہ وہ اس طرح کی ضمنی اور سطحی اصلاحات کرتے رہیں گے جیسی اب تک ہوتی رہی ہیں اور ان سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اپنے مدرسوں اور کالجوں کے لئے معلمین اور معلمات کے انتخاب میں ان کی سیرت و اخلاق اور دینی حالت کو ان کی تعلیمی قابلیت کے برابر بلکہ اس سے زیادہ اہمیت دیں اور آئندہ کے لئے معلمین کی ٹریننگ میں بھی اسی مقصد کے مطابق اصلاحات کریں۔ جو شخص تعلیم کے معاملہ میں کچھ بھی بصیرت رکھتا ہے وہ اس حقیقت سے ناواقف نہیں ہو سکتا کہ نظام تعلیم میں نصاب اور اس کی کتابوں سے بڑھ کر استاد اور اس کا کیرکٹر اور کردار اہمیت رکھتا ہے۔ فاسد العقیدہ اور فاسد الاخلاق استاد اپنے شاگردوں کو ہرگز وہ ذہنی اور اخلاقی تربیت نہیں دے سکتے جو ہمیں اپنے نظام میں مطلوب ہے۔ دوسرے تمام شعبہ ہائے زندگی میں تو بگڑے ہوئے کارکن زیادہ تر موجودہ نسل ہی کو بگاڑتے ہیں مگر نظام تعلیم اگر بگڑے ہوئے لوگوں کے ہاتھوں میں ہو تو وہ آئندہ نسل کا بھی ناس کر دیتے ہیں جس کے بعد مستقبل میں بھی کسی اصلاح و فلاح کی امید باقی نہیں رہتی۔

آخری چیز اس سلسلہ میں یہ ہے کہ ہمیں اپنی تعلیم گاہوں کا پورا ماحول بدل کر اسلام کے اصول اور سیرت کے مطابق بنانا ہوگا۔ یہ مخلوط تعلیم، یہ فرنگیت کے مظاہرے، یہ اندھا دھند مغربی تہذیب و تمدن کا غلبہ، یہ کالجوں کے مباحثے اور انتخابات کے طریقے اگر یہ سب کچھ آپ کے ہاں یوں ہی جاری رہے اور ان میں سے کسی چیز کو بھی آپ بدلنے کے لئے تیار نہ ہوں تو پھر ختم کیجئے اصلاح تعلیم کی ساری اس گفتگو کو، اس لئے کہ اس ذہنی و تہذیبی غلامی کے ماحول میں ایک آزاد مسلم مملکت کے وہ باغیرت شہری اور کارکن و کارفرما کبھی پروان نہیں چڑھ سکتے جنہیں اپنی قومی تہذیب پر فخر ہو اور اس بے سری کی آب و ہوا میں کبھی اس مضبوط کردار کے لوگ پرورش نہیں پا سکتے جو اصول اور ضمیر کے معاملے میں کوئی لچک کھانے کے لئے تیار نہ ہوں۔ یہ ماحول برقرار رکھنا ہو تو پھر ہمیں سرے سے یہ خیال ہی چھوڑ دینا چاہئے کہ یہاں ہمیں ایک ایماندار اور باضمیر قوم تیار کرنی ہے۔ آخر یہ کیا مذاق ہے کہ ——— ایک طرف آپ اپنی تمام حرکات و سکنات اور پورے ماحول سے اپنی نئی نسل کے ذہن پر فرنگی تہذیب و تمدن اور فرنگی زندگی کا رعب بٹھاتے ہیں اور دوسری طرف آپ چاہتے ہیں کہ زبانی باتوں سے ان کے دلوں میں اپنی قومی تہذیب کی قدر پیدا ہو جائے۔ ایک طرف آپ اپنے ماتحتوں میں زور اپنے حوالوں کو زبان اور ضمیر کا قفل توڑنے اور ضمیر کے خلاف بولنے کی مشق کراتے ہیں اور دوسری طرف آپ چاہتے ہیں کہ ان کے اندر راست بازی اور حق پرستی پیدا ہو۔ ایک طرف آپ ان وہ سارے انتخابی ہتھکنڈے اپنے کالجوں ہی میں برتنے کا خوگر بنا دیتے ہیں جنہوں نے ہماری پوری سیاسی زندگی کو گندا کر کے رکھ دیا ہے اور دوسری طرف آپ یہ امید رکھتے ہیں کہ یہاں سے نکل کر وہ بڑے ایماندار اور کھرے ثابت ہوں گے۔ ایسی معجزات کا ظہور صریحاً محال ہے۔ اگر ہم اپنی قومی زندگی کو خرابیوں سے پاک کرنے کے واقعی خواہشمند ہیں تو سب سے پہلے ہمیں اپنے سکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ماحول کی تطہیر سے اس کا آغاز کرنا ہوگا۔

"حسین منظر"

[illegible] کرانی کی [illegible]
[illegible] لٹائے پھرتے [illegible]

ابھی کل کی بات ہے ایک دوست نے بتایا کہ ایروں نے راوی کے آس پاس [illegible] دل کش مناظر کے فوٹو لینے کے علاوہ دو بڑے ہی مزید فوٹو لیے ہیں ایک [سو]رج غروب ہونے کا منظر ہے اور دوسرا چلتی ہوئی گاڑی کا۔

[illegible] دل کو اتنی ٹھیس لگی اور میرے جذبات کو اتنا شدید صدمہ [پہن]چا کہ جذبات کی شدت سے میں کوئی جواب نہ دے سکا۔

وہ [illegible] خیال میں مجھے لے ڈوبی اور خشک راہ اور جذا جانے کیا کیا سمجھ [ر]ہے تھے اور ادھر میں سوچ رہا تھا کہ آخر یہ بھی کوئی وقت ہے جب فوٹو گرافی کی جائے۔

کیا انسان آج اس حالت میں ہے کہ اس کے مختلف مناظر محفوظ کرے کے [illegible] کی جائے!

مجھے یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے انسانیت کا آفتاب غروب ہو رہا ہے انسانی [illegible] قیاس و گمان کے نصف النہار تک پہنچنے کے بعد اپنے ساتھ پوری انسانیت کو [م]غرب میں غائب ہو رہی ہے۔ انسان کے اعمال بادلوں کی مجسم شکل میں نمودار [ہو ر]ہے ہیں اور ان کے درمیان انسانیت کا جنازہ فضا و ندی کے کندھوں [illegible] کی صورت میں رخصت ہونے کو ہے۔

کیا بہتر یا حسین ہے؟

زمان و مکاں کی گاڑی انسانیت کو لیے ہوئے اپنی منزل کی طرف دوڑتی جا رہی ہے [اس] گاڑی کے ایک ڈبے میں انسان کے بچے درد کر کے کراہ رہے ہیں اور [ان] کا باپ اور اس کی ماں سہمے ہوئے ایک دوسرے کو تک رہے ہیں۔

گاڑی تیز رفتاری سے دوڑے جا رہی ہے، کتنا دل کش منظر ہے!!

انسانیت کی گاڑی کو چلانے والے ڈرائیور اور کنڈکٹر انسان ہونے کے [illegible] درندے اور جنگل جانور میں

یہ انسان نما حیوان اپنی درندگی اور حیوانیت سے جنگل جانوروں کو بھی مات کر چکے ہیں

یہ حیوان اپنا پیٹ بھرنے کے لیے انسانیت کی عقل اور اس کا ضمیر نگلنے کے [illegible] ان کے جسم کو ہاتھوں میں لیے ہوئے نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں۔

[اور] ایک دوسرے کے منہ سے نوالے چھینتے ہوئے اور غذا کی لذت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے گاڑی کو تیزی سے چلا رہے ہیں۔

انسانیت کی گاڑی کس تیز رفتاری سے اپنی منزل کی طرف بھاگی جا رہی ہے۔

اس سے زیادہ حسین سین شاید ہی کہیں دیکھنے میں آئے!!

مگر جلد ہی میرے ذہن میں خیال آیا کہ ہر روز غروب ہونے کے بعد اگلے دن سورج پھر بھی تو نکلتا ہے۔

اور گاڑی میں انسانیت کے بعض بچے گاڑی کے رخ کو بدلنے میں مصروف بھی تو ہوتے ہیں

اور کتنا دل کش اور حسین وہ منظر ہوگا:

- جب میں یا میرا کوئی دوسرا انسانی بھائی ہاتھ میں کیمرہ لیے اس سین کا فوٹو لے رہا ہوگا۔
- جب انسانیت کا سورج مشرق سے طلوع ہونے کے بعد نصف النہار کی طرف بڑھ رہا ہوگا۔۔
- اور جب انسانیت اپنے بچوں کو زمان و مکاں کی گاڑی میں لیے ہوئے اپنی منزل کی طرف دوڑ رہی ہوگی۔

کتنا حسین منظر ہوگا!!

اور فوٹو گرافی کے لیے کتنا موزوں وقت ہوگا!!

جاوید اقبال راسا

دو لمحوں کی چاندنی

وہ سپیدۂ سحر کے لطیف قہقہے سن کر بیدار ہوا۔ اپنے سامنے سجے گلاب کو غور سے دیکھا فرطِ مسرت سے آنسو چھلک پڑے وہ اس پر چند نوخیز پھول دیکھ رہا تھا اس نے دیوانہ وار ہاتھ بڑھایا اور جذبات کی شدت میں کھل کے رہ گیا اس خوشی کی مٹھاس کا اسے کوئی احساس تھا۔ گلاب کو دھیرے سے جھنجھوڑتے ہوئے کہا "آج میں دکھوں سے کتنا بے یار ہوں"۔ شبنم کے چند قطرے ہاتھوں پر گرے۔ انمول موتی۔ وہ اپنی خوشی چھپا نہ سکا زندگی ہوئی آواز میں چیخ اٹھا اور خود کو وقت کی لہروں کے سپرد کر دیا۔ بہاروں میں شدید نگہبانی کی۔ خزاؤں میں اس کی اُداسی پر ٹوٹ کے رو دیا۔ ساون میں اس کے جوان ہونے کا انتظار کیا۔ اس محبت کے سامنے عمر ہا پالی کے ناطے کیا حقیقت رکھتے ہیں، لیکن زمانے سے آنکھ مچولی کھیلنا معمولی بات نہیں۔ آس پاس چاروں طرف اس کے پڑوسی، برسوں کے ساتھی۔ بچپن کا یارانہ، بچپن سے جوانی تک کا اکٹھا گزارا ساتھ بھی کیا عجب ہوتا ہے۔ قربتیں دوستیاں بنتی ہیں اب نوخیز پتیاں چہرے پر اپنا گھر تلاش کر رہی ہیں، اس نے ٹھنڈی سانس میں خود کو گرم کر دیا۔ "اگر یہ ساتھ بھی نہ ٹوٹ سکیں تو محبت کیسی۔" یوکلپٹس نے مایوسی سے اس کی طرف دیکھا اور آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ مگر اس نے اتنا کہہ کر منہ موڑ لیا "مجھے تمہاری تکلیف کا احساس ہے دوست، مگر کیا کروں محبت چھوڑنے کا حوصلہ نہیں"

رات کی بڑھتی سیاہی نے پوری کائنات پر غنودگی طاری کر دی تھی۔ "جوانی بھی کیا چیز ہے" گلاب نے بھرپور انگڑائی لی اور پھر جلد بڑھتی ہوئی سردی کا مقابلہ نہ کر پایا ہو۔ ٹھٹھر کر رہ گیا۔ گرم ہاتھوں کے لمس نے اسے چونکا دیا۔ "تمہاری جوانی کو گرم سرد موسم سے بچانے کے لیے ابھی میرے بوڑھے ہاتھوں کی ضرورت ہے" آہستہ آہستہ نیند غلبہ پانے لگی، خواب اس پر مسلط تھے جنہیں وہ مسلسل جھٹکنے کی کوشش کر رہا تھا اس کے بوڑھے ہاتھ گلاب کو اسی حفاظت سے لیے سردی کی شدید لہریں برداشت کر رہے تھے چاند ایک لمحہ کو نکلا پھر گہرے بادلوں میں غائب ہو گیا۔ اچانک یوکلپٹس کا پورا وجود لرز اٹھا۔ آدھی رات ہونے کو ہے ساتھی۔ علم بشارت چھوڑ دو۔ کانٹوں کی چبھن محسوس کرتے ہوئے اس نے کہا "میں بہت بوڑھا ہو گیا ہوں، لیکن اس بڑھاپے میں بھی تمہارے لیے راحت لایا ہوں اگرچہ تمہارے لیے اس پالے کے ملبوں میں ٹھٹھرنا میرے لیے کوئی بڑی قربانی نہیں تمہاری پارسائی کے لیے اپنی عزت، شہرت اور تعمیر کے لیے جوانی کا لہو دیا ہے مجھ سے رسوائیاں سمیٹی نہیں جائیں گی مجھے رسوا نہیں نہ دو۔" گلاب دھیرے سے مسکرایا اور کانٹوں کی چبھن تیز ہوتی گئی بوڑھے جسم سے گویا بجلی کی رسہ تار چھو گئی۔۔۔ اس نے گلاب کے تیور محسوس کر لیے "تو گویا یہ اس لذت سے آشنا ہے" بوڑھے کے رگ و پے میں نفرت کی لہر دوڑنے لگی۔ اس کی ساری محبتیں دم توڑ گئیں۔ چند لمحے برسوں پر محیط تھے۔ ایسی خوفناک رات کبھی دیکھنے میں نہیں آئی گلاب کی مسکراہٹ اسے زہر لگنے لگی۔ اس کے ہاتھ تیزی سے بڑھے اور پوری قوت سے گلاب کو مسل گئے اس نے لرزتے ہاتھوں سے ساری پتیاں اکٹھی کر لیں جیسے کوئی فنکار شکستہ شاہکار کے ریزے جمع کرے۔ وہ اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا رات وہ اسے دل کے ریگستان رکھ کے برسا۔ گلستانوں کی نرم مٹی۔ سہمی سہمی کونپلوں اور سبزہ کر رہے دیا۔ وہ انجام سے بے خبر تو نہ تھا۔

تعلیم کی اس خرابی ہی کی پیداوار ہے ہمارے طالب علموں میں روز بروز بڑھتی ہوئی بے انضباطی فطری نتیجہ ہے، ہمارے معلموں کی زندگی کی اعلیٰ قدروں سے بے تعلقی اور بچوں کی کردار سازی سے مجرمانہ غفلت کا۔ اس تعلیم سے اس کے سوا اور کیا توقع کی جا سکتی ہے

۳ : تیسرا بڑا مسئلہ جو آج ہمارے سامنے ہے، وہ دو متضاد نظام ہائے تعلیم کا متوازی وجود ہے۔ ہمارے ملک میں ایک نظام تعلیم رائج نہیں ہے بلکہ دو بیک دو نظام ہائے تعلیم بیک وقت رائج ہیں جو تعلیم یافتہ افراد کو دو مختلف اور قطعی متضاد خطوط پر تیار کرتے ہیں یعنی اسکولوں اور کالجوں کا نظام تعلیم اور مدرسوں اور دارالعلوم کا نظام تعلیم کسی ملک کے لیے اس سے زیادہ مہلک اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی کہ اس میں بیک وقت دو نظام ہائے تعلیم پائے جائیں، لیکن ہمارے ملک میں دوعملی موجود ہے اور پورے تعلیمی سرچشمے کو مسموم کر رہی ہے سکول اور کالج ایک قسم کے افراد ڈھال رہے ہیں، مدرسے اور دارالعلوم اس سے بالکل مختلف قسم کے اور ستم ظریفی تو یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی قومی ذمہ داریوں کے [illegible] قابل نہیں

بلکہ ادارہ انسانی اور مادی وسائل اس دوعملی کی نذر ہو رہے ہیں مگر قوم اس نام نہاد "جدید" اور "قدیم" "ترقی پسند" اور "قدامت پسند" کے درمیان منقسم ہو کر رہ گئی ہے۔ اس دوعملی اور نزاع نے قوم کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے اس صورت حال کو اب زیادہ دیر باقی نہیں رہنا چاہیئے، بلکہ ان دو مختلف نظاموں کو ایک ایسی وحدت میں سمو دینا چاہیئے جو یکساں طور پر دینی، فکری، معاشی اور سیاسی قیادت کو جنم دے سکے۔

۴ : موجودہ نظام تعلیم کا چوتھا نقص اس کی محض نظریاتی خصوصیت ہے چونکہ اس تعلیم کے رائج کرنے والوں کا اصل مقصد محض کلرک اور عمال پیدا کرنا تھا اس لیے انہوں نے ملک کی ضرورتوں سے یکسر غفلت برتی۔ ہماری قوم کی عظیم اکثریت کو اعلیٰ علمی تعلیم کی ضرورت نہیں بلکہ بنیادی اور معقول پیشہ وارانہ تعلیم کی ضرورت ہے۔ مجموعی طور پر ملک کو سائنس دانوں، دست کاروں، صنعت کاروں اور سرمایہ داروں کی ضرورت ہے، لیکن موجودہ نظام تعلیم قطعی طور پر اس ضرورت کو پورا کرنے کے بھی لائق نہیں ہے یہ قطعی طور پر بیکار رہا ہے جب تک عملی نقطۂ نظر سے اس نظام تعلیم کی اصلاح نہیں کی جاتی اور اسے ملک کی ضروریات کے مطابق نہیں ڈھالا جاتا، یہ نظام تعلیم حیات و ترقی کا سرچشمہ ہرگز نہیں بن سکتا۔

۵ : اس کا ایک اور نقص ابتدائی مرحلے میں خصوصی تعلیم و مہارت ہے علم کو خانوں اور ٹکڑوں میں بانٹ دیا گیا ہے اور مضامین کی اس گوناگونی میں خود وحدت علم کو بھی نظروں سے اوجھل کر دیا گیا ہے اگرچہ ایک طالب علم کو چند خاص مجموعہ مضامین پر عمدہ اسباق مہیا ہو جاتے ہیں، مگر باقی تمام مضامین اور علوم اس کی نظر سے اوجھل رہتے ہیں یہ مہارت خصوصی طالب علم کو زندگی کے دوسرے حقائق سے غافل کر کے جسم بنا دیتی ہے۔ وہ کم سے کم کے متعلق زیادہ سے زیادہ جاننے لگتا ہے اور کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ اندیشہ یہ ہے کہ ایک وقت ایسا بھی آ سکتا ہے جب اس کا سارا علم لاشے ہو کر رہ جائے ——— علاوہ ازیں اسے جو علم حاصل ہوتا ہے اس میں کوئی نظم و وحدت نہیں ہوتی اس طرح منفرد شعبوں میں تعلیم پانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علم زندگی اور علم کو منتشر اجزا کی حیثیت سے دیکھتا ہے، اور علم و وحدت اور اس کے مقاصد کے ادراک سے قاصر رہتا ہے یہ بات نہ صرف ہماری بلکہ پوری مغربی تعلیم کے متعلق صحیح ہے۔ اور ہمارے دور کی سب سے بڑی ضرورت اسی کثرت میں وحدت پیدا کرنا ہے

۶ . ایک اور بڑا نقص اس نظام کا یہ ہے کہ یہ طالب علم میں تخلیقی صلاحیتیں پیدا کرنے میں ناکام رہا ہے تخلیقی کوششوں میں اس کی کوئی ہمت افزائی نہیں کی جاتی، بلکہ طالب علم کو محض مغرب کا اندھا نقال سا کر رکھ دیا جاتا ہے۔ انگریزی ذریعۂ تعلیم اس غیر معقول اور غیر تخلیقی انداز فکر کا بہت بڑا سبب ہے۔ جب طالب علم کو غیر ملکی اور نامانوس زبان میں کوئی چیز پڑھائی جاتی ہے، تو وہ اس کے مطالب کے فہم سے بالکل قاصر رہتا ہے لیکن چونکہ اسے لامحالہ امتحان پاس کرنا ہوتا ہے، اس لیے وہ رٹائی شروع کر دیتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی فکر بالکل کند ہو کر رہ جاتی ہے اور وہ ہر اس چیز کو بغیر نقد و جرح کے قبول کرنے کا عادی ہو جاتا ہے، جو اسے پڑھائی جائے یہ انسانی ذہن کے قتل عام سے کسی طرح بھی کم نہیں۔

۷ : آخری چیز اور جو کچھ اہم نہیں ہے یہ حقیقت ہے کہ موجودہ نظام میں تعلیم ایک خوش قسمت طبقہ کا حصہ ہے۔ جو لوگ امارت کے سائے میں آنکھیں کھولتے ہیں صرف وہی اس سے مستفیض ہو سکتے ہیں، اور نادار طبقہ کی صلاحیتیں تاریک گلی کوچوں میں دم توڑ دیتی ہیں۔

اے علم حاصل کرنے والے! شاید اگر تمہیں طالب علم نہیں مگر پھر بھی تم علم حاصل کرنے میں مصروف ہو ——— کیونکہ علم صرف وہی نہیں جو بڑی بڑی درس گاہوں اور موٹی موٹی کتابوں میں بحر علم کے صرف ایک قطرہ کی صورت ملتا ہے ——— بلکہ کھیتوں میں ہل چلاتے، کارخانوں میں مزدوری کرتے اور سے پیوں کو دودھ پلاتے ہوئے بھی تمہیں علم ملتا ہے بشرطیکہ تمہارے قلب میں اس حقیقت تک پہنچنے کی آرزو ہو ——— انسانی زندگی کے ایک ایک قدم اور ہر قدم کی ایک ایک جھلک تمہیں علم کے ... سے لبریز ہے اور گلستان کائنات کا ایک ایک پھول اور ہر ایک پھول کی ایک ایک پتی تمہیں علم کی نعمتوں سے سرفراز کرتی ہے، بشرطیکہ تمہارے دل میں اس حقیقت سے ملنے کی تمنا ہو ——— اگر تم ان جلیوں اور نعمتوں سے آشنا علم حاصل کر سکو کہ علم کی ابتدا اور انتہا ہی جان لو تو یاد رکھو طالب علم ہو کہ تم علم حاصل کرنے میں مصروف ہو۔

اے علم حاصل کرنے والے! علم صرف وہی نہیں جو استاد کے سفید چاک سے سیاہ تختہ پر لکھے کے بعد تمہارے ذہن میں منتقل ہو جائے اور جو پروفیسر اپنے لیکچر کے پرکشش الفاظ سے تمہارے کانوں کے پردوں کو مرتعش کرنے کے بعد تمہارے ذہن کو پارسل کر دے ——— اور جو ادیب اپنے مضمون کے دقیق نکتوں کے ذریعہ علم کی حقیقت کے متعلق تمہارے ذہن کو خیالات کی صورت میں دے دیتا ہے ——— بلکہ حقیقی علم جس کی ایک سطر کو تم علم سمجھ بیٹھے ہو تو وہ پوری عبارت ہے جو کائنات جیسے اس عظیم الشان ورق پر مختلف رنگوں میں مختلف استادوں نے مختلف رنگوں اور مختلف زبانوں میں لکھی ہوئی ہے ——— اور وہ پورا لیکچر ہے جو زندگی کے اس لامتناہی مکتب میں معلم حقیقی اس کائنات کے رقص اور اس میں اٹھتے ہوئے بادلوں کی گرج، گرتی ہوئی بجلیوں کی کڑک، ابھرتے ہوئے سورج کی چمک اور لہراتے ہوئے پھولوں کی مہک کی صورت میں دے رہا ہے۔

اے علم حاصل کرنے والے! کل تم اس امتحان گاہ میں ایک طالب علم کی طرح امتحان کی گھڑیوں میں سے گزر کر محنت کی سند حاصل کر لی ہے ——— اور اس لیے تمہیں مختلف صلاحیتیں اور قابلیتیں عطا کرنے کے بعد علم حاصل کرنے یا نہ کرنے کے متعلق مکمل آزادی دی گئی ہے تاکہ اس طرح تم اپنی تقدیر کی کاشت کرنے کے بعد خود ہی اپنے علم کی فصل کاٹو ——— نہ صرف یہ کہ علم حاصل کرو بلکہ محنت کی سند پانے کے لیے اس حاصل کیے ہوئے علم سے کمزور اور نالائق طالب علموں کو علم حاصل کرنے میں مدد دو ——— اور اس طرح اندھوں کو سہارا دینے کے لیے عصا کا کام دو اور چٹان کی طرح ہر قسم کے لیے علم و محنت کے معنوں کا مرقعہ سرانجام دو ——— تمہیں طالب علموں کے گلستان میں ایک ایسے لاثانی پھول کی طرح ہونا چاہیئے جو محنت کے امتحان میں پاس ہونے کی سند لینے کے بعد اس قابل ہو کر مستحق خود اسے توڑ کر اپنے محبوب ترین ٹیبل پر رکھ لے ——— نہیں نہیں بلکہ وہ خود محبت کے پاؤں سے چلتا ہوا اپنے محبوب کے پاس پہنچ سکے۔

آؤ کہ امتحان گاہ کو چل پڑیں

اے علم حاصل کرنے والے! آج تک تم محنت کی دنیا سے بے حرکتوں کی فضا میں بیشت ٹیوٹروں سے علم حاصل کرتے رہے ہو اور اب تم اس بات کے خواہش مند ہو کہ آئندہ طالب علم پبلک لائبریریوں میں بیٹھ کر ٹیوٹروں کے بطن میں علم حاصل کرنے کے علاوہ کتابوں کے زور سے جسم بھی دبیں پلتے رہیں ——— اور پھر تم ان علم حاصل کرنے والوں کو ملامت کرتے ہو جو تمہیں اچھی نگاہ سے دیکھتے ہوئے تمہارے ساتھ محبت کا سلوک کرتے ہیں اور انہیں بھی ایسا جو اپنی علمی سفر کی ابتدا تو در کنار اس کی ابتدا سے بھی ناواقف ہو اور راستے ہی میں کتابی پھولوں سے جی بہلا رہا ہو ——— اپنے ان ساتھیوں سے نفرت کرنا چھوڑ دے جو تم سے محبت کرتے ہیں اور انہیں نصیحتیں دینے سے بھی باز رہ، کیونکہ علم کی لگاتار بارش اور محنت کے مسلسل تجربے نے ان کی آنکھیں کھول دی ہیں ——— تجھے اس محبت کا واسطہ جو تجھے نفرت کرنے کے ساتھ ہے کہ تو نفرت سے نفرت اور محبت سے محبت کرنا سیکھ۔

اے علم حاصل کرنے والے! آؤ کہ دنیا کے جلیل القدر انسانوں کے خزانوں کو لوٹنے کے ساتھ ساتھ اس بہترین سرمایہ میں سے جو کچھ کہ ہم حاصل کر چکے ہیں اُسے لٹانا بھی شروع کریں ——— آؤ کہ انسانیت کے ہی بہترین سرمایہ سے بھوکی اور ننگی انسانیت کو امن اور شانتی کے چند نوالے اور صدق و آشتی کے چند لبادے مہیا کریں ——— آؤ کہ کائنات کے بے پایاں خزانوں سے اخلاق کے پھل ان انسانوں کے دسترخوان پر چنیں جو رنگ رنگ کے ادنیٰ کھانوں کے لشکر میں بھی بھیک مانگ رہتے ہیں ——— آؤ کہ آسمانی سمندر کے شفاف پانی سے انسانیت کی سحر زمین کو سیراب کریں تاکہ انسانی پودوں کی ڈالیوں پر اخلاق کے ایسے رنگین پھول کھلیں کہ فرشتے بھی وہاں سے گزرتے ہوئے ان کی مہک سے دم بخود ہو جائیں ——— آؤ کہ دوسرے ساتھیوں کو بھی انسانیت کے دل کے پیمانہ کے عطر سے بھر لو اس لافانی سمندر تک پہنچنا شروع کریں جس میں کہ ہم خود بہتر ... ——— آؤ کہ انسانیت کو انسانیت سے آشنا کریں۔

اے علم حاصل کرنے والے! آؤ کہ زندگی کے راز کو بے نقاب کریں کتابوں کی قطاروں اور شیلفوں کی لائبریریوں میں نظر سے غائب ہونا تو تم جانتے ہی ہو آؤ کہ اب زندگی کے راز کو جاننے اور پانے کا طریقہ بھی جان لو ——— اگر آج مقصد زیست کی محنت جتانے کے لیے کسی بغاوت کی ضرورت ہے تو آؤ کہ ہم نظام ہائے حیات کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیں جو ظاہری جاہ و جلال اور مادی آب و تاب کے زور سے ہماری محنت کے وجد آمیز رقص کو بند کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں ——— جو ہمارے ہی گاڑھے پسینے اور سرخ خون سے بنی ہوئی شراب سے ہماری محنت کے آتشیں شعلوں کو بجھانا چاہتے ہیں ——— جو سونے چاندی کے چمکتے ہوئے سکوں کی جھنکار میں ہماری محنت کے بربط سے نکلتے ہوئے گیت کو کچلنا چاہتے ہیں ——— آؤ کہ ظلم و تشدد کی اس تیرہ و تار فضا میں انقلاب و بغاوت کی شمع علم کے تیل اور محنت کی دیاسلائی سے اس طرح جلائیں کہ تیرگی بھی فطری موت مرنے کے بعد روشنی کی جون میں جنم لینے پر مجبور ہو۔

اے علم حاصل کرنے والے! اگر آج محنت کی اندھی امتحان گاہ میں قربانی کے لیے ایسے علم حاصل کرنے والوں کی ضرورت ہے کہ جو علم کے عالی فتاوں کو قربان کر کے محنت کے لاغر بدن کے ادھڑے کو تیار ہوں ——— تو آؤ کہ ہم محنت کے گیت گاتے ہوئے اپنی اس منزل کی طرف پرواز کریں، جہاں علم کی رسائی ہی نہیں اور جہاں تک پہنچنے کے لیے صرف والہانہ محبت کی ضرورت ہے ——— اور اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے عالم سفلی کے پرسطوت تاجداروں کے ہاتھوں سے قہر و غضب کے تازیانوں کو یوں خوش آمدید کہیں جیسے کہ محبت کے رباب کے تاروں کو مرتعش کرنے کے لیے یہ مضراب کا کام دے رہے ہوں ——— جیسے کہ محبت کی وادی میں خوشگوار پھولوں کی نکہت کی پرواز کیلئے یہ جھونکوں کا کام دے رہے ہوں ——— آؤ کہ علم کی پگڈنڈی کو چھوڑ کر محبت کی شاہراہ پر چلتے ہوئے اپنی منزل زیست کی طرف پرواز کریں ——— آؤ کہ ان حوصلہ ہارنے والے مالیوں کو تسلی دیں جن کے ہاتھ انسانیت کے لیے محبت کے پھول توڑتے ہوئے چھلنی چھلنی ہو گئے ہیں اور خود ان کا ساتھ دیتے ہوئے ان کی ہمت بڑھائیں۔

علوم و فنون میں آگے بڑھنے کا کام انہوں نے چھوڑ دیا اور دوسری طرف اسی زمانہ میں اہل مغرب نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور تحقیقات علمی شروع کی۔ انہوں نے نئی نئی معلومات جمع کرنی شروع کیں۔ انہوں نے ان کو مرتب کر کے نئے فلسفے اور نئے نظامہائے فکر و عمل کی تشکیل شروع کر دی۔ اس کا نتیجہ جو ہوا وہ یہ کہ ایک طرف مسلمان رفتہ رفتہ جمود میں مبتلا ہوتے چلے گئے اور دوسری طرف اس علمی تحریک کی بدولت مغرب کی طاقت روز بروز بڑھنی شروع ہو گئی۔ ظاہر ہے جب وہ نئی نئی معلومات جمع کریں گے اور نئی نئی تحقیقات کریں گے تو اس کے نتائج اور وسائل ان کے ہاتھ میں ہوں گے ان کے ذہنوں میں زندگی اور بیداری پیدا ہو گی اور آپ اس کو چھوڑ دیں گے تو آپ کے اندر لامحالہ جمود اور تعطل پیدا ہو گا۔ آپ اپنی تاریخ کو اٹھا کر دیکھئے اٹھارہویں صدی تک پہنچتے پہنچتے مسلمانوں اور اہل مغرب کے درمیان اتنا نمایاں فرق ہو گیا کہ مسلمان مغلوب ہونا شروع ہو گئے اور مغربی قومیں ان پر غالب آنی شروع ہو گئیں۔ وہ جس دور میں جمود میں لگے اور اس جمود کا نتیجہ آخر کار یہ ہوا کہ مسلمان مغلوب ہونا شروع ہو گئے اور مغربی قومیں غالب آ گئیں۔ اٹھارہویں صدی سے مسلمانوں پر مغربی قوموں کی یورش اور ان کی فتوحات خود اس بات پر شاہد ہیں کہ علمی تحقیقات چھوڑ دینے اور جمود اختیار کرنے کے نتائج ہم نے کیا بھگتے اور انہوں نے اس کام کا بیڑا اٹھانے کے کیا فوائد حاصل کئے۔

جیسا کہ میں نے آپ سے عرض کیا کہ جمود کا لازمی نتیجہ انحطاط ہے اور انحطاط کا لازمی نتیجہ مغلوبیت ہے۔ یہ بات بالکل ظاہر ہے۔ اگر علمی تحقیقات کی جائیں اور مسلسل کی جائیں اور نئی نئی معلومات فراہم کی جائیں اور ان کی بنا پر نئے فلسفۂ زندگی تیار کئے جائیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حرکت پیدا ہوتی ہے طاقت پیدا ہوتی ہے اور اس قوم کو غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ غلبہ حاصل ہونے کے بعد جمود پیدا نہیں ہوتا بلکہ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو قوم غالب ہے اور جو تحقیقات کر رہی ہے علوم و فنون کو جمع کر رہی ہے معلومات فراہم کر رہی ہے اور ان کو مرتب کر کے ایک تہذیب بنا رہی ہے وہ لازماً اپنی تہذیب کے ساتھ غالب آتی ہے۔ محض اپنی سیاسی طاقت اپنے اسلحہ اور اپنی فوجی قوت کے ساتھ غلبہ نہیں پاتی بلکہ اس کی پوری تہذیب مغلوب قوم پر غالب آنی شروع ہو جاتی ہے۔ یہ نقشہ پہلے بھی ہم دیکھ چکے ہیں اور آج بھی دیکھ رہے ہیں۔

مغربی تہذیب کا غلبہ

اسلام کے غلبہ کے دور میں تمام دنیا یہ محسوس کرتی تھی کہ تہذیب ہے تو مسلمانوں کی، تمدن ہے تو مسلمانوں کا ہے اور فکر و علم ہے تو مسلمانوں کا۔ لیکن اب اس کے برعکس یہ صورت حال پیدا ہوئی کہ خود مسلمانوں کے دلوں میں یہ بات اتر گئی کہ کوئی تہذیب ہے تو اہل مغرب کی ہے، کوئی تمدن ہے تو اہل مغرب کا ہے، اور علم و فن جو کچھ بھی ہے اہل مغرب کا ہے۔ ہمارا کام ان کا پس خوردہ کھانا ہے، ہمارا کام ان کے پیچھے چلنا ہے، ہمارا کام ان کی تقلید کرنا ہے۔ یہ عملاً صورت پیدا ہو چکی ہے، چاہے زبان سے انکار کریں چاہے زبان سے ہم مزاحمت کرنے کی کوشش کریں اور زبان سے ہم اظہار براءت کریں لیکن دیکھئے عملاً کیا ہو رہا ہے؟ عملاً یہی ہو رہا ہے کہ ہمارے اوپر مغرب کے افکار اور فلسفے، ان کے طرز زندگی، ان کی تہذیب اور تمدن سب کچھ چھایا جا رہا ہے۔ اس سے میں جو بات آپ کے ذہن نشین کرانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر ہم اپنی زندگی چاہتے ہیں، اپنی بقا چاہتے ہیں اور اپنا ارتقاء چاہتے ہیں، تو ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ ہم نئے سرے سے علمی تحقیقات کا کام کریں۔

نقصان دہ تحقیقات

اس سلسلے میں یہ بات بھی وضاحت طلب ہے کہ علمی تحقیقات کس نوعیت کی ہمیں مطلوب ہیں۔ ایک تو وہ ریسرچ ہے جو مغربی محققین ہم کو سکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک بے مقصد اور بے رنگ ریسرچ محض ریسرچ برائے ریسرچ ہے۔ مثلاً کتابوں کو ایڈٹ کرنا، ان کے مختلف نسخوں کا مقابلہ کر کے ان کی عبارتوں کے فرق کو دکھانا اور مصنفین کے سن وفات و پیدائش کو جمع کرنا اور اسی قبیل کی جو ریسرچ ہے۔ یہ بے مقصد اور بے معنی ریسرچ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ علوم و فنون میں مددگار ہوتی ہے لیکن بجائے خود یہ وہ ریسرچ نہیں ہے جو کسی قوم کو زندگی کی حرارت عطا کرے اور جذبات کی حرکت پیدا کرے۔ بے مقصدی اور بے معنی ریسرچ سے اہل مغرب ایک دلچسپ کام کرتے ہیں۔ وہ خود کس قسم کی ریسرچ ہے وہ اس مقصد کے لئے ہے کہ ان کے پاس وہ طاقتیں فراہم ہوں کہ جو ان کو دنیا پر غالب کر سکیں۔

ایک اور قسم کی ریسرچ جو اب ہمارے ملک میں شروع ہو رہی ہے وہ یہ ہے کہ ریسرچ تو اسلام کی کی جائے مگر اس غرض کے لئے کہ ایک نیا اسلام تصنیف کیا جائے جو تمام مغربی افکار و اقدار کے بالکل مطابق ہو۔ یعنی جو کچھ مغرب میں حلال ہے وہ حلال ثابت کیا جائے جو کچھ مغرب کی نگاہ میں حرام ہے اسے حرام ثابت کیا جائے اور اسلام کو کسی نہ کسی طرح ڈھال کر ایسا دکھایا جائے کہ گویا یہ بھی مغربی تہذیب و تمدن کا ایک دوسرا ایڈیشن ہے۔ یہ ریسرچ بھی ہمارے کسی کام کی نہیں ہے۔

اسلامی طریق تحقیق

ہم جو ریسرچ چاہتے ہیں، اور جس غرض کے لئے چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ٹھیک ٹھیک اسلام کے مطابق علوم و فنون کی تحقیقات کی جائے اور تحقیقات کر کے اسلام کے نظام فکر و عمل کو باقاعدگی کے ساتھ مرتب کیا جائے۔ اس سلسلے میں چند مقاصد ہمارے پیش نظر ہیں اور انہی مقاصد کی تحصیل کے لئے ہم کام کرنا چاہتے ہیں۔

۱۔ سب سے پہلا کام تو یہ کرنا چاہتے ہیں کہ مغربی فکر اور مغربی فلسفۂ حیات کا جو طلسم بندھا ہوا ہے اس کو توڑ ڈالا جائے۔ ایک معقول اور مدلل علمی تنقید کے ذریعے یہ بات ثابت کی جائے کہ مغربی علوم و فنون میں جتنے حقائق اور واقعات ہیں وہ دراصل تمام دنیا کا مشترک علمی سرمایہ ہے اور اس کے ساتھ کسی تعصب کا کوئی سوال نہیں ہے لیکن ان معلومات و حقائق کو جمع کر کے جو فلسفۂ حیات اہل مغرب نے بنایا ہے وہ قطعی باطل ہے۔ ان کو مرتب کر کے جو طرز فکر اور کائنات کے متعلق جو تصور اور انسان کے بارے میں جو تصور انہوں نے قائم کیا ہے اور جس کے اوپر اپنی پوری تہذیب کی عمارت

انہوں نے انسانی ہے۔ وہ ساری کی ساری از اوّل تا آخر باطل ہے۔ جو معاشرتی علوم (SOCIAL SCIENCES) انہوں نے مرتب کئے ہیں جو معاشی فلسفہ (Economic Philosophy) انہوں نے گھڑا ہے وہ مرتب فتنہ و فساد ہے وہ انسان کی فلاح کے لئے نہیں بلکہ انسان کی بربادی کے لئے ہے اور جو دنیا کی اپنی تباہی کے لئے ہے۔ یہ پہلا ضروری کام ہے جس کے درمیان سے ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ مسلمانوں پر مغربی فکر و فلسفے کا جو سحر ہے وہ ختم ہو جائے گا جس کے بغیر مسلمانوں کو اس ذہنی مرعوبیت اور ذہنی شکست خوردگی کی حالت سے نہیں نکالا جا سکتا اور جب تک وہ اس ذہنی شکست خوردگی میں مبتلا ہیں اس وقت تک آپ یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ مغلوبی کی زندگی چھوڑ کر مجتہدانہ زندگی اختیار کریں گے اس وقت تک ان کا کام آنکھیں بند کر کے اہل مغرب کے پیچھے چلنا ہے۔ اس حالت کو آپ نہیں بدل سکتے جب تک کہ اس سحر کو نہ توڑ دیں اور اس حقیقت کو واضح نہ کر دیں کہ علمی حقائق اور چیز ہیں اور علمی حقائق کو مرتب کر کے ایک فلسفۂ زندگی اور نظام حیات مرتب کرنا بالکل دوسری چیز ہے۔ حقائق اپنی جگہ بالکل صحیح ہیں لیکن حقیقت ان کو مرتب کر کے جو فلسفۂ حیات بنایا گیا ہے وہ بالکل غلط ہے۔

۲۔ اس کے بعد جو دوسرا کام کرنا ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے تمام علوم و فنون کو نئے اسلوب ——— اور نئے طریقے پر مرتب کیا جائے تاکہ وہ ایک اسلامی تہذیب کی بنیاد بن سکیں۔ اسی طرح اسلام کے مطابق ایک فلسفہ درکار ہے جو انسان کے ذہن کی اس تلاش کو تسکین دے کہ حقیقت کیا ہے۔ اگر یہ تسکین اس عقیدے کے مطابق نہ ہو جو اسلام نے ہمیں دیا ہے تو حقیقت کی تلاش اور اس کی تڑپ انسان کی فطرت میں ہے، وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مگر تلاش حقیقت کے مختلف راستوں میں سے صحیح راستہ ہمارے نزدیک وہ ہے جو انبیاء علیہم السلام کا تھا۔ اس راستے کے مطابق تلاش حقیقت اور کائنات کی حقیقت اور حیات انسانی کی حقیقت پر اس کے تمام کو ایک فلسفے کی شکل میں مرتب کرنا تاکہ آدمی کو اس کے مطابق ڈھالا جائے اور ظاہر ہے یہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ ہم ایک فلسفہ اسلام کے نقطۂ نظر کے مطابق مرتب نہ کریں۔ اس کے بغیر کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ آپ کی یونیورسٹیوں میں اور آپ کے کالجوں میں جو فلسفہ پڑھایا جاتا ہے یا نفسیات کے جو علوم پڑھائے جاتے ہیں یا دوسرے فلسفیانہ علوم کی تعلیم دی جاتی ہے اس کو بدل کر دیا جائے اور اس کی جگہ کوئی دوسرا فلسفہ پڑھایا جا سکے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ روس میں مغربی تہذیب سے بالکل مختلف ایک تہذیب اٹھانے کی کوشش کی گئی اور جب روسیوں نے کمیونسٹ طرز فکر کو اختیار کیا تو وہ کسی طرح سے بھی اس بات کو گوارا نہیں کر سکے کہ جس کو وہ بورژوا فلسفہ کہتے ہیں وہ اسے اپنی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں پڑھائیں کیونکہ کمیونسٹ اس کے اپنے وجود کے لئے خطرہ تھی اور ناگزیر ہے کہ وہ ایک کمیونسٹ فلسفہ مرتب کریں اور اسے اپنی نسلوں کو پڑھائیں کیونکہ جب تک وہ اس بورژوا فلسفے کو ہٹا نہیں گے اور اس کی جگہ اپنا تیار کیا ہوا فلسفہ ذہنوں میں نہ بٹھائیں گے اس وقت تک نہ تو طرز فکر بدل سکتا ہے نہ ایک کمیونسٹ نظام کھڑا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ہمارے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ ہم ایک اسلامی فلسفہ مرتب کریں تمام علوم عمرانی کو نئے سرے سے ترتیب دیں۔ بلاشبہ واقعات اور حقائق وہی رہیں گے جو دنیا کا مشترک علمی سرمایہ ہیں لیکن ان واقعات اور حقائق سے ایک پورا نظام فکر و عمل مرتب کرنا خواہ وہ معیشت کا علم ہو خواہ قانون و فلسفہ قانون کا علم ہو غرض جتنے بھی علوم عمرانی ہیں ان میں سے ہر ایک کو از سر نو مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ جب تک ان کو اسلامی نقطۂ نظر سے مرتب نہ کیا جائے اور کالجوں اور یونیورسٹیوں میں یہ علوم نہ پڑھائے جائیں گے اس وقت تک آپ یہ توقع نہ رکھیں کہ یہاں کبھی اسلامی تہذیب اٹھ سکے گی بلکہ اس کا باقی رہنا بھی مشکل ہے۔

نظام تعلیم کی اصلاح

کیونکہ آپ اپنے گھر میں ایک بچے کو چاہے یہ عقیدہ دے سکیں کہ خدا ایک ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے نبی تھے اور چاہے آپ اس کے ذہن میں یہ بٹھا دیں کہ قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے۔ اگرچہ بہت سے لوگوں نے یہ کام بھی چھوڑ دیا ہے اور اپنے بچوں کو وہ مشنریوں کے حوالے کر دیتے ہیں تاکہ وہ جو عقیدہ چاہیں ان کے ذہنوں میں اتار دیں۔ البتہ بعض لوگ احتیاطاً یہ ساری باتیں اپنے بچوں کے ذہن میں اتار بھی دیتے ہیں لیکن وہ بچے جب کالجوں میں جاتے ہیں اور جب ان کے سامنے یہ صورت آ جاتی ہے کہ تمام علوم جو وہ پڑھ رہے ہیں ان کے اندر خدا کہیں بیچ میں آتا ہی نہیں۔ وہ سائنس پڑھ رہے ہوں یا علوم عمرانی کبھی ان کو محسوس ہی نہیں ہوتا کہ اس کائنات کے اندر خدا کا بھی کوئی کام ہے، وہ بھی کوئی کچھ کر رہا ہے۔ ان کے سامنے نہ آتا ہی نہیں کہ رسولوں نے بھی کوئی علم الاقتصاد [illegible] رسولوں نے بھی کوئی فلسفہ قانون دیا ہے بلکہ اس کے برعکس ——— ایک علم جو وہ پڑھتے ہیں وہ ان کے ذہنوں میں یہ بٹھاتا ہے کہ اسلام نے معاذ اللہ بہت سارے غلط کام کر ڈالے ہیں۔ مثلاً اس نے سود کو حرام کیا گویا نعوذ باللہ ایک بڑا فضول کام کیا کہ اس سے نہ کا کوئی معاشی نظام نہیں چل سکتا، اور کوئی (FINANCIAL STRUCTURE) معاشی ڈھانچہ کھڑا نہیں ہو سکتا ہے۔ ان کے سامنے یہ بات آتی ہے کہ اسلام نے چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا قرار دیا گویا معاذ اللہ بڑا وحشیانہ کام کیا۔ حالانکہ اس نے یہ سزا محض پرطعن اور تفریحی چیز پر خواہ مخواہ اتنی سخت، آخر یہ کہ کوڑے مار مار کر کسی کی پیٹھ کی کھال اڑا دی جائے یہ بھی جیسے بہت وحشیانہ کام کیا۔

ذرا سوچئے! اس طرح کا طرز فکر جب ان کے سامنے آئے گا تو کیا آپ توقع رکھتے ہیں کہ اس قسم کے لوگ اسلامی تہذیب کے سچے دل سے قائل اور اس کے پیرو کبھی ہو سکتے ہیں؟ اور پھر وہی لوگ جو ان کالجوں اور یونیورسٹیوں سے نکلتے ہیں، وہی آپ کے ملک کا نظام چلانے والے ہیں وہی آپ کے ملک کے سکرٹری بنتے ہیں، وہی جنرل بنتے ہیں، وہی آپ کی حکومت کے کارپرداز بنتے ہیں۔ ان کے دماغ میں یہ بات کیسے اتر سکتی ہے کہ یہ اسلام چلنے کے قابل ہے اور چلانے کے قابل ہے۔ چنانچہ آپ تعلیم یافتہ لوگوں کے ایک بڑے گروہ سے بات کر کے دیکھ لیں۔ آپ کو تھوڑی ہی دیر میں

انگریزی خوانی

انگریزی میں اس کی متعدد وجوہ سے ضرورت ہے اور آپ خود بھی محسوس کرتے ہوں گے کہ انگریزی میں اس چیز کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اوّل تو خود ہمارے ملک کا ماڈرن طبقہ انگریزی زبان کے سوا کسی دوسری زبان میں کچھ پڑھنے کے لئے تیار نہیں ہے اور ان میں سے ایک اچھا خاصا گروہ ایسا ہے جو پڑھنے کے قابل بھی نہیں ہے اور ہمارے اونچے طبقے میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کے لئے اردو زبان میں اپنا نام لکھنا بھی مشکل ہے۔ پچھلے دنوں ہمارے ملک کے ایک بہت بڑے آدمی کو خیال پیدا ہوا کہ ان کے صاحبزادے جو انگریز ہیں ان کو کچھ اسلام سے واقفیت پیدا ہو، چنانچہ ایک صاحب ان کو اسلام کی تعلیم دینے کے لئے مقرر کئے گئے۔ معلوم یہ ہوا کہ وہ اردو زبان میں کوئی دینی تعلیم حاصل نہیں کر سکتے کیونکہ اردو زبان میں وہ کچھ پڑھ ہی نہیں سکتے۔ لامحالہ ان کو انگریزی میں تعلیم دینے کی ضرورت پیش آئی حالانکہ وہ اسی ملک میں پیدا ہوئے ہیں اور اسی ملک میں ان کا پورا خاندان پیدا ہوا ہے لیکن وہ اس ملک کی زبان سے واقف نہیں ہیں کہ دین کی تعلیم اردو میں حاصل کر سکیں۔ اس کے بعد کوشش کی گئی کہ کسی طرح وہ کم از کم قرآن مجید تو پڑھنے کے قابل ہو جائیں تو ان کو اس قابل بنانے میں ایک مہینہ لگا کہ وہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور سورہ فاتحہ پڑھ سکیں۔ وہ بیچارے کافی دنوں تک یہ کہتے رہے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ الٹا کیسے لکھا ہوا ہے، یعنی جو سیدھا ہے ان کے نزدیک الٹا ہے چونکہ ساری عمر ان کی ادھر سے اُدھر لکھنے اور پڑھنے میں گزری ہے اس لئے ادھر سے ادھر جو کچھ لکھا اور پڑھا جاتا تھا ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ان کو تو یوں دردِ سر ہوتا تھا کہ جیسے کوئی زبان ایسے ہی لکھی جاتی ہے۔ یہ طبقہ ہمارے ہاں موجود ہے اور یہی طبقہ ملک کے معاملات کو چلا رہا ہے۔ اسی کے ہاتھوں میں ملک کی باگیں ہیں۔ اب یہاں یہ لڑائی لڑے جائیں کہ پہلے اردو سیکھو تو ہم نہیں رہ سکیں گے، اس لئے ہمیں ان کے لئے اسی زبان میں بھی مواد فراہم کرنا ہے جس میں وہ سمجھ سکتے ہیں تاکہ کم از کم ان کے عقیدے اور ایمان کو تو بچایا جا سکے۔

اس کے علاوہ باہر کے ملکوں میں اگر آپ اسلام کی تعلیم کو پھیلانا چاہیں تو کم از کم ہمارے لئے انگریزی ہی وہ واسطہ ہے کہ جس کے ذریعہ ہم یہ خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ یوں تو تنہا ایک انگریزی ہی بین الاقوامی زبان نہیں ہے، دوسری زبانیں بھی ہیں جن میں اسلام کے متعلق لٹریچر تیار کرنے کی ضرورت ہے لیکن ہمارے پاس انگریزی کے سوا کسی اور زبان میں نشر و اشاعت کے ذرائع نہیں اور اگر ایک مرتبہ انگریزی زبان میں اسلامی علوم کو ان کی صحیح شکل میں پیش کیا جائے تو اس کے بعد دنیا کی تمام زبانوں میں ترجمے ہونے کا امکان ہے۔ مثلاً ہماری ایک کتاب ہے جس کا انگریزی زبان میں ترجمہ ہو چکا تھا۔ اب اس ترجمہ سے جرمن زبان میں اور جاپانی زبان میں بھی ترجمے ہوئے ہیں اور دوسری زبانوں مثلاً فرنچ میں بھی شروع ہو گیا ہے جرمن دوسری زبانوں میں اسلام کی دعوت پہنچانے کا کام بعد کے دور میں ہے کریں گے بالفعل ہماری کوشش یہ ہونی چاہئے کہ انگریزی زبان میں اسلام کے متعلق صحیح معلومات ہم پہنچا سکیں۔ یہ دنیا میں اسلام کی ترویج کا ایک ایسا ذریعہ ہے جو پوری طرح استعمال کئے جانے کی شدید ضرورت ہے

نومسلموں تک علم پہنچانا

ہمارے پیش نظر اس کے ساتھ ساتھ دو کام اور بھی ہیں اگرچہ اہمیت میں کم ہی سمجھے جائیں لیکن فی الواقع ان کی بھی بڑی ضرورت ہے۔ ایک کام یہ ہے کہ دنیا کے مختلف حصوں میں جو مسلمانوں کی آبادیاں منتشر ہیں وہاں ان کی نسلوں کے ارتداد کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ مثلاً ویسٹ انڈیز میں اور دوسرے دور دراز کے جزائر میں۔ خود امریکہ کینیڈا اور جنوبی امریکہ کے مختلف حصوں میں جو مسلمان آباد ہیں منتشر ہیں وہاں وہ اقلیت میں ہیں۔ کفار کی حکومت بھی ہے اکثریت بھی ہے۔ ان کا تعلیم کا سارا انتظام غیر اسلامی ہے مسلمانوں کی تعلیم کا کوئی ایک خاص انتظام نہیں ہے۔ مسلمانوں کی نئی نسلیں روز بروز غیر مسلم اکثریت میں جذب ہوتی چلی جا رہی ہیں ان کو اسلام کے بارے میں اس کے سوا کچھ معلوم نہیں کہ ہم مسلمانوں کی اولاد ہیں اور اس لئے ہم مسلمان ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان کی ضروریات کے مطابق کچھ مختصر نصاب ایسا تیار کر دیا جائے کہ کم از کم وہاں کی جو نئی مسلمان نسلیں ہیں وہ مسلمان رہ سکیں اور ان کو اسلام کے متعلق ضروری معلومات حاصل ہو سکیں۔

فقہی نصاب

دوسرا ضروری کام یہ ہے کہ مختلف علاقوں میں اسلام کی تبلیغ کی کوششوں کے نتیجے میں جو افراد اسلام قبول کریں ان کو اسلام کے متعلق ضروری معلومات فراہم کی جائیں۔ اس کے بغیر کوئی امکان نہیں ہے کہ وہ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی ایک مسلمان کی سی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں۔

اس مقصد کے لئے ایک ایسا مختصر سا نصاب تیار کرنے کی ضرورت ہے جو ضروری فقہی مسائل پر مشتمل ہو تاکہ جو لوگ اسلام قبول کرتے جائیں وہ اس کی مدد سے مسلمان کی سی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں وہ جان سکیں کہ طہارت اور نجاست کیا چیز ہیں اور ان میں کیا فرق ہے۔ طہارت کیسے حاصل کی جائے نماز کیسے پڑھی جائے۔ روزے کے احکام کیا ہیں۔ زکوٰۃ کے احکام کیا ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ خود اسلام کے مبلغ بن سکیں اس کے لئے ان کو ایسا مواد فراہم کر کے دیا جائے جس سے وہ اسلام کو ٹھیک ٹھیک سمجھیں اور اس کی تبلیغ کر سکیں۔ اس چیز کے لئے بھی کچھ چیزیں تیار کرنا ہمارے پیش نظر ہے، اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ انگریزی کے ماسوا اگر دوسری زبانوں میں بھی اس کا انتظام ہو سکے تو جیسا کہ ہمارے پیش نظر یہ ہے کہ یہ کام سواحلی زبانوں میں بھی کریں تاکہ افریقہ میں یہ چیزیں پھیل سکیں۔ جیسے جیسے دوسری غیر زبانوں میں یہ کام کرنے کے امکانات ہوتے جائیں گے انشاء اللہ ان سے فائدہ اٹھایا جائے گا

یہ اس کام کا ایک مختصر سا نقشہ ہے جو ہمارے پیش نظر ہے ہم نے یہ کام جس غرض کے لئے شروع کیا ہے اور جس ضرورت کو سامنے رکھ کر شروع کیا ہے اس کی وضاحت مختصر طور سے میں نے آپ کے سامنے کر دی ہے

وما علینا الا البلاغ

شاگرد اور استاد

جستہ جستہ

استاد کی نگاہ اور دعا دونوں میں اثر ہوتا ہے اور بلاشبہ شاگرد کی ذہنی اور روحانی زندگی پر استاد کی شخصیت گہرے اثرات مرتب کرتی ہے یہاں ہم بعض معروف شخصیات کے اپنے اساتذہ اور تعلیم کے حوالے سے ذاتی مشاہدات اور واقعات پیش کر رہے ہیں

(محمود)

امام ابو یوسفؒ

امام ابو یوسفؒ کے والد ایک غریب آدمی تھے ان کو اگرچہ بچپن میں لکھنے پڑھنے کا ذوق تھا لیکن باپ کی مرضی یہ تھی وہ چاہتے تھے کہ کوئی محنت کریں اور گھر میں چار پیسے کما کر دیں۔ تاہم جب بھی آپ کو موقع ملتا علما کی صحبت میں جا بیٹھتے۔ ایک دن امام ابو حنیفہؒ کے حلقۂ درس میں جا بیٹھے کہ ان کے باپ آئے اور وہاں سے زبردستی اٹھا کر گھر لے آئے اور کہا کہ بیٹا ابو حنیفہ تو خدا کے رزق کی طرف سے اطمینان رکھتے ہیں، تم ان کی حرص کیوں کرتے ہو؟ امام ابو یوسف نے مجبوراً لکھنا پڑھنا چھوڑ دیا اور باپ کے ساتھ رہنے لگے۔ امام ابو حنیفہؒ نے دو چار دن کے بعد لوگوں سے پوچھا کہ یعقوب اب نہیں آتے؟ ایک دن ابو یوسف خود حاضر ہوئے اور ساری کیفیت بیان کی۔ امام اعظمؒ نے چپکے سے ایک تھیلی حوالے کی۔ گھر آ کر دیکھا تو اس میں سو درہم تھے۔ امام صاحب نے ان سے یہ بھی کہہ دیا کہ جب خرچ ہو چکیں تو مجھ سے کہنا۔ اس طرح برابر ان کو مدد دیتے رہے یہاں تک کہ آپ نے تمام علوم میں کمال حاصل کیا اور استاد وقت ہو گئے۔

علامہ اقبالؒ

علامہ اقبالؒ نے کالج کے زمانہ میں مولوی میر حسن سے بہت کچھ حاصل کیا۔ اپنے شفیق اور بے مثل استاد کو آپ نے کبھی نہ بھلایا۔ ولایت گئے تو ان کی یاد کی تڑپ ساتھ تھی اور سعادت سے تو مولوی صاحب کی عقیدت و محبت ان کے دل کو گرمائے رکھتی تھی۔ اقبالؒ نے ولایت جانے سے قبل دعا کی:

وہ شمع بارگہِ خاندانِ مرتضوی — رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھ کو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی — بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو
دعا یہ کر کہ خداوندِ آسمان و زمیں
کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھ کو

علامہ اقبال کو جب سر کا خطاب پیش کیا گیا تو آپ نے یہ شرط پیش کی کہ پہلے میرے استاد محترم مولوی میر حسن کو شمس العلماء کا خطاب دیا جائے۔ حکومت نے یہ شرط منظور کر لی اور انہیں یہ خطاب دے دیا گیا

مولانا ظفر علی خاں

مولانا ظفر علی خاں طالب علمی کے زمانے میں بھی بہت ذہین و فطین اور برجستہ گو تھے۔ ایک واقعہ انہی کی زبانی سنیے:

"میں جن دنوں پٹیالہ میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا تو ایک رنگین مزاج استاد مکھن لال جی مجھے پڑھایا کرتے تھے۔ یہ استاد صاحب افیمی تھے اور باری باری لڑکوں سے افیم کی چسکی لیا کرتے تھے

ہر لڑکا اپنی باری آنے پر دو آنے کی افیم لا دیتا تھا۔ ایک دن مکھن لال افیم کی چسکی لے کر عجیب ترنگ میں آئے فرمانے لگے، لڑکو! ایک مصرع سناتا ہوں جو لڑکا دوسرا مصرع کہہ کر شعر پورا کرے گا، اسے ایک چسکی معاف ہو گی۔ مصرع یہ تھا:

نصابِ تعلیم

(اس مختصر مضمون میں نصابِ تعلیم کو اسلامی اصولوں میں ڈھالتے وقت پیش نظر رکھی جانے والی بنیادوں کو اجاگر کیا ہے —————— نورؔ)

سب سے پہلی چیز جو اس نظام میں ہونی چاہئے وہ یہ ہے کہ دینی اور دنیوی علوم کی انفرادیت مٹا کر دونوں کو ایک جان کر دیا جائے

پہلی خصوصیت

علوم کو دینی اور دنیوی دو الگ الگ قسموں میں منقسم کرنا دراصل دین اور دنیا کی علیحدگی کے تصور پر مبنی ہے، اور یہ تصور بنیادی طور پر غیر اسلامی ہے۔ اسلام جس چیز کو دین کہتا ہے وہ دنیا سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ دنیا کو اس نقطۂ نظر سے دیکھنا کہ یہ اللہ کی سلطنت ہے اور اپنے آپ کو یہ سمجھنا کہ ہم اللہ کی رعیت ہیں اور دنیوی زندگی میں ہر طرح سے وہ رویہ اختیار کرنا جو اللہ کی رضا اور اس کی ہدایت کے مطابق ہو، اسی چیز کا نام دین ہے۔ اس تصورِ دین کا اقتضاء یہ ہے کہ تمام دنیوی علوم کو دینی علوم بنا دیا جائے۔ ورنہ اگر کچھ علوم دنیوی ہوں اور وہ خدا پرستی کے نقطۂ نظر سے خالی رہیں، اور کچھ دوسرے علوم دینی ہوں اور وہ دنیوی علوم سے الگ پڑھائے جائیں تو ایک بچہ شروع ہی سے اس ذہنیت کے ساتھ پرورش پائے گا کہ دنیا کچھ اور چیز کا نام ہے اور دین کسی اور چیز کا، اس کے لئے یہ دونوں دو مختلف عنصر ہوں گے اور ان کے درمیان توافق پیدا کر کے ایک ایسی ہموار زندگی بنانا اس کے لئے مشکل ہوگا جو اُدْخُلُوا فِی السِّلْمِ كَافَّةً کے مصداق ہو سکے۔

مثال کے طور پر اگر آپ تاریخ، جغرافیہ، طبیعیات، کیمیا، حیاتیات، حیوانات، نباتات، ریاضی، ہیئت، معاشیات، سیاسیات اور دوسرے تمام علوم ایک شخص کو اس طرح پڑھاتے ہیں کہ اول سے آخر تک کہیں خدا کا نام نہیں آتا، نہ آفاق و انفس کے آثار پر اس حیثیت سے نظر ڈالی جاتی ہے کہ یہ آیاتِ الٰہی ہیں، نہ قوانینِ طبعی کا ذکر اس حیثیت سے کیا جاتا ہے کہ یہ ایک حکیم کے بنائے ہوئے قوانین ہیں، نہ واقعات کی توجیہ اس حیثیت سے کی جاتی ہے کہ ان میں کسی قادر و توانا کا ارادہ کام کر رہا ہے، نہ عملی علوم میں اس مقصد کا کہیں نشان پایا جاتا ہے کہ انسان سے خدا کی رضا کے مطابق کام لینا ہے، نہ معاملاتِ زندگی کی بحث میں اس ضابطے کا کہیں بیان آتا ہے جو انسان کو بنانے والے نے بتایا ہے، نہ سرگزشتِ حیات میں اس کے الٰہی مبداء و معاد کی بحث کہیں جگہ پاتی ہے، تو علوم کے اس پورے مجموعہ سے اس کے ذہن میں دنیا اور دنیا کی زندگی کا جو تصور پیدا ہوگا وہ خدا کے تصور سے بالکل خالی ہوگا۔ ہر چیز سے اس کا تعارف خدا کے بغیر ہوگا، اور ہر معاملہ میں وہ اپنا راستہ خدا اور اس کی رضا سے الگ بنائے گا۔ جب تمام شعبوں سے نقطۂ نظر اور معلومات کی یہ ترتیب لئے ہوئے ایک شخص دینیات کی کلاس میں جا کر خدا کا ذکر سنے گا اور ان معتقداتِ زندگی اور قوانینِ اخلاق اور ضوابطِ شرعی کی تعلیم حاصل کرے گا جن کو ہم دینیات کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں تو اس کی سمجھ میں نہ آئے گا کہ اس نقشے میں خدا کو اور اس سے تعلق رکھنے والی ان ساری چیزوں کو کہاں جگہ دوں۔ پہلے تو اسے خدا کی ہستی کا ثبوت ہی درکار ہوگا، پھر وہ اس بات کا ثبوت مانگے گا کہ مجھے اس کی ہدایت درکار بھی ہے اور اس کے پاس سے ہدایت آئی بھی ہے یا نہیں؟ اور ان سب باتوں کے بعد بھی اس کے لئے ایسی دنیوی معلومات کو اس نئی چیز کے ساتھ یکجان کر کے ہم رنگ نقشہ بنانا مشکل ہوگا، خواہ کتنا ہی بحیثیت ایمان لے آئے۔ مگر بہرحال اس کے لئے دین جس اس کی زندگی نہ ہوگا، بلکہ زندگی کا ایک ضمیمہ بن کر رہ جائے گا۔

یہ ساری خرابی دینی اور دنیوی علوم کی تقسیم کا نتیجہ ہے اور جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں یہ تقسیم بالکل اسلامی نقطۂ نظر کے خلاف ہے۔ نئے نظامِ تعلیم میں دینیات کے الگ کورس کی ضرورت نہیں بلکہ سارے کورس کو دینیات کے کورس میں تبدیل کر دینا چاہئے۔ شروع ہی سے ایک بچے کو دنیا سے اس طرح روشناس کرائیے کہ گویا وہ خدا کی سلطنت ہے جس کے اپنے وجود میں اور تمام آفاق میں خدا کی آیات پھیلی ہوئی ہیں۔ ہر چیز میں وہ خدا کی حکمت اور

قدرت کے آثار دیکھ رہا ہے اس کا اور بر تے کا براہ راست تعلق خداوند عالم سے ہے جو آسمان سے زمین تک تمام معاملات دنیا کی تدبیر کر رہا ہے۔ دنیا میں جس قوم اس کو حاصل ہیں اور جو اشیاء اس کے لئے مسخر ہیں، سب کی سب خدا نے اس کو دی ہیں ان سب سے خدا کی مرضی کے مطابق اور اس کے بتائے ہوئے طریقہ پر اسے کام لینا ہے اور اپنے اس کام کی جوابدہی خدا کے سامنے اس کو کرنی ہے۔

ابتدائی مراحل میں تو کوئی دوسرا نقطۂ نظر طالب علم کے سامنے آنا ہی نہیں چاہئے البتہ بعد کے مراحل میں تمام علوم اس کے سامنے اس طرح آنے چاہئیں کہ معلومات کی ترتیب، حقائق کی توجیہ اور واقعات کی تعبیر تو بالکلیہ اسلامی نقطۂ نظر سے ہو۔ مگر اس کے خلاف تمام دوسرے نظریات بھی پوری تنقید و تنقیح کے ساتھ اس حیثیت سے اس کے سامنے رکھ دیئے جائیں کہ یہ خطا پسندی اور مغضوب علیہم کے نظریات ہیں۔ اسی طرح عملی زندگی سے تعلق رکھنے والے جملہ علوم کی بنیاد میں تو مقصد حیات، اصول اخلاق اور مناہج عمل اسلام کے پیوست کئے جائیں اور دوسروں کے اصول اور طریقے اس حیثیت سے طالب علم کو پڑھائے جائیں کہ ان کی فکری اساس، منزل مقصود اور راہ عمل اسلام سے کتنی اور کس کس پہلو سے مختلف ہے۔ یہ طریقہ ہے عام علوم کو دینی علوم میں تبدیل کرنے کا اور جب اس طریقہ تعلیم پر عمل ہو جائے تو ظاہر ہے کہ اس دینیات کے لئے کسی علیحدہ کورس کی کوئی حاجت ہی باقی نہیں رہ سکتی

دوسری خصوصیت

دوسری اہم خصوصیت جو اس نظام تعلیم میں ہونی چاہئے وہ یہ ہے کہ اس میں ہر طالب علم کو مجموعہ علم ماننے اور تکمیل کے بعد ہر ایک کو "مولانا" اور ہر ایک کو جملہ مسائل میں فتویٰ کا مجاز قرار دینے کا وہ طریقہ جو اب تک رائج ہے ختم کر دیا جائے، اور اس کی جگہ اختصاصی تعلیم کا وہ طریقہ اختیار کیا جائے، جو سالہا سال کے تجربات کے بعد دنیا میں معتمد پایا گیا ہے انسان کا علم اب اتنی ترقی کر چکا ہے اور اتنے شعبے اس میں پیدا ہو گئے ہیں کہ کسی ایک شخص کا ان سب کو پڑھنا محال ہے، اور اگر تمام علوم میں محض معمولی سی شدبد اسے کرا دی جائے تو وہ کسی شعبۂ علم میں بھی کامل نہیں ہو سکتا، اس کے بجائے بہتر یہ ہے کہ پہلے آٹھ یا دس سال کا کورس ایسا رکھا جائے کہ ایک بچے کو دنیا اور انسان اور زندگی کے متعلق جتنی معلومات کم سے کم حاصل ہونی ضروری ہیں، وہ اس کو خالص اسلامی نقطۂ نظر و مدیٰ حاصل اس کے ذہن میں کائنات کا وہ تصور بیٹھ جائے جو مسلمان کا تصور ہونا چاہئے۔ زندگی کا وہ خاکہ جم جائے جو ایک مسلمان کی زندگی ہونی چاہئے اس کی عملی زندگی کے متعلق وہ تمام معلومات اسے حاصل ہو جائیں جن کی ایک آدمی کو ضرورت ہوتی ہے اور وہ سب چیزوں کو ایک مسلمان کے طریقے پر برتنے کے لئے تیار کی جائے اسے اپنی مادری زبان بھی آ جائے عربی زبان بھی وہ اتنی جان لے کہ آگے مزید مطالعہ میں اسے مدد مل سکے اور کسی ایک یورپین زبان سے بھی واقف ہو جائے تاکہ معلومات کے اس وسیع ذخیرے سے فائدہ اٹھا سکے جو ان زبانوں میں موجود ہے اس کے بعد اختصاصی تعلیم کے الگ کورس ہوں جن میں چھ یا سات سال کی محققانہ تربیت حاصل کر کے ایک طالب علم اس شعبے کا ایک ڈاکٹر قرار دیا جائے جس کی تعلیم اس نے حاصل کی ہے مثال کے طور پر چند شعبوں اور ان کے طریق تعلیم کی تشریح کروں گا جس سے آپ اندازہ کر سکیں گے کہ میرے ذہن میں اختصاصی تعلیم کا کیا نقشہ ہے۔

ایک شعبہ فلسفہ اور علوم عقلیہ کے لئے مخصوص ہونا چاہئے اس شعبہ میں طالب علم کو پہلے قرآن کا علم پڑھایا جائے تاکہ اس ذریعہ سے وہ معلوم کرے کہ انسانی حواس سے جو چیزیں محسوس ہوتی ہیں ان کی تہہ میں حقائق کی جستجو کرنے کی کیا سبیل ہے، عقل انسانی کی رسائی کہاں تک ہے اور کن حدود سے وہ محدود ہے۔ استدلال پر تخیلات کی عمارت کھڑی کرنے میں کس طرح انسان واقعات اور حقیقت کی دنیا سے الگ ہو کر خیالات کی تاریکی میں گم ہو جاتا ہے۔ مابعد الطبیعی امور کے متعلق کتنا علم انسان کے لئے فی الواقع ضروری ہے، اس ضروری علم تک پہنچنے میں مشاہدہ (OBSERVATION) اور استقراء (INDUCTION) سے کس طرح کام لینا چاہئے، کن امور مابعد الطبیعی کا تعین ہم کر سکتے ہیں، کن کے متعلق ایک مجمل اور مطلق حکم آگے نہیں بڑھ سکتے اور کہاں پہنچ کر اجمال کو تفصیل سے بدلنے یا اطلاق کو تقید میں تبدیل کرنے کی کوشش نہ صرف بے سود ہو جاتی ہے، بلکہ انسان کو خیالات لاطائل کی بھول بھلیوں میں بھٹکا دیتی ہے اس بنیاد کو مستحکم کرنے کے بعد طالب علم کو تاریخ فلسفہ کا مطالعہ کرایا جائے اور یہاں قرآنی فلسفہ کی مدد سے اس کو تمام مذاہب فلسفہ کی سیر کرا دی جائے تاکہ وہ خود دیکھ لے کہ حقائق تک پہنچنے کے جو ذرائع انسان کو دیئے گئے تھے

ان کو چھوڑ کر اس نے کس طرح اس نے اوہام کو حقیقت سمجھا ہے اور اس نے کس طرح اس نے اپنے حواس اور اپنی عقل کی حدود کا تعین کئے بغیر ان حقیقتوں کا تعین کرنے میں اپنا وقت ضائع کیا جن کا تعین اس کے بس کی چیز ہی نہ تھا، کہاں ہندو فلسفیوں نے ٹھوکر کھائی، کہاں سے یونانی فلسفہ بھٹکا، کدھر مسلمان ملا سفر قرآن کی بتائی ہوئی راہوں سے ہٹ کر نکل گئے۔ متکلمین کے مختلف اسکولوں نے بدلوں تک جن مسائل پر بحثیں کیں، ان میں قرآن کی رہنمائی سے کہاں کہاں اور کتنا کتنا تجاوز تھا۔ فلسفہ و تصوف کے مختلف مذاہب نے مفصل اور مطلق کو مقید بنانے کی کس طرح کوششیں کیں ایک ہی حقیقت کی جستجو میں کیسے مختلف مذہب بن گئے، ان مختلف مذاہب میں حق کیا ہے اور باطل کی آمیزش کیسی ہوئی اور کن راہوں سے آئی، کون سے مابعد الطبیعی تصورات ہیں جنہوں نے اپنی جڑ پکڑ لی ہے۔ ان سے اخلاق و اعمال پر کیا اثرات مترتب ہوئے ہیں اور اگر کتاب اللہ کی رہنمائی سے فائدہ اٹھایا جاتا تو فضول و دماغی کاوشوں میں وقت ضائع کرنے اور غلط بنیادوں پر زندگی کی تعمیر کرنے سے کس طرح دنیا بچ سکتی تھی۔ اس عام مطالعے کے بعد طالب اپنی تحقیق کے نتائج مرتب کرے اور جب اہل علم جرح و تنقید کے بعد وہ اپنا کامل الفن ہونا ثابت کر دے تو اس کو فلسفہ میں فضیلت کی سند دے کر چھوڑ دیا جائے

ایک تیسرا شعبہ تاریخ کا ہونا چاہئے جس میں قرآن کا فلسفۂ تاریخ مقصد، مطالعۂ تاریخ اور طرز تاریخ طالب علم کے ذہن نشین کرایا جائے تاکہ اس کے قلب سے تمام تعصبات نکل جائیں، وہ حقائق کو بے رنگ نگاہ سے دیکھے اور ان سے بے لاگ نتائج اخذ کرنے کے لئے مستعد ہو جائے۔ نوع انسانی کی سرگزشت

اور تہذیبِ انسانی کے نشو و ارتقاء کا مطالعہ کر کے اقوام کی فلاح و خسران اور سعادت و شقاوت اور عروج و زوال کے متعلق اصول مستنبط کر کے مدلولات اہم ہیں اس
میں حالات کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جو اوصاف انسان کو اونچا اٹھاتے ہیں اور جو اسے پست گراتے ہیں ان سے واقف ہو اور خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ
کر لے کہ کس طرح فطرت کا ایک خط مستقیم ابتدا سے آج تک سیدھا کھنچا چلا آ رہا ہے جو انسان کی زندگی کا اصل راستہ ہے اس خط سے ہٹ کر جو قومیں دائیں یا
بائیں جانب دور نکل گئیں انہیں تو ٹھوکر کھا کر اسی کی طرف پلٹنا پڑا ورنہ ہمیشہ بھٹکتا گیا کہ اس کا پتہ نشان نہ ملا۔ اس طرز مطالعہ سے جب طالب علم کو معلوم ہو جائے گا
کہ خدا کا قانون کس قدر بے لاگ ہے اور کسی غیر جانبداری کے ساتھ اس نے قوموں سے معاملہ کیا ہے تو کوئی قوم بھی نہ اس کی چہیتی رہے گی اور نہ کسی کے خلاف
اس کے دل میں نفسانی عداوت کا جذبہ رہے گا، جس قوم کے کارنامے پر بھی وہ نظر ڈالے گا بے لاگ طریقہ پر ڈالے گا، اور صلاح و خسران کے ابدی اصولوں
کی کسوٹی پر پرکھ کر کھرے کو الگ اور کھوٹے کو الگ کر کے سامنے رکھ دے گا۔ اس ذہنیت کی تربیت کے بعد اسے تاریخی وسائل سے مواد اور آثار قدیمہ اور واقعات سے
بطور خود نتائج اخذ کرنے کی مشق کرائی جائے اور اتنا تیار کر دیا جائے کہ وہ جاہل مورخین کے چڑھائے ہوئے رنگوں سے اصل حقائق کو الگ کر کے خود
بے لاگ رائیں قائم کر سکے

ایک اور شعبہ علوم عمرانی (SOCIAL SCIENCES) کا ہونا چاہیے جس میں پہلے قرآن اور حدیث سے انسانی تمدن کے بنیادی اصول بتائے جائیں پھر
تفصیل کے ساتھ اصول سے فروع کا استنباط کر کے پورا ڈھانچہ کی رہنمائی میں جو تمدن سے پہلے ان کے نظائر سے استشہاد کرتے ہوئے یہ بتایا جائے کہ ان قواعد
(FUNDAMENTAL PRINCIPLES) پر کس طرح ایک صالح نظام معاشرت، نظام معیشت، نظام سیاست، تدبیر مملکت اور تعلقات بین الاقوامی
کی عمارت اٹھتی ہے، پھر یہ بتایا جائے کہ کس طرح ان ہی اصولوں پر اس عمارت کی مزید توسیع ہو سکتی ہے اور اجتہاد سے توسیع کا نقشہ مرتب کرنے کا کیا طریقہ ہے
اور انسانی علم کی ترقی سے جو نئی قوتیں دریافت ہوتی ہیں اور تمدن کے فطری نشو و نما سے جو نئے طرز عمل پیدا ہوتے ہیں ان کو صالح تمدن میں جذب کرنے اور ایسے
ایسے مختلف مقام پر رکھنے کی کیا صورت ہے۔ اس کے علاوہ ایک طرف طالب علم کو پچھلی قوموں اور مسلمانوں کی مدنی تاریخ کا مطالعہ کرایا جائے تاکہ وہ دیکھے
کہ تمدن کے ان اساسی اصول اور الٰہی حدود کے قریب رہنے اور ان سے انحراف کرنے سے کیا نتائج رونما ہوئے ہیں اور دوسری طرف اسے دور جدید کے سیاسی،
معاشی، اجتماعی نظریات و عملیات کا تنقیدی مطالعہ کرایا جائے تاکہ وہ یہ بھی دیکھ لے کہ انسان نے الٰہی ہدایت سے بے نیاز ہو کر بطور خود اپنی زندگی کے لئے جو
راستے تجویز کئے ہیں وہ کہاں تک اس کے لئے موجب سعادت و شقاوت ہیں

سائنس کی مختلف شاخوں کے لئے چند شعبے علیحدہ ہونے چاہئیں جن میں قرآن کی رہنمائی سے فائدہ اٹھا کر نہ صرف اب تک کی جمع شدہ سائنٹیفک معلومات
کا جائزہ لیا جائے بلکہ آثار فطرت کے مزید مشاہدات اور قوانین فطرت کی مزید دریافت کا کام بھی ان ہی خطوط پر کیا جائے جو قرآن نے کھینچ دیئے ہیں۔ اگرچہ یہ
کتاب سائنس کی کتاب نہیں ہے، نہ اس کے موضوع کا براہ راست سائنس سے کوئی تعلق ہے لیکن چونکہ یہ اسی مصنف کی تصنیف ہے جس نے کائنات کو
تصنیف کیا ہے اور وہ مصنف اپنی ایک کتاب سے دوسری کتاب میں جگہ جگہ استدلال و استشہاد کا کام لیتا ہے، اس لئے اس کے گہرے مطالعہ سے سائنس کے
ایک طالب علم کو نہ صرف نظام کائنات کا بنیادی فارمولا معلوم ہو جاتا ہے بلکہ قریب قریب ہر شعبہ علم میں اسے ایک صحیح نقطۂ آغاز (STARTINGPOINT)
اور تلاش و تجسس کے لئے ایک صحیح سمت (DIRECTION) بھی مل جاتی ہے۔ وہ شاہ کلید (MASTER-KEY) جس کی مشکل کشائی سے اگر آدمی کام لے تو اس کا
بہت سا وقت گتھیوں کے سلجھانے اور سلجھا کے سلجھاتے ہوئے الجھ جانے میں ضائع نہ ہو۔ موجودہ سائنس کی گمراہی میں ایک بڑا سبب یہ ہے کہ وہ حقائق واقعہ کے
مشاہدے کی حد تک تو ٹھیک رہتا ہے، مگر جب حقائق کو جوڑ کر ان سے نظریات بناتا ہے تو کتاب فطرت کے مدار و مطالب سے ناواقف ہونے کے باعث
ٹھوکریں کھاتا جاتا ہے اور اس سے نہ صرف بہت سی انسانی قوت محض ضائع ہوتی ہے بلکہ ان غلط نظریات کو جب انسانی تمدن میں جذب کر کے عملیات کی
بنا اٹھائی جاتی ہے تو وہ فساد تمدن کی موجب ثابت ہوتی ہے۔ قرآن کی رہنمائی میں جب ایک مسلم سائنٹسٹ ثابت شدہ حقائق کو نظریات سے الگ
کر کے مرتب کرے گا اور مزید حقائق دریافت کر کے ان سے صحیح نظریات نکال سکے گا تو کوئی وجہ نہیں کہ دنیا ان سائنٹفک گمراہیوں کو چھوڑنے پر
مجبور نہ ہو جائے جن میں آج وہ مبتلا ہے

جن علوم کو اس وقت علوم دینی کہا جاتا ہے ان کے لئے بھی الگ الگ شعبے مخصوص ہونے چاہئیں۔ مثلاً ایک شعبہ قرآن کے تحقیقی مطالعہ کا ہو جس
میں پچھلے مفسرین کے کام کا جائزہ لینے کے بعد آگے مزید کام کیا جائے۔ مختلف پہلوؤں سے قرآن کی گہرائیوں میں اترنے کی کوشش کی جائے اور
علوم انسانی کے تمام شعبوں سے استفادہ کر کے قرآن میں مزید بصیرت حاصل کی جائے۔ اسی طرح ایک شعبہ علوم حدیث کا ہونا چاہیے جس میں قدیم
محدثین کے کام سے پورا فائدہ اٹھانے کے بعد حدیث میں تحقیق، تنقید، تدوین معلومات اور اخذ نتائج کا مزید کام کیا جائے اور دور رسالت کے متعلق
زیادہ سے زیادہ تفصیلات ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالی جائیں اور ان سے وہ نتائج اخذ کئے جائیں جو اب تک ہمارے علم سے مخفی ہیں۔ ایک شعبہ قانون کا ہونا
چاہیے جس میں قرآن کے احکام، حضرت نبوی کی قولی و عملی تشریحات، صحابہ کرام اور تابعین کے اجتہادات اور آئمہ مجتہدین کے طرز استنباط اور جزئیات
میں ان کی تصریحات کا مفصل تحقیقی مطالعہ کیا جائے، نیز دنیا کی دوسری پرانی اور نئی قوموں کے قوانین اور قانونی نظامات پر بھی گہری نظر ڈالی جائے۔
اور زندگی کے دور بدور بدلنے والے معاملات و مسائل پر اصولی قانون اسلامی کو منطبق کر کے فقہ کے ان حصوں کو پھر سے رواں کیا جائے جو صدیوں سے سوکھ
کر رہ گئے ہیں۔ یہ نہ صرف بجائے خود بہت عظیم الشان کام انجام دیں گے، بلکہ دوسرے تمام شعبوں کو بھی کتاب اللہ اور سنت رسول کے متعلق ان ہی
سے وہ مواد ملے گا جس کی بنیاد پر علم کی تمام راہوں میں تحقیق و اکتشاف کا کام چلایا جائے گا۔

صبا شاہد
(سابق ایڈیٹر [illegible])

انگریزی درسگاہوں کا زہر

ذیل میں ہم نے بیرٹ محمد اور حسکر کے بعد انگلش میڈیم سکولوں کے بارے میں ایسی معلومات جمع کی ہیں جو یقیناً آپ کے لئے دلچسپی کا باعث ہوں گی اور اہل نظر کو دعوت فکر دیں گی۔

شاید یہ ملک خدا کا۔ تہذیب کے نام پر حاصل کیا گیا ہے اپنی تہذیب کو ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی، دفتروں میں — بازاروں میں — دکانوں، گھروں، گلیوں اور محلوں میں، مگر وہ کسی جگہ دکھائی نہ دی۔ ہر طرف ایک ایسی تہذیب اور تمدن جلوہ فرما ہے جسے اس ملک سے نکالنے کی کوشش میں ہم نے بے شمار قربانیاں دی تھیں یقین ہو گیا کہ ہمیں بھی امریکہ کے روپ میں رہبر دیا گیا ہے اس رہبر کی تلاش میں نکلا، تو سامنے ایک عمارت دکھائی دی جس کی پیشانی پر پرانے آقاؤں کی زبان میں کچھ لکھا تھا اندر جھانکا، ایک خوبصورت سبزہ زار پر بہت سے معصوم بچے اور بچیاں نظر آئے ان کے لباس غیر ملکی تھے اور زبان بھی غیر ملکی قریب کھڑے ہوئے ایک بچے نے اپنے ساتھی سے کچھ کہا بیچارے کو یاد ہی نہ رہا کہ اپنے ملک کی زبان میں گفتگو کرنا جرم ہے ایک استاد نے اس کی بات سن لی تھوڑی دیر بعد سب لڑکے چلے گئے لیکن اس بچے کو ایک گھنٹہ تک دھوپ میں کھڑے رہنے کی سزا ملی اس کا خوبصورت چہرہ پسینے سے تر ہو گیا، نظریں شرم و ندامت سے جھک گئیں اور وہ ایک غیر ملکی زبان میں قسمیں کھا کھا کر یقین دلانے لگا کہ آئندہ ملکی زبان میں گفتگو نہیں کرے گا

تھوڑی دیر بعد میں ایک استانی صاحبہ کے ساتھ سکول میں گھوم رہا تھا استانی صاحبہ اینگلو انڈین تھیں اور منہ بگاڑ بگاڑ کر انگریزی بولتی تھیں سکول کی عمارت صاف ستھری وسیع و عریض تھی۔ آراستہ پیراستہ کمرے، ہرے بھرے لان، خاکی پتلون اور سفید قمیص پہنے ہوئے صاف ستھرے بچے دیکھ کر بہت مسرت ہوئی معلوم ہوا اسٹاف میں کل ۲۱ ملازم ہیں ان کی تفصیل یہ تھی:

غیر ملکی عیسائی —— ۵
ملکی عیسائی —— ۹
ملکی مسلمان —— ۶
مولوی صاحب —— ۱

تین پادری تھے جن میں سے ایک ملکی تھے، دو غیر ملکی چھ مسلمان اساتذہ میں سے دو کے نام بدل چکے تھے ایک صاحب کا نام مسٹر شے تھا تحقیق کرنے سے پتہ چلا کہ زمانہ طالب علمی میں ان کا نام مل شیخ تھا اس سکول میں آ کر وہ اپنے آپ کو مسٹر شیخ کہلانے لگے بعد میں مسٹر شے بن گئے ایک اور استاد محترم کے نام کا ایک جز نیک (یعنی پارسا) تھا، انہیں یہ بھی کچھ زیادہ پسند نہ تھے، چنانچہ وہ نیک کے بجائے نک (NECK) (یعنی گردن) ہو گئے۔ سفید براق لباس پہنے

پادری صاحبان سے ملاقات ہوئی آنکھوں میں نرمی اور شفقت، ہونٹوں پر مسکراہٹ بڑی محبت سے پیش آئے انہوں نے پاکستانیوں کی مہمان نوازی کی بہت تعریف کی میں فخر سے پھولا نہ [illegible]

مولوی صاحب سے مل کر جی بہت خوش ہوا انہیں اس وقت ملازم رکھا گیا تھا جب حکومت کی طرف سے تمام تعلیمی اداروں میں دینیات کی تعلیم لازمی قرار دی گئی اُن کا لباس بہت معمولی تھا بیچارے کچھ پریشان سے نظر آئے معلوم ہوا دوسرے اساتذہ کے مقابلے میں انہیں تدریس کے لیے وقت بھی کم ملتا ہے اور معاوضہ بھی کم ہفتے میں ایک دو بار کسی جماعت کو دینیات پڑھانا اُن کے فرائض میں شامل تھا ویسے اکثر طلبہ اس پیریڈ سے غائب رہتے ہیں اور جو ہیں تو دلچسپی نہیں لیتے

انہوں نے بڑے دکھ سے شکایت کی کہ طلبہ اُن کے لباس اور وضع قطع کا مذاق اڑاتے ہیں تنخواہ کے بارے میں پوچھا، انہوں نے ٹالنا چاہا بہت اصرار کے بعد بتایا ۹۰ روپیہ ماہوار ملتے ہیں۔

مولوی صاحب کسی مستند دینی درسگاہ کے فارغ التحصیل نہ تھے صرف قرآن مجید حفظ کیا تھا چند سال قبل ایک سرکاری افسر کے بچوں کو قرآن مجید پڑھاتے تھے، انہی افسر نے سکول میں ملازمت دلوائی

استانی صاحبہ سے درخواست کی چند طلبہ سے ملنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے عجیب سی نظروں سے دیکھا، اجازت دے دی تھوڑی دیر بعد دس طلبہ میرے سامنے تھے ان کی عمر سات برس سے گیارہ برس تک تھی تین لڑکیاں تھیں، سات لڑکے بات چیت انگریزی زبان میں ہوئی چھوٹے بچے بمشکل انگریزی بولتے تھے کسی لفظ پر رک جاتے تو ترجمہ طلب نگاہوں سے استانی صاحبہ کی طرف دیکھتے وہ جملہ مکمل کر دیتیں اس گفتگو سے حسب ذیل معلومات حاصل ہوئیں۔

- دس میں سے چار طالب علم بالائی طبقے سے تعلق رکھتے تھے تین اعلیٰ متوسط طبقے سے آئے تھے دو ملکی عیسائیوں کے بچے تھے، ایک زیریں متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا
- دس میں سے صرف ایک طالب علم کے گھر میں انگریزی زبان رائج تھی، باقی نو گھرانوں سے آئے تھے جہاں بات چیت ملکی زبان میں ہوتی تھی۔
- تین طلبہ کے والدین اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے چار معمولی تعلیم یافتہ، لیکن دولت مند،

کی اولاد تھے۔ ایک طالب علم تعلیمی اعتبار سے متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ دو طلبہ معاشرتی اور معاشی لحاظ سے ادنیٰ طبقے سے آئے تھے مگر عیسائی ہونے کی وجہ سے انہیں خاص مراعات حاصل تھیں۔

- گھر کے افراد اور دوستوں کے حلقے میں صرف تین طلبہ اپنے اصلی ناموں سے پکارے جاتے۔ سات کو پیار کے ناموں سے یاد کیا جاتا تھا۔ سکول میں عام نام یہ تھے۔ ردل، ٹینی، ٹنی، لی، مانی، ڈولی، کسنڈی، ایری، پیٹر ردر، ڈنکل بڈو وغیرہ۔
- نو بچے والدین کو ڈیڈ اور مم کہتے تھے۔ صرف ایک بچی ابا اور امی کے نام سے یاد کرتی تھی
- گھر سے سکول آتے وقت ایک طالب علم السلام علیکم کہتا تھا، باقی ۹ بائی بائی۔

ان کی معلومات عامہ کا اندازہ کرنے کے لیے چند سوال بھی پوچھے۔ پہلا سوال تھا

- "کسی قومی تہوار کا نام لیجیے"

طلبہ کے جواب بالترتیب یہ تھے:

کرسمس، کرسمس، عید کرسمس، ایسٹر، کرسمس، اتوار، عید مبارک، کرسمس، شب برات

- عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کے معنی بتایئے

اس سوال کا جواب صرف ایک بچی نے دیا۔ اول عیدالفطر میٹھی ہوتی ہے اور عیدالاضحیٰ نمکین۔ فطر اور اضحیٰ کے معنی کوئی نہ بتا سکا۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ عید کیوں منائی جاتی ہیں۔

- "رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کب اور کس شہر میں پیدا ہوئے؟"

کب کا جواب کوئی نہ دے سکا۔ شہر کا نام یہ بتائے گئے

عرب، عرب، عرب، صحرائے عرب، مکہ مدینہ، مکہ مدینہ، مدینہ، مدینہ، مکہ۔ ایک طالب علم نے کوئی جواب نہ دیا

- دس میں سے صرف دو طلبہ کو نماز یاد تھی۔ ان میں سے بھی ایک طالب علم مشکل سورہ فاتحہ سنا سکا۔ ایک بچی نے غلط سلط نماز سنائی مگر دعائے قنوت پر پہنچ کر اس کی ہمت جواب دے گئی

- "حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یہودیوں نے کیا سلوک کیا؟"

دس کے دس طلبہ نے بتایا وہ مصلوب کر دیے گئے تھے۔ کوئی طالب علم مسلمانوں کے اس عقیدے سے آگاہ نہ تھا کہ انہیں زندہ اوپر اٹھا لیا گیا ہے۔

- "پاکستان کس نے بنایا؟"

سات طلبہ نے قائداعظم کا نام لیا۔ ایک نے مسٹر محمد علی جناح کہا۔ ایک کے خیال میں قائد ملت پاکستان کے بانی تھے۔ ایک طالب علم نے یہ اعزاز صدر محمد ایوب خان کو دیا

میں سوال پوچھ رہا تھا اور استانی صاحبہ بے چینی سے پہلو بدل رہی تھیں۔ آخر وہ بولیں۔

"مجھے پیریڈ لینا ہے اب ہمیں چلنا چاہیے"

میں نے طلبہ کا شکریہ ادا کیا اور ان کے ساتھ ہو لیا۔ سکول کی عمارت کا ایک چکر لگایا۔ گرجا گھر دیکھا جس کی دیواروں پر اور برآمدوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم کی رنگین تصویریں تھیں۔ میں نے بھی بڑے اشتیاق سے یہ تصویریں دیکھیں۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ انگلش میڈیم سکول دیکھنے کی غرض سے مجھے مغربی پاکستان کے بیشتر بڑے بڑے شہروں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ مشنری اداروں کے تحت تقریباً تمام سکولوں میں گرجا گھر عمارت کا ایک لازمی جزو ہے۔ کئی مقامات پر جگہ کی کمی کے باعث چھوٹے بچوں کی کلاسیں بھی گرجے میں لگی تھیں۔ استانی صاحبہ سے معلوم ہوا اکثر اوقات یہاں فلمیں دکھائی جاتی ہیں چونکہ انگریزی میڈیم سکول ہے اس لیے فلمیں سب کی سب انگریزی ہوتی ہیں۔ انگریزی فلمیں چھوٹے چھوٹے بچوں کے ذہنوں پر بڑے گہرے اثرات چھوڑتی ہیں۔

اگو پر میں نے جس سکول کا ذکر کیا وہ غیر اقامتی تھا۔ سوچا اچھے اچھے اقامتی سکول بھی دیکھے جائیں۔ مغربی پاکستان کے ایک مشہور اقامتی سکول میں پہنچا اور ابتدائی کلاسوں کے رہائش کمرے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی جس عمارت میں بچے مقیم تھے، وہ گرجا گھر کے بالکل سامنے تھی۔ سکول ۵۰ ایکڑ کے رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ مسجد اس جگہ سے کوئی پون میل کے فاصلے پر ہوگی۔ رہائشی کمروں کی دیواروں پر وہی تصویریں نظر آئیں جنہیں اصولاً گرجا گھر میں ہونا چاہیے تھا۔ بچوں کا ڈرائنگ ورک بھی دیکھا۔ چند بچے متبرک تصویروں کی نقل اتار رہے تھے۔ یہ سکول کسی مشنری ادارے کے تحت نہ تھا۔ اس کے باوجود ہیڈ مسٹریس اور کئی استانیاں عیسائی تھیں۔ ہیڈ مسٹریس صاحبہ بولیں

"آپ نے گرجا نہیں دیکھا، اندر سے بہت خوبصورت اور آرام دہ ہے۔ ہمارے بچے اکثر شوق سے وہاں جاتے ہیں اور وہیں بیٹھ کر سبق تیار کرتے ہیں"

سوچا وہ دماغ کتنے دوررس تھے جنہوں نے بچوں کے رہائشی کمروں کے سامنے گرجا گھر تعمیر کیا۔ بچوں کا روزمرہ معمول یہ تھا۔ صبح اٹھ کر ناشتا کرنا اور سکول جانا۔ ساڑھے گیارہ بجے تک کلاس میں پڑھنا، بارہ بجے کھانے کے لیے واپس ہاسٹل میں آنا۔ دوپہر کے دو گھنٹے کھیل یا تفریح میں بسر کرنا۔ تین بجے سے شام پانچ بجے تک کھیل کے میدان میں حاضری۔ پانچ بجے چائے پینا (سب چھوٹے بچوں کو دودھ ملتا ہے) بعد ازاں سبق یاد کرنا۔ تصویریں بنانا۔ اپنے اپنے مشاغل میں وقت گزارنا۔ لائبریری میں جس قدر کتابیں انگریزی کی تھیں اردو کی دس بیس کتابیں نظر آئیں جو سب کی سب مسیحی اداروں کی شائع کردہ تھیں۔ کہانیوں کی یہ کتابیں اکثر چھوٹے بچوں کو دی جاتی تھیں۔ ایک کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ اس جملے پر نظر پڑی:

"جاوید بہت اچھا لڑکا تھا۔ ہر اتوار کو باقاعدہ گرجے میں جاتا تھا"

ایسی کتابیں پڑھ کر ایک بچہ یہ مفہوم سمجھا اچھا بننا چاہتا ہے، تو اسے بھی ہر اتوار گرجے جانا چاہیے

چھوٹے بچوں کے بعد میں نے بڑے بچوں سے ملنے کا منصوبہ بنایا ــــ انگریزی میڈیم کے ایک بہت بڑے مشہور تعلیمی ادارے میں استاد صاحب نے میرا تعارف آٹھ طلبہ سے کرایا۔ یہ طلبہ میٹرک کا امتحان دینے والے تھے۔ ان کی عمریں ۱۴ سے ۱۸ برس تک تھیں۔ استاد صاحب کو کام تھا، وہ مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ اتفاق سے طلبہ کا ریڈ ہال تھا۔ ہم لان میں بیٹھ گئے۔ خاصی دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ طلبہ انگریزی اس طرح بولتے تھے جیسے ہالی ووڈ کی فلموں میں اداکار بولتے ہیں۔ اکثر گھٹیا اور بازاری انگریزی میں گفتگو کر رہے تھے۔ بعض اوقات وہ کسی جملے پر رک جاتے۔ شاید انگریزی زبان ساتھ چھوڑ دیتی تھی۔ ایسے موقعوں پر بات چیت ایسی زبان میں ہونے لگی جو اردو، انگریزی اور چند علاقائی زبانوں کا معجون تھی۔

آٹھ طلبہ میں سے تین نے بیٹلز (BEATLES) کی طرح کے بال رکھے ہوئے تھے۔ ایک کے ہونٹوں سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ہلکی سی سرخی استعمال کی گئی ہے۔ باقی طلبہ اس طالب علم کو مِس   کے نام سے پکارتے تھے۔

سات طالب علموں نے انتہائی چست کپڑے پہن رکھے تھے، ایک کا لباس بستا آرام دہ معلوم ہوتا تھا۔

دو طالب علموں نے قمیصوں کے بٹن کھول رکھے تھے اور آپس میں بحث کر رہے تھے کہ کس کے سینے پر بال زیادہ ہیں۔

یہ طلبہ بالائی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ سکول میں بھی اساتذہ کا رویہ بہت نرم تھا۔ اس لیے خاصی گرمجوشی اور بیہودہ زبان استعمال کر رہے تھے۔ استاد قریب سے گزرے تو ایک طالب علم نے نعرہ لگایا

" BARKING DOGS SELDOM BITES

، دوسرے نے صرف اتنی کمی کر دی، سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ مخصوص حوالہ جات کی عدم موجودگی میں اکثر ہمیں ایسے ہی خوبصورت ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ چند نام جو ہم نے ان کی گفتگو سے اخذ کیے یہ ہیں:

"MR LAZY, MR PUSSY, MR DONKEY, , MR KINGSTORK, MR PIGGY"

ان طلبہ سے براہ راست سوال کرنا تقریباً ناممکن تھا میں نے بے تکلف ہونے کی خاطر تاکہ باتوں ہی باتوں میں معلومات حاصل کر سکوں۔ تھوڑی دیر بعد وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے:

"شہر میں کون کون سی فلمیں چل رہی ہیں؟"

"کیا یہ سچ ہے کہ لاہور میں لڑکیوں کی قمیصیں پھر سے لمبی ہو رہی ہیں؟ اور منی سکرٹ کا رواج ہونے والا ہے!"

آخری سوال سن کر ایک طالب علم نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا اور بولا:

"YOU GOT A SWEET HEAR"

اس بے تکلفی پر میں حیران ہو گیا جواب دینے کے لیے میں الفاظ تلاش کر رہا تھا کہ دوسرا بولا

"O, COME ON, TELL US THE TRUTH
YOU ARE NOT AN OLD CAT
MUST HAVE ONE SWEET HEART AT LEAST".

اس بات پر سب نے زور زور سے قہقہے لگائے مجھے بھی ان کا ساتھ دینا پڑا۔ ایک صاحب بڑے فخر سے اپنی سویٹ ہارٹ کی باتیں کرنے لگے۔ سننے والوں کے چہرے خوشی سے گلنار ہو رہے تھے۔ وہ لڑکا جسے اس کے ساتھیوں نے مس کے خطاب سے سرفراز کیا تھا لڑکیوں کی طرح شرمانے لگا۔ ایک طالب علم بولا:

"آج شام کا ہیرو کون ہے؟"

سب نے ہاتھ کھڑا کیا۔

یوں کام نہیں چلے گا ٹاس کرو۔ مس نامی لڑکے نے احتجاج کیا۔

ٹاس کے بعد جیتنے والا لڑکا اور "مس" آپس میں گلے مل رہے تھے۔

"وہ کون سی شخصیت ہے جس نے آپ سب کو سب سے زیادہ متاثر کیا؟" میں نے سوال کیا

جواب کا خلاصہ یہ ہے

ایلوس پریسلے (امریکی گلوکار) ایلوس پریسلے، قائداعظم، بانی ڈورس (امریکی ایکٹریس)، ذوالفقار علی بھٹو، راک ہڈسن (امریکی ایکٹر)، عزیز بھٹی شہید، سامد راڈی (امریکی ایکٹرس)

آخری نام پر چار پانچ طلبہ نے یک زبان کہا

"ہاں ہاں سامد راڈی ہماری پسندیدہ شخصیت ہے"

"بکواس بند کرو، یہ میری پسند ہے۔ تم نے تو صدر ناصر کا نام لیا تھا"

"قذافی کی ایک بات مجھے بہت پسند ہے" وہ بولا میں سمجھا تھا ناصر کی عرب پسندی یا قذافی کے خلوص اور لگن سے متاثر ہے لیکن معاملہ اس کے برعکس نکلا "قذافی اپنے ملک میں مولویوں کا صفایا کر رہا ہے میرے بس میں ہوتا تو اپنے ملک کے سارے مولویوں کو ..." وہ فقرہ نامکمل چھوڑ کر دانت پیسنے لگا۔

"میرے خیال میں صرف یہ سزا کافی ہے کہ ان سب کی داڑھیاں منڈوا دی جائیں" دوسرے نے اظہار خیال کیا

"تعلیم سے فارغ ہو کر آپ کیا بننا چاہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میں پاک فوج میں جانا چاہتا ہوں" یہ اس طالب علم کا جواب تھا جس نے عزیز بھٹی کو اپنی محبوب ترین شخصیت بتایا تھا اس کے ماتھے پر عزم و ہمت کے آثار دکھائی دیتے۔

صدر ناصر کو پسند کرنے والا طالب علم سی ایس پی بننے کا خواہشمند تھا۔

تین طالب علم اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ملک سے باہر جانا چاہتے تھے ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ تعلیم سے زیادہ سیاحت (بلکہ آوارگی) کے شوقین ہیں

دو طالب علم بڑے زمینداروں کے چشم و چراغ تھے وہ کوئی واضح جواب نہ دے سکے

ایک طالب علم ڈاکٹر بننا چاہتا تھا۔

دوران گفتگو یہ محسوس کر کے تعجب ہوا کہ طلبہ ایک نہایت ماڈرن لڑکے کو مولوی صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ استفسار کیا تو پتہ چلا کہ وہ طالب علم ایک [illegible] گھرانے سے تعلق رکھتا ہے والد ملک سے باہر ہیں والدہ کبھی کبھار اُن کی خیریت دریافت کرنے کے لیے اپنے بھائی کو بھیج دیتی ہیں جو باریش ہیں۔ بے تکلف دوستوں میں اس طالب علم کو مولوی صاحب کے نام سے ہی پکارا جاتا ہے۔ میری طرف دیکھ کر وہ بولا:

"میں ہزار بار امی سے کہہ چکا ہوں کہ ماموں کو یہاں نہ بھیجا کریں اور اگر بھیجنا ضروری ہے تو پہلے ان کی داڑھی صاف کرائیں مگر وہ ہنس کر ٹال دیتی ہیں۔ یہ ذات شریف اس مرتبہ آئے تو ملنے سے انکار کر دوں گا"

بھٹو صاحب کو پسند کرنے والے طالب علم سے بھی گفتگو ہوئی کہنے لگا

"بھٹو مجھے صرف اس لیے پسند ہے کہ دوسروں کی نسبت سمارٹ اور خوش پوش ہے اگر سیاستدان نہ ہوتا تو بالی ووڈ کے بڑے سے بڑے ایکٹر کا مقابلہ کر سکتا تھا خصوصاً فیس ایکسپریشنز (FACE EXPRESSIONS) میں اس کے"

اوپر کی چند مثالوں سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان سکولوں میں کس قسم کی پود تیار ہو رہی ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم ان سکولوں کا جائزہ لیں، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ برصغیر میں ان اداروں کی آمد اور غرض و غایت پر نظر ڈالی جائے

موجودہ دور کے عظیم فلسفی برٹرینڈ رسل نے ان سکولوں کے بارے میں کہا

"میرے خیال میں پبلک سکولوں کو ختم کر دینا چاہیے — ان کی بنیادوں میں نمک ڈال دیا جائے (تاکہ دوبارہ سرسبز نہ ہو سکیں)"

برصغیر میں انگریزوں نے اپنی آمد کے ساتھ ہی یہ محسوس کر لیا کہ جب تک یہاں کا نظام تعلیم اپنی مرضی کے مطابق مرتب نہ کیا جائے حسب منشا نتائج برآمد نہ ہو سکیں گے وہ چاہتے تھے کہ ملک میں برطانوی سامراج کے لیے وفاداروں کی ایک کھیپ تیار کی جائے جو مغربی تہذیب سے مرعوب اور متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی معاشرت سے نفرت کرتی ہو اور مقامی باشندوں سے الگ تھلگ رہے۔ اس خاص مقصد کو پورا کرنے کے لیے انہوں نے راجوں، مہاراجوں، نوابوں اور اپنے دوسرے خوشامدیوں کے بچوں کے لیے پبلک سکولوں کی طرز پر اقامتی درسگاہیں بنائیں۔ ان درسگاہوں میں ایچی سن کالج لاہور، لارنس کالج گھوڑا گلی، ڈیلی کالج اور ایچکا کالج کے نام زیادہ مشہور ہیں۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ ان کالجوں میں داخلے کے لیے نامزد شدہ افراد کی ایک فہرست بنائی گئی تھی۔ صرف انہی لوگوں کے بچوں کو داخل کیا جاتا، جن کا نام فہرست میں شامل ہوتا بعض اوقات گورنر کی ذاتی سفارش پر بھی داخلہ مل جاتا تھا

اس دور میں پڑھائی سے زیادہ اٹھنے بیٹھنے کے مغربی آداب پر زیادہ زور دیا جاتا تھا

ان سکولوں کے ساتھ ساتھ مشنریوں نے بھی خاص تعلیمی ادارے قائم کیے۔ مقصد یہ تھا کہ تعلیم کے پردے میں مخصوص نظریات اور عقائد کی تبلیغ کی جائے۔ پاکستان بننے کے بعد اصولی طور پر یہ سلسلہ ختم ہو جانا چاہیے تھا کیونکہ ہم نے یہ ملک تہذیب اور مغربی سامراج

کے پاکستان کی ضرورت ہے۔ لیکن بدقسمتی سے برسرِ اقتدار لوگ مغربی تہذیب سے اس درجہ متاثر تھے کہ انہیں ایسے اداروں کا وجود ضروری معلوم ہوا، چنانچہ یہ ادارے باقاعدگی سے اپنا کام کرتے رہے۔ پہلے صرف وہ لوگ بچوں کو ان سکولوں میں بھیج سکتے تھے جن کا نام ایک خاص فہرست میں شامل ہو۔ تقسیم کے بعد یہ پابندی ختم کر دی گئی۔ اب ہر وہ شخص اپنے بچوں کو یہاں داخل کرا سکتا تھا جس کے پاس دولت ہو۔ ایسے اداروں کی سرپرستی زیادہ تر ان طبقوں نے کی۔

۱۔ وہ طبقہ جو مغربی تہذیب کا پرستار ہے

۲۔ ایسے لوگوں کی وفاداریاں تقسیم کے بعد بھی انگریزوں کے ساتھ تھیں

۳۔ وہ طبقہ جو نظریۂ پاکستان پر یقین نہ رکھتا تھا۔

۴۔ ضعفائے صبر لوگ

۵۔ وہ لوگ جنہیں روپیہ اچانک ہاتھ لگا تھا اور نام نہاد ترقی کی راہ پر سب سے آگے نکلنا چاہتے تھے۔

۶۔ نام و نمود کے شوقین

۷۔ وہ صنعت کار اور جاگیردار جو تعلیم یافتہ نہ تھے اور چاہتے تھے کہ اُن کا بچہ انگریزی بولتا ہوا نظر آئے۔

۸۔ تعلیم یافتہ اور متوسط طبقے کے افراد جو اعلیٰ طبقہ میں داخل ہونا چاہتے تھے اُس مقصد کے پیشِ نظر انہوں نے بچوں کو وسیلہ بنایا اور انہیں ایسے تعلیمی اداروں میں داخل کرایا جہاں اُمرا کے بچے پڑھتے تھے۔

آج کل ملک میں جو انگلش میڈیم سکول کام کر رہے ہیں انہیں آسانی کی خاطر درج ذیل قسموں میں بانٹا جا سکتا ہے

۱۔ وہ غیر سرکاری پبلک سکول جو مشنری اداروں کے تحت نہیں ہیں، ان میں ایچی سن کالج لاہور، لارنس کالج گھوڑا گلی، علی گڑھ پبلک سکول ملاکنڈ، حبیب پبلک سکول کراچی، مرزا سکیم سکول اور اس قسم کے دوسرے ادارے شامل ہیں۔ کچھ ادارے اقامتی ہیں بعض مقامات پر مقامی طلبہ DAY SCHOLARS بھی داخل کر لیے جاتے ہیں۔ بالعموم ان اداروں کو بورڈ آف گورنرز چلاتا ہے محکمۂ تعلیم سے باقاعدہ گرانٹ ملتی ہے۔

۲۔ افواجِ پاکستان کے سکول۔ ان میں پاک فضائیہ کے دونوں سکول سرِفہرست ہیں یعنی پی اے ایف سکول لوئر ٹوپہ، پی اے ایف سکول سرگودھا۔ دوسرے اداروں میں کیڈٹ کالج حسن ابدال، ملٹری کالج سرائے عالمگیر جہلم، کیڈٹ کالج کوہاٹ اور کیڈٹ کالج پٹارو کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ یہ ادارے بھی بورڈ آف گورنرز کے تحت ہوتے ہیں۔ بورڈ کا چیئرمین علاقے کا انسپکٹر جنرل (ٹریننگ) ہوتا ہے۔

۳۔ سرکاری پبلک سکول تعلیمی کمیشن کی سفارشات پر عملدرآمد کرتے ہوئے محکمۂ تعلیم نے ہر ڈویژن میں ایک پبلک سکول قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ڈویژنل پبلک سکول متعدد مقامات پر قائم ہو چکے ہیں۔

۴۔ کنٹونمنٹ پبلک سکول۔ یہ سکول کنٹونمنٹ بورڈ کے ماتحت ہوتے ہیں۔

۵۔ مشنری اداروں کے تحت کام کرنے والے سکول۔ ان میں اقامتی ادارے بھی ہیں غیر اقامتی ادارے بھی۔ اقامتی سکولوں میں برن ہال ایبٹ آباد، سینٹ ڈینی ہائی سکول، سیکرڈ ہارٹ سکول لاہور، لارنس کالج مری، جیسس اینڈ میری کونونٹ مری وغیرہ شامل ہیں۔

غیر اقامتی سکولوں میں گرامر سکول کراچی، سینٹ انتھونی سکول لاہور، سینٹ پیٹرک ہائی سکول کراچی، گرامر سکول کوئٹہ، سینٹ گریگوری سکول ڈھاکہ زیادہ مشہور ہیں۔ اس قسم کے اداروں میں سے بعض براہ راست مشنریوں کے تحت کام کرتے ہیں اور بعض دیگر مشنریوں سے متعلق ہیں۔

۶۔ انگریزی میڈیم سکولوں کی آخری اور سب سے عام قسم وہ چھوٹے چھوٹے پرائیویٹ ادارے ہیں جو آپ کو شہروں اور قصبوں میں جابجا ملیں گے۔ کسی اچھے سے مکان پر "کنڈرگارٹن" اور "داخلہ شروع ہے" کا بورڈ لگایا اور پڑھائی شروع ہونے لگی۔

اوپر ہم نے جن سکولوں کا ذکر کیا ہے ان سب میں قدرِ مشترک انگلش میڈیم ہے۔ انگلش میڈیم کی حمایت اور مخالفت میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ ایک مختصر سا جائزہ ہمیں سمجھنے میں مدد دے گا۔ عام طور پر انگلش میڈیم کے حسبِ ذیل فوائد بیان کیے جاتے ہیں

۱۔ ہمارے ہاں انگریزی زبان کو وہی اہمیت حاصل ہے جو برطانوی عہد میں تھی۔ انگریزی دفتری زبان ہے۔ اعلیٰ ملازمتوں کے لیے انگریزی دان ہونا ضروری ہے مقابلے کے امتحانوں میں سارے پرچے انگریزی زبان میں حل کیے جاتے ہیں، چنانچہ اس صورت میں ترقی کے خواہش مند طلبہ کے لیے ضروری ہے کہ انگریزی لکھ پڑھ اور بول سکیں۔ انگلش میڈیم سکولوں میں سارے مضامین انگریزی میں پڑھائے جاتے ہیں، اس لیے تصور کیا جاتا ہے کہ طلبہ انگریزی زبان پڑھنے لکھنے اور بولنے کی صلاحیت پیدا کر لیں گے۔

۲۔ سماجی (SOCIAL) اعتبار سے انگلش میڈیم سکول کی نسبت بہتر سمجھے جاتے ہیں۔ بہتر ماحول، صاف ستھری عمارت، اچھا سٹاف اور طلبہ پر ذاتی توجہ ان سکولوں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

۳۔ انگلش میڈیم سکولوں میں پڑھنے والے طلبہ کسی مضمون میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ملک سے باہر جانا چاہیں، تو انہیں آسانی رہتی ہے، کیونکہ انہوں نے اس خاص مضمون کی تعلیم انگریزی زبان میں حاصل کی ہے۔

ظاہر ہے فوائد کے ساتھ ساتھ انگلش میڈیم کے نقصانات بھی ہوں گے۔ حسبِ ذیل نقصانات قابلِ ذکر ہیں:

۱۔ بچے کا بہت سا وقت صرف انگریزی سیکھنے پر صرف ہو جاتا ہے، حالانکہ اس وقت میں وہ بہت کچھ حاصل کر سکتا تھا

۲۔ دوسری زبان کی نسبت اپنی زبان میں تعلیم حاصل کرنا نسبتاً سہل ہے۔ بچے کے ذہن پر زیادہ بوجھ نہیں پڑتا

۳۔ ہر زبان کا ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے۔ زبان کے ساتھ ساتھ طلبہ غیر محسوس طور پر انگریزی تہذیب سے متاثر ہوتے ہیں (GOOD MORNING DADY) اور تسلیمات جات ہم معنی ضرور ہیں، تہذیب و مزاج کے اعتبار سے دیکھا جائے تو دونوں فقروں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

۴۔ انگلش میڈیم سکولوں کے بیشتر اساتذہ عیسائی ہیں مسلمان اساتذہ کی اکثریت مغربیت زدہ اور اسی تہذیب سے پیار ہوتی ہے۔ اساتذہ کی شخصیت چونکہ طلبہ پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہے، اس لیے طلبہ اسی تہذیب میں ڈھل جاتے ہیں جو ان کے اساتذہ کو پسند ہو

۵۔ نصابی کتب میں قومی عنصر بہت کم ہے گو اب انگریزی کی کتابیں ملک میں بھی لکھوائی جا رہی ہیں، لیکن بیشتر سکولوں کی ابتدائی جماعتوں میں ابھی تک بیرونِ ملک چھپی ہوئی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ ان کتابوں پر غیر ملکی رنگ زیادہ صرف ہوتا ہے اور یہ اپنے ساتھ ایک مخصوص تہذیب کی بو باس لے کر آتی ہیں۔

۶۔ انگریزی زبان پر زیادہ زور دینے کی وجہ سے طلبہ دوسری غیر ملکی زبانیں نہیں سیکھ سکتے۔ انگریزی اور دوسری غیر ملکی زبانوں میں سے کسی ایک زبان کا انتخاب کرنا پڑے، تو ہمارے ہاں چینی، جرمن، فرانسیسی اور روسی زبانیں جاننے والے ہزاروں طلبہ تیار کیے جا سکتے ہیں

موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ روس، چین، فرانس اور جرمنی سے ہمارے دوستانہ تعلقات کے باوجود پاکستانی طلبہ اُن ملکوں میں اعلیٰ تعلیم کے لیے نہیں جا سکتے، کیونکہ انہیں متعلقہ زبانوں پر عبور نہیں۔

۷۔ انگریزی میڈیم نے ملک میں لے شمار عیسائیوں، مغرب پرستوں اور ایسی تہذیب کو فروغ دینے والوں کو نہایت مؤثر اور منفعت بخش کام مہیا کیا ہے۔ ایک صاحب کی یہ بات بجا کہ گویا کہ انگریز جاتے ہوئے یہ کہہ گئے ہوں، "یہی ہمارے جانشین ہیں" اور جو شادیوں کے لیے معاش کا نہایت ہی بیع بخش اور مستقل بندوبست کر گئے ہیں۔ ان سکولوں کے اساتذہ کا تجزیہ کیا جائے، تو یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے۔ استثنائی صورتیں ہر جگہ موجود ہوتی ہیں، لیکن زیادہ تر وہی اشخاص اس پیشے سے منسلک ہیں جو مذہباً عیسائی ہیں یا پھر مغرب پرست مسلمان، اینگلو انڈین لوگ بھی خاطر خواہ فوائد حاصل کر رہے ہیں۔

۸۔ ان سکولوں میں پڑھنے والے طلبہ چونکہ ایک خاص طبقے سے آتے ہیں، اس لیے عوام سے ان کا رشتہ ویسے بھی دُور کا ہوتا ہے۔ یہاں کی تعلیم و تربیت اور ماحول انہیں عام لوگوں سے مزید دُور لے جاتا ہے۔ وہ سرکاری اور غیر سرکاری عہدوں پر پہنچتے ہیں، تو مکمل طور پر صاحب بن چکے ہوتے ہیں۔ اور حیثیت کا انداز، رہن سہن اور انداز فکر ہماری معاشرتی قدروں سے بالکل جدا ہوتا ہے۔ عوام کا خادم سمجھنے کے بجائے وہ خود کو آقا سمجھتے ہیں۔

۹۔ انگریزی میڈیم کے اقامتی سکولوں میں ایک طالب علم کے لیے والدین کو تین سو سے چار سو روپے ماہوار تک خرچ ادا کرنا پڑتا ہے۔ غیر اقامتی سکولوں کی فیسیں ۴۰ روپے سے ۱۵۰ روپے تک ہیں۔ گویا ایک طالب علم پر اقامتی سکولوں میں اوسطاً ۴ ہزار روپے سالانہ اور غیر اقامتی سکولوں میں ۹ سو روپے سالانہ خرچ ہوتا ہے۔ دوسری طرف ملک کی فی کس اوسط آمدنی ۵۳۴ روپے سالانہ ہے۔ ملک کی کل آمدنی میں سے ۳۴ فیصد دفاع پر خرچ کرنا پڑتا ہے۔ باقی ۶۴ فیصد میں تعلیم کے علاوہ باقی تمام مدوں پر بھی خرچ اٹھتا ہے۔ کوئی جمہوریت پسند ملک ایسے اداروں کو برداشت نہیں کر سکتا جہاں ایک طالب علم پر اتنے اخراجات اٹھتے ہوں۔ عام لوگوں کے بچوں کو تعلیم حاصل کرنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا کہ امرا کے بچوں کو۔ دردِ دل رکھنے والے ماہرینِ تعلیم کا اندازہ ہے کہ انگلش میڈیم کا ایک اقامتی سکول بند کر کے

- چار عام سکول کھولے جا سکتے ہیں
- انگریزی میڈیم سکولوں سے بھی اچھے دس پرائمری سکول بن سکتے ہیں

پھر بیڈرسل نے بھی جمہوری نقطۂ نظر سے پرائیویٹ سکولوں کی مخالفت کی تھی۔ ہمارے دانشوروں کو بھی اس مسئلے پر غور کرنا چاہیے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان سکولوں میں تعلیم کا معیار بہت بلند ہے۔ کیسے کوئی بات کہی جا سکتی ہے، لیکن ثبوت کے بغیر کیونکر تسلیم کر لیا جائے۔ طوالت کے پیشِ نظر ہم سال بہ سال اعداد و شمار پیش نہیں کر سکتے، تاہم ہر شخص بڑی آسانی کے ساتھ انٹرمیڈیٹ اور میٹرک کے نتائج دیکھ سکتا ہے۔ یہ امتحانات ایسی کسوٹی ہیں جن پر اردو میڈیم اور انگریزی میڈیم کے طلبہ جانچے جا سکتے ہیں۔ فرق یہ کہ وہ ایک سکول چھوڑ کر باقی انگلش میڈیم سکولوں کے نتائج کسی لحاظ سے بھی عام ہائی سکولوں اور ہائر سیکنڈری سکولوں سے اچھے نہیں ہوتے۔ وجہ سے متعلق سکولوں کے نتائج صرف اس لیے بہتر ہوتے ہیں کہ وہاں داخلے کی شرائط بہت کڑی ہوتی ہیں۔ صرف ان طالب علموں کو داخلہ ملتا ہے جو ٹیسٹ میں اعلیٰ نمبر حاصل کریں۔ اگر ان سکولوں میں داخلے کی شرط محض دولت ہو، تو ان کے نتائج کبھی اتنے اچھے نہ ہوں۔ عام کالجوں کے طلبہ اور اساتذہ کی رائے میں انگریزی میڈیم کے طلبہ غلط سلط انگریزی بولنے، سب سے بیش قیمت کپڑے پہننے اور اپنے آپ کو دوسرے طالب علموں سے بلند و برتر سمجھنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے۔ میری ذاتی رائے ہے کہ انگریزی میڈیم سکول اصل میں تعلیم کی غرض سے نہیں، بلکہ مخصوص عادات و نظریات کو پھیلانے کے لیے بنائے گئے تھے۔ اس لیے اب تک وہاں تعلیم پر کم اور غیر تعلیمی مشاغل اور اٹھنے بیٹھنے کے آداب پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔

انگریزی میڈیم سکولوں کے طلبہ فی طالب علم ہر ماہ ۳ سو سے ۵ سو تک ماہوار خرچ کرتے ہیں۔ اب ذرا ہم اپنے ہاں آمدنی کا جائزہ لیں۔ پوسٹ گریجویٹ ایم اے، ایم ایس سی، ایم بی بی ایس، ایم ایس سی انجینئرنگ، ایم کام اعلیٰ شروع میں جن اسامیوں لیکچرار، انجینئر، ڈاکٹر، اکاؤنٹنٹ وغیرہ پر فائز ہوتے ہیں، وہاں سرکاری مشاہرہ اوسطاً ۴ سو سے ۸ سو تک ہوتا ہے۔ اس بات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جو طالب علم میٹرک اور ایف اے یا ایف ایس سی کے دوران تین سو روپے ماہوار خرچ کرتا تھا، تعلیم سے فارغ ہو کر چار پانچ سو روپے ماہوار میں کیونکر گذر بسر کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض بیشتر زیادہ افراد ملک چھوڑ کر باہر جانا پسند کرتے ہیں اور بعض جائز ناجائز طریقوں سے دولت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے نوجوانوں کی بھی کمی نہیں جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود بیکار رہتے ہیں۔ ان کے مالی حالات بہت اچھے ہوتے ہیں اور تنخواہ چار پانچ سو کی خاطر دل بھر کر کھیا نہیں جاتا۔ مالی پوزیشن مضبوط ہونے کی وجہ سے انہیں کام کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، چنانچہ مجموعی طور پر ملک و قوم کو ان کی تعلیم سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور وہ سرمایہ جو ان پر خرچ ہوا تھا بے کار رہتا ہے۔

اب ہم باری باری ان تمام سکولوں کا جائزہ لیں گے جن کا ہم نے پہلے ذکر کیا تھا۔ سب سے پہلے مشنری سکولوں کو لیجئے۔ یہ سکول تعلیم سے زیادہ مخصوص تہذیب و عقائد کو پھیلانے میں دلچسپی لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت اور مصر، عرب جمہوریہ نے مشنری سکولوں پر زبردستی قبضہ کر لیا ہے۔ یہ سکول ہمارے مذہب، تہذیب، معاشرت اور اخلاقی قدروں کی پامالی میں بڑی تندہی سے مصروف ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حکومت نے دینیات لازمی کر دی ہے، اس لیے یہ سکول مضر نہیں رہے۔ اس لازمی دینیات کا کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ اصل چیز تو وہ مغربی ماحول ہے جو بچے کے ذہن پر غلط اثرات ڈالتا ہے۔

اس ضمن میں ایک واقعے کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مشنری اداروں کی طرف سے یہ صفائی پیش کی جاتی ہے کہ انہوں نے آج تک ایک مسلمان کو بھی عیسائی نہیں بنایا۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ایک مشہور مشنری ادارے کے سربراہ سے اُس کے کارناموں کی رپورٹ طلب کی گئی تو اس نے کہا "ٹھیک ہے کہ ہم نے دس برس میں کسی مسلمان طالب علم کو عیسائی نہیں بنایا، لیکن یہ بھی جانیے کہ ہم نے کسی مسلمان کو مسلمان بھی نہیں رہنے دیا۔" یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس پر مشنری ادارے بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔

لڑکوں سے زیادہ لڑکیاں مشنری اداروں کی تعلیم سے متاثر ہوتی ہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ ان سکولوں کی لڑکیاں اچھی بیویاں ثابت نہیں ہوتیں۔ وہ اپنے ماحول سے اس درجہ کٹ جاتی ہیں کہ گھروں میں رہنا اور کام کرنا انہیں باعثِ عار محسوس ہوتا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ طوالت کے خوف سے ہم یہاں مثالیں پیش نہیں کر سکتے، تاہم گرد و پیش کا جائزہ آپ کو اس امر سے بخوبی آگاہ کر سکتا ہے۔

ہماری رائے میں حکومت کو اس سلسلے میں فوری قدم اٹھانا چاہیے اور ان اداروں پر قبضہ کر لینا چاہیے۔ جب تک یہ ممکن نہ ہو، دانشوروں کو کوشش کرنی چاہیے کہ عوام کو اُن سے دُور رہنے کی ہدایت کریں۔ عام سکولوں کی حالتِ زار دیکھ کر والدین مجبور ہو جاتے ہیں کہ بچوں کو انگریزی میڈیم سکولوں میں بھیجیں۔ ضروری ہے کہ اردو میڈیم سکولوں کا معیار بلند کیا جائے۔ نئے سکول کھولے جائیں تاکہ والدین بچوں کو مشنری اداروں میں بھیجنے پر مجبور نہ ہوں۔

افواجِ پاکستان کے سکول انگریزی میڈیم ہونے کے باوجود نسبتاً بہتر ہیں۔ حقائق نے ثابت کر دیا ہے کہ مذہب بہت بڑی طاقت ہے۔ ان سکولوں میں مغربی تہذیب کے بجائے اسلامی تہذ-

(باقی صفحہ ۱۹۶ پر)

عطاء الحق قاسمی

"ط" سے طالبعلم
"ط" سے طوطا

قاسمیات

"ا" سے استاد اور "ط" سے طالب علم بنتا ہے۔ "ا" اور "ط" کے درمیان خاصا فاصلہ ہے، شاید اسی لیے کہ استاد اور طالب علم کے درمیان بھی یہ فاصلہ اتنا ہی ہے۔ ط سے طالب علم کے علاوہ طوطا بھی بنتا ہے۔ طوطا جو توپ چلاتا ہے، ان دنوں ایک سیاسی طوطا بھی توپ چلانے کی فکر میں ہے مگر اس نے غلطی سے توپ کا رخ اپنی طرف کیا ہوا ہے، لیکن ہمیں اس سے کیا، طالب علم سے طوطے کی طرف تو دھیان محض اس لیے گیا تھا کہ دونوں کا علم رٹا رٹایا ہوتا ہے ورنہ طالب علم، طالب علم ہے اور طوطا طوطا، چہ نسبت خاک را با عالم پاک!

●

طالب علموں کی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں اور یہ قسمیں ان کے اختیار کردہ مضامین سے ترتیب پاتی ہیں مثلاً ایم اے اردو کے طالب علم ہوتے ہیں جن سے ملیں تو وہ "الو اردو" کے طالب علم لگتے ہیں۔ بعض طالب علم جغرافیے میں مہارت حاصل کرتے ہیں۔ اس قسم کے ایک طالب علم نے اپنے ایک مضمون میں اس ماہرانہ رائے کا اظہار کیا تھا کہ لڑکیوں کو "جغرافیہ" نہیں آنا چاہیے۔ ہماری ملاقات نفسیات میں ایم اے کرنے والے طلبہ سے بھی ہے، ان میں سے بعض "نفسیات" کا مطلب "ترکیب نفس" سمجھتے ہیں اور بعض اس مضمون میں مہارت حاصل کرنے کے لیے رضاکارانہ طور پر خود کو نفسیاتی الجھنوں میں مبتلا کرتے ہیں تاکہ اس ضمن میں انہیں "فرسٹ ہینڈ انفارمیشن" حاصل ہو اور پھر وہ اپنی نفسیاتی الجھنوں کی روشنی میں دوسروں کی نفسیاتی الجھنیں دور کر سکیں

●

لیکن صاحب، ہماری دوستی اگر آج تک کسی سے ہے، تو وہ تاریخ کے طالب علم ہیں۔ اگر ان کی گفتگو میں تاریخ کا حوالہ بہت ہو۔ تاریخ سے سبق سیکھنے کا، تاریخ بنانے کا اور تاریخ کے خود کو دہرانے کا۔ ان میں سے تاریخ کے ایک طالب علم تو تاریخ کے بہت ہی طالب تھے، کیونکہ یہ تاریخ کے قائل ہونے کے باوجود اس ضمن میں اپنی انفرادی آرا بھی رکھتے تھے، مثلاً ان کا کہنا یہ تھا کہ تاریخ کے طالب علم کو تاریخ سے سبق سیکھنا نہیں چاہیے بلکہ تاریخ کو سبق سکھانا چاہیے۔ سو انہوں نے تاریخ کو وہ سبق سکھایا ہے کہ بیچاری ابھی تک اپنی چندیا سہلا رہی ہے۔ تاہم انہیں تاریخ بنانے کا بھی بہت شوق تھا اور بزرگوں نے کہا ہے کہ شوق کا کوئی مول نہیں ہوتا، چنانچہ انہوں نے ہر قیمت پر اپنا یہ شوق پورا کیا۔ ان کی بنائی ہوئی تاریخ گلی گلی محلے محلے میں دستیاب ہے کسی بھی تہمد کی ماں سے طلب کریں۔ البتہ جہاں تک تاریخ کے خود کو دہرانے کا تعلق ہے تو تاریخ کے یہ طالب علم اس کے دل سے قائل تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے تاریخی دور میں وہ تمام چیزیں دہرائیں جنہیں گذشتہ تاریخ تباہ کن ثابت کر چکی تھی۔ ان سب امور کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب ایک روز صبح کے وقت وہ تاریخ تاریخ کرتے ہوئے اٹھے، تو ان کے اپنے کیلنڈر کی تاریخ بدل چکی تھی

●

ط سے طالب علم بنتا ہے اور ط سے طوطا بھی۔ دونوں توپ چلاتے ہیں۔ طالب علم کا توپ چلانا اس کا امتحان دینا ہوتا ہے کیونکہ وہ امتحان دینے کو توپ چلانے ہی کے برابر سمجھتا ہے اور طوطا اپنے مالک کی خوشنودی کے لیے توپ چلاتا ہے۔ طوطے کے توپ چلانے سے پہلے اس کے گرد تماش بینوں کا ہجوم ہو جاتا ہے اور جب وہ توپ چلا دیتا ہے، تو مجمع چھٹنا شروع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا طوطے کو توپ چلاتے دیکھئے کہ یہ ایک بے ضرر حرکت ہے اور اس سے لوگوں کا دل بہلتا ہے۔!

**

وقت کی پکار

جواں قلم کاروں سے — **نسیم حجازی (ایبٹ آباد)**
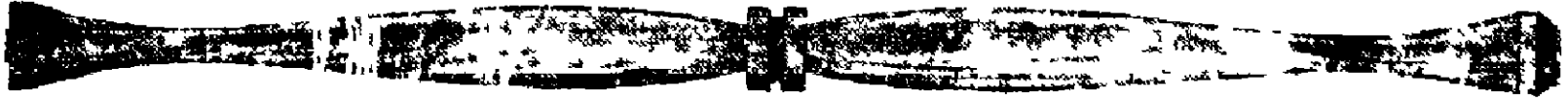
"یاسر بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں ہر وقت اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ دنیا میں اِن کا مشن کیا ہے بعض آدمیوں میں قوم کا سپاہی بننے کی صلاحیتیں ہوتی ہیں قدرت انہیں قوم کی عزت اور آزادی کا محافظ بنا کر بھیجتی ہے، لیکن وہ شاعر نقال اور گویے بن جاتے ہیں، بعض محض شاعر ہوتے ہیں اور قوم کی بدقسمتی سے لیڈر بن جاتے ہیں بعض قدرت کی طرف سے فلسفی یا موجد کا دماغ لے کر آتے ہیں لیکن اپنی تن آسانی کے باعث داستان گو بن جاتے ہیں بعض لوگوں کو بھی ہو جاتا ہے کہ ایک شخص اپنے دل و دماغ میں صحیح درجہ کی انفرادیت لے کر آتا ہے لیکن قوم کی اجتماعی ضروریات کا احساس کرتے ہوئے وہ اپنی انفرادیت قربان کر دیتا ہے۔ وہ ایک شاعر ہے ایک ادیب ہے اس کا دل ایک رباب ہے جس کے نازک تاروں کے لیے کلیوں کی مسکراہٹ کا کام دیتی ہے وہ ایک مصور ہے جس کے دل میں قدرت نے قوس و قزح کے رنگ بھر دیئے ہیں وہ ایک مغنی ہے جس نے پرندوں کے نغمے چرائے ہیں لیکن قوم پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں قوم کے بیٹے خاک و خون میں لوٹ رہے ہیں قوم کی بیٹیوں کی عصمت خطرے میں ہے ایسے دور میں یہ لوگ اپنی انفرادی خواہشات کو قوم کی اجتماعی ضروریات پر قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں شاعر پھولوں کی مسکراہٹ کی بجائے قوم کے معصوم بچوں کی جگر سے متاثر ہوتا ہے وہ قوم کو لوریاں نہیں دیتا بلکہ جھنجھوڑتا ہے مصور قلم پھینک کر تلوار اٹھا لیتا ہے اور مغنی کے نغموں میں پرندوں کے چہچہوں کے بجائے تلوار کی جھنکار اور توپوں کی گرج سنائی دیتی ہے لیکن بدقسمتی سے ابھی تک ہمارے شاعروں اور ادیبوں میں سے بہت کم ایسے ہیں جنہوں نے موجودہ حالات کا صحیح جائزہ لینے کی کوشش کی ہے وہ قوم کے افراد میں اجتماعی شعور اور اجتماعی سیرت بیدار کرنے کی بجائے ایک ایسا ذہنی انتشار پیدا کر رہے ہیں جو موجودہ حالات میں ہمارے لیے بے حد خطرناک ہے دشمن لیل کانٹے سے لیس ہو کر میدان میں کھڑا للکار رہا ہے اور ہمارا شاعر قوم کے نوجوانوں سے کہہ رہا ہے ٹھہرو میں تمہیں ایک نیا گیت سناتا ہوں میں نے ایک نئی نظم لکھی ہے یہ ادب برائے ادب ہے یہ نئے دور کی ابتدا ہے ہم ایک ٹوٹی پھوٹی کشتی پر سوار پاکستان کی منزل کا رخ کر رہے ہیں ہمیں ہر قدم پر ایک نیا بھنور دکھائی دے رہا ہے اور کشتی کے ایک کونے میں ہمارا آرٹسٹ اپنے ریت کے تار درست کر رہا ہے۔ یاسر مجھے تمہاری تحریر نے اس لیے متاثر نہیں کیا کہ اس میں ایک شاعر اور ادیب کے دل کی دھڑکنیں ہیں بلکہ میں اس لیے متاثر ہوا ہوں کہ تم نے پہلی بار سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلے کی طرف توجہ دی ہے جس کے ساتھ دس کروڑ مسلمانوں کی موت و حیات وابستہ ہے خدا کرے کہ یہ تمہارے شعر و ادب کے نئے دور کی ابتدا ہو۔

ان کے خیال میں شعر میں کوئی خاص انداز بیان اور کوئی نادر بات ہونی چاہیے

زلف سا پیچدار ہے ہر شعر
ہے سخن میر کا عجب ڈھب کا

شعر میرے ہیں سب خواص پسند
گفتگو پر مجھے عوام سے ہے

شعر میں غیر زبان کی دہی تراکیب لانی چاہئیں جو زبان پر بار نہ ہوں کیونکہ اُسے غیر شاعر نہیں سمجھ سکتا نادر ترکیب کا استعمال ہی سلیقۂ شاعری پر موقوف ہے متقدین میں ایہام گوئی کا رواج عام تھا مگر اب اساتذہ اُسے ناپسند کرتے تھے ؎

کیا جانیں دل کو کھینچیں ہیں کیوں شعر میرؔ کے
کچھ ایسی طرز بھی نہیں ایہام بھی نہیں

شاعر سے کلام کو پاک کرنے کی کوشش بھی میر صاحب کے نزدیک ضروری ہے۔

؎ ہم حرفوں کے شاعر کا بھی یاروں کو نہیں
اس پر رکھتے ہیں تشو تست میری صحت سے پہل

ان کے نزدیک شاعر کو محاورے میں تصرف کرنا جائز نہیں جو طرز کلام اور انداز شعر گوئی میر نے اختیار کیا وہ تمام صنائع بدائع کا حاوی اور جامع تھا اور یہی ان کو پسند بھی تھا اس لیے کہ زمانے کی روش یہی تھی مگر ان سے صرف شعر کے خارجی پہلو پر روشنی پڑتی تھی مگر داخلی اوصاف کے متعلق بھی ان کے یہی خیالات تھے شعر جذبات دل کا آئینہ ہونا چاہیے اور جو کچھ کہا جائے اُسے تاثیر اور تاثر کے ساتھ روح و جسم کا سا قرب حاصل ہو۔

کیا تھا ریختہ پردہ سخن کا
سو ٹھہرا ہے یہی اب فن ہمارا

ہم کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب ہم نے
درد و غم کتنے جمع کئے تو دیوان کیا

یہ حقیقت ہے کہ جس قدر دل گداز ہوگا اتنا ہی اثر لے گا اور اگر غور کیا جائے تو ان کی شاعری میں ہر کوئی نیا مضمون دکھائی دیتا ہے۔ گہرا فلسفۂ حیات ملتا ہے ہر بار عشق کی کوئی انوکھی تصویر ہی نظر آتی ہے مگر پھر بھی دروں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ مجموعی طور سے ان کے اشعار میں ایسی خوبی ہے جو دل پر اثر انداز ہوتی ہے ان کو اردو کے شعراء میں خدائے سخن کا مرتبہ عطا کرتی ہے

**

دم توڑتے ہوئے مشرقی پاکستان میں ابھرنے والے تعلیمی چہرے کے خدوخال مشرقی پاکستان کے آخری سیکرٹری تعلیم مسعود مفتی کی زبانی

ایک اور چہرہ

وہ پچیس سالہ نوجوان افسر تھا اور میرے ماتحت کام کرتا تھا۔ خوش شکل، خوش پوشاک، خوش کلام۔ گفتگو میں بیباک مگر لہجے میں مرتب۔ جذباتی سوچ اور حساس دل۔ وہ بس عام بنگالی مسلمان سے مختلف بنگ بنگالی سندو کا گرویدہ۔ یوم اقبال سے لاتعلق اور یوم مندالاسلام پر فدا۔ اسلام کے رشتہ اخوت سے عاری مگر کلچر کی یگانگت کا پجاری۔ ۱۹۴۶ والے ایک پاکستان کے ریزولیشن کا منکر اور ۱۹۴۰ والے دو پاکستانوں والے ریزولیشن کا نقیب۔ ۱۹۴۷ میں برصغیر کی تقسیم پر شاکی۔ اپنے کلچر کی جڑیں محمد بن قاسم کی بجائے سوسمراٹ میں ڈھونڈنے والا۔ معاشرتی اقدار پر مٹی کے رشتے کو ترجیح دینے والا۔ قائد اعظم کے ذکر پر بسی جبر خاموشی اختیار کرنے والا۔

مجھے اس نے ، اس کی مکمل تصویر کا اندازہ اس طرح ہوا کہ میں سرکاری کاموں کے علاوہ اس سے حالات حاضرہ پر بھی بات کیا کرتا تھا۔ دفتر میں یا گھر میں چائے پیتے ہوئے کافی طویل نشست ہوتی۔ شروع میں وہ محتاط تھا مگر چند نشستوں کے بعد کھل گیا۔ بعد ازاں تبادلہ خیالات کی بجائے گفتگو بحث کا رنگ اختیار کرنے لگی۔ اس وقت افسر اور ماتحت کا رشتہ ختم ہو جاتا اور دو بچھڑے ہوئے بھائیوں کی شکوہ طرازی کا انداز ہو جاتا۔

میں نے یہ طرز استدلال اختیار کی تھی کیونکہ وہ اس نسل کا بھرپور نمائندہ تھا جو پچھلے تیس سال کے غلط نظام تعلیم کی پروردہ تھی۔ میں اس نسل کے دل و دماغ میں جھانکنا چاہتا تھا جس کے لاشعور نے اس سیاسی شعور کو گمراہ کر دیا تھا۔ لاشعور ہندو پروپیگنڈے سے متاثر تھا مگر شعور اس کیفیت سے لاعلم تھا۔ تحریک پاکستان سے تو پاکستان کی دہلیز پر ہی دم توڑ دیا تھا۔ مصلحتوں نے اس کی یاد کو بھی گھروں سے نکلنے نہ دیا اور اس کی تاریخ نصابی کتب کے ستر میں کھو گئی۔ ایسے میں مشرقی پاکستان کی نئی نسل نے آنکھ کھولی تو اس کا شعور ایک خلا سے دوچار ہوا۔ اس خلا کو اس کے لاشعور نے بھیڑیوں کی اچھائیوں اور راہبوں کی عبرت کے تصور سے پر کیا۔

وہ نوجوان افسر اس نسل کی نمائندگی کرتا تھا۔ اس رویے کا پہلا انکشاف مجھے اپنی تعیناتی کے چند ہی روز بعد ہو گیا جب وہ ایک وفد کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوا۔ وفد میں محکمے کے چند افسر بھی شامل تھے۔ انہوں نے ایک روز پہلے کا اخبار "پاکستان ٹائمز" میرے سامنے پھیلا دیا اور ایڈیٹوریل کے چند جملوں کی طرف توجہ دلائی جن میں لکھا تھا کہ مشرقی پاکستان کے تعلیمی اداروں میں اسی فی صدی اساتذہ ہندو ہیں۔ انہوں نے احتجاجی انداز میں کہا کہ اخبار نے بالکل غلط تاثر دیا ہے اور مطالبہ کیا کہ اس کی فوراً تردید جاری کی جائے۔

"تردید کا فائدہ کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا

"یہ خواہ مخواہ ہندوؤں کو بدنام کرنے کی کوشش ہے اور قابل مذمت ہے۔"

مجھے ابھی چارج لیے ہوئے چند ہی دن ہوئے تھے اور میں ان افسران کو اچھی طرح جانتا بھی نہ تھا۔ اس کے باوجود طویل بات چیت ہوئی جس میں وہ بار بار اصرار کرتے رہے کہ فوری تردید ہونی چاہیے۔ کافی بحث کے بعد میں نے فیصلہ دیا کہ میں تردید کے لیے تیار ہوں بشرطیکہ ہم تعلیمی اداروں میں ہندو اساتذہ کی تعداد کے متعلق صحیح اعداد و شمار بھی پریس کو بتائیں۔

وہ اس پر آمادہ نہ تھے۔ اس پر مزید گفتگو ہوتی رہی اور بالآخر جب وفد کے ارکین واپس گئے تو وہ کافی ناخوش نظر آتے تھے۔

دوسرے دن اسی افسر نے فائل پر لکھ کر بھجوا دیا کہ قیمتی وقت ضائع ہو رہا ہے، ہمیں فوراً تردید کر دینی چاہیے۔

میں نے لکھا کہ جب تک میں صحیح صورت حال کے متعلق اپنے آپ کو مطمئن نہیں کر لیتا تردید کیسے کر سکتا ہوں۔

ایک ہفتے بعد فائل دوبارہ آئی۔ اس افسر نے عصل نوٹ لکھنے کے بعد پھر اپنی بات دہرائی تھی کیونکہ اعداد و شمار اکٹھے نہیں ہو سکے تھے۔

میں نے لکھا اگر صحیح اعداد و شمار اکٹھے نہیں ہو سکتے تو کم از کم اندازہ ہی بتایا جائے۔

اس کے بعد فائل نہیں آئی اور معاملہ ختم ہو گیا۔

مگر میں سوا کا رخ پہچان گیا تھا جو کئی چہروں پر بھی ہوئی دھول اڑا کر لے گئی تھی۔

چند روز بعد ایک ہیڈ آفیسر کی طرف سے رپورٹ آئی کہ رات کے وقت پاکستانی فوج نے ایک سکول کے چوکیدار اور چپڑاسی کو حراست میں لے لیا ہے اور زدوکوب بھی کیا ہے۔

اس رپورٹ پر اسی نوجوان افسر نے نوٹ لکھا کہ ہمیں فوراً مارشل لاء حکام کے پاس احتجاج کرنا چاہیے کہ وہ سکولوں کے تقدس کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے فوج کو تعلیمی اداروں میں داخل نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی ان کے سٹاف کو ہراساں کرنا چاہیے۔

میں نے لکھا کہ ہمیں اس کیس کے تمام حالات کا اندازہ نہیں اس لیے مارشل لاء والوں کو لکھنے کی ضرورت نہیں۔ علاوہ ازیں کوئی عمارت یا علاقہ قانون سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ خصوصاً جب کہ حالات جنگ کے قریب قریب ہوں۔

دو گھنٹے بعد فائل پھر واپس آ گئی۔ اس افسر نے لکھا تھا کہ احتجاج کرنا مناسب ہوگا ورنہ محکمے کے لوگوں میں بددلی پھیلے گی کیونکہ سیکرٹری تعلیم مغربی پاکستانی ہے اس لیے ان کے حقوق کا تحفظ نہیں ہو رہا۔

اس پر میں نے اسے بلایا اور بڑے پیار سے سمجھایا کہ میں ذاتی طور پر اس کارروائی کی ضرورت محسوس نہیں کرتا لیکن اگر اس کے اور باقی محکمے والوں کے جذبات اتنے ہی قابل ہوں؟

میں تو یوں بھی فائل میں درج ہی مارشل لا والوں کو سمجھا دیتا ہوں تاکہ ان کو اندازہ ہو جائے

اس نے گھبرا کر فائل اٹھائی اور جلدی سے باہر نکل گیا

چند ہفتے بعد میرا تبادلہ ہوا۔

مئی کے مہینے میں جب ہم مغربی پاکستان سے ڈھاکہ کے لیے روانہ ہوئے تو عزیزوں اور دوستوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ہاتھوں میں امام ضامن باندھے اور زبانوں نے ذاتی حفاظت کے ڈھیروں مشورے دیئے جن میں ریوالور کا حصول بنیادی مشورہ تھا، چنانچہ ڈھاکہ پہنچے تو سب کی جیبوں میں ریوالور اور ذہنوں میں ذاتی حفاظت کے داؤ پیچ تھے، مگر چند ہی دن کے قیام میں اندازہ ہو گیا کہ سب حفاظتی تدابیر بے معنی ہیں۔ ہمارے سب سے بڑے دشمن تھے مسموم فضا، خوف و ہراس، باہمی بے اعتمادی، علاقائی منافرت اور پروپیگنڈہ سازشیں .. ان پر ریوالور کون چلاتا، اور کہاں چلاتا اور پھر یہ ساری توپیں ہمارے ارد گرد تانے بیٹھی تھیں کیونکہ ہر مغربی پاکستانی ایک علامت تھا جس کے ارد گرد سازشوں اور نفرتوں کے عصور چکر کاٹ رہے تھے۔ صرف اتنی کا اندازہ تھا کہ وہ کب اور کہاں اپنا گھیرا تنگ کر کے مرکز کر لیں گے۔ ہمارا کام صرف انتظار کرنا تھا، کیونکہ وار کرنے کا فیصلہ ان کا تھا اور پہل دستی بھی ان ہی کی طرف سے ہونی تھی۔ اگر وہ وار کرنے کا ارادہ نہ کرتے تو ہم محفوظ تھے، لیکن اگر وہ وار کرنے کا فیصلہ کر لیتے تو ہم کسی طرح بھی محفوظ نہ تھے اور ہمارا ریوالور کھلونے سے زیادہ کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا، کیونکہ ہم بنگالیوں میں اس طرح گھرے ہوئے تھے جیسے مخمل پال میں گھڑی ہوتی ہے۔ کسی کے لئے یہ مشکل نہ تھا کہ خاموشی سے چھرا گھونپ دیتا، پیچھے سے گولی چلا دیتا، کھانے میں زہر ملا دیتا، راہ چلتے مشکل ہی سے بچنے دیتا، دفتر میں ملاقات کے دوران حملہ کر دیتا یا کسی اور طریقے سے اچانک حملہ کر دیتا۔ اس لئے چند ہی دن قیام کے بعد میں نے ریوالور صندوق میں بند کر دیا اور خدا کے بھروسے پر کھلے بندوں گھوما کرتا معمول بنا لیا۔

ہر حقیقت کو بانداز تماشا دیکھا

مگر اس لغزش پا میں اس حد تک پابندی آداب ضرور تھی کہ ہم لوگ سینما دیکھنے نہیں جاتے تھے۔ سکیورٹی والے حضرات کی مسلسل نصیحت تھی کہ اندھیرے کمرے میں گھری کرسی میں جکڑ کر محسوس ہونا تو قبول نہیں، حماقت ہے۔ اس محرومی کا بدل یوں ہوا کہ ہماری درخواست پر انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ والے ہر دوسرے تیسرے دن بعد اپنے آڈیٹوریم میں کوئی بنگالی یا انگریزی فلم دکھا دیا کرتے تھے۔ مختلف محکموں سے تعلق رکھنے والے لوگ بیوی بچوں سمیت آ کر فلم دیکھا کرتے تھے اور اکثریت بنگالیوں کی ہوتی تھی۔

ایک دن ایک نوجوان افسر میرے دفتر میں آیا کہنے لگا "سر آپ کل فلم دیکھنے آ رہے ہیں گے؟"

"کون سی فلم ہے؟"

"مجھے نام تو معلوم نہیں، مگر انفارمیشن والے کہتے ہیں کہ بہت اچھی فلم ہے"

"پھر بھی کتنی اچھی؟"

"وہ کہتے ہیں کہ ایسی فلمیں کبھی کبھار ہی ملتی ہیں، اور یہ بھی ایسی ہی ہے"

"اس دفعہ تو میرا موڈ نہیں ہے۔ شاید نہ آ سکوں"

"نہیں سر۔ کل آپ ضرور آئیے"

اس دن میں کسی اور مصروف تھا اس لئے ٹالتا رہا، مگر اس کے اصرار پر ارادہ بدل گیا اور اگلے روز صبح وہاں پہنچ گیا۔ فلم اتوار کو ہوتی تھی۔

مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے تقریباً سبھی افسران وہاں موجود تھے مگر بنگالیوں کی تعداد معمول سے زیادہ تھی۔ میں نے سوچا کہ فلم کا چرچا کافی ہو چکا ہے، یقیناً اچھی ہو گی۔

تھوڑی دیر بعد فلم شروع ہوئی۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو اس کا عنوان THE TRAIN تھا۔ کہانی کچھ یوں تھی کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران جب جرمنوں کو فرانس خالی کرنا پڑا تو ان کے ایک جرنیل نے حکم دیا کہ نادر تصاویر آرٹ گیلریوں سے اتار کر حفاظت سے بند کی جائیں اور ایک ریل گاڑی میں احتیاط سے رکھ کر جرمنی منتقل کر دی جائیں۔ جب حاکم جابر ہوں اور حکم بندوق کی نالی سے نکلے تو انکار کی مجال کسے، چنانچہ فرانسیسی افسردہ دلوں، خاموش چہروں اور سست ہاتھوں سے تعمیل کرتے رہے مگر جب ریل گاڑی روانہ ہوئی تو ریلوے کے اہلکاروں نے ایسی ایسی ترکیب کے مطابق اسے رستے ڈالے کہ تصاویر کو فرانس سے جرمنی منتقل کرنے کا منصوبہ ناکام ہو گیا۔

یہ فلم اسی عدم تعاون کی داستان تھی اور اس میں شک نہیں کہ واقعی اچھی فلم تھی۔

فلم کی نوعیت سے اس نوجوان افسر کے اصرار کا مقصد آشکارا ہو گیا۔ جب لبوں پر مہر ہو تو انسانی عقل نت نئی زبانیں تراش لیتی ہے۔ آنکھوں کی زبان، خاموشی کی زبان، ضمیر کی زبان، علامت کی زبان۔ سمجھانے والا کبھی گرفتار ہو جاتا ہے کہ ہر حلقہ زنجیر زبان بن جائے۔ کبھی رواج ہو جاتا کہ اس کا ترجمان مسکن زبان بن جائے۔

اسی طرح یہ فلم نہ تھی بلکہ زبان تھی۔ یہ ایک مکتبۂ فکر کے لوگوں کا مبنی منشور تھا جو علامتی انداز میں ہم تک پہنچ رہا تھا۔ فلم کی کہانی کے ماحول اور مشرقی پاکستان کے ماحول میں بہت مطابقت تھی یعنی حاکم وقت کے ساتھ عدم تعاون کی خاموش اور مؤثر مہم۔ ان کے احکام کے بعد میں اندر ہی اندر ایسے ڈالنا کہ گرفت نہ ہو سکے۔ بظاہر سر تسلیم خم، مگر ساتھ ہی دل پرستی اور اپنا گر عمل نامہ۔ ہاتھوں سے سلام میں بھی دشنام۔ سرکاری ملازموں کی اکثریت اسی مسلک پر کاربند تھی۔ چند ایک ان کے برعکس بھی تھے، مگر وہ کھل کر سامنے نہیں آتے تھے، کیونکہ وہ اکثریت سے خوفزدہ تھے اور حکومت سے بد دل۔

فلم ختم ہوئی۔ ہال میں روشنیاں چمک اٹھیں۔ سکرین کی دنیا سے نکل کر ناظرین اپنی دنیا میں واپس آئے اور جانے کے لئے اٹھنے لگے۔ معمول عود کر آیا۔ رسم جاگی اور ہاتھ ملنے لگے۔ خدا حافظ کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ نوجوان افسر مجھ سے کافی دور دروازے کے قریب بیٹھا تھا۔ وہ چاہتا تو وہیں سے باہر نکل سکتا تھا مگر وہ اٹھ کر میری طرف آیا۔ مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا مگر خدا حافظ کہنے کی بجائے خاموش رہا اور ہم دونوں نے اس طرح ہاتھ ملایا جیسے دو حریف کشتی سے پہلے اکھاڑے میں ملاتے ہیں۔ اس کے ہاتھ کی گرفت میں طنزیہ گرمجوشی تھی۔ مگر بار بار جھپکنے میں ڈھکا چھپا چیلنج تھا۔ اور آنکھیں ۔۔۔؟

ان کی آنکھوں میں زباں ہو جیسے

یہ تارنگ ہال ایک لیبارٹری تھی اور یہ عمل ایک تجربہ تھی جس نے ہمارا جزلقمہ رشتہ ذرا ابھار کر نمایاں کر دیا تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مغربی پاکستان سے جانیوالے صحافی، بہاری افسران، بنگالی اہلکاروں کے جم عصر میں اسی تکلف وہ رشتہ میں منسلک تھے۔ ان کے مابین ایک بے روح تعلق تھا۔ مصنوعی رواداری تھی اور خاموشی تصادم تھا۔

اگلے دن ہم دونوں عمر دفتر میں تھے، وہ میرے کمرے میں چائے پی رہا تھا اور حالات حاضرہ گفتگو کا موضوع تھے۔ مگر آج وہ پرانے انداز میں دلائل دینے کی بجائے یہ موقف اختیار کر رہا تھا کہ وقت ہی صحیح فیصلہ دے سکے گا۔ اس پختہ اعتماد کے ساتھ کہ وقت اس کے حق میں ہے گویا جو نقشہ گزشتہ روز کی علم نے پیش کیا تھا وہ اس کا منطقی نتیجہ نکال رہا تھا۔

چودہ اگست کی آمد آمد تھی۔

ایک سرکاری مراسلہ دفتروں میں گھوم رہا تھا کہ تمام سرکاری ملازموں کے لئے لازمی ہے کہ وہ پریڈ دیکھنے آئیں — سکولوں کے بچوں اور بچیوں کی پریڈ جس کی سلامی کمشنر ڈھاکہ لیں گے

چند روز کے بعد ایک اور مراسلہ ملا۔ تمام سرکاری ملازموں کو گتے کے بلے مہیا کئے جائیں گے جن پر لکھا ہوگا "پاکستان زندہ باد" اس بلے کو اپنے سینے پر لگانا ہوگا حب وطن سے خالی سینوں پر نعرۂ وطن کوئی نئی بات نہ تھی۔ خود فریبی مسلمانوں کی پرانی رسم ہے۔ سچا ایمان، اونچا اعلان، تیرہ سو برس کی تواریخ نے بار بار بتایا ہے

لے بد سمجھا ہے میرا حرم کی آتش

دیں میں کھوٹا دنیا میں بھی کھوٹا ہوتا ہے منافقت جب عادت بن جائے تو پھر کیا جگہ کی قید — مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو — لیکن اگر نیتیں بدلیں سے دل بدلے جا سکتے تو پتھروں کی بجائے کاتب بیچے جاتے اور دنیا کے سارے ہنگامے سرد پڑ جاتے۔

گیارہ اگست کو شیخ مجیب الرحمٰن پر مقدمہ شروع ہوا اسی شام کو ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل میں زوردار دھماکہ ہوا۔ دیواریں شق ہوئیں۔ چند کھڑکیاں اڑ گئیں بہت سے شیشے ریزہ ریزہ ہوگئے۔ اگلے دن گوپال گنج کے قریب ایک پولیس چوکی پر حملہ ہوا جس میں انتالیس آدمیوں کا سارا اسٹاف مارا گیا۔ دو دن بعد ہم اگست آ گیا دفتروں میں چھٹی، آسمان پر بادل۔ فضا میں دھماکوں کی بازگشت اداس اور ویران سڑکیں۔ یہ تھا ۱۹۷۱ء کا چودہ اگست ڈھاکہ میں پاکستان کا آخری یوم آزادی۔ پریڈ گراؤنڈ میں شامیانے لگے تھے ہر چہار طرف رنگ برنگی جھنڈیاں لگی تھیں۔ سرخ صوفے اور رنگین کرسیاں تھیں کرنا عام بے جان جیسی جس کے لئے پیار بھی تھی مگر جاندار مدعوئین جس پر آمادہ نہ تھے۔ یہ جوش و جذبے کے اہل وہ مسلک گھومیں کے انداز۔ منتظمین آنے والوں کو مرتبے کے مطابق بٹھا رہے تھے۔ بیٹھنے والے ایک دوسرے کو چور نظروں سے دیکھتے ہوئے، سمٹے سمٹائے ہوئے جیسے آنے پر نادم ہوں اور زبان حال سے واضح کر رہے ہوں کہ

میں خود آیا نہیں، لایا گیا ہوں

گرمجوش معانقے مفقود تھے پر شور مصافحے غائب تھے فاصلوں سے مسکراہٹوں کے پیغام نہ تھے نظریں ملیں تو فوراً جھک گئیں۔ ہاتھ اٹھے تو فوراً گر گئے۔ بات چلی تو فوراً رک گئی آگے والے اٹھ کر کھڑے نہ ہوئے تھے پیچھے والے سرک کر آگے نہ آتے تھے جو جہاں تھا خاموشی سے بیٹھا تھا جیسے اسے سر پڑ نظر آتی تھی یا نہیں۔

کچھ فاصلے پر مجھے وہ نوجوان افسر نظر آیا۔ نہ معلوم اس کے دامن یا محض اتفاق سے کرسیاں خالی تھیں یا وہ جان بوجھ کر تنہا بیٹھا تھا۔ اس کے سینے پر "پاکستان زندہ باد" کا بلا کافی نمایاں تھا۔ اس سے کہیں زیادہ نمایاں ماتھے کی تیوری اور چہرے کی بیزاری تھی۔ ماحول سے ناتا توڑنے کی دانستہ کوشش میں وہ کرسی پر اپنے پہلو بدل رہا تھا کہ اس کی ساری توجہ سامنے والی پریڈ گراؤنڈ پر نہ ہو سکے اور ادھر ادھر بھٹکتی رہے۔ اسی کوشش میں اس کی نظر مجھ پر بھی پڑی، مگر وہ اس قدر بر افروختہ تھا کہ مجھے بھی پہچاننے سے انکاری ہو گیا۔ ان حالات میں زیادہ سے زیادہ بغاوت یہی ہو سکتی تھی کہ اپنا احتجاج مکمل بے اعتنائی کی صورت میں واضح کر دیا جائے اور ہر اس چہرے سے بے رخی برتی جائے جس کا تعلق پاکستان سے ہو چاہے وہ حق پاکستان ہو یا پاکستان کی سالمیت چاہنے والے لوگ ہوں۔

پریڈ شروع ہو گئی۔

بینڈ کی دھنوں کے ساتھ مختلف سکولوں کے بچوں کی ٹولیاں مارچ کرتی ہوئی گزرنے لگیں بے حس، لاتعلق اور غیر جذباتی، آنکھیں انہیں بلا دیکھے دیکھنے لگیں۔ اگر وہ دیکھتی تھیں تو صرف اتنا کہ کون شعف سے مارچ کر رہا ہے اور کون مجبوری سے چل رہا ہے اس لحاظ سے جس کی پریڈ کم تھی اور سامنے پریڈ زیادہ تھی، جس میں مجلس کی آنکھیں لئے سامنے سے گزرنے والے لوگوں میں سے عزم کو شناخت کر لی ہیں۔ سرکاری ملازموں کے اس مجمع کے سامنے سے گزرنے والوں میں سے وہ عام لوگ عزم تھے جن کے سینے پر بھی بلے تھے کی بجائے پیشانی پر پاکستان کی پرخلوص حمایت درج تھی۔ یہ سب مستقبل میں دار پر چڑھائے جائیں گے

میں نے ویسے ہی سر گھما کر دیکھا تو وہ نوجوان افسر اپنی ڈائری میں کچھ درج کر رہا تھا۔

میں سوچتا ہی رہا کہ یہ کیا لکھ رہا ہے

پانچ ستمبر کو عام معافی کا اعلان ہو گیا۔ جن لوگوں نے یکم مارچ سے پانچ ستمبر تک سیاسی نوعیت کے جرم کئے تھے انہیں معافی مل گئی اور ان سے اپیل کی گئی کہ اگر وہ ہندوستان میں پناہ گزین ہیں تو بلا خوف و خطر واپس آ جائیں اس رعایت کا اعلان باغی نوجوانوں، باغی پولیس والوں اور وحشت میں قتل عام کرنے والوں پر بھی تھا۔ چھ ستمبر کو ۱۹۶۵ء کی پاکستان و ہند جنگ کی یاد میں یوم دفاع منایا گیا تو اخبارات میں بڑی نمایاں وہ تصویریں جن میں ایسے باغیوں کو جیل سے رہا ہوتے دکھایا گیا تھا

چند ہی دنوں بعد دہشت انگیزی کی وارداتوں میں بہت اضافہ ہوگیا پہلے سے زیادہ بم پھینکے جانے لگے پاکستان کے حامی عناصر کے قتل بڑھ گئے اور فوج اور پولیس پر اچانک حملوں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا۔

اس پس منظر میں اس نوجوان افسر کے رویئے میں بھی سختی آنے لگی۔ ہماری گفتگو اس سے پہلے انگریزی اور اردو میں ہوتی تھی مگر اب وہ اردو بولنے سے کترانے لگا اور ہم ساری بات چیت انگریزی میں کرنے لگے۔

انہی دنوں گفتگو کے دوران میں نے اس سے پوچھا "آپ کے خیال میں مشرقی پاکستان کے موجودہ حالات کا نتیجہ کیا ہوگا؟"

اس نے سگریٹ کا لمبا کش لیا۔ منہ سے دھواں چھوڑا اور اعتماد سے کہنے لگا "علیحدگی"

"کیا اس سے کمتر کوئی حل نہیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"پھر مشرقی پاکستان کا کیا مستقبل ہوگا؟"

"میرا جواب وہی ہے جو ۱۹۰۶ء کے متعلق تھا۔"

"اور پھر ۱۹۴۷ء میں ساری بنگالی قوم پاکستان میں کیوں شامل ہوئی؟ حتیٰ کہ سلہٹ میں رائے شماری کرائی گئی تو ووٹ پاکستان کو ملے۔"

"اس وقت ہم جذبات کی رو میں بہہ کر اندھے ہوگئے تھے اب ہماری آنکھیں کھل گئی ہیں۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اُس وقت کا فیصلہ صحیح ہو اور آج کل آپ جذبات کی رو میں بہہ کر اندھے ہو رہے ہوں۔"

"نہیں۔ یہ درست نہیں۔"

"کیوں؟"

"کوئی قوم جوش جذبات میں بھی رضامند ہوتی ہے جب اس نے سوچ سمجھ کر اور عقل و دانش سے کام لے کر ایک دانشمندانہ فیصلہ کیا ہو۔ ہم آج کل خوب سوچ رہے ہیں اس لئے یہ شعوری فیصلہ ہے۔ جذباتی نہیں۔"

"جوش تو ۱۹۴۷ء میں بھی بہت تھا۔"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ خوفناک فسادات تو کلکتہ میں ہوئے اور پھر بہار میں۔"

"فسادات تو ہوتے ہی رہتے ہیں آج کل بھی ہندوستان میں ہوتے رہتے ہیں۔ یہ تو معمولی بات ہے۔ ہم انہیں کوئی اہمیت نہیں دیتے۔"

"شاید اس لئے کہ آپ کا کوئی قریبی عزیز نہیں مارا گیا۔"

"نہیں۔ اس لئے کہ فسادات کسی مقصد کے بغیر ہوتے ہیں اور ان میں جو خون ۱۹۴۷ء میں بہا وہ ضائع گیا۔ ہم جو خون آج کل بہا رہے ہیں وہ ایک واضح مقصد سے ہے اور وہ ضائع نہیں جائے گا۔"

"مقصد تو ۱۹۴۷ء میں بھی تھا۔ مگر آپ یہ بتائیے کہ کیا ہندو یہ فسادات بغیر کسی مقصد کے کرتا ہے؟"

"ہندو کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟"

"مسلمانوں کو مسلسل کمزور کرنا، انہیں ڈرا دھمکا کر ہندو ثقافت کی طرف مائل کرنا، ان پر ہندوستان میں عرصۂ حیات تنگ کر کے برعظیم سے اسلام کو ختم کرنا۔"

"یہ محض جذباتی باتیں ہیں۔"

"نہیں کی تاریخ نہیں پڑھی آپ نے؟"

"میں اس برعظیم ـــ اپنی دھرتی ـــ کی تاریخ سے دلچسپی رکھتا ہوں۔ مجھے دوسری قوموں کے ماضی سے کوئی دلچسپی نہیں ہمیں اپنے ماضی سے واسطہ رکھنا ہے۔"

"آپ کے ماضی میں مسلمانوں کا ہزار سالہ دور حکومت بھی تو ہے۔"

"مگر ماضی تو اس ہزار سال سے پرے بھی ہے۔"

"آپ اس ماضی سے تعلق رکھتے ہیں؟"

"نہیں۔ میں سارے ماضی سے تعلق رکھتا ہوں۔ جس میں وہ ماضی بھی شامل ہے۔"

"کیا آپ کے ماضی میں یہ حقیقت شامل نہیں کہ ایک ہزار سال اکٹھا رہنے کے باوجود ہندو آپ کو اچھوت سے بھی بدتر سمجھتا تھا؟"

"مجھے تو یہ بات تعصب زدہ پروپیگنڈا لگتی ہے۔"

"میری بات پر شاید آپ اعتبار نہ کریں لیکن اپنے بزرگوں سے پوچھئے تو وہ آپ کو بتائیں گے کہ ہندو سمجھتا تھا کہ مسلمان کو پانی پلانے سے اس کا دھرم پلید ہو جاتا ہے۔ اول تو وہ پانی پلانے سے ہی انکار کر دیتا تھا لیکن اگر کسی رفاہ عامہ کے لئے سبیل لگاتا تو وہاں ہندوؤں کو گلاس میں پانی ملتا لیکن اگر کوئی مسلمان پانی مانگتا تو اسے اوک سے پانی پینا پڑتا یا وہ لمبے کھوکھلے بانس کے ایک سرے پر منہ لگاتا اور پانی پلانے والا بانس کے دوسرے سرے میں گڑوی یا لوٹے سے پانی ڈالتا۔"

"میں نے تو ایسی بات کبھی نہیں سنی۔"

"یہ بھی نہیں سنا کہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے گھروں میں کھانے کے کمرے یا باورچی خانے میں جانے کی اجازت رہتی۔ اگر کوئی مسلمان غلطی سے وہاں چلا جاتا تو ہندو فرش ہی دھلوا دیا کرتے یا کرسی وغیرہ دھلاتے۔"

• ہر شخص کو اپنی PRIVACY کا حق ہے۔۔۔ کوئی زیادہ خلوت پسند ہیں تو کوئی کم۔ اگر ہندو زیادہ خلوت پسند ہے تو ہمیں اسکی خلوت میں مخل نہیں ہونا چاہیئے"

• یہ خلوت کی نہیں حقارت کی بات ہے۔"

"جو بھی ہماری خلوت میں مخل ہوتا ہے ہم اسے حقارت سے نہیں دیکھتے۔ ایک ہی گھر کے لوگ بعض اوقات اپنے اپنے کمروں میں اکیلا رہنا چاہتے ہیں تو ایک قوم کے افراد دوسری قوم کے لوگوں سے اپنے چند گوشے کیوں نہیں چھپا سکتے۔"

"اگر کوئی آپ سے کہے کہ آپ ہندو ہو جائیں تو آپ کا ردعمل کیا ہوگا؟"

وہ ہنسنے لگا: "سر اب آپ بحث کی بجائے کفر کر رہے ہیں۔"

فون کی گھنٹی بجنے لگی میں ادھر متوجہ ہوگیا۔ فون ختم ہوا تو سرکاری بات چھڑ گئی اور وہ بات ختم کر کے اپنی فائل اٹھا کر چلا گیا۔

وہ چلا گیا مگر مجھے اپنے عہدے کی کرسی گرتی ہوئی سی لگی اور سیکرٹری تعلیم کے کمرے کے در و دیوار سراسیمہ ہو کر چڑانے لگے کہ دیکھئے چھبیس برس کے نظام تعلیم نے ایسی نسل کھڑی کی ہے جسے یہ بھی اندازہ نہیں کہ پاکستان کیوں بنایا گیا تھا۔

میں نے فائلوں کو دیکھا تو وہ بھی میرا مذاق اڑاتی ہوئی معلوم ہوتی

میں گھبرا کر اٹھا اور دفتر سے باہر نکل گیا۔

ہمارے باہمی تعلقات بعد میں تصادم کی صورت کبھی بھی نہیں اختیار کئے بلکہ ایک پیار رکھ رکھاؤ تھا جس کی وجہ سے وہ اپنا دل کھول کر مجھ سے بات کر لیتا تھا نظریاتی اختلاف کے باوجود احترام کی فضا کبھی مجروح نہیں ہوئی۔ بہت کھرے انداز میں تبادلۂ خیالات ہوتا اور راست گوئی میں دونوں طرف کوئی جھجک نہ تھی۔ اس وجہ سے مجھے اس کے دل و دماغ میں جھانکنے کا پورا موقع ملا اور مجھے اس کی ہم عمر نسل سے گہری ہمدردی ہو گئی۔ اس لئے کہ وہ گمراہ نسل تھی جو غلط راستے پر محض اس وجہ سے چل پڑی کہ صحیح راہ دکھانے والے پاکستانی کوتاہ اندیش تھے اور فرض ناشناس بھی۔ اور غلط راہ دکھانے والے ہندوستانی دور اندیش تھے اور سازشی بھی۔ والدین بچے پر توجہ نہ دیں تو وہ ہمسایوں یا نوکروں سے گھل مل جاتا ہے، اور انہی کی عادات اختیار کرنے لگ جاتا ہے۔ قصور اس گمراہ نسل کا نہیں تھا بلکہ اس سے بڑی پہلی نسل کا تھا۔

۱۹۴۷ میں دو قوموں کے ساتھ دو رویوں نے بھی جنم لیا۔ ایک طرف پاکستان میں کامرانی کے بعد کاہلی ابھری، دوسری طرف ہندوستان میں ہار کے بعد جہد ابھری۔ ۱۹۴۷ء میں مقصد سامنے تھا۔ ۱۹۴۷ء میں مقصد براری ہوئی تو ہم نے سامان حرب اتار کر رکھ دیا اور سستانے ہوئے سو گئے۔ ہندو ۱۹۴۷ء سے بہت پہلے مقصد سامنے رکھ چکے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں انہیں اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی تو ان کی ساری سوچیں اور کوششیں اسی مقصد کے تعاقب میں لگ گئیں۔ ہماری مقصد فراموشی اور ان کی مقصد رسی دو مختلف رویے تھے۔ مشرقی پاکستان کی نئی نسل ان دو رویوں کا لازمی نتیجہ تھی۔ جب ہم نے ان بچوں کی انگلی چھوڑ دی تو دوسروں نے تھام لی اور قدم قدم اپنے ساتھ چلانے لگے اور بالآخر ادھر لے گئے جدھر وہ لے جانا چاہتے تھے۔

ان دو رویوں نے ہماری نئی نسل کو کس طرح نئے انداز میں ڈھالا؟ اس کی داستان طویل ہے مگر دو لفظوں میں بیان ہو سکتی ہے "نظام تعلیم"

نظام تعلیم سوچوں کے دھارے ڈھالتا ہے۔ ایک خاص انداز میں صحرائی ہوا کی طرح جو ایک طرف چلنے لگتی ہے تو اگلی عمر پیدا ہوا پتھر اس سے متاثر ہونے لگتے ہیں ریت اڑ اڑ کر اس جھاڑی یا پودے کے گرد جمع ہونے لگتی ہے اور ایک چھوٹا سا ٹیلہ ابھرتا ہے۔ ہوا اور ریت اور ریت لاتی ہے اور ٹیلے کا ابھار بڑا ہونے لگتا ہے جو بڑھتے بڑھتے ریت کا تودہ اور پھر پہاڑ بن جاتا ہے مگر اس کی شکل ہوا کے رخ کے مطابق ہے جدھر سے ہوا آتی ہے اس طرف ٹیلے کی اونچی ڈھلوان اور جدھر ہوا جاتی ہے اس طرف چابک سا کٹاؤ۔ تودے کی شکل ہوا کے رخ کی نشاندہی کرتی ہے جس نے اسے ڈھالا ہے کچھ وقت کے بعد ہواؤں کے رخ بدلتے ہیں تو ساتھ ہی ساتھ تودوں کی ڈھلانیں بھی بدل جاتی ہیں۔

نظام تعلیم ایک خاص رخ میں چلنے والی ہوا ہے جس کے رخ کا تعین ہر قوم کو خود کرنا پڑتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے تساہل کی وجہ سے مشرقی پاکستان میں یہ ہوا چھبیس برس تک پاکستان کے مخالف رخ میں چلتی رہی اور نئی نسل کے ذہنی تودوں کے گرد آہستہ آہستہ ایسے پہاڑ بن گئے جن کی ڈھلان میں ایسی تھیں جیسے کوئی پاکستان [illegible]

اس ہوا کے رخ کے تعین میں سب سے بڑا حصہ ہندو اساتذہ کا تھا اس کے بعد ان عناصر کا تھا جو یا تو ہندوستان کے ایجنٹ تھے یا اپنے طور پر نظریۂ پاکستان سے بیر رکھتے تھے یہ عناصر بڑے مؤثر طریقے سے پالیسی مرتب کرنے والے اداروں میں داخل تھے

محکمۂ تعلیم کے بجٹ کا سب سے زیادہ حصہ پرائمری تعلیم پر خرچ ہوتا تھا مگر ملک بھر میں ایک بھی پرائمری سکول سرکاری نہ تھا۔ تمام سکول پرائیویٹ تھے اور حکومت سے گرانٹ لیتے تھے مگر پرائیویٹ ہونے کی وجہ سے سٹاف اپنی مرضی سے بھرتی کرتے تھے یعنی حکومت رقم تو دیتی تھی مگر اس کے پاس انتظامی اختیارات نہ تھے۔

اس بندوبست کے تحت پرائمری سکولوں میں بڑی تعداد میں ہندو اساتذہ چھائے ہوئے تھے اور ہر جھاڑی اور پودے کے گرد ریت کا چھوٹا ٹیلہ بنانے میں لگے رہتے تھے

دیگر سکولوں اور کالجوں میں صورت حال ذرا مختلف تھی کیونکہ ان میں زیادہ تر سرکاری ادارے تھے مگر یہاں بھی ہندو اساتذہ کافی مل جاتے تھے۔ اگر اس سطح پر بھی زیادہ تر پرائیویٹ ادارے ہندوؤں کے ہاتھ میں تھے ڈھاکہ یونیورسٹی کو ہم پرائیویٹ نہیں کہہ سکتے۔ یہ بھی بالعموم گورنمنٹ کا ادارہ بھی نہیں کہہ سکتے یہاں بھی بیس کے قریب ہندو اساتذہ تھے۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ مارچ ۱۹۷۱ء کی فوجی کارروائی کے بعد تعلیمی ادارے دوبارہ کھلنے لگے تو مسلمان اساتذہ کی بہت بڑی تعداد

سلیم حامد بھی مگر ہندو اساتذہ کم و بیش سبھی حاضر ہو گئے تھے اور بڑی تندہی سے اسے مذموم کاروائیں مصروف رہے۔ جب حکومت کی متعدد اپیلوں پر طلبا سکولوں
اور کالجوں میں آنے لگے تو یہ اساتذہ ان کو غلط سلط افواہوں سے بھگانے کی کوشش کرتے۔ پہلے یہ عمل کانا پھوسی تک محدود تھا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ
شدت پکڑتا گیا اور وہ زیادہ دلیری سے مانگے دیں پاکستان کے خلاف اکسانے لگے۔ نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے ہندو پروفیسروں نے ایک بیان لہٰذا
پاس کیا کہ ان کی حفاظت کا مناسب انتظام کیا جائے کیونکہ وہ دلجمعی سے درس و تدریس کا کام نہیں کر سکتے

سات دسمبر کو ایک لیکچرر نے کہا تھا کہ آج جاج کالج کے اساتذہ بہت خوش تھے کیونکہ ہندوستان نے بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا ہے اور ان کا ہندو وائس پرنسپل
دیوتاؤں کی طرح کالج میں ایسے گھوم رہا تھا جیسے اس نے کالج کے ہر شخص پر بڑا ہی احسان کیا ہے۔

ریت کے چھوٹے ٹیلے دن بیتے بیتے اب پہاڑ بن چکے تھے۔

اساتذہ کے علاوہ نصابی کتب بھی ہوا کے رخ کو ادھر ہی چلا رہی تھیں

چھٹی یا ساتویں جماعت کی ایک درسی کتاب میں پاکستان کے مختلف حصوں کے متعلق ایک مضمون تھا بظاہر معصوم اور سیدھا سادا معلوماتی مضمون۔

میٹرک کے لئے انگریزی گرامر کی کتاب میں بظاہر ایسی گنجائش نہیں ہو سکتی کہ اسے پروپیگنڈا کے لئے استعمال کیا جا سکے مگر اس میں التزام یہ تھا کہ گرامر کی
مختلف تراکیب کی تشریح کے لئے جو فقرے بنائے جاتے تھے ان میں زیادہ تر نام ہندوؤں کے تھے اور ذکر بھی ہندو رسومات یا کلچر کا ہوتا تھا مسلمانوں کے
نام یا کلچر کے نشان خال خال ہی تھے۔

کالجوں میں انگریزی نثر کی جو کتب تھیں ان میں نصف سے زیادہ مضامین کلکتہ کے پروفیسروں نے لکھے تھے حالانکہ مشرقی پاکستان کے پروفیسر
انگریزی لکھنے میں اچھے خاصے تھے۔ یہی حال بنگالی کی نثری کتابوں کا بھی تھا۔

میٹرک یا کالج کے لئے تاریخ کی ایک درسی کتاب میں سب سے نمایاں تصویر پرتھوی راج کی تھی۔ دوسری نمایاں تصویر رانا سانگا کی تھی اور پھر اکبر اعظم
کی جس کے سیکولر ہونے کی تعریف کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ کسی مسلمان بادشاہ کی تصویر نہ تھی۔

تاریخ کی کتاب ہو یا بنگالی اور انگریزی نثر کی کتاب ہو ان میں کسی نہ کسی رنگ میں ۱۹۴۰ء کے پاکستان ریزولیوشن کا ذکر ضرور ہوتا تھا جس میں دو اسلامی
ریاستوں کے قیام کا تقاضا تھا اور ۱۹۴۶ء کے ریزولیوشن کا ذکر دوسری کتابوں میں تو کجا تاریخ کی کتابوں میں بھی نہ تھا کیونکہ اس میں ایک پاکستانی ریاست کا ذکر تھا
جانا ہے ۱۹۶۷ء یا ۱۹۶۸ء میں مرکزی حکومت کی ہدایت پر نصاب میں ایک نئی کتاب کا اضافہ کیا گیا جس کا نام تھا "ولیسو کرشٹی" یہ کتاب تحریک پاکستان اور
اس کے محرکات سے متعلق تھی اس کتاب کے خلاف صوبہ بھر میں شدید تحریک چلائی گئی کہ اس کے پڑھنے سے بچوں کے ذہن پر بوجھ پڑتا ہے حکومت نے بالآخر
کتاب نصاب سے خارج کر دی۔

اس نوجوان افسر سے گفتگو کے بعد میں پریشان ہو کر کمرے سے باہر نکلا تو یہ ساری حسابات ٹوٹتے تاروں کے شراروں کی طرح میرے ذہن میں لپک گئے۔
کر آہیں اور میری رگ رگ کو جھنجھوڑ دیا۔ ہلچل ذرا مدھم پڑی تو میں سڑک پر بلا مقصد گھومتے ہوئے ٹھنڈے دل سے سوچنے لگا

اس نسل پر الزام ہے کہ اس نے وطن سے نفرت کی اور وطن کے دشمن سے محبت کی اس نے دو قومی نظریئے کی نفی کی جس پر پاکستان کی عمارت کھڑی ہے
اس نے ان حالات کو فراموش کر دیا جن کی وجہ سے پاکستان کا وجود ناگزیر تھا اس نے اپنی تاریخ کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے سے انکار کر دیا۔ اس نے اپنا ماضی
اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا بلکہ اسے کانوں اور غیروں کی زبانوں سے پرکھا۔ اس کا یقین دھندلا اور عمل الٹا ہے۔

ناہموار چال سے سڑک کے پتھر روڑوں کو ٹھوکریں مارتے ہوئے میں نے سوچا کہ اس نسل پر الزام بے شک درست ہے ـــــ مگر یہ مجرم نہیں ہے
اصل مجرم وہ نسل ہے جس پر یہ الزام نہیں لگایا جاتا۔ یعنی بزرگ نسل جس نے پاکستان حاصل کیا تھا اور پھر وہ بڑی دیدہ دلیری سے ان نعروں کو تار تار کرنے
لگے جو سفر کے دوران اس نے پرچم پر لکھے تھے ان کی بجائے تاریخ کی مردہ قوموں کے کفن کی دھجیاں اٹھا کر سینے پر سجانے لگے عہد توڑ ڈالے اور کھبے
فرسودگیوں کو نئے نام دے کے سمجھ کر اپنا لیا۔ مرلن پرنچ کر نئی نسل کو تربیت دینے کی بجائے اس کے سامنے جسم و روح کی سٹرپ ٹیز STRIP-TEASE کرنے لگے مرشد
علی برادران، عطاء اللہ شاہ بخاری، علامہ مشرقی، علامہ اقبال اور قائداعظم کی دی ہوئی اکتا کیں نوچ نوچ کر اتارنے لگے اور ملا اقرا اندر سے انڈاروں
اور ایسے ہی سعدی کا وہ گھن زدہ زوال پذیر کردار بحال کر سکتیں کیا جس نے ہند کی اسلامی سلطنت کو فرنگی کے ہاتھ بیچ ڈالا تھا۔ بزرگ نسل نے نئی نسل کو اگر
کچھ بتایا تو صرف یہ کہ عقیدہ ہیرو ہے، شرافت گناہ ہے، وضع داری بزدلی ہے موقع پرستی عقلمندی ہے، بے اصولی اصل ہے۔ با اصولی تعصب ہے
جو نشہ عبادت ہے، اخلاقی جرأت حماقت ہے، خود احتسابی بغاوت ہے اور سیاست رشوت ہے ـ جب سوچ کا یہ دھارا الٹا بہنے لگا تو
نظام تعلیم کی کجی بھی نظر نہ آئی اور اس کے نتیجے میں نئی نسل کے وطنیت کے تصور کو بھی گھن لگ گیا

میں یہ سوچ کر لرز گیا کہ پاکستان سے غداری اسی نسل نے کی ہے جس نے پاکستان بنایا تھا ـــــ معماروں کی غداری بدترین غداری ہوتی ہے ایسی عمارت کے
مکین ہمیشہ ہی چھت گرنے کے اندیشوں میں بھٹکتے رہتے ہیں۔

مگر کیا ایک نظریاتی سلطنت کی نئی نسل کو یہ احساس بھی ہے کہ اس کے ساتھ اس کے بزرگوں نے بے ایمانی کی ہے

میں نے سوچا کہ اس نوجوان افسر سے دریافت کروں گا۔

اس کا جواب کیا ہو گا؟ میں نے اندازہ لگانے کی کوشش کی مگر ذہنوں کے مدوجزر کون ناپ سکتا ہے اور جب دل و دماغ میں بغاوت کا دھواں گھوم

رہا ہو تو سرحدوں کی بجائے دھماکے ابھرتے ہیں۔ ایسے دھماکوں کی نفی کون کر سکتا ہے

چند روز بعد میں نے اپنے ایک دو دوستوں کو دوپہر کھانے پر بلایا تو اس نوجوان افسر کو بھی مدعو کر لیا۔ کھانا چینی ریستوران میں تھا۔ فارغ ہونے کے بعد وہ دوست تو چلے گئے مگر ہم دونوں چائے کی ایک اور پیالی پینے کے لئے رک گئے۔ باتیں ادھر ادھر سے گھوم پھر کر وہیں آگئیں جو ہمارا مسلسل موضوع بنا ہوا تھا۔ اسی گفتگو میں مجھے یہ سوال پوچھنے کا بھی موقع مل گیا

اس کا جواب بالکل واضح اور غیر مبہم تھا

" پاکستان کی نوجوان نسل نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے کہ اپنے ڈھلے ڈھلائے نظریات ہم پر ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اگلی نسل کو اپنا راستہ خود متعین کرنے کی اجازت دی ہے۔ میں آج کا باشندہ ہوں اور مجھے اپنے بزرگوں کے ماضی سے کوئی دلچسپی نہیں جن افکار کی جڑیں ان کے ماضی میں ہیں وہ میرے افکار نہیں بن سکتے۔ میری سوچیں وہی ہیں جو میرے مشاہدے اور تجربے سے بنی ہیں'

میں نے کہا " قوموں کی نشوونما کے لئے ضروری ہے کہ ایک نسل کا تجربہ دوسری نسل تک سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہے۔ اس سے قومی ذہن بنتا ہے اور اداروں کا ڈھانچہ بنتا ہے۔ مثال بالکل سائنس کی ترقی کی طرح ہے۔ ایک نسل کافی ریسرچ کے بعد ایجادات کرتی ہے اور اگلی نسل ان ایجادات کو من وعن قبول کرتی ہے اور پھر اپنے تجربوں سے ان ایجادات کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتی ہے۔ اگر ہر نسل پچھلی نسل کے تجربے سے منہ موڑ کر روز اول والی ریسرچ سے شروع کر دے تو سائنس کی ترقی نہیں ہو سکتی اسی طرح دو قومی نظریے میں سر سید کا تجربہ، علی برادران کی ہندوؤں سے مایوسی، علامہ اقبال کا فکر اور قائد اعظم کا کرب شامل ہے۔ اس نظریے کو تشکیل دینے میں کم و بیش ایک صدی اور چار پانچ نسلوں کا خون پسینہ لگا ہے اور یہ احساس کشید ہوا ہے کہ ہندوؤں کی تنگ نظری اور تعصب کی وجہ سے دونوں قوموں کا اکٹھا گزارہ ممکن نہیں۔ اب آپ اس سبق سے کیسے آنکھیں بند کر سکتے ہیں ؟'

وہ بلند ہنسی ہنسا۔ " سر، اس کا جواب تو بالکل صاف ہے کہ ہماری نسل اس نظریے سے آنکھیں بند نہیں کر رہی بلکہ یہ نظریہ ہم تک اس انداز میں پہنچا ہی نہیں جس انداز میں بزرگوں نے اسے محسوس کیا تھا'

" یعنی تو میں کہہ رہا ہوں کہ کیا آپ اپنے بزرگوں کی کوتاہی تسلیم نہیں کرتے ؟"

"بالکل نہیں۔ میں تو اپنے بزرگوں کا احسان مانتا ہوں۔"

"اگر آپ کے بزرگ آپ کو کھانے کے انداز، پہننے کے انداز، محفل کے آداب اور تہذیبی رکھ رکھاؤ سکھاتے تو کیا آپ اسے بھی ان کا احسان سمجھتے ؟'

" جی نہیں یہ مثال غیر متعلق ہے میں غور و فکر کی بات کر رہا ہوں۔ اس میں ہمیں آزادی دے کر انہوں نے احسان کیا ہے۔ انہیں دو قومی نظریے میں جان نظر آتی ہوگی، مگر ہمیں تو کوئی جان نظر نہیں آتی۔ غالباً آج کل یہ نظریہ باطل ہے۔"

یہ باطل تو نہیں ہے مگر اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے دوسری قوم کے افراد کو اکثریتی ہمسائے کے طور پر نہیں دیکھا۔ ہزار سال ایک ہی محفل میں بیٹھنے کے باوجود اس تہذیبی فاصلے کو محسوس نہیں کیا جو ہمیں پلید اور ان کو پاک اور برتر بناتا ہے۔ وہ معاشی قتل عام نہیں دیکھا جو کسی مسلمان کو باعزت روزی کمانے سے روکتا تھا۔ آپ کی بڑی نسل نے ہندو کو وحشی اکثریت کے روپ میں دیکھا تھا جو درندگی پر آمادہ تھی۔ مگر آپ کی نسل نے ہندو کو اپنے ملک میں مسکین اقلیت کے طور پر دیکھا اور دوسرے ملک میں امن پسند صلح کا روپ دھارے دیکھا۔ آپ کو اس کی گہری ریاکاری کا اندازہ نہیں۔ اسی لئے آپ پہچان نہیں پاتے کہ اس ملک میں اور ہمسایہ ملک میں ہندو کے دونوں روپ دھوکا اور فریب ہیں۔ اگر آپ پچھلی نسل کے سبق کو بھول گئے تو آپ کو پھر ایک صدی اور تین چار نسلوں کو ذلت، اور آزار کے دوزخ میں جھونکنا پڑے گا تب کہیں جا کر آپ یہ سبق سیکھیں گے۔"

اس نے چائے کا ایک گھونٹ لیا گلا اور دھیمے انداز میں کہنے لگا " سر، اس کا فیصلہ وقت کرے گا "

"میرے عزیز" میں نے کہا "اگر آپ حقیقت پسند ہیں تو وقت کے فیصلے خوشگوار ہو سکتے ہیں لیکن اگر آپ خوش فہم اور انانیت زدہ ہیں تو وقت کے فیصلے بڑے سفاک ہو سکتے ہیں "

وہ تھوڑی دیر خاموش رہا اور پھر کہنے لگا " سر آج کا کھانا بہت اچھا تھا "

دن گزرتے گئے وقتاً فوقتاً ہماری گفتگو ہوتی رہی کبھی براہ راست اس موضوع پر اور کبھی ضمناً اور سرسری مگر یہ ظاہر تھا کہ میں اپنے ارادے میں ایک حد تک ہی کامیاب ہو سکوں گا اس کا ذہن سمجھنے میں تو مجھے کامیابی ہو رہی تھی مگر اس کا ذہن بدلنے میں کامیابی کے آثار نہ تھے وہ اپنے نقطۂ نظر پر سختی سے قائم تھا بلکہ اب تک مجھے یہ بھی اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ مکتی باہنی کی مدد دامے، درمے اور سخنے ہر انداز میں کرتا ہے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ مارشل لا والوں کو بھی علم تھا مگر وہ بلا خوف و خطر اپنے کام میں مصروف تھا، حالانکہ مارچ کے ایکشن کے بعد فوج نے اسے تھوڑی دیر کے لئے گرفتار بھی کیا تھا، پھر عدم ثبوت کی بنا پر وہ رہا ہو گیا۔ مگر یہ جھٹکا بھی اس کی حوصلہ شکنی نہ کر سکا تھا۔

ایک دن میں دفتر کی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا کہ اس سے مڈبھیڑ ہو گئی وہ اپنے ایک اور دوست کے ساتھ اوپر آ رہا تھا اور دونوں سخت غم و غصے کی حالت میں تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بے اختیار بولا " دیکھئے سر، فوج کتنے ظلم کر رہی ہے۔"

"کیا ہوا ؟"

" ہم دونوں ابھی ابھی تین لاشیں دیکھ کر آ رہے ہیں ہسپتال کے پاس، نالے پر سڑک کا پل ہے۔ اس کے نیچے تین لاشیں پڑی ہیں "

"موت کیسے واقع ہوئی ؟"

"گولیاں لگنے سے"

"کون لوگ ہیں وہ ؟ کسی نے شناخت کیا ان کو ؟"

"ابھی تک ان کی شناخت نہیں ہو سکی۔"

"جب تک شناخت نہ ہو، ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔"

"کیا مطلب ؟"

"اگر تو وہ مکتی باہنی کے حامی تھے تو غالباً فوج نے مارا ہوگا لیکن اگر وہ پاکستانی ذہن کے مالک تھے تو ممکن ہے مکتی باہنی والوں نے انہیں مارا ہو۔ ورنہ صحیح حالات کا اندازہ ہوئے بغیر کچھ کیسے کہہ سکتے ہیں ما ؟"

مگر وہ یہ دلیل قبول کرنے کو تیار نہ تھے اور اصرار کر رہے تھے کہ فوج نے انہیں مارا ہے۔

بالآخر مجھے کہنا پڑا کہ خانہ جنگی کے حالات میں قتل و خون تو ہوتا ہی ہے جس طرح مکتی باہنی والے فوج اور پولیس والوں پر اچانک حملے کر کے انہیں قتل کرتے ہیں اور ان کو گوارا کئے جاتے ہیں، اسی طرح فوج والے بھی ایسے ہی اقدام کرتے ہیں۔"

مگر وہ یہ بھی تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے اور اصرار کرتے رہے کہ فوج کو ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہیئے، یہ سراسر ظلم ہے۔ ان کی باتوں کا لب لباب یہ تھا کہ مکتی باہنی والے قتل و غارت کرنے میں حق بجانب ہیں مگر فوج کو یہ حق نہیں پہنچتا۔

میں نے سوچا یہ شیخ مجیب الرحمٰن کا طرز استدلال ہے جو تعلیم یافتہ بنگالیوں میں بھی سرایت کر گیا ہے اور اس کی گونج ہم ہندوستان ریڈیو پر بھی سنتے ہیں بلکہ ہمارے ذرائع ابلاغ اتنے کمزور ہیں اور اپنے نقطۂ نظر بیان کرنے کی کوششیں اتنی ادھوری ہیں کہ ہمارے ہر عمل کی ظلم کے طور پر تشہیر کی جاتی ہے۔

لاشوں کے متعلق اصل حقیقت کا پتہ نہ چل سکا جیسا کہ مشرقی پاکستان میں اکثر ہوتا تھا جب تقدیر گردش میں ہو، تدبیر میں گھنگھرو اور ضمیر میں تعصب ہو تو اصلیت افواہوں کی دھند میں کھو جاتی ہے اور حقائق مخفی صداؤں کی طرح قیاس کے آسمانوں میں بھٹکنے لگ جاتے ہیں۔ طرفین ان صداؤں کو بیے اپنے روپ میں پیش کرتے ہیں اور مذہبی حلقوں کا ساحروں ہر طرف چھا جاتا ہے۔ جنون جب بڑھتا ہے تو مقابلہ خیر و شر کے درمیان نہیں رہتا بلکہ شر اور شر کے درمیان ہو جاتا ہے اس مقام پر پہنچ کر سچ اور جھوٹ کی حد فاصل مٹ جاتی ہے، ظلم اور زیادتی کا تصور ختم ہو جاتا ہے اور تمام قانونی اور اخلاقی معیار معدوم ہو جاتے ہیں۔

نومبر بھی ایسا ہی مقام تھا جب ہندوستان نے مشرقی پاکستان پر بھرپور حملہ کیا تھا چٹاگانگ کے پہاڑی علاقے، سلہٹ اور جیسور کے علاقے میں تین طرف سے پیش قدمی کی حملے میں ایئر فورس بھی استعمال کی گئی۔ مشرقی پاکستان پر ہندوستان کی بارہ ڈویژن فوج جمع تھی اور پاکستان ریڈیو کے مطابق اور محاذ بھی کھلنے کی توقع تھی۔ پھر یہ محاذ کھل بھی گئے مگر ہم نے بین الاقوامی محاذ پر کوئی قدم نہ اٹھایا اقوام متحدہ میں بھی دہائی نہ دی کہ ہم پر حملہ ہوا ہے دس دن تک حملہ اسی طرح چلتا رہا اور مشرقی پاکستان میں سوالیہ نظریں آسمان کی طرف اٹھ اٹھ کر حیرتوں پر شک کرتی رہیں اور پاک وطن کو اپنا کہنے والے محب وطن پاکستانی زبان حال سے ارباب اقتدار سے سوال کرتے رہے۔

یہ جہاں مرا جہاں ہے کہ تری کرشمہ سازی

ان دس دنوں میں میری کی ملاقات اس نوجوان افسر سے ہر روز ہوتی تھی مگر ملاقاتوں کی نوعیت بدل چکی تھی اب وہ بحث سے بچتا تھا اور ملک کے حالات پر بات چیت کے لئے تیار نہ تھا۔ نہ ہی یہ تسلیم کرنے کو تیار تھا کہ ہندوستان نے پاکستان پر حملہ کیا ہوا ہے

" اگر یہ حملہ ہوتا تو پاکستان یقیناً اقوام متحدہ میں شور کرتا" اس نے ایک مرتبہ معنی خیز انداز میں کہا تھا مگر اس سے زیادہ گفتگو پر آمادہ نہ تھا مگر میرے بہاری ڈرائیور نے مجھے بتایا تھا کہ اس افسر کو حملے کی خبر سب سے پہلے اسی ڈرائیور نے بتائی تھی۔ یہ خبر سن کر وہ زیر لب مسکرایا تھا اور بول اٹھا تھا " اب دیکھنا "

حملے کے دس دنوں میں ہمیں یقیناً تشویش تھی مگر وہ افسر مطمئن نظر آتا تھا، جیسے عام تمہید نے اس پر مستقبل آشکارا کر دیا ہو اور اسے حالات کا پانسہ اپنے حق میں پلٹنے کا یقین ہو۔ مجھے یوں لگتا جیسے اس کی خاموشی دھمکی زبانِ حال سے ہمیں دھمکا رہی ہو " اب دیکھنا "

پھر تین تاریخ کی رات کو ڈھاکہ پر قیامت ٹوٹ پڑی رات تین بجے کے قریب ہوائی حملے سے در و دیوار لرز اٹھے اور پھر لڑائی جنگ شروع ہوگئی۔ رات کا باقی حصہ اور اگلا سارا دن ہوائی حملے جاری رہے۔ حملوں میں بمشکل آدھ پون گھنٹے کا وقفہ ہوتا تھا

چار تاریخ کی صبح کو میں ہماری اور ہوائی جہازوں کی DOG FIGHT کے سائے میں گاڑی چلاتا گورنمنٹ ہاؤس ایک میٹنگ کے لئے گیا مگر میٹنگ ملتوی ہو گئی تھی وہاں سے سول ڈیفنس کا کنٹرول روم دیکھنے کے بعد میں ساڑھے دس بجے کے قریب دفتر پہنچا وہاں ہو کا عالم تھا دو چار لوگ آئے تھے اور باقی لوگ ادھر ادھر سے فون کر کے صورت حال کا پتہ کر رہے تھے۔ میں نے حاضر لوگوں سے کہا کہ جو کوئی بھی فون پر مل سکتا ہے اسے دفتر آنے کو کہا جائے۔ چنانچہ تھوڑی ہی دیر میں کافی لوگ پہنچ گئے۔

ہمارا دفتر سیکرٹریٹ کی عمارت کی چھٹی منزل پر تھا۔ اس نوجوان افسر کا کمرہ عمارت کی بیرونی طرف تھا اور وہاں سے ایئرپورٹ صاف نظر آتی تھی اس

لئے جب ہوائی حملے کا سائرن ہوتا تو ہم لوگ بھاگ کر اس کے کمرے میں جمع ہو جاتے اور حملہ ختم ہونے تک وہیں رہتے۔

کمرے میں بیک وقت پندرہ بیس لوگ ہوتے مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان، وطن دوست بھی اور وطن دشمن بھی، رفیق بھی اور رقیب بھی —— ایئرپورٹ پر جارحانہ لپکتے جھپٹتے ہندوستانی ہوائی جہاز، نیچے سے دفاعی توپوں کی چنگھاڑ، فضا میں گولوں کے دھماکے، کمرے میں دل گرفتہ لوگوں کا ہجوم، دلوں کی متضاد وابستگی پر تمام کوائف مل کر علامتی انداز میں برعظیم کی صورت حال کی مکمل تصویر پیش کرتے تھے۔ انتشار زدہ برعظیم میں دو قوموں کا تاریخی اور اصلی تصادم، اس کمرے کی محدود فضا میں یہ لامحدود عناصر سمٹ کر اکٹھے ہو گئے تھے۔ اس وجہ سے وہاں عجیب قسم کا کھچاؤ تھا کیونکہ ایئرپورٹ پر ہر دھماکے کا کوئی ردعمل پیدا ہوتا تھا یہاں سموں میں قربت تھی مگر دلوں میں فاصلے تھے۔ تماشہ کھڑے ہوئے لوگ مخالفت میں بٹے ہوئے تھے۔ اس مخالفت کی تسکین سامنے والے منظر سے ہوتی تھی۔ ہندوستانی جہاز غوطہ لگا کر بم گراتا اور توپیں دھڑا دھڑ فائر کرتیں۔ وہ بچ کر نکل جاتا تو ایئرپورٹ سے دھوئیں کا بادل اس کی کامیابی کا پھریرا بن کر ابھرتا اور ہمارے کمرے میں چند چہرے دمک اٹھتے اور چند ایک مرجھا جاتے۔ اگر کسی جہاز کو توپ کا گولہ لگ جاتا تو کچھ لوگ اچھل پڑتے اور کچھ ڈھیلے پڑ جاتے کمرے کے اندر گویا بارود کی جنگ تھی کمرے کے اندر حرکات و سکنات کی جنگ تھی۔ باہر حریف آزادانہ گتھم گتھا تھے۔ اندر حریف مسافقانہ متحمل تھے باہر وقت کی کلائیاں مروڑ کر فیصلے کی کوشش تھی، اندر مناسب وقت کے انتظار میں انگلیاں بھینچ رہی تھیں۔ باہر دشمن دست و گریباں تھے، اندر دشمن دوستوں کی طرح تماشہ دیکھ رہے تھے اس ستم ظریفانہ فضا کی وجہ سے کمرے کا چپہ چپہ طنزیہ انداز میں تمام چہروں کو گھور رہا تھا

میں بار بار کنکھیوں سے اس نوجوان افسر کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ خاموش تھا مگر اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ بول رہے تھے اس میں شک کی ذرہ برابر گنجائش نہ تھی کہ وہ ہم میں سے نہ تھا بلکہ مخالف فریق کے ساتھ تھا۔ اس کی امیدیں اور امنگیں ہندوستانی ہوائی جہازوں کی پرواز کے ساتھ ابھرتی ڈوبتی تھیں۔ اس کے دل کی دھڑکن ہماری دھڑکنوں سے الٹ تھی اور فتح و شکست کے متعلق اس کی دعائیں ہماری دعاؤں سے مختلف تھیں۔

دشمن نے بڑا حملہ کیا۔ پہلے چھ ہوائی جہاز دو دو کے گروپ میں آتے تھے اس دفعہ بارہ ہوائی جہاز ایئرپورٹ پر لپکے چلے آئے

نیچے سے بیالیس طیارہ شکن توپیں دھڑا دھڑ فائر کرنے لگیں

ایک جہاز غوطہ لگاتے لگاتے ایک دم اوپر اچھلا۔ اگلے لمحے شعلوں کا ایک ایسا گولا سا تھا جیسے غالب نے کہا تھا۔

اک گونہ آتش زیرِ سر کھلا

پھر یہ شعلہ لکیر بن گیا اور ہوائی جہاز فضا میں ہی حل کر تحلیل ہو گیا کیونکہ کوئی حصہ نیچے گرتا نظر نہیں آیا

"وہ مارا"

"نعرۂ تکبیر"

"شاباش"

ہم لوگ خوشی سے دیوانے ہو کر چلائے۔ جس کے منہ میں جو آیا نعرہ بن گیا دو ایک بنگالی بھی خوش ہوئے مگر زیادہ تر خاموش رہے کہ مصلحت کا تقاضا یہی تھا۔

اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کئے

وہ سوچتے تھے کہ بزم اٹھے گی تو نہ معلوم کیا رنگ کھل جائے۔ بساط بچھی رہے گی کہ الٹ جائے گی۔ ساقی بدستور ہوگا یا خاک بسر اس موقع پر نہ معلوم اہل بزم کا کیا بنے گا۔ اس کی تحسین اس وقت کا نالہ نہ بن جائے۔ کچا پکا خوشی اور مایوسی دونوں مصلحت کے غلاف میں چھپی رہیں۔

میں نے اس نوجوان افسر کی طرف دیکھا ہندوستانی ہوائی جہاز جلنے سے اس کا صدمہ صاف عیاں تھا۔ چھپانے کی کوشش میں اس نے سگریٹ نکالا اور ہونٹوں میں لے کر لائٹر سے لگانے لگا، مگر ہاتھ اس بری طرح کانپ رہے تھے کہ سگریٹ شعلہ نہ پکڑ سکا۔

اس نے زور سے لائٹر بند کیا سگریٹ ہونٹوں سے باہر کھینچا اور پیٹھ موڑ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

بمباری جاری رہی۔ اگلے روز، اور اس سے اگلے روز حتیٰ کہ سات تاریخ کو شکست کے آثار نظر آنے لگے

میں روزانہ دفتر جاتا، فائلوں کی آمد و رفت قریباً قریباً بند ہو چکی تھی۔ میں کبھی کمرے میں کرسی پر سر تھامے بیٹھا رہتا، کبھی ریڈیو پر خبریں سنتا کبھی اس افسر کے کمرے سے ایئرپورٹ پر بمباری دیکھتا۔

اب ماحول میں تبدیلی کی چیخ سنائی دے رہی تھی۔ ماضی سے رشتہ ٹوٹ رہا تھا۔ حال میں دراڑیں پڑ رہی تھیں اور ایک بالکل مختلف مستقبل جھانک رہا تھا ایسے میں لوگوں کا ضبط خس و خاشاک کی طرح بہہ گیا۔ ان کے محتاط انداز چھوٹ گئے اور رائے کا اظہار ہونے لگا اس لئے ہم دونوں کی گفتگو میں بھی حالات حاضرہ پھر سے نمودار ہونے لگے بغیر کسی شعوری ارادے کے باتوں کا دھارا اس طرف چلنے لگا جیسے ہوا کا رُخ بدلنے سے پتوں کے ہلنے کے انداز بھی بدل جاتے ہیں۔ فرق یہ تھا کہ اب اصولی بحث نہیں ہوتی تھی بلکہ ہم قیاس آرائی کرتے تھے کہ کیا بنگلہ دیش آزاد رہے گا یا ہندوستان کا ایک صوبہ بن جائے گا ان دنوں وہ بہت فکرمند تھا

"اگر بنگلہ دیش پر ہندوستان نے قبضہ کر لیا تو یہ بہت برا ہوگا۔ ہم ان کے دوست رہنا چاہتے ہیں مگر غلام نہیں بننا چاہتے . . ہم ہندوستان کی پناہ میں رہنے کو بھی برا نہیں سمجھتے مگر ان کی غلامی میں نہیں جانا چاہتے۔"

"پناہ اور غلامی میں تھوڑا ہی فرق ہے"۔ میں نے کہا

اس نے بے چینی سے پہلو بدلا، مگر خاموش رہا جیسے میرے ساتھ متفق ہو مگر اظہار کرنے سے گھبرا رہا ہو۔ پچھلے سات ماہ کے مسلسل اختلاف کے بعد اب اتفاق

کرنا خاصہ مشکل تھا۔

تیرہ دسمبر کو سوموار تھا ہم لوگ گورنمنٹ ہاؤس میں تھے۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ دفتر جانا ہے سو دس بجے میں ساڑھے نو روانہ ہو گیا باہر نکلتے ہی ہوائی حملے کا سائرن سا مگر دفتر پہنچنے تک کوئی ہوائی جہاز نہ آیا

سکرٹریٹ قریباً ویران تھا جیسے میدان جنگ بنا ہوا اور اداسی رونق کی تلاش میں گھوم رہی ہو۔ کار پارک کسی گنجے سر کی طرح صاف اور چٹیل تھا۔ نئے شہزادی ستون کی طرح ساکت تھا۔ کئی منزلہ عمارت کی سیڑھیاں سکھڑی کی طرح دامن پھیلائے پڑی تھیں نہ کوئی تیزی سے اترنے والا نہ کوئی اب کر چڑھنے والا مگر کبھی کبھی اوپر یا نیچے کی منزلوں سے پاؤں کی دھمک سنائی دے جاتی جس سے اندازہ ہوتا کہ عمارت میں اکا دکا لوگ گھوم رہے ہیں۔ چوکیدار اور چپراسی بھی خال خال ہی تھے اس لئے زیادہ ہو کر سے سد تھے۔

میں اپنے کمرے میں گیا تو تھوڑی دیر بعد دو نوجوان افسر بھی آ گئے کیونکہ اس کا کچھ بھی نہ تھا میری میز پر کوئی فائل نہ تھی اور فون کی گھنٹی خاموش تھی۔

علیک سلیک، دو ایک رسمی جملے اور پھر ہم خاموش بیٹھ گئے کبھی کبھی فضا میں توپوں کے دھماکے گرج اٹھتے یا ہوائی حملے کا سائرن گونجنے لگتا۔ اس سے خاموشی ٹوٹ جاتی مگر خاموشی کا احساس قائم رہتا۔

میں سوچ رہا تھا کہ آج امریکہ ریڈیو نے کہا ہے کہ ڈھاکہ کے قریب ہندوستانی چھاتہ بردار فوج کے اترنے سے صورت حال بہت بدل گئی ہے اور اب چند گھنٹوں میں ڈھاکہ کی جنگ شروع ہو جائے گی اور گلی کوچے میدان جنگ بن گئے۔ نہ معلوم جنگ کیا رخ اختیار کرے اور کن گلیوں میں لڑائیاں ہوں گی۔ اُدھر سیکیورٹی کونسل میں کل رات امریکی مندوب نے بہت سخت اور تیز تقریر کی اور ہندوستان کو مطعون کرتے ہوئے فرمایا کہ اس جنگ میں امریکہ براہ راست مداخلت کر سکتا ہے۔

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ محکمہ تعمیرات کے سیکرٹری بول رہے تھے۔ عظیم پورہ کے گورنمنٹ کوارٹرز فوری طور پر فوج کو چاہئیں۔ وہاں کے مکینوں کو یونیورسٹی کا کوئی ہوسٹل دلوا دیں۔

میں نے وائس چانسلر سے رابطہ قائم کیا انہوں نے بتایا کہ تین ہوسٹلوں میں ہسپتال قائم ہو چکا ہے۔ چوتھے میں جگہ نہیں دے سکتے ہیں۔

میں نے سوچا ڈھاکہ کی جنگ کی تیاریاں شروع ہو چکی ہیں۔

گیارہ بج چکے تھے۔ ویرانی، خاموشی، بیکاری اور غیر یقینی صورت حال سے تنگ آ کر میں نے ریڈیو لگا دیا۔ ادھر ادھر سوئی گھمائی تو ریڈیو آسٹریلیا بول پڑا۔ اناؤنسر نے بتایا کہ جیسور کا جو علاقہ پاکستان سے چھن چکا ہے۔ وہاں ایک بہت بڑا جلسہ ہوا جس میں "بنگلہ دیش" کے "صدر" نذرالاسلام اور "وزیر اعظم" تاج الدین نے ہندوستانی علاقے سے آ کر شرکت کی اور دھواں دھار تقریریں کیں۔ جلسے کی کارروائی کا ریکارڈ پیش کیا جا رہا تھا

بلند بانگ تقریریں ہوئیں جن میں پاکستان شیطان تھا اور ہندوستان فرشتہ تھا۔ ظلمت کے دور کے اختتام کی خوشخبری تھی اور سنہری زمانے کی آمد کی نوید تھی بے تحاشا طعنے تھے، اونچے دعوے تھے، سانچ کو آنچ تھی اور دروغ کے پاؤں تھے۔

بیچ بیچ میں نعرے گونجتے تھے فلک شگاف اور پرجوش نعرے۔

مجیب الرحمٰن زندہ باد
اندرا گاندھی زندہ باد
اندرا مجیب بہن بھائی
کوسیجن مجیب بھائی بھائی

نعروں کی گونج گرج یوں لہر پر لہر اٹھتی تھی جیسے حد نظر تک پھیلا ہوا بیکراں سمندر ہو۔ یہ گونج ایک تاریخی تعبیر کی داستان کا سا بھر رہی تھی۔ وقت کے کار میں یہ فاتح کی للکار تھی جسے دو افراد ایک اداس اور ویران کمرے میں طرح کی علامتیں بن کر ریڈیو پر سن رہے تھے اور کمرے کی اداسی اور ویرانی ان دو شخصیتوں کے تضاد سے اور بھی پریشان تھے۔

گزشتہ سات ماہ سے ہم دونوں نظریاتی حریف بیکس مانوس شریک تھے ہمارے دل کڑھتے تھے مگر نگاہیں جھکی تھیں۔ زبانوں میں کاٹ تھی مگر میں لحاظ تھا۔ ہماری مخالفت پر وضع داری کا پردہ تھا اور حفظ مراتب کی روک تھی۔

مگر ریڈیو سے ابھرنے والے نعروں نے گویا سب پردے جھر جھر پھاڑ دیئے۔ ہم دونوں یوں محسوس کر رہے تھے جیسے کسی تیسرے نامدے ہمیں ایک دم کر دیا ہو اور ہماری نظریں ملانے کی ہمت نہ ہو۔ حقائق مخفی ہوں تو لے صرف مستور ہوں تو قابل برداشت مگر مشہود ہوں تو بعض اوقات ناقابل برداشت بن جاتے ہیں۔ یہ نعرے ایسی ہی سفاک حقیقت تھے جس نے بے رحم تابڑ توڑ ہم دونوں کا حریفانہ روپ ایک دم آشکار کر دیا تھا

یہ نعرے پاکستانی فوجوں کی پسپائی کے بعد پاکستانی علاقے میں پاکستان کے خلاف بلند کئے جا رہے تھے اور پاکستان کے سابقہ سنہری نگار رہے تھے۔

یہ نعرے اس کے لئے امرت اور میرے لئے زہر تھے۔

یہ نعرے سات ماہ کی اصولی کشتوں کے بعد اس کی جیت اور میری ہار کا اعلان تھے۔

ماتحت ابھر رہا تھا اور افسر ڈوب رہا تھا۔

اس کا وطن نمودار ہو رہا تھا اور میرا وطن دور سرک رہا تھا۔

ایک ہی قسم کے نعروں کے دو متضاد اثرات سخت تکلیف دہ تھے۔ حفظ مراتب چور چور ہو گیا، وضعداری تار تار ہو گئی، مروت شرمانے لگی اور نظروں میں اُٹھنے کی سکت نہ رہی۔ تھوڑی دیر تو ہم اس عجیب کی پر ہول گرفت میں بیٹھے رہے۔ پھر میں نے ہمت کر کے ٹیلیویژن کی سوئی گھما ڈالی۔

ڈھاکہ ریڈیو سے اعلان ہو رہا تھا کہ دو بجے غیر معینہ عرصے کے لئے کرفیو لگ جائے گا۔

ہم دونوں نے ایک ساتھ گھڑیاں دیکھیں —— ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔

"اوہ!" وہ گھبرا کر بولا "میری گاڑی تو اڑھائی بجے آئے گی!"

"گھبراؤ نہیں میرے پاس گاڑی ہے۔"

وہ بازار بھی جانا چاہتا تھا تاکہ کچھ چیزیں خرید سکے۔

ہم دونوں بازار پہنچے تو ایک بھگدڑ سی مچی تھی۔ لوگ بھاگم بھاگ گھروں کو جا رہے تھے۔ دکانداروں کے پاس گاہکوں کا ہجوم تھا کیونکہ لوگ کرفیو کے دوران کے لئے خریداری کرنا چاہتے تھے۔ اس کے باوجود دکاندار آہستہ آہستہ دکانیں بڑھا رہے تھے۔

وہ ایک چنچل دوپہر تھی مگر مجھے ہر چہرا اداس لگتی تھی۔ شاید یہ میری ذہنی حالت کا نتیجہ تھا۔ مگر وہ بھی خاموش تھا اور جب میں نے اسے گھر کے سامنے اتارا تو مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور قریباً بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا "سر پتہ نہیں اب کہاں اور کن حالات میں ملاقات ہو گی لیکن اگر —— کسی وقت میری ضرورت ہو —— تو بلا تکلف یاد فرمایئے گا۔"

اور پھر وہ تیزی سے مڑ کر گھر میں داخل ہو گیا۔

میں نے سوچا کہ ہم کو ابھی تک سکیورٹی کونسل سے امیدیں ہیں کہ شاید جنگ بندی ہو جائے، مگر اسے خوب اندازہ ہے کہ معاملہ ختم ہو چکا ہے اور اب ڈھاکہ میں پاکستان کوئی دم کا مہمان ہے۔ اس کے بعد اسے میری حیثیت کا بھی اندازہ ہے اور اپنی کا بھی

میں جب گورنمنٹ ہاؤس میں داخل ہو رہا تھا تو کرفیو شروع ہو چکا تھا۔

رات ڈیڑھ بجے پتہ چلا کہ ہندوستانی فوجیں ڈھاکہ سے چھ میل دور ہیں اور ان کے ساتھ مکتی باہنی کے بیس ہزار رضاکار بھی شامل ہیں۔ اسی وقت اسلام آباد اور کراچی سے رابطہ قائم ہوا اور فیصلہ کیا گیا کہ کل گورنمنٹ ہاؤس خالی کر دیا جائے اور سب لوگ ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل میں ریڈ کراس کی پناہ میں منتقل ہو جائیں۔

اگلے دن صبح ہی صبح پتہ چلا کہ روس نے سکیورٹی کونسل میں جنگ بندی کا ریزولیوشن ویٹو (VETO) کر دیا ہے۔

اب ڈھاکہ کی جنگ ناگزیر تھی اور کسی وقت بھی شروع ہو سکتی تھی، بلکہ شہر پر ایک دو ہوائی حملے تو بھی ہو چکے تھے۔ حالانکہ اس سے پہلے ائیرپورٹ اور انڈسٹریل ایریا پر ہوتے رہے تھے۔

ہم اپنا بچا کھچا سامان باندھ رہے تھے۔

مجھے کسی نے کہا کہ میرا فون آیا ہے۔

"ہیلو"

وہی نوجوان افسر بول رہا تھا۔

"سر، مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ ہوٹل میں جا رہے ہیں؟"

"ہاں یہی فیصلہ ہوا ہے۔"

"سر، یہ بہت اچھا فیصلہ ہے —— میں نے یاد دلانا تھا کہ اگر کوئی بھی خطرہ ہو تو مجھے نہ بھولیے گا"

یہ میرا حریف بول رہا تھا جو اب جنگ جیت چکا تھا۔

میرے بار شکست تھی میرے اور ریکٹ تھی۔ میرے اور موت کے سائے تھے۔ ایسے میں ہمدردی کے دو بول اتنے اجنبی لگے کہ اندیشے چیخے۔

ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

مگر اندیشے خود ہی شرمندہ ہو گئے اور پگھل کر گہرے تاریک ڈوب گئے جو اس کی ہمدردی نے پیدا کیا تھا۔ فون بند کرتے ہوئے میں نے سوچا کہ دو نسلوں کی نحبت مر گئی مگر انسانیت بچ گئی۔ شاید یہی انسانیت صبح کے بھولے ہوئے کو شام تک گھر واپس لے آئے۔

مگر ہوائی حملے کے سائرن نے چیخ کر پوچھا کون سا گھر؟ —— گھر تو ٹوٹ رہا تھا۔ کون سا گھر آگ سا رہی ہے۔ ایسا گھر جسے انہوں نے برق سے روشن کیا ہے —— خدا خیر کرے

گو فقط دو دن کی ملاقات کے بعد یہ ہمارا آخری رابطہ تھا۔ اس کے بعد وہ نئے ملک کے رونق میں گم ہو گیا اور میں زنداں کی گمنامی میں کھو گیا۔ ایک دفتر کے شریک کار دو مختلف ملکوں کی بین الاقوامی سرحد کی اوٹ میں ایک دوسرے سے اوجھل ہو گئے۔

زنداں میں خیال کی بیاباں نوردی عروج پر ہوتی تو ماضی کے گوشوں میں دور تک بھٹکتی پھر جاتی۔ کسی گوشے میں اس نوجوان افسر کا چہرہ ابھرا تو میں سوچتا کہ اسی طرح کی بھٹکی ہوئی نئی نسل صرف مشرقی پاکستان میں ہی نہیں ہے بلکہ اس کی کافی بڑی تعداد مغربی پاکستان میں بھی ہے۔ مختلف صوبوں میں ملازمت کے

دوران کئی جگہ میری ان سے مڈبھیڑ ہوئی تھی مگر اس وقت میں اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ اس کے بکھے ہوئے قدم انہیں ہم سے کتنی دور لے جا سکتے ہیں۔ اس میں دکھ چکا تھا کہ بابائی تلخیاں چیخ کر مار حسگی بن جاتی ہیں اور دہنی فاصلوں کے درمیاں رفتہ رفتہ ملکی سرحدیں اُگ آتی ہیں۔ وہ نوجوان اس بنگلہ دیش کے طلوع کی کہانی کا عنوان تھا اور مجھے ایسے ہی عنوانات مغربی پاکستان کے در و دیوار پر چپکے نظر آتے تو میں بے کل ہو کر سوچنے لگتا کہ کیا یہی کہانی وہاں بھی دہرائی جائے گی۔

اس کہانی کا ماحصل یہ تھا کہ نظریاتی فلسفہ بار بار نظریئے سے انحراف کرنا ایسا جرم ہے جو پوری نسل کے زمرے میں آتا ہے

بقیہ : انگریزی درس گاہوں کا زہر

یہ دور دیا جائے اور اسلامی تاریخ کو خصوصی مضموں کی حیثیت سے پڑھایا جائے۔ تو رہا بات ہماری افواج کے حق میں بہتر تاسب ہوگی سمجھ میں نہیں آتا کہ افواج یا سول کے لیے انگریزی میڈیم اور مغربی تہذیب کی کیا ضرورت ہے۔ ایک اُستاد نے بتایا طلبہ کے لیے GOOD MORNING کی جگہ السلام علیکم کہنے کی اجازت پر کوئی ڈیڑھ برس تک کوشش کرنی پڑی حکام کو اعتراض تھا کہ دوج میں GOOD MORNING اور GOOD EVENING کہتے ہیں، اس لیے سکول میں بھی بچوں کو یہی الفاظ استعمال کرنے چاہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں بھی ایک مخصوص طبقہ دوسروں کی نسبت فائدے میں رہتا ہے صرف قابلیت کی بناء پر بچوں کا انتخاب کر کے انہیں بلامعاوضہ تعلیم دی جائے، تو ہر یا متوسط اور غریب طبقہ کے بچے بھی ان اداروں میں تعلیم حاصل کر سکیں گے

غیر سرکاری پبلک سکولوں میں مغربی تہذیب، بے تحاشا اخراجات اور صرف ایک مخصوص طبقے کے بچوں کا داخلہ غور طلب مسائل ہیں

سب سے آخر میں ان عام انگلش میڈیم سکولوں کو لیجیے جو آپ کو ہر محلّے میں نظر آتے ہیں۔ اُردو میڈیم سکولوں میں فیس سرکاری شرح کے مطابق رکھی پڑتی ہیں، لیکن انگلش میڈیم سکول

کو تعلیم کے نزدیک خاص قسم کے ادارے SPECIAL TYPE OF INSTITUTION کی حیثیت رکھتے ہیں انہیں حسب خواہش فیس لینے کی آزادی ہے۔ دوسری طرف عوام بھی انگریزی میڈیم سکولوں میں بچوں کو پڑھانا پسند کرتے ہیں۔ ان حالات کے پیش نظر کاروباری لوگوں نے جا بجا نام نہاد انگریزی سکول کھول رکھے ہیں۔ اس قسم کے دس سکولوں کا جائزہ لینے سے پتا چلا کہ اکیاسی اُستادوں میں سے صرف پانچ تربیت یافتہ ہیں۔ فیسوں کی شرح دس روپے سے پچیس روپے تک ہے۔ یہ تمام سکول کنڈر گارٹن ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، حالانکہ ان میں سے اکثر منتظمین کو کنڈر گارٹن طریقۂ تعلیم کے معنی معلوم نہیں

عام سکولوں کا معیار کیونکر بلند کیا جائے؟ انگریزی سکولوں کو کس طرح ملک و قوم کے لیے مفید بنایا جائے؟ وہ کون سے طریقے ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر کم سے کم خرچ میں زیادہ سے زیادہ معیاری سکول کھولے جا سکتے ہیں؟ مثالی سکول کھولنے میں درد دل رکھنے والوں نے کیا کوششیں کیں اور وہ کہاں تک کامیاب رہے؟ اس موضوع پر ہم تحریک کا رہا ہر لیڈر تعلیم سے رابطہ پیدا کر رہے ہیں، آئندہ کسی نسبت میں ہم اس موضوع پر اپنے قارئین کے لیے جامع، مستند اور مفید معلومات پیش کریں گے

موجودہ نظامِ تعلیم "آئیڈیل" دلوانے میں کس قدر کامیاب ؟

معاونت ایک طرف رہی یہ تو "سیلپر" بھی نہیں (راحہ منور۔ تعلیم و تحقیق)

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا (سلیم حیتانی۔ مدوالوحی)

میں اس نظامِ تعلیم سے مطمئن نہیں لہٰذا "آئیڈیل" کیسے؟ (نشاط بیگ فارمیسی)

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا (رئیس شاہد۔ سوشیالوجی)

ناممکن عدم اطمینان بحث ہو سکے سب "حواب گر" ہے (صالحہ سلیمان صحافت)

گلا تو اہل مدرسہ نے کاٹ دیا اور آئیڈیل ڈگریوں نے (طارق رحمٰن ارضیات)

اگر اس سے مراد سیں ہیں تو جواب نفی (عتیق السار۔ باٹنی)

آئیڈیل تو کجا "نا 100" بنا دے جوش قسمتی (اشفاق مہر فارمیسی)

ہیں جی کیا کہا "ضرور کر کرتا ہے (الیاس احمد۔ زوالوجی)

آئیڈیل کے لیے تو نہیں البتہ دال روٹی چلانے میں مدد دے ہی دیتا ہے۔ (شگفتہ ملک۔ فارمیسی)

ہرگز نا کام ہے (سلمیٰ رشید۔ زوالوجی)

بلکہ چھینتا ہے (نوازکھوکھر۔ سوشل ورک)

قطعاً نہیں (ظہیر بابر۔ کیمیکل ٹیک)

ایک کریلا دوسرا نیم چڑھا (ذوالفقار چیمہ۔ لاء کالج)

یہاں تعلیم اور آئیڈیل کا چینل خراب ہے (مہر عبدالغفار۔ عربی)

آئیڈیل بھی تو عوامی رہنما ہے جس کا اعتبار نہیں (مسعود احمد۔ لاء کالج)

کیوں دل جلانے کی بات کرتے ہو (یاسمین حمید فلسفہ)

خوشی سے مر جاتے اگر اعتبار ہوتا (حمزہ۔ عربی)

آئیڈیل کانچ جیسا نازک۔ نظام پتھر جیسا سخت (راجہ شفقت۔ فلسفہ)

یہ خود حاصل کیا جاتا ہے مانگا نہیں جاتا (مقصود احمد۔ ہیلی کالج)

جاب! آئیڈیل عقیدے کی پختگی کے ذریعے ملتا ہے (ماجد عرفان۔ ہیلی کالج)

ہم کہاں کھڑے ہیں | **میجر سعید ٹوانہ**

عسکری تربیت گاہیں

کامیاب جنگی طاقت

نیا فوجی نصاب بنانے سے پہلے تو اس میں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ آیا ہمیں "جنگی طاقت" درکار ہے یا "کامیاب جنگی طاقت"۔ میں قطر کی فوج میں تھا تو ایک دن کمانڈر نے پوچھا آپ کا اس فوج کے بارے میں کیا خیال ہے۔ میں نے جواب دیا میں اس کو فوج نہیں کہوں گا۔ یہ تو صرف پولیس کی مدد کرنے کا فوجی دستہ ہے۔ وہ پریشان ہو گئے۔ تو میں نے کہا کہ آپ ایسے ہمسایوں سے جنگ لڑ سکتے ہیں سعودی عرب، ایران وغیرہ۔ آپ کے ہمسائے ہیں کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ ان سے لڑ سکتے ہیں؟ اگر نہیں تو یہ "جنگی طاقت" نہیں ہے۔ اب یہ دیکھیے کہ ۱۹۷۱ء میں پاکستانی فوج کے پاس "جنگی طاقت" موجود تھی۔ مگر "کامیاب جنگی طاقت" نہ تھی۔ ۱۹۶۵ء میں گو ہندوستان کی "جنگی طاقت" ہم سے کئی گنا تھی، مگر وہ "کامیاب جنگی طاقت" ثابت نہ ہوئی۔ ویت نام میں امریکہ کے پاس "جنگی طاقت" تھی، مگر وہ "کامیاب جنگی طاقت" ثابت نہ ہوئی۔ برخلاف اس کے ویت نام کے پاس "جنگی طاقت" (امریکہ کے معیار کی) نہ تھی، مگر وہ "کامیاب جنگی طاقت" ثابت ہوئی۔ ہٹلر کے پاس "جنگی طاقت" تھی مگر وہ "کامیاب جنگی طاقت" ثابت نہ ہوئی۔ عرب اسرائیل جنگوں میں ہمیشہ عربوں کے پاس زیادہ "جنگی طاقت" تھی مگر وہ "کامیاب جنگی طاقت" ثابت نہ ہوئی۔ ماؤزے تنگ کے پاس "جنگی طاقت" (مقابلتاً چیانگ کائی شیک) نہ تھی اگرچہ کم تھا وہ "کامیاب جنگی طاقت" تھی۔ ہمیں "جنگی طاقت" درکار نہیں ہے، بس صرف "کامیاب جنگی طاقت" درکار ہے۔

اس لیے کسی فوج کے پاس اسلحہ ہو اور اسلحہ کی سکھلائی ہو، تو وہ فوج نہیں بن جاتی جب تک کہ اس کی "جنگی طاقت" متحارب فریق سے مقابلہ میں کامیاب نہ ہو جائے۔ ہر ملک کو اپنے ہمسایوں کے حساب سے اپنی جنگی طاقت استوار کرنی پڑتی ہے اور اگر وہ ملک ہمسایہ کے مقابلہ میں "جنگی طاقت" میدان میں نہیں لا سکتا تو اسے معاہدات اور دوسرے ڈپلومیسی کے سہاروں کی ضرورت پڑتی ہے۔

پاکستان کے دشمن ممالک

پاکستان کے ہمسایہ ممالک تین قسم کے ہیں۔ کمیونسٹ ہمسایہ ممالک یعنی چین اور روس۔ اسلامی ہمسایہ ممالک یعنی افغانستان اور ایران اور ہندو ہمسایہ ملک ہندوستان۔

فرض کیجیے سرکاری سطح پر اگر پاکستان میں کمیونزم ہو، تو اس کا ٹکراؤ تین طرح کا ہو گا۔ اولاً چین کا حامی بن کر روس کے خلاف یا روس کا اتحادی بن کر چین کے خلاف۔ دوم ہندوستان اگر کمیونسٹ ہو رہا ہے، تو اس کے ساتھ دوستی ورنہ معاہدہ امن۔ سوم مسلم ممالک سے ٹکراؤ بالخصوص ایران کے ساتھ۔ یہ تو وہ صورت ہے جب پاکستان خدانخواستہ کمیونسٹ ہو جائے۔

اگر پاکستان اسلامی مملکت رہتا ہے، تو اس کے ٹکراؤ دو قسم کے ہیں۔ اولاً ہندوستان کے ساتھ کہ وہ ہندو کی ریاست ہے۔ دوم کمیونسٹ ممالک کے ساتھ۔ اگر افغانستان اور ایران کا اسلامی تشخص رہتا ہے، تو ان کی طرف سے خطرہ نہیں۔ اگر تشخص کسی سپر پاور کا ہو رہا ہے، تو اس سپر پاور سے بالواسطہ ٹکراؤ ہمارا مسئلہ درپیش ہو گا ______ اس لیے ہم فرض کرتے ہیں کہ پاکستان کو اسلامی ریاست رہنا ہے اور ہمارا فوجی نصاب "ایک اسلامی ریاست کے ٹکراؤ" کی بنیاد پر مرتب کرنا ہو گا اور افواج کی جنگی کارکردگی اسلامی نصب العین کی رو سے مرتب کرنا ہو گی، یعنی ہندوستان اور کمیونسٹ ممالک کے خلاف کامیابی جنگی طاقت کے اصول پر افواج استوار کرنی ہو گی۔

جدید جنگی سٹائل اور پاکستان

اس کے بعد ایک اور مسئلہ سامنے آتا ہے وہ ہے جنگی سٹائل کا مسئلہ۔ فی زمانہ ہر فوج کے پاس ٹینک ہیں۔ ہوائی جہاز ہیں۔ بکتر بند گاڑیاں ہیں۔ مشین گنیں ہیں۔ راکٹ ہیں۔ ساتھ ہی توپخانہ

جب کہ ہر ایک فوج کا جنگی سٹائل مختلف ہے۔ مثلاً جرمن جنگی سٹائل، روسی جنگی سٹائل، اسرائیلی جنگی سٹائل، امریکی جنگی سٹائل، چینی جنگی سٹائل وغیرہ وغیرہ۔ مثلاً کے جرمنی کا جنگی سٹائل ایک مختصر سی فوج کا تھا جو آناً فاناً اپنا عسکری وزن بدل کر دیتے سے تعداد میں زیادہ اور کمزور دشمن پر حاوی آ جاتی تھی۔ اس سٹائل کی رو سے اس کا ٹینک ہلکا ہوتا تھا اور دور مار توپ کی جائے بہت چھوٹی توپ ہوتی تھی۔ وہ ٹینک زیادہ سرعت رفتار تھا اور اس کی CRUISING RANGE دور مار صلاحیت بہت زیادہ تھی۔ اس ٹینک کے ساتھ مختصر سی فوج ہوتی تھی جو ٹینک کی رفتار کے ساتھ چل سکتی تھی۔ اس فوج کی جو ٹینک کے ارد گرد استوار تھی عسکری صلاحیت اس کے وزن گھٹانے بڑھانے کی صلاحیت کی راہ میں مضمر تھی۔ اس فوج وسیع محاذ پر دشمن کو الجھا کر لاک کر دیتی تھی۔ پھر اپنا سارا عسکری وزن کسی ایک جگہ اچانک بڑھا کر حملہ کر کے دشمن کی دفاعی لائن میں شگاف ڈال دیتی ہے اور اس شگاف سے پوری فوج نکل کر دشمن کے عقب گھستے عقب۔ ہیڈ کوارٹر، سپلائی لائن پر حملہ کرتی تھی جس سے بھاری نقصان اور سست الوجود دشمن بے بس ہو کر ہتھیار ڈال دیتا تھا۔ اگر ہمیں مکمل میکانکی صلاحیت جیسی جرمنی کی تھی بصورت سندھ کے ریگستان میں میسر آ جائے۔ تو اس فوج کی نگرانی اور معاونت کے لیے اچھی اور بھرپور وار کی صلاحیت رکھنے والی ہوائی فوج درکار ہوگی اور ایسی صلاحیت کی مدد سے ہم سندھ کا صرف دفاع کر سکیں گے، بلکہ سندھ کے محاذ سے نکل کر دشمن کے عقب، گہرے عقب اور علیک ریعنی پنجاب کے محاذ کے عقب میں ہم وہی کارروائیوں کی صلاحیت رکھیں گے جیسا کہ سندھ کے محاذ پر ہمارا جنگی سٹائل جرمن ہونا چاہیے جو اس بات کا متقاضی ہے کہ اس محاذ کی فوج ٹینک کے ارد گرد تشکیل کی جائے اور اس ٹینک کے ہمراہ مختصر سی انفنٹری ہو اور اس کی فوج کی نگرانی اور حفاظت کے لیے ایک خصوصی ہوائی فوج جو ریگستان میں دشمن کے ٹینک ور و یب مار اڑانے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ جیسا کہ سندھ کے محاذ میں فوج کی ترتیب پنجاب اور کشمیر سے مختلف ہونی چاہیے اسلحہ مختلف ہوگا، جنگی منصوبے مختلف ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔

دوسری جنگِ عظیم کے روس کا جنگی سٹائل پیدل فوج کے ارد گرد تشکیل دیا گیا تھا۔ گو ۱۹۴۳ء میں روسی افواج تدریجاً ٹینک کے ارد گرد استوار ہو گئی تھیں، اس میں پیدل انفنٹری کو میدانِ جنگ میں تقویت دینے کے لیے ٹینک، توپخانہ، انجینئرز، ہوائی فوج وغیرہ تھی۔ دفاع میں روسی فوج کی دو طرح کی تھی۔ روسی محاذ میں سردیوں میں چونکہ دلدل وغیرہ نہ ہوتی تھی اور جرمن ٹینک افواج وسیع محاذ متحرک صلاحیت حاصل کر لیتی تھیں، اس لیے انہیں روکنے کے لیے تہہ در تہہ دفاعی لائنیں بنانے کا کام شروع ہوتا تھا اور جس میں پوری روسی قوم مرد، عورتیں اور بچے سب کھدائی کرتے تھے اور روسی افواج ان دفاعی پلاسٹیوں کی آڑ میں ٹینکوں کی متحرک صلاحیت کو کمزور (صرف سامنے سے حملہ آور) کر کے قلعہ بند فوج کا دفاعی ردِ عمل اختیار کرتی تھیں یعنی دشمن کے حملہ کو روکا، تھکایا، پھر اس پر جوابی حملہ شروع کر دیا۔ روس میں بہار، خزاں اور گرمیوں میں دلدل کی وجہ سے ٹینک کی متحرک صلاحیت ختم ہو جاتی تھی۔ اس لیے روسی انفنٹری توپخانہ کی مدد سے دشمن کے ٹینکوں کو روک سکتی تھی اس لیے بات کو جرمن مشینیں کہ روسی انفنٹری کے عقب میں گھس جاتے اور جنہیں ٹینکوں کی مدد سے بھگایا جاتا۔

اب صاف ظاہر ہے کہ ہم سندھ کے ریگستانوں میں روسی سٹائل نہیں اپنا سکتے۔ ہندوستان نے اپریل، مئی ۱۹۶۵ء میں رن کچھ کے ویرانوں میں ایسی پیدل فوج کو ایسی دفاعی لائنوں کے بغیر پوزیشنل دفاع میں لگا دیا، نتیجتاً ہمارے ٹینک افواج کے عسکری وزن کو بدل بدل کر حملے کیے اور ان کے دفاع کو روند دیا۔ بعینہٖ ۱۹۶۷ء کی جنگ میں اسرائیلی مختصر فوج جو جرمن سٹائل پر استوار کی گئی تھی۔ نے مصری انفنٹری کے پوزیشنل دفاع کو عسکری وزن بدل بدل کر الٹا دیا۔ گو مصر نے ایک مثالی فوج کو چار جگہ پوزیشن میں لگایا تھا، لو اسرائیلیوں نے ایک ٹینک بریگیڈ سے پے در پے چار حملوں میں اس مثالی کو روند دیا یعنی ۱/۳ کی عسکری کثافت (بلکہ کمس کمس ۱/۸۰ کی عسکری کثافت) سے دشمن پر حاوی ہو گئے۔ البتہ پنجاب کے محاذ پر پیدل فوج کو تقویت دینے کے دفاعی لائنیں بنا کر دفاع کرنا ہوگا اور اس طرح اس پیدل فوج کو ہوائی جہاز، ٹینک، توپخانہ، مارٹر وغیرہ کی تقویت دے سکتے ہیں۔

اس لیے ہمارا مسئلہ پنجاب میں یہ ہوگا کہ نہروں، دریاؤں کو صحیح طریقہ سے دفاعی لائن میں تبدیل کیا جائے اور ان کی آڑ مرتب کی جائے۔ پھر وسیع محاذ پر آناً فاناً اپنی عسکری کثافت بڑھا کے دشمن کے حملوں کو پیچھے کی صلاحیت حاصل کی جائے۔ ظاہر ہے کہ یہاں کی سپاہ کی ٹریننگ، اسلحہ اور انصاب بلحاظ سندھ مختلف ہوگا۔ یہاں دفاع اہم ہے جب کہ سندھ میں حملہ یا جوابی حملہ یہاں دفاع اور اس کی بیتی سندھ کی تربیت ہوگی جب کہ سندھ میں حملہ اور جوابی حملہ اور حملہ در حملہ کی جنگی ٹریننگ حاصل کرنی ہوگی۔ یہاں (یعنی پنجاب میں) قلیل علاقہ دے کر جوابی حملہ کی پوزیشن حاصل کرنی ہوگی جب کہ ریگستان کے محاذ پر کثیر علاقہ دے کر جوابی حملہ کی پوزیشن حاصل کرنی ہوگی۔ اس فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے سندھ، پنجاب، آزاد کشمیر وغیرہ میں مختلف جنگی سٹائل اپنانے ہوں گے۔

آزاد کشمیر کا جنگی سٹائل سنائپر وار کا ہونا چاہیے تاکہ وسیع محاذ پر پھیلے ہوئے سنائپرز (SNIPERS) دشمن کو الجھائے رکھیں، اگر دشمن بڑھے، تو یہ پیچھے ہٹ جائیں۔ اگر دشمن منتشر ہو کر بڑھے تو ہم اپنی قوت مرکوز کر کے اپنی فیصلہ کن طاقت کسی ایک مقام پر مرکوز کر کے دشمن کو دو تین ٹکڑوں سے کاٹ دیں اور اس کے گہرے عقب میں وہی کارروائی کا آغاز ہو۔ اگر دشمن مرکوز ہو کر بڑھے تو اس کو کسی جگہ لا کر شکست دی جائے۔ دوسرا اس کے علاوہ سے گزر کر عقب میں جا کر اس کی سپلائی لائن توڑ کر دفاع اختیار کیا جائے تاکہ وہ مجبوراً پیچھے ہٹے۔ اور اس طرح ہزیمت سے دوچار ہو جائے۔ پہاڑی علاقوں میں افواج کی سپلائی مشکل کام ہے، اس لیے خود ہمیں اپنی فوج مختصر رکھنی چاہیے اور دشمن کی کثیر فوج کی سپلائی لائن توڑ کر اس کو ماہیِ بے آب کی طرح تڑپنے دیا جائے۔ پھر ہم اگر کشمیر میں پوری قوت جھونک دیں گے تو نہ کشمیر لے سکیں گے نہ پاکستان بچا سکیں گے بالخصوص پنجاب نہیں بچا سکیں گے۔ کشمیر لینے کا راستہ یہ ہے کہ جنگ میں دشمن کی پوری افواج کو فیصلہ کن شکست دی جائے۔ کشمیر پر ہی صرف چڑھائی نہ کی جائے۔

نعرۂ تکبیر بمقابلہ نعرۂ تکبیر

اب ہمارا اسلامی تشخص ہے تو افغانستان کو ہم سے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا۔ مگر بالفرض اگر افغانستان روس کی شہ پر ہم سے لڑتا ہے تو اس پاکستانی فوج کا جنگی سٹائل کیا ہوگا؟ یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ افغانستان کی مشرقی علاقہ کی پٹی ہی آباد ہے، باقی مغربی ۹۰ فیصد علاقہ غیر آباد ہے اور افغانستان کی ۹۰ فیصد فوج مشرقی پٹی میں ہے اور اس مشرقی پٹی (ERN BELT)

سٹریٹجی کی رو سے اگر کسی ملک کی فوج کو ختم کرنا ہو تو یہ اندازہ لگایئے کہ بھرپور جنگ وہ کتنے گھنٹے کے لیے لڑ سکتے ہیں۔ پس اتنے گھنٹے لڑو پھر جب اس فوج کو ضعف آ جائے تو تازہ دم فوج لا کر اس کو ختم کر دو۔ آج دنیا کی تمام فوجیں (جو جدید اسلحہ نہیں رکھتیں اور اسلحہ کے لحاظ سے خود کفیل نہیں) سٹریٹجی آف ایکسہاسشن سے ختم کی جا سکتی ہیں۔ اس میں بہادری اور صلاحیت کام نہیں دیتی۔ ہمیں بھی اپنی فوج کو اس طرح تیار کرنا ہے کہ اگر دشمن ۱ سال بھی لڑے، تو ہم لڑتے رہیں۔ یہ بات تین چیزوں کی متقاضی ہے:

- دشمن سے شدید نفرت کا جذبہ تاکہ مزاحمت مسلسل اور دیرپا ہو۔
- جدید اسلحہ SOPHISTICATED EQUIPMENT سے لیس۔
- ہتھیاروں میں خود کفیل صلاحیت یا دشمن کے ہتھیاروں سے اس کے خلاف جنگ در جنگ کی صلاحیت۔ ہمیں افواج کی ٹریننگ میں ان عناصر کا خیال رکھنا ہوگا۔

اب میں افواج کی پریکٹیکل اصلاحات کی طرف آتا ہوں۔ ان اصلاحات کے بعد ہی افواج نئے طور طریقوں سے ترتیب پا سکتی ہیں۔

یک شخصی کمان کی بحالی

جنگ کا سب سے پہلا سبق یہ ہے کہ فوج یک شخصی کمان کے اصول پر لڑائی جائے اس کو ہم انگریزی میں (ONE-MAN-COMMAND) کہتے ہیں۔ اس ایک مثال سے میں اپنا مدعا پیش کرتا ہوں۔ پاکستان قومی اتحاد کی حالیہ تحریک میں میں نے دیکھا کہ مال روڈ پر تقریباً ۵ سپاہیوں کا ایک دستہ سڑک پر جا رہا تھا اور تقریباً ۳ ہزار لوگ ان پر پتھراؤ کر رہے تھے مگر ۳ ہزار میں ایک قیادت نہ تھی اور وہ ایک شخص کے حکم پر عمل نہ کر رہے تھے نتیجہ یہ تھا کہ ۵ سپاہیوں نے ہلہ بول بول کر ۳ ہزار کو منتشر کر دیا۔ وہ ۵ سپاہی ایک انسپکٹر پولیس کے احکامات کو من و عن پورا کر رہے تھے نتیجہ یہ نکلا کہ فوج وہ ہے جو ایک شخص کے حکم پر من و عن کام کرے انگریزی میں ہم کہیں گے۔

THERE IS NOT TO REASON WHY
THERE IS BUT TO DO AND DIE

(فوج کا ڈسپلن یہ ہے کہ پوری فوج ایک شخص کے حکم پر من و عن اور بھرپور جذبے سے حکم بجا لائے ڈسپلن وہ سیمنٹ ہے جو فوج کی عمارت کو کھڑا کرتا ہے بغیر ڈسپلن کے فوج ایک گھروندا ہے رومن لیجن قدیم روم کی ڈویژن کا نام تھا جب یہ ڈویژن دشمن سے لڑتی تھی، تو ایک شخص کے حکم پر عمل کرتی تھی اور کشتوں کے پشتے لگا دیتی تھی۔

مسٹر بھٹو نے اقتدار ملتے ہی فوج میں یک شخصی کمان کا اصول ختم کر دیا اور کمانڈر انچیف کا عہدہ ختم کر دیا اور تینوں سروسز کو آزاد کر دیا نتیجہ یہ تھا کہ تینوں سروسز بحث و تکرار میں الجھ کر رہ گئیں اور بحث گفتگو کر کے مسلح افواج کی تینوں سروسز کی جوائنٹ چیفس کے اجلاس دیکھ کر محظوظ ہوتے رہے۔ اس فوج میں کمانڈر انچیف کا عہدہ دوبارہ بحال کیا جانا ضروری ہے یک شخصی کمان کا اصول یہ ہے کہ فتح کی تمام ذمہ داری ایک شخص پر ہو لہٰذا اس کے سر شکست کی تمام ذمہ داری بھی ڈالی جائے" جب ایک شخص پر فتح کی تمام ذمہ داری ہوگی اور شکست کی صورت میں وہی مجرم گردانا جائے گا، تو کمان صحیح ہو جائے گی۔ کمان کی اصلاح کے سلسلے میں اور بھی تجاویز ہیں مگر وہ کسی اور وقت پیش کروں گا۔ اس وقت یہ دیکھنا ہے کہ پوری فوج کی ترتیب اس انداز کی ہو کہ وہ من و عن کوشش کے ساتھ اور وفاداری کے ساتھ ایک شخص کے احکامات کو مانے اور حکم ملنے پر آگ میں کود پڑیں۔ فوج کی مادی اور کمی کوئی شے نہیں اصل چیز تو ڈسپلن ہے۔ ایک چھوٹی فوج جس میں یہ ڈسپلن ہوگا وہ بڑی سے بڑی فوج پر حاوی ہوگا اس لیے ٹریننگ سکولوں میں اس ڈسپلن کی داغ بیل اچھی عمدہ طریقے سے رکھنا ہوگی کہ سپاہ احکامات بجا لانے کی مشین بن جائیں۔ اگر آدمی کی ایک سوچ ہوگی، تو وہ فوجی دستہ ہوگا اگر اس فوجی دستے کی ۱۰ سوچیں ہوں گی، تو وہ MOB ہوگا۔ کسی اچھی فوج کا ڈسپلن ہی اس کی قابلیت کا اصل معیار ہے۔ الحمد للہ کہ افواج پاکستان میں یہ معیار اونچے درجے کا ہے۔ مگر اس کو مزید بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

مشرقی پاکستان ناکام حکمت عملی

دوسری بات یہ ہے کہ ہم جنگ میں تو افواج کو مرکوز کرتے ہیں اور مارشل لگا ہو تو افواج کو منتشر کر دیتے ہیں مارشل لاء میں سیکٹر کمانڈر ہوتا ہے اور اس کی علیحدہ فوج ہوتی ہے اور پورے ملک میں فوج بکھری ہوتی ہے۔ اب جنگ مارشل لاء میں اگر جنگ لڑے سے پہلے ہماری فوج پورے ملک کے علاقے میں بکھری ہوگی اور ہر فوج دوسری سے علیحدہ علیحدہ ہوگی اور ہر فوج اپنے سیکٹر کمانڈر کے ماتحت ہوگی، تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ کمانڈر انچیف کی جنگ نہیں ہوگی بلکہ سیکٹر کمانڈر کی جنگ ہوگی جنرل نیازی صاحب نے مشرقی پاکستان کی جنگ اسی طرح لڑی کہ مشرق کا محاذ ایک ڈویژن کے سپرد کر دیا۔ شمال دوسری ڈویژن کے سپرد کر دیا اور مغربی محاذ تیسرے ڈویژن کمانڈر کے سپرد کر دیا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ جنگ نیازی صاحب کی نہ رہی کیونکہ انہوں نے تو اپنی افواج کو سیکٹر کمانڈروں کو تحفتاً عطا کر دیا تھا وہ تو ٹیلیفون ایکسچینج جا کر بیٹھ گئے۔ جنرل الف سے پوچھا، ساتھی کیا خیال ہے حالات کیا ہیں" جنرل ب سے یہی پوچھا۔ جنرل ج سے یہی پوچھا اور سب اچھا سن کر آرام سے لیٹ گئے نیازی صاحب نے تو دفاعی ذمہ داری اپنے ماتحت کے سپرد کر دی تھی دفاعی جنگ کی ذمہ داری کبھی بھی ماتحتوں کے سپرد نہیں کی جاتی یہ ہمیشہ کمانڈر انچیف کی جنگ ہوتی ہے اس میں کمانڈر انچیف دشمن کا پلان وقت سے پہلے دیکھتا ہے اور جنگ سے پہلے دفاعی ردعمل اور ردِ یلغار کا طریقہ جمع کر لیتا ہے پھر پوری فوج کو یکجا کر کے تیزی سے حرکت دے کر دفاعی ردعمل کرتا ہے دفاع تو ردِ یلغار کا دوسرا نام ہے۔ دشمن یلغار کرتا ہے یعنی (OFFENSIVE) لیتا ہے اور دفاعی کمانڈر اس یلغار کو روک کر جوابی یلغار سے ٹھپ دیتا ہے اس کے لیے کبھی کبھی ابتدائی علاقہ دے کر جوابی یلغار کرنی پڑتی ہے کبھی سب سے زیادہ علاقہ دے کر اس لیے یہ دفاع تو کمانڈر انچیف کی جنگ ہوتی ہے اور جو کمانڈر انچیف یہ ذمہ داری اپنے ماتحت کو دے دے وہ (SECTORISATION) کے جرم کا مرتکب ہوتا ہے اور اس میں وہ فوج اپنی بھرپور قوت استعمال نہیں کر پاتی اور شکست کھا جاتی ہے۔

جنرل سانی صاحب اگر محاذوں سے افواج پیچھے ہٹا کر مرکوز کر لیتے اور اس مرکوز فوجی قوت سے دشمن کے ساتھ چند فیصلہ کن معرکوں میں اپنی بھرپور قوت استعمال کرے، تو دشمن کے گھیراؤ کی مہم توڑی بھی جا سکتی تھی دشمن کو ایک دوسرے سے منقطع بھی کیا جا سکتا تھا اور اس کے وسائل اس کے خلاف استعمال ہو سکتے تھے لیکن ECTORISATION سے اور افواج کو پورے سرحدی علاقے پر برابر برابر منقسم کر کے جنگی بے بصیرتی STRATEGIC IMMATURITY کا مظاہرہ ہوا۔

اعلیٰ عسکری اداروں میں جو کمانڈر تیار کیے جاتے ہیں انہیں تربیت کے دوران مندرجہ ذیل فوجی غلطیوں سے پرہیز سکھایا جانا ضروری ہے:

• جنگ میں افواج کو سیکٹروں میں منقسم نہیں کرنا

فوج کی تقسیم

THERE SHOULD BE NO EQUALITAXIANISM IN WAR

• افواج کی سرحدات پر مساوی مساوی تقسیم نہیں کرنا۔ افواج کو زکوٰۃ کی طرح سرحدوں پر بانٹ کر منتشر نہیں کرنا چاہیے، بلکہ مرکوز رکھ کر معرکے جاری رکھنے چاہییں۔ اعلیٰ جنگی بصیرت یہ ہے کہ اہم محاذ پر اہم فوجی کثافت مرکوز ہو۔ اگر دشمن حملہ کسی اور محاذ سے قوت سے کرے تو غیر اہم علاقوں سے اپنی افواج نکال نکال کر اہم محاذ پر بھیجی جائیں۔ آپ کو ایک مثال سے یہ سمجھاتا ہوں:
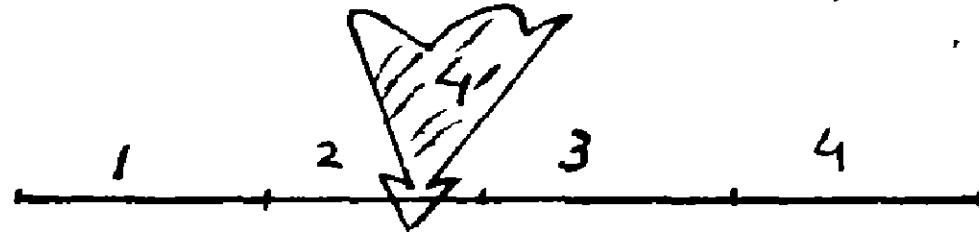
یہ چار عدد ڈویژن سرحد پر پھیلے ہوتے ہیں۔ دشمن اپنی ۴ ڈویژن سے ایک جگہ حملہ کرے، تو غالباً وہ ۱/۴ (۴/۱) کی نسبت سے عسکری وزن ڈال رہا ہے۔ ۴ ڈویژن اگر پوری ڈویژن سرحد پر حملہ کرے تو یہ ۱/۴ کی عسکری کثافت ہو گی۔ مگر اگر وہ چار ڈویژن ایک بریگیڈ یا ایک بٹالین کے علاقہ پر حملہ کریں تو یہ ۱/۱۲۰ (۴۰) کی عسکری کثافت ہو گی۔ حالانکہ دونوں افواج کی ڈویژن کی تعداد برابر ہے یعنی دونوں کے پاس ۴ عدد ڈویژن ہیں۔ اسرائیلیوں نے ۱۹۶۷ء میں مصری فوج کو ۱/۸۴ کی عسکری عددی کثافت سے روندا، لہٰذا فتح ان کی رہی۔ اب ایک اچھا دفاعی کمانڈر ۴ ڈویژن کے حملے کو روکنے کے لیے مندرجہ ذیل عسکری قوت پیدا کرے گا۔
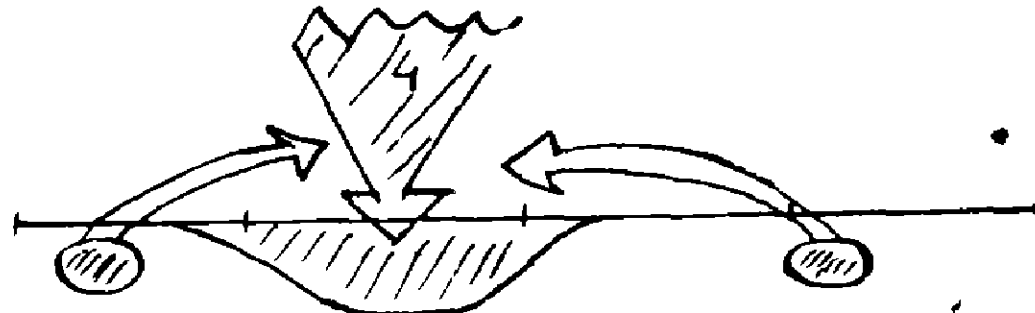
افواج وہی ہیں یعنی ۴ ڈویژن مگر ۴ ڈویژن کے حملے کو دو ڈویژن سے روکا اور دو عدد ڈویژن اس وقت جوابی حملے میں پھینکی جب دشمن تھک کر چور ہو گیا اور کم از کم ۱/۲ کی عسکری کثافت اہم رخ پر دفاع کے لیے مرکوز کی گئی۔

سبق یہ ہے کہ جنگ میں عسکری کثافت پیش بندی سے لگانا۔ دوران جنگ صحیح عسکری کثافت حملے کے رخ سے آنا۔ دشمن افواج کو تھکانے کے لیے قلیل افواج کا استعمال اور جوابی حملے کے لیے محفوظ فوج کے ہاتھ میں رکھنا یہ جرنیلی کا فن ہے اور اگر آپ کسی فوج کو علاقے پر پھیلا دیں گے، گویا وہ فوج جنگ کی بجائے مارشل لاء چلا رہی ہے، تو اس فوج کی شکست یقینی ہے۔ علاقہ کے لحاظ سے افواج کی فوجی مساوات "یہ کوئی جنگی بصیرت نہیں بلکہ فوجی بیماری ہے جو کسی بھی فوج کو ذلیل کر سکتی ہے۔"

• جنگ میں فتح کی تعلیم کی جاتی ہے تعلیم کا نعم البدل شکست ہے عسکری تعلیم ایک ہنر ہے جو مشکل سے سیکھا جاتا ہے سکھایا بھی جاتا ہے، مگر یہ علم سیکھنے کے لیے سوچ کا منفرد انداز درکار ہے۔

میں نے "نوائے وقت" میں "سوچ کا انداز" کے عنوان سے کچھ مضامین لکھے اور یہ دلیل دی کہ جب ایک فوجی کمانڈر ہتھیار ڈالنے کو تیار ہو جائے گا، وہاں دوسرا فوجی کمانڈر یہ کہے گا صورت حال اتنی مخدوش نہیں اور پیش بندی کر کے سو جائے گا۔ "کمانڈر کی سوچ کا انداز" فتح حاصل کرنے کے لیے سب سے اہم نکتہ ہے۔ ۱۹۶۵ء میں میرے کمانڈر نے حکم دیا کہ فلاں جگہ ٹینک کے مورچے بناؤ تاکہ دشمن ٹینکوں سے حملہ کرے تو مدافعت ہو سکے "میں نے عرض کیا" اگر دشمن فاصلہ کا سہرے ٹینک لا کر یہاں حملہ کرے، تو ہمیں یہاں دفاع کرنے کی بجائے فی الفور دوسری طرف سے فاصلہ لے لینا چاہیے۔ چونکہ اس جگہ سے اس کی فوج یہاں پر حملہ آور ہو رہی ہے "پس کمانڈر نے اس تجویز کو پسند کیا۔

ہنی بال روم پر فاتح بن کر قابض ہو گیا تو روم کی فوج کے سپہ سالار سکیپیو SCIPIO نے کہا "تم میرا ملک لے لو، میں تمہارا ملک لے لیتا ہوں" چنانچہ سکیپیو نے بڑھ کر ہنی بال کا ملک لے لیا اور ہنی بال کو مجبور کر دیا کہ وہ روم پر قبضہ چھوڑ کر اپنے ملک کی حفاظت کرے۔ یہاں سکیپیو نے ضروری اقدامات کر لیے اور جب ہنی بال اس کے جال میں آ گیا، تو اس کی فوج کو ختم کر دیا۔ سکیپیو اس وقت ۳۲ سال کا تھا اور ہنی بال دنیا کا مشہور جرنیل تھا۔ سکیپیو نے صرف سوچ کے منفرد انداز سے ہنی بال کو شکست دی۔

مختصراً ـــــ نکات

اب ہم اِس تمام مضمون کا ماحصل ان الفاظ میں بیان کر سکتے ہیں۔ مقصد کو سامنے رکھے بغیر کوئی جنگی ترتیب ممکن نہیں۔ مقاصد یہ ہیں:

- ہم جنگی طاقت میں کامیاب جنگی طاقت در کار ہے۔ اس لیے نصاب میں فتح کو اہمیت ہو، زمین کے قبضہ کو اہمیت نہ دی جائے۔
- ہماری افواج کے اسلامی تشخص کو مدنظر رکھتے ہوئے صرف اسلام کے دشمنوں سے نپٹنے کی جنگی تیاری کرنی چاہیے۔
- ہمارا مخاذ ہندوستان سے ہے۔ اگر کوئی بڑی طاقت ہم پر حملہ آور ہو تو اس کو طویل عرصہ تک مزاحمت دے کر پسپائی پر مجبور کرنا ہمارا فوجی مقصد ہو اور اسی بنیاد پر فوج کی ترتیب کی جائے۔
- سندھ میں ہم متحرک صلاحیت کا سٹائل اپنانے سے ہم سندھ کا دفاع کر سکتے ہیں۔ پنجاب میں روسی جنگی سٹائل اپنانے سے پنجاب کا دفاع ممکن ہے۔ آزاد کشمیر میں افواج پاکستان کو سمجھنے کے خطرناک نتائج نکل سکتے ہیں اس لیے وہاں چھوٹی سپاہیانہ فوج سے بڑی فوج کو الجھائے رکھنے کی سٹریٹجی ہو اور اسی بنیاد پر یہ افواج کی ترتیب کی جائے۔
- افغانستان اور ایران سے جنگ کی نا ہی۔ ہو البتہ اگر افغانستان روس کی شہ پر حملہ کرتا ہے، تو صبر کا مظاہرہ کرنا چاہیے اگر افغانستان حملہ پر بضد رہے، بالعموم بسیار صبر ہمیں انتہائی متحرک صلاحیت کا مظاہرہ کر کے جنگ افغانستان کی مغربی سرحد میں پہنچانی چاہیے اور اسی کی ترتیب اس طرح کر دی جائے۔ (خدا کرے کبھی ایسی نوبت نہ آئے)
یا تو ہم عوامی فوج بنائیں اس صورت میں علاقہ کا تحفظ ممکن ہے۔ جب تک عوامی فوج نہیں بنتی، علاقے کا دفاع نظر انداز کر کے صرف فتح پر نظر رکھنی چاہیے اور تمام ترتیب ان خطوط پر ہو۔
- افواج کو از سر نو ملک کے اندر بنائے جانے کے قابل اس کی ضرورت سے اسلحہ دے جانے کو گھر بنایا جا سکے۔ کہ جو امریکہ سے آئے اور چین جنگ کے وقت امریکہ اس کا ایمونیشن نہ دے اور (   ) لگا دے۔ اسلحی پولیس یہ ہو کر دس سال بھی جنگ لڑنی پڑے تو لڑ سکیں۔
- ہم تمام محاذوں پر افواج کو برابر برابر تقسیم نہیں کر سکتے۔ نہ تمام محاذ اہم ہو سکتے ہیں۔ اس لیے کسی ایک محاذ پر پوری قوت مرکوز کرنے کا چینی جنگی سٹائل اپنانے کی ترتیب دی جائے۔
- دفاع بذریعہ فیصلہ کن معرکہ جات کی جنگی ترتیب کا اصول اپنایا جائے۔
- سپر پاور حملہ کرے تو (FABIAN TACTICS) استعمال کیے جائیں۔ مزاحمت جاری رہے اور دشمن کا ناقابل برداشت نقصان ہو کر وہ پسپا ہو اور کبھی حملہ کی جرأت نہ کر سکے۔ اس کی فوج کو ایک دلدل میں پھنسا ہمارا نصب العین ہو۔
- ہمیں ماؤزے تنگ کے جنگی فکر کا مطالعہ درکار ہے اور پوری قیادت اس فکر سے رہنمائی حاصل کرے۔ ہمیں چینی طریق جنگ سمجھانا اور اس کو رائج کرنا ہے۔
- ہماری فوج علاقہ لینے اور علاقہ بچانے کی رسیا نہ ہو، بلکہ فتح لینے اور شکست دینے کی رسیا ہو اور تمام ترتیب اس نکتہ کو سامنے رکھ کر کی جائے۔
- مستقبل کی جنگی حکمت عملی دور مار صلاحیت جسے اصطلاحاً (LONG ARM) کہتے ہیں کے مطابق افواج تیار کی جائیں۔
- ہماری لانگ آرم نہ صرف دشمن مورچوں تک ہو بلکہ آئی مورچوں (دشمن کی مورچی) کے خلاف بھی ہو۔
- (SOPHISTICATED) اسلحہ کو چھوڑ کر (INDIGENOUS) اسلحہ استعمال ہو۔ امیر ملک کی جنگ چھوڑ کر غریب ملک کی جنگ کا سٹائل اپنایا جائے۔ ایسی حالت کی حامر دشمن کے اسلحہ سے دشمن کے خلاف کارروائی کرنے کی ترتیب دی جائے۔ دشمن کی اسلحہ کی فیکٹریوں پر ہمارا قبضہ بھی اتنا ہی حق ہے جتنا اس کی فوجوں کا ہے۔
- فتح اسلحہ سے نہیں، اسلحہ کے صحیح اور بروقت استعمال سے ہوتی ہے۔
- اچھا تو یہ ہے کہ بھینچر اور بڑا اسلحہ بیچ دیا جائے اور اس رقم سے سستا اور مہلک دفاعی اسلحہ خرید لیا جائے اور دفاعی اسلحہ کو اس خوبی سے استعمال کیا جائے کہ اس سے حملہ اور گھیرے کا مقصد بھی پورا ہو جائے۔
- دشمن ہماری افواج کو تھکا کر ختم کرنا چاہے گا۔ اس لیے ہماری ترست یہ ہو کہ اس سٹریٹجی کو فیل کر دیں۔
- فوج ایک ہی کمان کے تحت استوار کی جائے اور ڈسپلن یہ ہو کہ پوری فوج ایک کمانڈر انچیف کے حکم پر جان کی بازی لگا دے۔
- زمانہ امن میں تو فوج سیکٹروں میں منقسم ہو سکتی ہے مگر زمانہ جنگ میں نہیں۔ یہی جنرل سٹاف کی ترتیب ہو کہ خطرہ دیکھتے ہی افواج کو مرکزی کمان میں لے آئیں۔
- فوجی مساوات (MILITARY EGALITARIANISM) جنگ کا اصول نہیں اس لیے اپنی افواج کو سرحدات پر برابر برابر تقسیم کرنے کے بجائے دشمن سے مقابلہ میں اعلیٰ عسکری کثافت سے حاصل کی جائے۔ اہم محاذ پر زیادہ فوج اور غیر اہم محاذ پر کم فوج کا اصول رہنا چاہیے اور متحرک جنگ میں اس اصول کو مدنظر رکھا جائے۔
- فوج صرف فتح کی تعلیم کی ٹریننگ سے۔ صرف فتح، صرف فتح۔ صرف فتح باقی ہر چیز غیر اہم ہے۔ ان اصولوں کو مدنظر رکھ کر فوجی نصاب مرتب کیے جائیں اور افواج کی ٹریننگ ہو۔

"علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دارومدار حواس پر ہے۔ اس علم سے ایک طبعی قوت ہاتھ آتی ہے جس کو دین کے تحت رہنا چاہیے۔ اگر یہ دین کے ماتحت نہ رہے تو محض شیطنت ہے۔ مسلمان کے لیے لازم ہے کہ علم کو مسلمان کرے۔ بولہب را حیدرِ کرار کن۔ اور اگر یہ بولہب حیدرِ کرار بن جائے یا یوں کہئے کہ اگر اس کی قوت دین کے تابع ہو جائے تو نوع انسانی کے لیے سراسر رحمت ہے۔" اقبال

موجودہ نسل کا نوجوان مسلمان قومی سیرت کے اسالیب کے لحاظ سے ایک بالکل نئے اسلوب کا ماحصل ہے جس کی عقلی زندگی کی تصویر کا پردہ اسلامی تہذیب کا پردہ نہیں ہے۔ حالانکہ اسلامی مدرسے کے بعیر میری رائے میں وہ صرف نیم مسلمان بلکہ اس سے بھی کچھ کم ہے اور وہ بھی اس صورت میں کہ اس کی خالص دنیوی تعلیم نے اس کو مذہبی عقائد سے متزلزل نہ کیا ہو۔ اس کا دماغ مغربی خیالات کی جولان گاہ بنا ہوا ہے اور میں علی رؤس الاشہاد کہتا ہوں کہ اپنی قومی روایات کے سرمایہ سے عاری ہو کر اور مغربی لٹریچر کے نشے میں سرشار رہ کر اس نے اپنی قومی زندگی کے ستون کو اسلامی مرکزِ ثقل سے بہت دور ہٹا دیا ہے۔ بلاخوفِ تردید میرا یہ دعویٰ ہے کہ دنیا کی کسی قوم نے ایسی اعلیٰ اور قابلِ تقلید مثالیں ایسے افراد میں پیدا نہیں کیں جیسی ہماری قوم نے، لیکن مائی ہمارے نوجوان کو جو اپنی قوم کی سوانح عمری سے بالکل نابلد ہے، مغربی تاریخ کے مشاہیر سے استفصانا اور استشہاداً رجوع کرنا پڑتا ہے۔ عقل و ادراک کے لحاظ سے وہ مغربی دنیا کا غلام ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی روح اس صحیح القوام خودداری کے عنصر سے خالی ہے جو اپنی قومی تاریخ اور قومی لٹریچر کے مطالعے سے پیدا ہوتی ہے۔ ہم نے اپنی تعلیمی جدوجہد میں اس حقیقت پر جس کا اعتراف تجربہ آج ہم سے کرا رہا ہے نظر نہیں ڈالی کہ اغیار کے تمدن کو بلا مشارکت احائے اپنا ہمدمِ دمِ کا رفیق بنائے رکھنا گویا اپنے تئیں اس تمدن کا حلقہ بگوش بنا لینا ہے۔ یہ وہ حلقہ بگوشی ہے جس کے نتائج کسی دوسرے مذہب کے دائرے میں داخل ہونے سے بڑھ کر خطرناک ہیں۔ کسی اسلامی مصنف نے اس حقیقت کو مولانا اکبر سے زیادہ واضح طور پر بیان نہیں کیا جو نئی نسل کے مسلمانوں کی موجودہ عقلی زندگی پر ایک نظرِ غائر ڈالنے کے بعد حسرت آمیز لہجے میں پکار اٹھتے ہیں ؎

شیخ مرحوم کا یہ قول مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

شیخ مرحوم کا یہ کلام کہا یہ ہے کہ خالص اسلامی تہذیب کے اس قدامت انتساب نام لیوا نے جو مغربی تہذیب کے بارے میں سرسید احمد خاں مرحوم کے ساتھ ملت العمر جھگڑتا رہا۔ آج ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ بے چارا شیخ خود بے بنیاد نہ تھا۔ کیا اب بھی کسی کو اس میں کلام ہے کہ شیخ مرحوم کے قول میں جو سچائی کا شائبہ مضمر ہے اس پر ہماری تعلیم کا ماحصل زندہ گواہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان کڑوی کسیلی باتوں کو سننے والے مجھے معاف فرمائیں گے۔ آج کل کی طالب علمانہ زندگی سے چونکہ گزشتہ دس بارہ سال کی مدت میں مجھے سابقہ پڑتا رہا ہے اور میں ایک ایسے مضمون کا درس دیتا رہا ہوں جس کو تہذیب سے قریب کا تعلق ہے لہٰذا میں اس بات کا تھوڑا بہت استحقاق رکھتا ہوں کہ میری باتیں سنی جائیں۔ مجھے رہ رہ کر یہ رنج دہ تجربہ ہوا ہے کہ مسلمان طالب علم جو اپنی قوم کے عمرانی، اخلاقی اور سیاسی تصورات سے نابلد ہے روحانی طور پر بمنزلہ ایک روحانی لاش کے ہے اور اگر موجودہ صورتِ حال اور بیس سال تک قائم رہی تو وہ اسلامی روح جو قدیم اسلامی تہذیب کے چند علم برداروں کے فرسودہ قالب میں ابھی تک زندہ ہے ہماری جماعت کے جسم سے بالکل ہی نکل جائے گی۔ وہ لوگ جنہوں نے تعلیم کا یہ اصل الاصول قائم کیا تھا کہ ہر مسلمان بچے کی تعلیم کا آغاز کلامِ مجید کی تعلیم سے ہونا چاہیے۔ وہ ہمارے مقابلے میں ہماری قوم کی ماہیت اور نوعیت سے زیادہ باخبر تھے۔

ابوالکلام آزاد

میں جو نئے تعلیم یافتہ حضرات کا ہمیشہ شاکی رہتا ہوں تو اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کی ہر گزشتہ خوبی کو ان سے دور پاتا ہوں اور اس کی جگہ کوئی نئی خوبی مجھے نظر نہیں آتی۔ ہماری گزشتہ مشرقی معاشرت، اوضاع و اطوار، اخلاق و عادات، طریق بود و ماند یہ سب کے سب انہوں نے ضائع کر دیے۔

اخلاق وتمدن کے بعد مذہب کا نمبر آیا اور جدید تہذیب کے منڈیر پر مذہب کی قربانی بھی چڑھائی گئی۔ خیر مضائقہ نہیں، خرید و فروخت کا معاملہ ہے اور متاع بے بہا ہاتھ آتی ہو تو دل وجان تک کو اس کی قیمت میں لگا دیتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ سب کچھ دے کر وہ کون سی چیز ہے جو ہاتھ آئی؟

علم؟ نہیں۔ اخلاق؟ نہیں۔ تہذیب و معاشرت؟ نہیں۔ ایک پوری انگریزی زندگی؟ نہیں۔ ایک اچھی مخلوط معاشرت؟ یہ بھی نہیں۔ پھر یہ کیا بدبختی ہے کہ جیب اور ہاتھ دونوں خالی ہیں۔

آنندہ گدستہ تمنا وحسرت است ۔۔۔ یک کاشکے بود کہ بصد جا نوشتہ ایم

موہن داس گاندھی

موجودہ نظام تعلیم ناقص و خام ہے۔

(۱) ہمارے ملک اور ہندوستان اپنے تمدن و تہذیب سے بالکل قطع نظر کر کے اس کا خمیر غیر ملکی تہذیب و تمدن سے اٹھایا گیا ہے۔

(۲) یہ قلب و اعضاء کی تہذیب سے صرف نظر کرتا ہے اور ساری اہمیت محض دماغ کو دیتا ہے۔

(۳) غیر ملکی زبان کے ذریعے حقیقی معنوں میں تعلیم دی ہی نہیں جا سکتی۔

یہ نظام تعلیم کسی بھی شکل وصورت میں ملک کی ضروریات کو پورا نہیں کرتا۔ انگریزی نے جسے اعلیٰ تعلیم کی ہر شاخ کے لیے ذریعۂ تعلیم بنا دیا گیا ہے اعلیٰ تعلیم یافتہ اقلیت اور ناخواندہ اکثریت کے درمیان ایک مستقل خلیج پیدا کر دی ہے۔ یہ علم کے عوام تک نفوذ کرنے کی راہ میں حائل ہے۔ انگریزی کی غیر معمولی اہمیت نے تعلیم یافتہ طبقے پر ایک ایسا بوجھ ڈال دیا ہے جس نے اسے ذہنی طور پر زندگی بھر کے لیے ماؤف کر دیا ہے اور خود اپنی ہی سرزمین کے لیے ان کو اجنبی بنا دیا ہے۔"

سی کیورا

(۱) دوسری قوموں کی غلامانہ نقالی کا نتیجہ یہ ہے کہ اسکولوں اور کالجوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے باوجود ہم آج تک ایک تعلیم یافتہ قوم کی حیثیت نہیں رکھتے۔ جن نوجوانوں نے اعلیٰ ترین تعلیم حاصل کی ہے ان کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے علم کو تعمیری مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ حالات پر اصولوں کے انطباق کی قابلیت سے محروم ہیں۔ اپنی کتابی معلومات کو اپنے آس پاس کے ماحول کے مطابق نہیں ڈھال سکتے اور اپنے قلب کو حصول علم کی بے غرض تمنا سے خالی پاتے ہیں۔

(۲) ہمارے ملک کی تعلیم کا ایک بڑا نقص یہ ہے کہ اس کی تعمیر اس زبان تاریخ اور فلسفے کی بنیاد پر نہیں ہوئی جو ہمارا اپنا سرمایہ ہے بلکہ ان کو نظر انداز کر کے ایک دوسری زبان، دوسری تاریخ اور دوسرے رسم و رواج کا پیوند اس میں لگا دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسکول گھر کا تتمہ اور تسلسل نہیں بلکہ ایک دوسری دنیا کا چھ گھنٹے کا خواب کا سا عمل ہے۔ طالب علم کی نظر میں اسکول کی حیثیت ایک نمونہ کی سی ہوتی ہے، وہ اسے اپنا مطمح نظر بناتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اسے گھر کی دنیا غلط اور لسماندہ محسوس ہوتی ہے۔ اسے اس زبان پر شرم آتی ہے جو اس کے والدین بولتے ہیں۔ ان کی روایات، ان کے رہن سہن، عادات و اطوار حتیٰ کہ وہ مذہب جسے وہ بہت عزیز رکھتے ہیں سب سے وہ بھاگتا ہے اور ایسی دنیا تلاش کرتا ہے جو اس نے سکول میں دیکھی تھی۔ اور وہ اپنے آس پاس کی حقیقی دنیا سے بے تعلق ہو جاتا ہے۔ یہ طالب علم اپنے مذہب اور روایات سے بھی جاتا ہے اور کسی دوسرے نظام کو بھی اختیار نہیں کر پاتا۔

(۳) مذہب کے بغیر تعلیم کا کوئی تصور ممکن نہیں۔ تعلیم یافتہ طبقے میں مذہب کے زوال کا سب سے بڑا سبب ہی یہ ہے کہ ان کی تعلیم میں مذہب کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا گیا ہے۔ وہ عقائد اور روایات پر صدیوں کی تاریخ سے اب مذہب کا حزو بن گئی ہیں ان کو نظر انداز کر کے تعلیم آخر کیسے دی جا سکتی۔ طالب علم کو موقع ہی نہیں دیا جاتا کہ وہ ایک مربوط اور منظم طریقے سے اپنے مذہب کا مطالعہ کرے۔ اس نظام کا تیار کردہ طالب علم ایک ایسا فرد ہوتا ہے جو اپنے مذہب کے ذکر پر کچھ محجوب اور شرمندہ ہو جاتا ہے اور اسے خود معلوم نہیں ہوتا کہ کیوں اپنے والدین اور بزرگوں کی خاطر وہ ظاہراً کچھ رسوم کی پابندی کرتا ہے لیکن اسے کسی ایک طرف ایمان و ایقان حاصل نہیں ہوتا۔ اس کا دماغ چوں چوں کا مربع ہوتا ہے جہاں حقائق و اوہام، تاریخی واقعات اور کہانیاں اور یقین و شبہات مجہول طریقے سے ملے جلے ہوتے ہیں۔

تعلیمی ضرورت

از حمود الرحمٰن
سابق چیف جسٹس سپریم کورٹ

یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ علم کا یہ تصور کہ اس کا حصول ذہنی قوتوں کے ابھار اور لطیف انسانی جذبات کی تہذیب کی خاطر ہوتا ہے چند لوگوں کے دقیق کی بات ہوگئی ہے۔ آج کے دور کا رجحان یہ ہے کہ تعلیم کو بس معیشت ملا جائے، بجائے اس کے کہ اس سے ترقی و تہذیب حاصل کی جائے۔ آج ہمیں جس علم کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ وہ ہے جو ہمیں امراض کا خاتمہ کرنے، انسانیت کے دکھوں کو دور کرنے، ضروریات پوری کرنے کے لئے قدرتی ذرائع کو بھرپور استعمال کرنے، بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے خوراک و رہائش کا انتظام کرنے، تمام طبعی تکالیف کو اس کی کم سے کم حد تک محدود رکھنے اور ایسے حالات پیدا کرنے کے قابل بنائے جس میں ہر کسی کے لئے مسرت سے ہمکنار ہونے کا امکان ہو۔ یہ سب کچھ اتنا مفید ہے کہ اس قسم کی تعلیم کے ضروری ہونے کے بارے میں کوئی شبہ بھی نہیں کر سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی ذرا ٹھہر کر سوچے تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکے گا کہ اگر اعلیٰ تعلیم سے محض یہی کچھ مراد لے لی جائے تو اعلیٰ تعلیم اپنے حقیقی مفہوم کو کھو دے گی۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ انسانی ترقی میں ان کی بہ نسبت جنہوں نے فوری عملی نتائج کی خاطر اصلاحات کیں ان لوگوں کا زیادہ اہم حصہ رہا ہے جنہوں نے علم کی خاطر حصول علم میں اپنے کو لگا دیا خواہ ان کی تعداد کتنی ہی کم رہی ہو۔

جوں جوں انسانی علم میں اضافہ ہو رہا ہے انسانی مسائل کی پیچیدگی بڑھتی جا رہی ہے۔ ہر وہ قدم جو بنی نوع انسان کی مادی ترقی میں آگے اٹھا ہے۔ نئی خواہشات، نئے مسائل اور کچھ نئی مایوسیاں ساتھ لاتا ہے کیا یہ ستم ظریفی نہیں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی سے پیدا شدہ یہ ترقی تباہی و بربادی کے ان آلات کے ساتھ مربوط ہے جن سے انسانیت کے وجود ہی کو خطرہ لاحق ہے اور کیا یہ بوالعجبی نہیں کہ ایک طرف ہم انسانی مسرت میں اضافہ کی کوشش کر رہے ہیں اور دوسری طرف ہم زیادہ تیز رفتاری سے اوہام و تشکیک کا شکار ہوتے جاتے ہیں اور اس طرح اپنے کو مستقل پریشانی اور تکلیف میں مبتلا کئے ہوئے ہیں جس شدت و بیباکی سے ہم نے قدرت کو فتح کرنے کا آغاز کیا ہے، اس نے ہم کو یہ تقریباً بھلا ہی دیا ہے کہ ہم دراصل انسان ہیں اور محض جسم اور ذہن ہی نہیں، روح بھی رکھتے ہیں۔ جس طرح جسم کی نشوونما کے لئے غذا اور ذہن کی اصلاح کے لئے علم ضروری ہے اسی طرح روح کی بالیدگی کے لئے ایمان ناگزیر ہے ایمان کا ضیاع شدید ترین جسمانی امراض سے زیادہ خطرناک مرض ہے قدیم انسانی تاریخ کے ماہرین ہم کو یہ بات باور کراتے ہیں کہ بہت سے قدیم قبائل محض اس لئے صفحۂ ہستی سے مٹ گئے کہ ان کا اپنے طریقۂ حیات پر ایمان نہ رہا تھا ہم کو یہ غلطی نہ دہرانی چاہیئے۔ اگر ہمیں ایک معاشرے کو جس کی انسانی اقدار پر ایسے ایقان کو حیات لو دینی چاہیئے اس لئے کہ تعلیم جو ہمیں محض یہ بتائے کہ جسم کو برقرار رکھنے کے لئے کیا ذرائع اختیار کئے جائیں جس کے پیش نظر محض ہمارے ذہن کی نشوونما ہو نا مکمل ہے جب تک کہ وہ ہمیں انسانی اقدار پر ایمان عطا نہ کرے اور یہ صرف ایمان ہی ہے جو ہماری روح کو شاد کام کر سکتا ہے

آج ہم ایک نئے اجتماعی نظام کی تشکیل میں مصروف ہیں، لیکن یہ نظام کیا شکل اختیار کرے گا؟ اس کا انحصار اس امر پر ہے کہ ہم اپنے نوجوانوں میں کن اقدار کا شعور بیدار کرتے ہیں ہم کو یہ ہرگز نہ بھولنا چاہیئے کہ مستقبل میں ہماری منزل کا دارومدار اور قوم کی قسمت کا اصل انحصار اس بات پر ہے کہ ہم کس نوعیت کے انسان پیدا کر رہے ہیں۔ ہم نے معاشرتی استحکام عدل اجتماعی اور فرد کے سیتو مقام کا نصب العین اپنے سامنے رکھا ہے۔ اگر ہمیں اس نصب العین کے حصول کی راہ میں آگے بڑھنا ہے تو ہماری یونیورسٹیوں کو ——— جو ہمارے نظام تعلیم کی اعلیٰ ترین شق اور اس کا محور ہیں ——— ایسا نصاب تعلیم و تربیت وضع کرنا چاہیئے جو صرف مفید علم میں اضافہ ہی کا باعث نہ ہو بلکہ ہمارے نوجوانوں میں واضح فکر، صائب فیصلے، شدید عصبیت اور منظم دیانتدارانہ اخلاق کی صفات پرورش کرے اور ان اعلیٰ انسانی اقدار کا صحیح شعور عطا کرے جو صرف فرد کی آرزوؤں کی تسکین ہی کے لئے نہیں بلکہ وسیع پیمانہ پر قومی امنگوں اور تمناؤں کو پالنے کے لئے ناگزیر ہے ——— ہم میں سے جو خدا پر اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان رکھتے ہیں، ان کے لئے ایک مرکزی نقطہ پہلے ہی سے موجود ہے۔

تعلیم فرد کی ذات کو ترقی دینے کے لئے مشغلوں کا نام نہیں ——— اس کا مقصد فرد کو صرف اس کی اپنی ذات کے بارے میں نہیں بلکہ اس کے آس پاس

لینے والوں اور اس کے ماحول کے بارے میں بھی علم فراہم کرنا ہے۔ فرد اگر کسی اجتماعی گروہ کسی طبقہ یا کسی قوم کے ایک فرد کی حیثیت ہی سے بندہ رہ سکتا ہے تو وہ تعلیم نہیں جو اس کو اس کے گروہ، طبقہ یا قوم سے کاٹ دے اور دو تعلیم ہو ہی نہیں سکتی جو اس اجتماعی نظام کی جڑیں کاٹنے والی ہو اس لئے اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ تعلیم، فرد کو معاشرہ کے ایک بہترین رکن کی حیثیت سے تیار کرے تو ہمارے نظام تعلیم کو لازماً ہمارے نظریات کا عکاس ہونا چاہیئے۔

مغربی طرز کا نظام تعلیم جو ایک صنعتی معاشرے کی ضروریات کے جواب میں تشکیل پاتا ہے اصل اہمیت وجود و بقا کے لئے باہمی کشمکش اور مقابلہ کو دیتا ہے۔ اس رجحان کے مفکرین نے اسے کسی پسند نہیں کیا ہے۔ جس طرح ہر یورپی چیز جس کو پہلے پہل اچھا سمجھا گیا اور پھر بالآخر اس کا ملمع اترا بالکل اسی طرح یہ بات ذہن نشین کی کہ مذکورہ نظام تعلیم کے نقائص بھی واضح ہونے شروع ہو گئے۔ رابندر ناتھ ٹیگور جو مغربی سائنس اور تمدن کے حامی تھے، یہ محسوس کرتے تھے کہ یہ نظام تعلیم مقامی ماحول سے کٹا ہوا ہے انہوں نے مغربی طور طریقوں کے ساتھ غلامانہ تعلق کے خلاف متنبہ کیا اور کہا کہ اگر تعلیم کو فی الواقع مفید بنانا ہے تو اسے ان لوگوں کی معاشی، سماجی، معاشرتی اور روحانی زندگی سے مربوط و ہم آہنگ ہونا چاہیئے جنہیں وہ دی جاتی ہے ٹیگور ان لوگوں میں سے تھے جنہیں جدید سائنس کی افادیت کا احساس نہ ہو لیکن ان کا یہ ایقان تھا کہ ہمارے لئے مناسب ترین تعلیم وہی ہو سکتی ہے جو ملک کے اپنے تہذیب و تمدن کے ساتھ جدید سائنس کے اصولوں کو سمو کر تشکیل پائے

علامہ اقبال کا بھی یہی خیال تھا کہ تعلیم کا اصل مقصد فرد کی شخصیت کی نشوونما اور اس کا ارتقاء ہے ــــــ ان کی نظر میں جس فرد کا ملت سے ربط نہ ہو وہ کچھ بھی نہیں ــــــ فرد صرف اس صورت میں کسی حقیقی وجود کا مستحق قرار دیا جا سکتا ہے جب کہ وہ اجتماع کے مقاصد کو جذب کرے اور اپنی شخصیت کے ذریعے ان کا اظہار کرے، اس لئے ہماری نظر میں تعلیم کا اولین مقصد یہ ہے کہ فرد کی اس طرح کہ ہمہ گیر تربیت ہو۔ اس نقطہ نظر سے اگر تعلیم کی کامیابی کا جائزہ لیا جائے تو یہ دیکھا جائے گا کہ فرد میں ان نظریات کا حقیقی شعور جو اسے سب سے زیادہ عزیز ہے کس حد تک پیدا ہوا ہے۔ کیونکہ دنیوی زندگی میں کامیابی میں اس کا کیا حصہ ہے یا یہ کہ ملازمت کی تلاش میں وہ کیا مدد دیتی ہے، اور وحدانی کیفیت پر ہے جس کا عظیم مفکر کانٹ کہا ہے:

"بظاہر یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہماری فکر نظام فطرت سے نتائج اخذ نہیں کرتی بلکہ اس پر اپنے نتائج ٹھونس دیتی ہے"

مختصر یہ کہ یہاں آدمی کا اپنا نقطۂ نظر ہے جو کام کرتا ہے اور شے کی تعبیر کرتا ہے اس طرح سائنس جو خود نہ مادی ہے اور نہ روحانی۔ ہمیں کائنات کی بے شمار تعبیرات کی طرف لے جاتی ہے، یہ تعبیرات مادی بھی ہو سکتی ہیں اور روحانی بھی مغربی تہذیب کی بنیاد چونکہ مادیت پر ہے اس لئے اس کے سائنسی علوم میں بھی مادیت ہی کی روح رچی بسی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جدید سائنسی علوم کا مطالعہ اسلام کے ثقافتی حقائق کے خلاف نہیں ہے بلکہ ان کے مطالعے کے دوران اس نقطۂ نظر کو اختیار کرنا اسلام کے خلاف ہے جو مغرب کی مادی تہذیب کے ساتھ مخصوص ہے سائنس کی درس و تدریس مغرب کے سامنے زانوئے ادب تہ کئے بغیر بھی ہو سکتی ہے۔ آج عالم اسلام کو سب سے زیادہ ضرورت ایک نئے فلسفیانہ نقطۂ نظر کی نہیں بلکہ جدید تقاضوں سے ہم آہنگ سائنسی اور تکنیکی آلات کی ہے

اس مسئلے کا بہترین حل میرے خیال میں یہ ہے کہ مغرب کے طبیعی علوم اور بیان کردہ طریق پر تو ہمارے اسکولوں میں بے شک رائج کر دیئے جائیں مگر یورپی فلسفہ، ادب اور سماجی علوم کو وہ بنیادی اہمیت حاصل نہیں رہنا چاہیئے جیسا کہ آج کل ہمارے ہاں ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ ہمارے نوجوانوں کے ناپختہ ذہن چھوٹی عمر میں مغربی تہذیب کے معنوی پہلو کا ادراک نہیں کر سکتے اس لئے اس کی ظاہری چکا چوند سے ان کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں اس طرح شروع ہی سے اُن کے دل میں مغربی تہذیب کے لئے ایک نرم گوشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ صرف مطالعۂ تاریخ کے نقطۂ نظر سے ہی دیکھ لو تو صورتِ حال کی یہ تکلیف ہمارے سامنے واضح ہو جاتی ہے مغربی مؤرخین تاریخ عالم کی تعبیر خالص اپنے نقطۂ نظر سے کرتے ہیں۔ اُن کے تاریخ پیش کرنے کا جس کا اعتراف وہ کبھی نہیں کرتے ــــــ یہ ثابت کرنا ہوتا ہے کہ مغربی نسلیں اور ان کی تہذیب دنیا کی ہر نسل اور تہذیب سے اعلیٰ اور برتر ہے اور اس طرح وہ باقی دنیا پر مغرب کے تسلط کی اخلاقی توجیہ فراہم کرتے ہیں۔ مطالعۂ تاریخ کا یہی خود مرکزی (SELF-CENTERED) نقطۂ نگاہ ہے جس نے ابھی حال ہی تک مؤرخین کی لکھی ہوئی دنیا کی تاریخوں کو مغرب کی تاریخ بنا دیا تھا ان تاریخوں میں غیر یورپی اقوام کا تذکرہ اس حد تک کیا جاتا تھا جس حد تک یورپ سے متصل یہ وہ اقوام اہمیت رکھنے کی صلاحیت رکھتی ہوں گویا باقی ساری دنیا یورپ ہی کے لئے تخلیق کی گئی ہو اور دنیا کی باقی تہذیبیں محض اس لئے پروان چڑھی ہوں کہ مغربی تہذیب کی عظمت ان کے مقابلے میں ذرا زیادہ شان و شوکت سے واضح ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ ایسی تاریخوں کا مطالعہ غیر یورپی نوجوانوں میں اپنی عظمت، تاریخی ورثے اور مستقبل کے امکانات کے بارے میں احساسِ کمتری پیدا کرنے کے علاوہ کر ہی کیا سکتا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ تعلیم نہایت منظم طور پر غیر یورپی نوجوانوں کو اپنی تہذیبوں سے متنفر کرانے کے ساتھ ساتھ مغرب کے سامنے گھٹنے ٹیک دینے کا سبق بھی دے رہی ہے۔

پس اگر ہم اسلامی اقدار کا تحفظ اور احیاء چاہتے ہیں تو ہمیں مغربی تہذیب کی اندھی تقلید چھوڑنا پڑے گی حقیقت یہ ہے کہ مغربی تہذیب کے تباہ کن نقصانات اُن چند مادی فوائد سے کہیں زیادہ ہیں جن کی خاطر ہم اس تہذیب کے دلدادہ ہوئے ہیں۔

اگر ماضی میں مسلمانوں نے سائنسی تحقیق سے صرفِ نظر کیا ہے تو آج وہ اپنی اُس غلطی کا تدارک مغربی علوم سے نہیں کر سکتے

اگر ہم اسلام کو بحیثیت ایک تہذیبی عامل اور تمدنی طاقت کے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں مغربی تہذیب کی ذہنی فضا سے اپنے آپ کو بچانا ہوگا جو ہم پر حملہ آور ہے۔ مغربی اطوار کی پیروی کرتے کرتے مسلمان آہستہ آہستہ مغربی نقطۂ نظر بھی اختیار کرتے جا رہے ہیں کیونکہ خارجی مظاہر میں تقلید بتدریج نظریات کو قبول کرنے کی طرف بھی مائل کر دیتی ہے جو اس خارجی مظاہر کی بنیاد ہیں۔

ع "پھر جمع کرتا ہوں جگرِ لخت لخت کو"

جناب اسہاں جامعہ کے طلبہ و طالبات کے جگر گوشوں
لہو کے قطروں ۔ اور سوچ کے سنگھیوں کی لمبی
اڈاریوں سے آپ کو متعارف کرانے ہیں جن کا کلام کم ہے
اس میں قصور ان کا ہے ۔ کہ نقیبہ شعر" سادہ ہی اچھا ہے
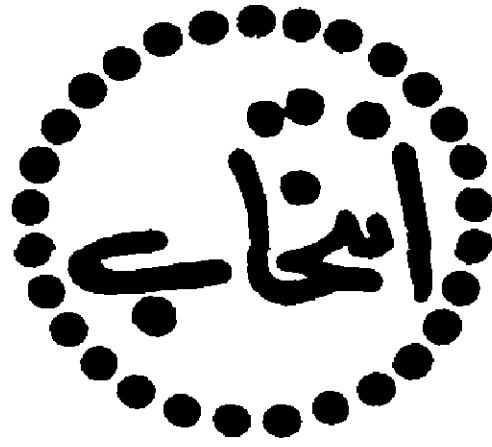
زندگی

عبدالرؤف نظامی
(شعبہ ارضیات)

یہ عظیم کائنات
یہ کائنات رنگ و بو
اور رنگ و بو کی محفلیں
ان محفلوں میں رونقیں
پھر رونقوں میں شور ہے
اس شور میں اٹھتی صدا
یہ صدائے من و تو
اس صدا میں سوز ہے
اس سوز میں تاثیر ہے
تاثیر میں اخلاص ہے
اور اخلاص ہی ہے زندگی
" زندگی بے بندگی شرمندگی "

شاہد سلیم

(شعبہ عمرانیات)

میری سوچ کا سمندر دریں
سات سمندر تک پھیلا ہے
مٹھی میں تتلی تھی شاید
رنگ ہتھیلی پہ پھیلا ہے
رات کا سناٹا اور آئیں
جانے کس کا گھر اجڑا ہے

"انقلاب"

محمد اکرم ناصر ...

وقت کا لمحہ لمحہ صدا دے رہا ہے
اُٹھو جلد خوابوں کی دنیا سے نکلو
تم آتش فشاں ہو تو لاوا بکھیرو
وگرنہ سنو ——
گر یوں سوئے رہے
برف گرتی رہی ——
دیکھنا ایک دن تم بھی جسم ہو جاؤ گے

*

سعید ظفر (شعبۂ اُردو)

تتلیاں ساری کتابوں میں سجائی جائیں گی
اور پھولوں میں پڑا رس دیکھتا رہ جائیگا

سال بھر کیا، عمر بھر تو میری آنکھوں میں دیکھ
ان نگاہوں میں مگر تو ہی بسا رہ جائے گا

وہ چلی جائے گی ڈگری لے کے بوڑھی ماں کے گھر
تو اسے کیمپس کے پل سے دیکھتا رہ جائیگا

سب گلابوں کو سجا لے گا کوئی کالر نواز
اور بھونرا اپنا پہر سر نوچتا رہ جائے گا

نوچ لے گا وہ تری آنکھوں سے ہر اک خواب کو
اور آنکھوں کے لیے اک رتجگا رہ جائے گا

*

طارق عزیز طارق (شعبۂ اُردو)

سپرانِ سنگ کو ہمرنگ درختوں پر ہے برف کی اک چادر
پھر بے حال ہزاروں سے یہ کس نے ہیں اوڑھے، رُت بدلی
پھر سے ٹھنڈی آہوں میں اب جلتے بجھتے دیے ہیں
پھر بے چین سمے نے گھر میں ڈیرے ڈالے، رُت بدلی
اس موسم کے پہلے پنچھی لوٹ کے آئے پھر اپنے دیس
سوکھی شاخیں، ٹوٹ رہے ہیں پیلے پتے رُت بدلی

ناصر حمید حمیدی (شعبۂ سماجیات)

ہم کڑی دھوپ میں تنہا ہی چلے تھے یارو
دشتِ فرقت میں کہیں سایۂ دیوار نہ تھا

وہ شفق رنگ غزالوں کی نشیلی آنکھیں
کون کافر لبِ ساغر کا گنہگار نہ تھا

شہرِ آشوب میں ناصر سے جُدائی توبہ
وقت اس قدر پہلے سر پہ سوار نہ تھا

*

خاور منصور (یونیورسٹی لاء کالج)

لطافتوں کا وہ پیکر تھا آنکھ نے دیکھا
چراغِ دل سے مگر روشنی سی کی تو سہی

نہ سوچ پھیل گیا غم کئی رسالوں پر
یہ دیکھ دوستی اس بت سے کچھ بڑھی تو سہی

یہ اور بات کہ غم کا مداوا ہو نہ سکا
خوشی تو یہ ہے کہ بات اس نے اب سنی تو سہی

*

بشریٰ بیٹ (شعبۂ اُردو)

مجھ کو دامن میں چھپایا بس غبارِ راہ نے
دُور تک دشتِ محبت میں کوئی سایہ نہ تھا

دل بھی تڑپا میں بھی تڑپی رات کے پچھلے پہر
اور تھا کھڑکی میں کوئی چاند کا سایہ

میں نے غم بانٹے ہیں بشریٰ سب لواؤں کچیاں
یوں تو میرے پاس اس جیون کا سرمایہ نہ تھا

نثری نظم

(جاوید اقبال راہ سوشل ورک)

نئے دنوں کی بات

تم رات بھر جاگتی رہی ہو
صبح کا تارا نمودار ہونے تک
چھت پر منڈیروں کا سہارا لیے
تمہارا وجود
سرد موسم میں کہرا اور دھند میں لپٹے اندھیرے چھپائے رہے
آنسو تمہارا درد سمونے کی کوشش کرتے رہے
سفر ——
میں نے کرب جھیلے اور ہر ساعت اذیت سوچوں کے دکھ جھیلے ہیں
لیکن ——
مصنوعی لفظوں کے عذاب سے میں بھی تھک گیا ہوں
اس بستی دو پہر میں
گھنی دیار ساحلوں کی تلاش میں ہوں
کہ میں نئے سورج کی ان کرنوں کی حدت، برداشت کرنے کے قابل نہیں
جو اپنے ساتھ مہذب عہد سے بھی لائی ہیں
ساعتوں کے انتظار سے
تخلیقی ساعتیں جہنم ساری میں روشنی بکھیرے ترتیل لگتی ہے

ایسے میں تخلیقی لمحے بارش کے قطرے بنتے ہیں
... دھرتی بکھرتی ہے، رنگوں کے جادو بکھلتے میں
... میرے گھر میں بہت حبس ہے
... چاہتا ہے آج بارش برسے
... ہم خوب اودھم مچائیں
... راحتوں کا احساس اتنا ہی ضروری ہے
... دکھوں کا اس کا انکار

زہر کے پیالے اور سقراط کے مقدس ہونٹوں کی توہین
کہ سچائی
ابدی مسرت زہر کا پیالہ
اس کا سچا اظہار میری جاں
نیند سے بوجھل پلکیں
حقیقتوں کی شکست کا اعلان ہیں گی
کل شئے پر جمیع علے اصلیہ
انسانی ادہان کی تخلیق میں پوشیدہ مفاہیم کا ادراک
سو ہم اس وآشتی کی جنت عدن میں واپس لوٹتے ہیں
یہ واپسی کی میعاد ہے
کہ دکھ ہماری میراث نہیں
ہم آئندہ نسلوں کی وراثت بھی
راحت تحویز کرتے ہیں
ما ...تی رسی ہے
گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بجلیاں روشنی کا احساس دلاتی ہیں
تمہارے ہاتھ میرے ہاتھ میں ہیں
ہم نئے عہد کی آمد کا گیت گاتے ہیں
صحرا میں دور نخلستانوں کا نشان
تاریک رات کے بعد صبح کے تارے کی یقینی اُمید
خوشیاں —— ابدی راحتیں
زہر کے پیالے میں بھی الطیاں

ہمارے پیار کا عہد نامہ
اور نئے عہد میں محبت کرنے والوں کا مینی فیسٹو

شمشاد اختر (شعبہ سماجیات)

میں بار بار تقاضائے وصل کرتا ہوں
وہ بار بار بہانے بناتا رہتا ہے
میری نگاہ کے بکھراتے آبگینوں میں
ترا سراپا صنم جھلملاتا رہتا ہے
اسے بھی دیکھ ستاروں کو دیکھنے والے
جو تیری یاد میں آنسو بہاتا رہتا ہے
میری نظر کا تجسس میری لگن کا خلوص
حریم ناز میں ہلچل مچاتا رہتا ہے

محمد علی نوید (شعبہ فارسی)

رنگ سی رنگ ہیں ملبوس بہاراں کی طرح
وہ اکیلا ہے مگر پورے گلستان کی طرح
جاگتی آنکھوں سے جو خواب کبھی دیکھے تھے
اب انہیں ڈھونڈتا ہوں عمر گریزاں کی طرح
عجب حسن کا موسم ہے کہ اب گلشن میں
پھول بھی کھلتے ہیں تو چاک گریباں کی طرح

پہچان

سلیم منصور خالد
— (شعبہ سیاسیات) —

برفانی تاریک فضا میں
رات کے اندھے سناٹے میں
سورج کے جھولے جھول رہا تھا
پہچانوں میں اپنے من کو
تیرے من کو
میرے ہمدم
تو نے کیسا جسم لیا ہے
چٹیل، جھلسے اور پتھریلے شہر جفا میں
من کی دنیا، من کی بستی، دل کے نگر اور شہر وفا میں
بس تو ہے اک زندہ لاشہ — زندہ انساں

ورنہ اک اک انگ ہے پتھر
پھر بھی تو ہے
جیون ساتھی، پیارا ساتھی
سچ سچ کہہ دے
آخر اپنا جرم ہی کیا ہے
مجھ سے تو کیوں بیگانہ ہے
کیا —
میں بھی بن جاؤں بیگانہ
توڑ کے جام و مینا سارے
پیس کے سب بولان کے پتھر
قریہ قریہ، بستی بستی
ہر سورج کو، ہر چندا کو، ہر تارے کو
نوچ کھسوٹ پھر توڑ کے سب کو
بے دانوں کورا کھ بنا کر

جھوٹے لعل دیپ بجھا کر
ایک دیا ایسا بھی جلاؤں
دھیرے دھیرے، ہولے ہولے
اپنے ان بے بس ہاتھوں سے
ایک مجسم پیکر ڈھالوں
الفت اور اخلاص کا پتلا
جس میں ہو سورج کی حدت
جس میں ہو چندا کی ٹھنڈک
اور چمک جھلمل تاروں کی
تیرے نینوں کے درپن میں
اپنے من کو خود پہچانوں
ورنہ جیون ہے لاحاصل
مجھ کو اس کی تاب نہیں ہے
سندر سایہ خواب نہیں ہے !

ڈاکٹر سید عبداللہ (سابق پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج)

شاہراہِ تعلیم

پچھلی صدی میں بعض ایسے ارباب فکر بھی گذرے ہیں جو کہتے تھے کہ تعلیم تو ایک گھوڑا گاڑی ہے اس پر بیٹھ جائیے، سواری کیجئے، پھر واپس آکر گھوڑے کو طویلے میں باندھ دیجئے اور گاڑی کو شیڈ کے درخت کے پیچھے۔ پھر ضرورت ہو تو پھر جوت لیجئے پھر چھوڑ دیجئے۔ پھر لیجئے بس تعلیم سے آدمی کا اتنا سا ہی تعلق ہوتا ہے ضرورت کے لئے استعمال کیجئے پھر اسے دل و دماغ سے نکال کر اسی طرح طاق پر رکھ دیجئے جس طرح سے وقت کوئی آدمی عینک کو طاق پر رکھ دیتا ہے۔ یہ دلیل دینے والے بھی شاید دل میں یہ سوچتے ہوں کہ تعلیم نہ گھوڑا گاڑی ہے اور نہ عینک، کلچر اور سوسائٹی کے جسم و جان دونوں سے گہرا تعلق ہے اس واسطے سے مذہب، آداب، معاشرت، سیاست غرض زندگی کا داخلی اور خارجی ہر شعبہ متاثر ہوتا ہے اسی لئے اکبر نے کہا تھا کہ

دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

اگر غور کیا جائے تو تعلیم اتنا وسیع عمل ہے جس کی حدیں مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی ہیں اس کا تعلق تو انسان کی پوری زندگی سے ہے، طہارت اور معاشرت بھی ہے اور اخلاق شہریت سے بھی ہے ایک ماحول اور بااثر ادب کا عنصر بھی ہے اور اگر امام غزالی کی بات مانیں تو رضائے الٰہی اور عقبیٰ سے بھی ہے

میری نظر میں تعلیم ایک ہمہ گیر سماجی ادارہ ہے جو کل زندگی کا قائم مقام ہے لہذا تعلیم کی آخری اور صحیح منزل فرد اور سماج کی کل زندگی کو صرف متاثر کرنا نہیں بلکہ اسے سنوار کر بااثر، بامعنی اور انسانیت کے لئے اور ذات کے لئے خوشگوار بنانا ہے۔ اس منزل تک پہنچنے کے کئی راستے انسانوں نے اپنی تاریخ میں تجویز کئے اور آج بھی دنیا کی مختلف ترقی یافتہ اقوام اپنے اپنے مزاج اور اپنی اپنی بصیرت کے مطابق ان راستوں کی نشاندہی کر رہی ہیں ہر ملک کی تعلیم کے کچھ مخصوص مقاصد ہوتے ہیں۔ اس مختصر مضمون میں میں یہ کوشش کروں گا کہ اپنے ملک کی تعلیمی منزلوں کے بارے میں کچھ گفتگو کروں۔ پاکستان کے مخصوص حالات کے پیش نظر پاکستانی تعلیم کی چند ایسی خصوصیات کا شمار کیا جاتا ہے جن کا پاکستان کی نظام تعلیم میں ہونا ضروری ہے۔

ایک اہم خصوصیت تعلیم میں مقصدیت کا ہونا ہے کہا جاتا ہے کہ تعلیم جو بھی ہو مفید ہوتی ہے لیکن یہ خیال درست نہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ عِلْمٍ لَا یَنْفَعُ (اے خدا مجھے بے نفع علم سے بچانا)۔ اس کے صاف صاف یہ معنے ہوئے کہ بعض علم ایسے بھی ہوتے ہیں جو بے نفع ہوتے ہیں بے نفع تعلیم کی تعریف کی جا سکتی ہے، مگر اس دور تعلیم میں بے نفع تعلیم وہ ہوگی جو تعلیم پانے والے کو اس کے مقصود تک نہ پہنچائے۔ یہ مقصد روحانی بھی ہو سکتا ہے اور ذہنی و فکری بھی، عملی بھی ہو سکتا ہے اور مقصدی (اور معاشی بھی)۔

ہمارے دور تعلیم کا ذکر اس لئے کیا کہ آج کل تعلیم ایک منظم سماجی ادارہ ہے اور ہر سماجی ادارے کی طرح یہ بھی ایک پلاننگ چاہتا ہے اور چونکہ اس کا تعلق اب عشر حکومت سے ہے، ——— اس لئے یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ تعلیم کے وسائل کہاں تک موجود ہیں اور ان مقاصد قومی لحاظ سے کن ضرورتوں کے سلسلے میں مد نظر ہیں وہ کہاں تک پورے ہو سکتے ہیں؟ لہذا یہ سارا عمل تنظیم کا محتاج ہے یعنی کہہ دینے سے اور سوچنے سے نہیں ہوگا ورنہ وہی حال ہوگا جو ایک طالب علم کا ہوا تھا جو پڑھتا پڑھاتا کم تھا صرف اپنے استاد کے اُستاد کی قبر کے پاس کتاب کھول کر بیٹھ جاتا تھا اور زور زور سے دعا کیا کرتا تھا۔ اے اللہ علم نافع عطا کر۔ کئی مہینوں تک یہ عمل اس نے جاری رکھا مگر اس کو اپنی کتاب کا پہلا سبق بھی یاد نہ ہوا آخر ایک دن طیش میں آکر کتاب کے ورق پارہ پارہ کر دیئے اور استاد اور استاد کے استاد کو برا بھلا کہا اکثر بازاروں میں جا کر چیخ کر کہا: لعنت ہے علم پڑھنے والے پر اور پڑھانے والے پر۔ سب سے اچھا علم وہ ہے جو شام کو کھانے کے لئے چار پیسے تو دلوا دے۔

بے کار اور بے نفع تعلیم

انگریزی دور کے آخری حصے ہی میں یہ صورت حال پیدا ہو چلی تھی کہ بہت سے لوگ اپنی تعلیمی تحصیل کو بیکار اور بے مصرف سمجھنے لگے تھے کیونکہ تعلیم کا مقصد واحد نرا تو نوکری تھا۔ اس لئے بے روزگاری پیدا ہوئی اور یہ صورت حال کم و بیش اب بھی موجود ہے پھر بھی نوے فی صدی اشخاص اس لئے بچوں کو تعلیم دلاتے ہیں کہ شاید اس کے بعد انہیں نوکری یا عہدہ مل جاتے۔ سو چونکہ نہیں ملتا اس لئے بے اطمینانی اور پریشانی کا سامان ان کے مقدر میں کم سے کم اتنی ہی عقل مل جاتی جتنی روایتی لکڑہارے کو حاصل تھی۔

اگر تعلیم کا ایک مقصد نوکری بھی ہے تو تعلیم کے ارباب اختیار کا قومی طرف سے پہلا فرض یہ ہے کہ تعلیم کے موجودہ راستوں کو فوراً بدل ڈالیں یورپ کی ہر مثال صحیح نہیں مگر ہر مثال غلط بھی نہیں۔ یورپ میں اسکول دو طرح کے ہیں ایک وہ اسکول جن میں علم برائے علم ہوتی ہے دوسرے وہ اسکول جن میں تعلیم برائے معاش ہوتی ہے۔ ان اسکولوں کے چند اور بعد یکساں ہوتے ہیں۔ پھر ہر سال یہ میلان راستے بدل جاتے ہیں۔ تعلیم برائے معاش کی مدت کم ہوتی ہے اور فراغت کے بعد لوگ اپنے اپنے معاش میں جذب ہو جاتے ہیں اور اوپر کے اس بے ساختہ ہجوم سے بچ جاتے ہیں جو آج کل ہمارے یہاں نظر آتا ہے۔

اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ پاکستان ایک زراعتی ملک ہے اس میں صنعتی ترقی ابھی نہیں ہوئی اور جہاں تک زراعت کا تعلق ہے وہ پرانے طریقے پر چل رہی ہے۔ لہٰذا اس میلان کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد معمولی تعلیم پانے والے آدمی کو کیا خاص فائدہ؟ یہ اعتراض درست ہے لیکن کسی خراب صد عادت کو کسی نہ کسی دن، بیکار اور بے نفع تعلیم کے راستے بند کرنے ہوں گے۔ یہ بھی پچھلی صدیوں کی غلطیوں اور مجبوریوں بلکہ نعمتوں میں سے ایک ہے کہ لوگوں کو مقامی، دیہی پیشوں سے متنفر کر کے بابو بنا دیا گیا تھا۔ یہ اسی زمانے کا تحفہ ہے کہ بابو بنا تو حق ہے سب سے بہتر ہے۔ اور جولاہا ہونا یا ایسا نا گناہ ہو گیا تھا کہ لوگ اپنی ذات کو چھپانے لگے تھے تاآنکہ گاندھی نے جولاہوں کے اس پیشے سے کچھ داغ دھونا کے بعد اب کیا ہو رہا ہے باپ ہل چلا رہا ہے بیٹا بیکار میٹرک پاس، اپنے گاؤں کے تکیے یا حجرے میں یا قصبے کے قہوہ خانے میں سگریٹ پی رہا ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی پہلی کتاب میں یوں خوش خبری دی تھی کہ بیٹا جب بڑا ہوگا تو آپ بھی کھائے گا اور باپ کو بھی کھلائے گا مگر یہاں کیا ہے — بیٹا بڑا ہو کر اور میٹرک پاس کر کے باپ کی کمائی اڑا رہا ہے اور کچھ کمانے لگا تو صرف اپنا حقہ سگریٹ چلا رہا ہے اور باپ مشقت کے مارے مرا جا رہا ہے۔

لیکن کیا کہا جائے کہ لوگ بابو ہی کو ہر حال میں اچھا سمجھے گئے ہیں، تو ہم کیا کریں کہ دیہی اور مقامی پیشے پھر لپسند خاطر بننے لگیں اس کی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی مگر ایک دھاسی روشنی یہ سمجھا رہی ہے کہ حکومتی اور غیر حکومتی ذرائع کو کام میں لا کر بکثرت ٹیکنیکل اسکول کھولے جائیں۔ اور ملکی مصنوعات کے حق میں رائے عامہ پیدا کی جاتے اور غیر ملکی درآمد کو محدود کر کے زیادہ سوا مشینی آلات کے لوگوں کو ملکی وضع اور ملکی اشیاء استعمال کرنے پر مائل کیا جاتے۔

یونیورسٹیاں یا ٹیکنیکل اسکول

مجھے یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ پاکستان میں بڑے بڑے سیاستداں اپنے اپنے علاقے میں محض تفاخر کے لئے یونیورسٹیاں کھلوانے کے لئے طرح طرح کے جتن کرتے ہیں۔ گویا یونیورسٹی پگڑی بھی ہو تو بڑی بات ہے مگر بہت کم کوشش اس کی کی جاتی ہے کہ دیہی آبادیاں میں ٹیکنیکل اسکول کھلوائیں۔ دیہاتی صنعتوں اور دستکاریوں اور پیشوں کو ترقی دلائیں اور جلی پھر کر لوگوں کو سمجھائیں کہ تعلیم کے ساتھ دستکاری اور ہنر کوئی عیب کی بات نہیں میں بڑے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس زرعی معیشت والے ملک میں صنعتی ملکوں کے مطالبات فی الحال کامیاب نہیں ہو سکتے — اس ملک کی اولین معیشت کی ترقی، زرعی طرز زندگی کے اصول پر ہوگی اور اس کے لئے واحد حل سادہ ٹیکنیکل تعلیم کا فروغ ہے۔

میرا اپنا خیال یہ ہے کہ ہمارے تعلیمی مسئلے کی کلید یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ مفید پرائمری تعلیم ہو اور یونیورسٹیاں بقدر ضرورت ہوں اور میں ارباب تعلیم سے التجا کرتا ہوں کہ وہ علاقائی یونیورسٹیوں کے چکر میں نہ پھنسیں ملک میں کم یونیورسٹیاں ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں مگر جتنی ہوں عمدہ ہوں۔ عجیب بات ہے کہ بیکار یونیورسٹیاں تو ہر گلی کوچے میں موجود ہوں گی مگر اسکولوں کی حالت ابتر۔ آپ نے دیہاتی اسکولوں کو دیکھا ہوگا۔ ان کا ماحول جیسے ویرانے کا کوئی گوشہ اسباب مدارد، ٹاٹ غائب، ماحول غلط، عمارت میر تقی میر کے گھر کی طرح۔ پوری فضا ایسی جیسی ایک میراثی کے پیچھے بیان کی تھی "جھکے ہوئے دیوار تھی" یہ سب تکلف کیوں ہے، اس لئے کہ ہمارے ملک میں سیاست کا کام زیادہ ہوا ہے اور تعلیم بھی ایک شعبہ سیاست بنتی جاتی ہے خصوصاً علاقائی سیاست کو خوش کرنے کے لئے، تعلیم کو بھی استعمال میں لایا جاتا ہے۔ اس لئے یونیورسٹیاں بکثرت کھلتی جاتی ہیں اور نیچے کی سطح غائب۔

آپ صاحبوں کو شاید اس کہانی سے دلچسپی نہ ہوگی مگر آپ کے علم میں اضافہ ضرور ہوگا کہ اب ملتان، سرگودھا، لائل پور اور پنڈی کو نیم یونیورسٹی کا درجہ مل رہا ہے ان جگہوں میں یونیورسٹی کی تعلیم جاری ہو رہی ہے — حالانکہ نہ اساتذہ موجود نہ سامان میسر — لیکن غیر مفید یونیورسٹیاں کھلتی جا رہی ہیں جن کی حقیقت میں کوئی ضرورت نہیں۔ یہ بھی آپ کے سامنے ہے کہ ملک میں دو دو تین تین ایک ہی فیکلٹی سے متعلق پیشہ ورانہ یونیورسٹیاں بھی اس طرح کھل رہی ہیں گویا کالج ہیں جن کی ہر آبادی کو ضرورت ہوتی ہے میں با ادب عرض کرتا ہوں کہ اس غریب ملک میں جس میں روپیہ بھی کم ہے اور ماہرین بھی کم — پیشہ ورانہ یونیورسٹی سارے پاکستان میں، ایک ایک بڑے پیشے کے لئے ایک ایک ہی ہونی چاہیئے اس سے بیکار رقابت سے بچاؤ اور کفایت شعاری کے علاوہ مختلف علاقوں اور خطوں کے لوگوں کے باہم میل جول کے مواقع نکلیں گے اور اس سے بھی بڑی بات ماہرین کی ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں کہ جو شخص ڈگری یافتہ ہوتا ہے وہ ضرور ماہر ہوتا ہے۔ ماہر تو وہی ہوتا ہے جو تجربہ رکھتا ہے اور مدتیں اس فن کی آب یاری میں گزار چکا ہوتا ہے ؎

کرم کہ رندوں نے عمریں گزار دیں ساقی ؛ مزاج دانیِ پیمانہ وسبو کرتے

تعلیم نسواں کا مقصد

بے کار تعلیم کے سلسلہ میں مجھے ایک اور نازک مرحلے سے بھی دوچار ہونا ہے اور وہ ہے عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ — اصولاً تعلیم نسواں کی ضرورت اور اہمیت سے تو کسی کو انکار نہیں لیکن عورتوں کی تعلیم خصوصاً اعلیٰ تعلیم کا کوئی مقصد ضرور متعین ہونا چاہیئے۔ یعنی عورتیں تعلیم حاصل کریں مگر کسی معین مقصد کے تحت اور وہ مقصد ایسا ہو جو نسوانی زندگی اور نسوانی مقاصد حیات سے ہم آہنگ ہو۔ میں جب عورتوں کو غیر مفید تعلیم کے چکر میں دیکھتا ہوں تو مجھ پر گہری پریشانی محیط ہو جاتی ہے حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ملک میں تعلیم نسواں کا سارا اسلوب غلط ہے۔ وہی مردوں کی نقالی، جس سے طبقہ نسواں میں بے روزگاری اور مغربی تقلید سے بیزاری بڑھ رہی ہے۔ مردوں اور عورتوں کی مخلوط تعلیم کا رواج عام بھی قابل غور ہے میرے خیال میں طریق تعلیم سراسر غیر مفید اور رسمی طرز تعلیم ہے اس میں پڑھانے والوں اور پڑھنے والوں کے مابین، افہام و تفہیم کے وہ مواقع نہ ممکن ہیں نہ مناسب جو استاد کے منصب اور فرائض کا جزو لازم ہے۔ جو امر کی تعلیم کی پیرل بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ ہر لڑکی کو ملازمت کرنی ہے ایک ایسے ملک میں جس میں خود مردوں کے لئے جگہیں کافی نہیں تو ہر لڑکی کو ملازمت کہاں مل سکتی ہے؟ میرے خیال میں جو اتنی تعلیم حاصل [illegible]

ملازمت کے لئے پڑھنے کے غلط رجحان نے پاکستانی معاشرت میں شدید بے اطمینانی کا احساس پیدا کر دیا ہے جس سے ہر وہ شخص آگاہ ہے جس کے ماتھے پر دو آنکھیں ہیں اور اس کی آنکھوں میں نور اور اس کے پیچھے وہ دیدۂ عبرت نگاہ بھی ہے جو سفید اور سیاہ میں فرق کو محسوس کر سکے۔ یہ اور بات ہے کہ اب ہمارے ملک کے مردوں نے عورتوں کے متعلق سوچنا شروع چھوڑ دیا ہے اور اس کو وہ حوشامد سے صنف نازک کی رعایت کہتے ہیں ——— حالانکہ یہ صنف نازک کے بارے میں تعامل یا بعض مسائل کو عورتوں کے متعلق سوچنا چاہیئے اور اس طبقے کی بہتری اور مستقبل پر ضرور رکھنی چاہیئے۔

اہلیت و استحقاق کا اعتراف

پاکستانی نظام تعلیم کا دوسرا اثر جمہوریت اصول ہے۔ جمہوریت کی غیر اصطلاحی تعریف یہ ہے کہ قانون اور شہریت کی نظر میں ملک کا ہر شہری برابر ہو وہ ملک کے فوائد اور وسائل سے اپنے حق کے اندر رہ کر فائدہ اٹھاتے اور ملک کے قواعد و ضوابط کی اطاعت کی ذمہ داری میں کسی شخص کو دوسرے کے مقابلے میں رعایت یا امتیاز حاصل نہ ہو۔

ہماری تعلیم میں یوں تو جمہوری اصول نافذ ہے اور مسلمانوں کی معاشرتی حس نے کبھی وہ تفاوت روا نہیں رکھا جو مثلاً جنوبی افریقہ یا امریکہ میں ہے پھر بھی انگریزی کے زمانے میں بعض ایسے نظام رائج ہو گئے ہیں جن میں امیر و غریب کا فرق بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ فرق بھی اب خاصا کم ہو رہا ہے۔ پھر بھی بعض گوشے ایسے ہیں جن میں دانستہ یا نادانستہ اس تفاوت کو ابھارا جا رہا ہے۔

تعلیم میں دو عملی

تفاوت کی یہ عملی شکل وہ دو عملی ہے جو اس وقت ہماری تعلیم میں روز بروز بڑھ رہی ہے۔ ایک طرف ملک کے عام اسکول ہیں جن میں غریبوں کے بچے پڑھ رہے ہیں۔ دوسری طرف پبلک اسکول ہیں جن کا ذریعہ تعلیم ابھی انگریزی ہے اور معاشرت کے لحاظ سے بھی وہ ملک کے جمہوری اسالیب زندگی سے مختلف ہیں۔ ان میں امراء کے بچے پڑھتے ہیں یا ان غرباء کے بچے جن کے ذہن پاکٹ کی کمزوری کے باوجود امیرانہ ہیں، یہ وہ گنگوا تیلی ہیں جو تیل لگانے نکلتے ہیں اور گھر لیتے ہیں تو اپنے آپ کو راجہ بھوج کے محل میں محسوس کرتے ہیں مگر جب آنکھ کھلتی ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ کل جائیداد سو کنال تھی وہ بچے کی تعلیم میں اٹھ گئی اس قسم کے گنگوا تیلی اس ملک میں بہت پیدا ہو رہے ہیں۔

یہ غلط فہمی نہ ہونے پائے کہ میں صاف ستھرے اسکولوں کا مخالف ہوں میں جب پبلک اسکولوں میں جاتا ہوں تو میرا دل باغ باغ ہو جاتا ہے صفائی، سلیقہ، نکھار، سنوار، اشجار قطار اندر قطار، گل و گلشن بہار اندر بہار ——— اسے نونہالوں کو صاف ستھرے لباس میں دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ یہاں کے بچے کم عمر ہو کر بھی انگریزوں سے بہتر انگریزی بولتے ہیں ——— خوب اچھی، ویسی نہیں جس کی شکایت سردار کرنیل سنگھ کو ہوتی تھی۔ انگلستان میں فر فر انگریزی بولنے والے بچوں کو اس نے سن کر کہا تھا "واہ بھئی اساڈے منڈے تے وہی وی ورے سر کھپا مرے نہیں انگریزی بول ہی نہیں سکدے۔ ایتھے تو چھاں ستاں وریاں وچ ہی خوب بولن لگے نیں" غرض ستھرے انگریزی والے جن کو سن کر کرنیل سنگھ کو کوئی شکایت نہ رہے اور مسابقہ کر ان اسکولوں میں تعلیم بھی اچھی ہوتی ہے اور یہ بھی خوشی کی بات ہے لیکن اس فضا میں پہنچ کر مجھے فوراً وہ لاکھوں کروڑوں بچے بھی یاد آ جاتے ہیں جن کو مدنے پیر ہماں باپ کے گھر پیدا کیا یہ وہ بچے ہیں جن کے پاس بعض اوقات قلم دوات، کتابیں تک بھی نہیں ہوتیں۔ ان کروڑوں کے اندر سے محض روپیہ کے زور سے محض چند فرزندوں کے بچوں کو اعلیٰ اور خوب صورت تعلیم دلا کر ایک اعلیٰ اور برتر طبقہ پیدا کیا جا رہا ہے۔ جس کی بظاہر ملازمت میں ترجیح ملے گی کیونکہ اس کا کلچر اعلیٰ، اس کی تعلیم خوبصورت اور اس کی TURNOUT چاق و چوبند اور اس کی انگریزی بھی ایسی کہ کرنیل سنگھ بھی باغ باغ ہو جائے۔ پھر کیا وہ کروڑوں بچے ازلی ابدی مذمت اور محروم ہیں جو عوامی اسکولوں میں پڑھتے ہیں اور اگر ہیں تو اس کی ذمہ داری تقدیر پر ہے یا ملک کے نظام تعلیم پر یا ماں باپ پر؟

میں مانتا ہوں کہ ملک میں چند پبلک اسکول بھی مفید ہی ہوں گے مگر اس کی کیا وجہ ہے کہ ہر سال پبلک اسکولوں کی تعداد اور ان کے لئے عوامی خزانہ سے گرانٹ بڑھ رہی ہے اس کے جال پھیلائے جا رہے ہیں۔ وقت آ گیا ہے کہ ہمارے ملک کا نظام حکومت اس تقسیمی دو عملی کو ختم کرے اور ملک کی پبلک کا روپیہ فرس کے پبلک اسکول پر ضائع نہ کیا جائے۔ داخلے کا حق برابر تمام ملت ہونا چاہیئے۔ ملازمتوں کا اصول صلاحیت و استعداد کے سوا کچھ نہ ہو تعلیم کا نصاب اور ذریعہ تعلیم یکساں ہو۔ کسی کے مقابلے میں ماسوائے قابلیت کے کوئی ترجیح نہ ہو۔ اقبال کے اس شعر کو ہم کتنی بار دہراتے ہیں اور جوش میں آتے ہیں۔ ؎

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقت نماز   قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز   نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

تو مساوات کے اس سبق پر تعلیم اور قومی زندگی میں عمل کیوں نہیں کرتے؟ طول کلام سے بچنے کے لئے میں پبلک اسکولوں کے کچرل اثرات کے سلسلے میں نہیں جاتا، لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ تہذیبی اقدار کے اعتبار سے بھی یہ اسکول ہماری توقعات کو پورا نہیں کرتے جو ہم ان سے ان کے گراں اخراجات کی وجہ سے رکھتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں صاحبی کی ایک نئی قسم نشو و نما پا رہی ہے اس کی سب سے بڑی سرپرستی یہی پبلک اسکول ہیں۔ معترض کہہ سکتا ہے کیا آپ گندے رہنا چاہتے ہیں؟ اگر سب اسکول ستھرے نہیں ہو سکتے تو چند ستھرے اسکولوں کو باقی رہنے دیجئے ——— لیکن میں نے کب کہا کہ میں ستھرے اسکول نہیں چاہتا۔ ایک منصوبے کے تحت تعلیم میں معیت کا اصول نافذ کر دیجئے۔ اس سے اسکولوں میں ہجوم کم ہو جائے گا۔ اور ہجوم کم ہونے کی صورت میں سب اسکول ستھرے بھی ہو سکیں گے۔ لیکن سادگی اور ملکی وضع اور کفایت شعاری لازمی شرط ہے پبلک اسکولوں کے متعلق میرا اختلاف تہذیبی وجوہ کے علاوہ اس وجہ سے بھی

تعلیم نہیں ملکہ ایک غیر ملکی زبان بنے۔ ایک ہی ملک کے ذریعہ تعلیم کے بارے میں یہ دو عملی ناقابل فہم بھی ہے اور قابل افسوس بھی۔

استعداد کی اساس پر انتخابیت ۔یہاں ایک غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے اس کو رفع کرنا ضروری ہے۔ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ جمہوریت کا مطلب یہ ہے کہ ملک کا ہر عاقلہ۔ ہر چیز ہر کسی کو یکساں مل جائے۔ یہ سخت غلط فہمی ہے لارڈ مارلے نے کہا تھا ”جمہوریت کے متعلق بدترین بات یہ ہے کہ اس نظام میں لوگ زندگی میں ایسے مقام و مرتبہ کو حصول جاتے ہیں“ مگر جمہوریت اوصاف مرتبری کی قائم مقام نہیں۔ جمہوریت ہرگز یہ حق نہیں دیتی کہ جو شخص جس چیز کا مستحق نہیں وہ بھی اسی کو مل جائے۔ کسی شے کے حاصل کرنے کے لئے استحقاق ضروری ہے اس کے لئے محنت اور استعداد دونوں لازم ہیں جمہوریت تو ہمارے لئے صرف اتنا ہی کر سکتی ہے کہ محنت اور استعداد کے باوجود ہم کسی دوسرے آدمی کے مقابلے میں محروم نہ کر دیئے جائیں۔

جمہوریت کی غلط تعبیر کی وجہ سے ہم بعض اوقات حکومت اور معاشرے سے معنوی چیز توقعات وابستہ کر لیتے ہیں اور فرق مراتب اور استعداد و استحقاق کی سطحوں کو نظر انداز کر کے اس چیز کی آرزو کرنے لگتے ہیں جس کی آرزو تو جائز لیکن اس کا حق ہم نے پیدا نہیں کیا ہے اعلیٰ اور اعلیٰ تر تعلیم ہی جمہوری اصول کو نافذ کرانے کے لئے انتھک حامیوں میں سے ہوں لیکن مجھے اکثر یہ احساس ہوا ہے کہ اعلیٰ اور اعلیٰ تر تعلیم میں انتخابیت کا قدرتی اصول کبھی نہ کبھی نافذ کرنا پڑے گا ورنہ بیکار تعلیم کی اتنی افراط ہو جائے گی کہ لوگ جہالت کو تعلیم پر ترجیح دینے لگیں گے اعلیٰ تعلیم میں ہجوم کا ایک کیا جانتے ہیں مطلب کیا ہے کالجوں میں جماعتیں طلبہ عام منتی جار ہی ہیں۔ اساتذہ کم ہوں زیادہ کم ہیں اور ہر طالب علم کے ساتھ استاد کا رابطہ شخصی نہیں ہو سکتا اور اعلیٰ تعلیم کے معیار حال سے گہری واقفیت کا کام نا ممکن ہو جاتا ہے ایسے طلبا۔ کو ڈگری تو حاصل ہو جاتی ہے مگر علم کی روح ان کے دل اور کان کے قریب بھی نہیں جاتی۔

بعض لوگ انتخابیت کو مخصوص مفادات کی خاطر پسند کرتے ہیں لیکن میں مخصوص مفاد والے گروہ میں سے نہیں ہوں میرا تعلق عوام سے ہے لہذا انتخابیت کے حق میں بات کہنے والے ہر کسی کو بدگمانی کی نظر سے نہ دیکھنا چاہیئے۔ انتخابیت ایک معصوم مگر قومی ترقی اور اعلیٰ تعلیم کے عمدہ نتائج کے سلسلے میں نہایت ناگزیر تجویز ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ تجویز امراء کے مقابلے میں غربا کے لئے زیادہ مفید ہوگی کیونکہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ذہانت کا چراغ غریبوں کے گھر میں زیادہ روشن رہتا ہے اس کے باوجود انتخابیت کے چند ناگزیر اصول ہیں جن کے بغیر عوام و جمہور کو مطمئن نہیں کیا جا سکتا۔ اول یہ کہ سچی ذہانت کو نشو و نما کے لئے پبلک اور حکومتی سطح پر ایسے ذرائع اختیار کئے جائیں کہ غریبی ذہانت کے اظہار میں مانع نہ ہو۔ وظائف کا وسیع نظام تیار کیا جائے۔ معیار نیز اسی کے امتحانات کو لائق اعتماد بنایا جائے تاکہ یہ شبہ نہ رہے کہ کوئی شخص اثر و رسوخ سے شعبدہ امتحانات یا کسی کی مہربانی سے ایک لائق مگر غریب آدمی سے بڑھ گیا۔

پاکستانی نظام تعلیم

ان سب باتوں کے باوجود کچھ لوگ جمہور میں ایسے بھی نکل آئیں گے جو اعلیٰ تعلیم میں داخلے کے معیار تک نہیں پہنچ سکیں گے تو میں خلوص سے عرض کروں گا کہ ہر ل تعلیم میں عارضی پرائیویٹ امتحان کے راستے کسی پر بند نہ ہونے چاہئیں۔ یوں کسی کا جی چاہے تو پرائیویٹ امتحان والوں پر یہ بات پہلے سے ظاہر کر دے کہ امتحان کا پرائیویٹ نظام باقاعدہ نظام کے برابر نہیں ہوگا عام رستہ ہی بھی اور ملازمتی انتخاب میں بھی ۔۔۔۔؟ اس صورت میں وہ اعتراض بھی رفع ہو جائے گا کہ باقاعدہ تعلیم اور بے قاعدہ تعلیم میں کو قدرتی فرق ہے وہ ملحوظ نہیں رکھا گیا اور کالج اسکولوں میں ہجوم بھی کم ہو جائے گا۔

اس کے علاوہ پرائیویٹ امتحان کی اجازت اس لئے بھی ضروری ہے کہ اس ملک میں لوگ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں لوگوں کا پیٹ پورا نہیں بھرتا پچھلی صدی سے اس وقت تک تعلیم تعلیم کی اتنی رٹ لگی ہے کہ بعض اوقات مذہب تک کو نظر انداز کر دیا گیا تھا اور لوگوں کا طرز عمل یہ ہو گیا تھا کہ مذہب کی تعلیم ہو نہ ہو انگلش کی تعلیم ضرور ہو۔ اور بڑے مزے بات کی یہ ہے کہ تعلیم کے اس بخار میں مذہبی تعلیم والے کو لوگ تعلیم یافتہ کہتے ہی نہ تھے تعلیم یافتہ صرف وہ جس نے سرکاری مدرسے میں تعلیم حاصل کی ہو خصوصاً انگریزی کی ۔۔۔ اس لحاظ سے مولانا شبیر احمد عثمانی اور علامہ سلیمان ندوی تک کو تعلیم یافتہ نہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ سب انگریزی تعلیم کے شوق کی وجہ سے ہوا تھا اور وہ شوق اب بھی بدستور موجود ہے اور لوگ اب بھی لکھنا پڑھنا چاہتے ہیں لہذا ان پر تعلیم کے دروازے بند کرنا آسان کام نہیں۔

پہلے غم یہ تھا کہ بالوں میں نہیں تاثر ۔۔۔ وہ جو مضطر ہیں تو اب رنج اثر ہے درپیش

لہذا اس کا واحد راستہ یہ ہے کہ ہر ل تعلیم میں پرائیویٹ امتحان کے راستے سب کے لئے کھول دیئے جائیں اس سمجھوتے کے ساتھ کہ یہ امتحان تعلیم کے شوق کی تسکین کے ہوگا ۔۔۔۔۔ اور ممکن ہے کہ کسی نازک وقت میں تعلیم یافتہ لوگوں کی یہ کھیپ بھی ملک و ملت کے لئے مفید ثابت ہو جائے۔

درحقیقت یہ مسئلہ ایسا ہے اس کو ٹالتے رہنے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ ضرورت ہے کہ اس مسئلہ کو انتخابیت اور پرائیویٹ امتحان کے امتزاج سے ہمیشہ کے لئے حل کر لیا جائے ۔۔۔۔۔ اگر یہ نہیں کیا جاتا تو گلگت سے لے کر کراچی اور چٹاگانگ تک ہر گاؤں میں پڑھے والوں کے جلسے لگتے جام کا اسطام کر دیکھئے۔ اسی صورت میں لاکھ لاکھ آدمی دیباچہ میں ۔ اور دو دو استاد۔ اور لاوڈ اسپیکر کی اجازت تو اس کام کے لئے مل ہی جائے گی۔ آپ ہی فرمایئے کہ تعلیم کی کون سی شکل ہوگی ایسی تعلیم سے بے تعلیمی اچھی، کم از کم جاہل آدمی کو یہ اقرار تو ہوتا ہے کہ میرے پاس ڈگری نہیں میں بے علم ہوں مگر موجی دروازے کے جلسوں کی مانند تقاضے مارتی ہوئی کلاسوں میں تعلیم پاکر نہ اقرار بھی کوئی کریگا کہ میں بے علم ہوں پسند کرتے میں تو چاہتا ۔۔۔

تعلیم میں پاکستانیت کا مقصد کسی با اصول پاکستانی نظام تعلیم کے لئے یہ بڑی بنیادی بات ہے کہ اس کے نصابوں سے پاکستانی قومیت کا جذبہ ترقی کرے مگر ابھی تک یہ سوال پریشان کئے ہوتے ہے کہ پاکستانیت ہے کیا؟ ذاتی طور پر میرے نزدیک پاکستانیت اسلامیت ہے تعمیر کرنے کا کا متبادل نفس ہے۔ عملی لحاظ سے پاکستانیت کا مطلب ہوگا۔ پاکستان سے محبت اس بنا پر کہ یہ وہ خطہ ہے جو ہمیں اس مخصوص دین ایک مخصوص طرز زندگی اور مخصوص تاریخی اصول رنگ کی روحی رنگی بنا پر حاصل ہوا ہے اور اب ہم اس میں نہ صرف ان کو اتفاق سے خود مکتفی ہوں گے بلکہ اس کی اقدار کو، ایک تہذیبی اور روحانی تجربے کے طور پر آگے بھی پھیلائیں گے اے

وصی اللہ

فنی تعلیم : اہمیت

قدیم تعلیم کا مقصد طلبا کے طرز فکر و عمل میں اچھی تبدیلی لانا سمجھا جاتا ہے اور جوں جوں انسانی تمدن زیادہ پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے تعلیم کے دو بڑے مقاصد سامنے آ رہے ہیں۔ اولاً یہ کہ طالب علم کو کسب معاش کے قابل بنایا جائے اور دوسرے یہ کہ اس کی شخصیت اور کردار میں نظریہ مقاصد حیات کے مطابق تبدیلی لائی جائے۔ مثال کے طور پر پاکستانی معاشرہ میں متعلمین کی بہت بڑی اکثریت اب محض اس لئے تعلیم حاصل نہیں کرتی کہ وہ تعلیم کے ذریعہ زیادہ مہذب زندگی گزار سکے گی، بلکہ اس کے سامنے تعلیم کے ذریعہ حصول معاش کے بہتر طریقے سیکھنا اور اختیار کرنا زیادہ واضح ہو کر رہتا ہے۔ محض اخلاقی اصلاح و تہذیب تعلیم کا مقصد نہیں رہی، جیسا کہ آج سے کچھ عرصہ پہلے سمجھی جاتی تھی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ علی گڑھ یونیورسٹی کے زمانہ آغاز میں جو مسلمان طلبہ وہاں تعلیم حاصل کرنے جاتے تھے ان میں کافی تعداد ایسے لوگوں کی ہوتی تھی جو اگر تعلیم حاصل نہ کرتے تو ان کی معاشی حالت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا تھا۔ زمینداروں اور جاگیرداروں کے بیٹے تعلیم کو ایک زیور سمجھ کر حاصل کرتے تھے تاکہ زیادہ مہذب اور متمدن سمجھے جائیں۔ آج اس کے برعکس تعلیم کا حصول زیادہ تر کسب معاش کے تقاضوں کے پیش نظر کیا جاتا ہے اور جو لوگ تعلیم حاصل نہیں کرتے ان کا معاشی مستقبل مختلف حالات میں تاریک سمجھا جاتا ہے۔ یہ نظریہ ملک کے اقتصادی حالات میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں ان کی وجہ سے زیادہ مضبوط ہوتا جا رہا ہے۔ آیئے ان تبدیلیوں کا جائزہ زیادہ گہرائی میں جا کر لیں۔

اقتصادی اعتبار سے ایک قدیم اور پسماندہ معاشرہ وہ ہوتا ہے جہاں پیدائش دولت کے وسائل محدود ہیں اور فی کس آمدنی میں قابل ذکر تبدیلی ممکن نہ ہو۔ ایسے معاشرہ میں مثلاً قابل کاشت زمین کا بیشتر حصہ چند جاگیرداروں کی ملکیت میں رہتا ہے اور آبادی کی اکثریت مزارع ہوتی ہے۔ کاشتکاری کے قدیم طریقوں کی وجہ سے فی ایکڑ پیداوار میں قابل ذکر اضافہ ممکن نہیں ہوتا۔ زراعت کی طرح صنعت و تجارت پر بھی چند افراد کی اجارہ داری ہوتی ہے اور صنعتی پیداوار بھی قدیم طریقوں کی وجہ سے محدود رہتی ہے۔ امیر اور غریب افراد کے درمیان فرق اقتصادی اعتبار سے اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ غریب طبقہ اکثر حالات میں اپنی معاشی حالت بہتر بنانا خارج از امکان سمجھنے لگتا ہے، اور تقدیر پر شاکر رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے برعکس امیر طبقہ کو جو وسائل حاصل ہوتے ہیں وہ ان وسائل پر اپنی گرفت مضبوط کرتا چلا جاتا ہے۔ اقدار حیات کے معاملہ میں بھی امیر اور غریب طبقہ کے بیچ بڑا فرق ہوتا ہے۔ امرا اور متمول افراد جن باتوں پر نظری اعتبار سے غریب لوگوں کے ساتھ متفق ہوتے ہیں، ان کے طرز عمل کے ساتھ ان باتوں کا سروکار تقریباً بالکل نہیں ہوتا۔ سیاسی قوت بھی امیر طبقہ کی دست نگر رہتی ہے۔

پاکستانی معاشرہ کچھ عرصہ قبل اور اب بھی اپنی بہت سی خصوصیات میں اسی قسم کا پسماندہ معاشرہ تھا اور ہے۔ ایسے معاشرہ میں تعلیم کا کام زیادہ تر تہذیبی اور ثقافتی نوعیت کا ہوتا ہے اور غریب افراد کی بہت بڑی اکثریت تعلیم کو اپنے حصول اعتبار سے باہر یا اپنے مقاصد زندگی کے لئے بے فائدہ تصور کرتی ہے اور زیادہ تر امرا افراد ہی تعلیم سے بہرہ ور ہونے کی فکر کرتے ہیں۔

اس قسم کے معاشرہ میں جب کوئی اقتصادی تغیر واقع ہونے لگتا ہے تو اس کی ابتدا میں تعلیم ہی کے بعض اثرات کارفرما ہوتے ہیں۔ مثلاً مختلف علوم کی ترقی سے پیدائش دولت کے جو نئے طریقے دریافت ہوتے ہیں جب غریب افراد کی ایک قابل ذکر تعداد کو ان کا علم ہوتا ہے تو وہ اپنا معیار زندگی بلند کرنے کے ذرائع سوچنے لگتے ہیں۔ مثلاً ہم میں سے ہر ایک اس بات سے اتفاق کرے گا کہ پاکستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریات پیدائش دولت کے قدیم طریقوں سے پوری نہیں کی جا سکتیں۔ زرعی پیداوار بڑھانے کے لئے ہمیں ہل کے بجائے ٹریکٹر، مصنوعی کھاد اور دوسرے جدید طریقوں کو اختیار کرنا پڑے گا۔ ہماری قدیم کھڈیاں ضرورت کا کپڑا تیار نہیں کر سکتیں۔ بڑی بڑی ملوں کا قیام اس مقصد کے لئے ضروری ہے۔ اسی طرح دوسری اشیاء ضرورت بھی بغیر جدید صنعتی ترقی کے اتنی تعداد میں نہیں بنائی جا سکتیں کہ لوگ عام طور پر خوشحال ہو سکیں۔

صنعتی معیشت کی جانب یہ قدم بعض ملکوں میں معاشرہ کے تعلیم یافتہ افراد کی تحریک پر اٹھایا جاتا ہے جیسا کہ برطانیہ اور امریکہ میں ہوا اور بعض ملکوں میں برسر اقتدار طبقہ ایسے حالات پیدا کر دیتا ہے کہ پیدائش دولت کے جدید طریقوں کے استعمال سے زرعی اور صنعتی پیداوار میں اضافہ ہو جیسا کہ پاکستان میں ہو رہا ہے۔ ان حالات کے پیدا کرنے میں تعلیم ایک نہایت اہم عامل کی حیثیت سے اثر انداز ہوتی ہے چونکہ تعلیم ہی کے ذریعہ لوگوں کو پیدائش دولت کے جدید طریقوں کا علم ہوتا ہے اور تعلیم ہی انہیں ایسے طریقوں کے استعمال کی ترغیب دیتی ہے، جبکہ ایسے امرا افراد جو اپنے علاقہ کے اقتصادی وسائل پر پہلے سے اجارہ رکھتے ہیں ایسے علاقوں میں تعلیمی سہولتوں کے عام ہونے کی شدید مزاحمت کرتے ہیں اور اس بات سے خوف کھاتے ہیں کہ ان کے غریب مزارع اور مزدور تعلیم یافتہ ہو کر اپنی غربت پر قانع نہیں رہیں گے اور ان کی اطاعت و خدمت میں فرق واقع ہونے لگے گا۔

بہرحال ایک مرتبہ اگر کسی قوم کے جسم میں علم کا انجکشن لگا دیا جائے تو اقتصادی ترقی کی راہ میں حائل جراثیم مرنے لگتے ہیں، چنانچہ ان تمام ملکوں میں جہاں تعلیم عام کی گئی اور وہاں کا معیار بلند ہوا اقتصادی ترقی ہو کر رہی۔ جوں جوں عوام میں تعلیم پھیلنے لگتی ہے وہ ایک ایسے زمانے کا دھندلا سا خواب دیکھتے

ہیں جب حرمت غیر ضروری ہو جائے گی اور اشیائے ضرورت اس قدر وافر تعداد میں پیدا ہوں گی کہ ہر ایک کی بنیادی ضروریات، زندگی آسانی سے پوری ہو سکیں گی۔ لوگ مالی وسائل پس انداز کر کے صنعتوں میں لگاتے ہیں اور پیداوار دولت کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد ایک وقت ایسا آتا ہے کہ مجموعی قومی آمدنی میں اضافہ کی رفتار آبادی میں اضافہ کی رفتار کو پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔ ذرائع رسل و رسائل کی ترقی کے ساتھ صنعتی پیداوار میں اضافہ تجارت کی ترقی کا موجب بنتا ہے اور روزگار کے نئے نئے مواقع عوام کے لئے پیدا ہونے لگتے ہیں۔ یہ صورت اگر استحکام کے ساتھ جاری رہے تو ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ہر قسم کی [illegible] صنعتی پیداوار کے لئے بنیادی اہمیت کی صنعتیں ملک میں قائم ہو جاتی ہیں اور پیداوار میں اس قدر اضافہ ہو جاتا ہے کہ خوشحالی عام طور پر پھیلنے لگتی ہے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ اس قسم کی صنعتی ترقی کے لئے تعلیم ہی عوام کو بنیادی طور پر تیار کرتی ہے۔ اگر کسی قوم کی افرادی طاقت پیدائش دولت کے جدید طریقوں میں تربیت یافتہ ہو تو وہ قدرتی وسائل کی کمی پر بھی قابو پا لیتی ہے۔ جرمنی اور جاپان دوسری جنگ عظیم میں تباہی کا ڈھیر ہو گئے تھے مگر ان کے تربیت یافتہ شہریوں نے پندرہ بیس سال کے قلیل عرصہ میں انہیں اقتصادی ترقی کی اسی منزلوں پر پہنچا دیا جن کا خواب وہ جنگ کی تباہ کاری سے پہلے دیکھتے تھے۔ اس کے برعکس ہمیں بھی آزاد ہوئے تقریباً اتنا ہی عرصہ گزرا ہے، تعلیم کی کمی کی وجہ سے ہماری پسماندگی میں بہت تھوڑا فرق واقع ہوا ہے۔ اس لئے تعلیم کو آج کل انسانی وسائل میں سرمایہ کاری کا نام دیا جاتا ہے۔ جس طرح قدرتی وسائل مثلاً زمین، جنگلات، معدنیات وغیرہ میں سرمایہ لگا کر پیداوار بڑھائی جا سکتی ہے اسی طرح انسانی وسائل میں سرمایہ لگا کر منافع حاصل ہو سکتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں تعلیم اور آمدنی کے تعلق کا تناسب ۹۰ سے ۹۵ فیصد تک پایا گیا یعنی جن افراد نے تعلیمی ترقی کی ان میں سے ۹۵ فیصد لوگوں کی آمدنی بھی بڑھتی گئی۔

اقتصادی ترقی کے تقاضوں کے تحت ہمارے ملک میں سائنس اور ٹیکنیکل تعلیم کی ضرورت روز بروز زیادہ شدت سے محسوس کی جا رہی ہے۔ جہاں تک حصول معاش کا تعلق ہے فلسفہ، تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات، عربی، فارسی، اردو وغیرہ میں اعلیٰ تعلیم اتنی مفید ثابت نہیں ہوتی جتنی طب، انجینئرنگ اور دوسرے ٹیکنیکل شعبوں میں تعلیم ثابت ہوتی ہے۔ جو علوم کچھ عرصہ پہلے تک مہذب اور متمدن بننے کی خاطر پڑھے جاتے تھے، آج ان کی تعلیم اکثر اوقات بے روزگاری کی طرف لے جاتی ہے اور جن ٹیکنیکل شعبوں میں تربیت کی ضرورت صنعتی ترقی کی وجہ سے بڑھتی جا رہی ہے وہاں روزگار کے درخشاں مواقع بھی بڑھتے جا رہے ہیں۔ اب کے طالب علم کو یہ کہہ کر ترغیب دلانا کہ تم محض پیسہ کمانے کی خاطر تعلیم حاصل کر رہے ہو خیال مؤثر نہیں رہا۔

زراعت میں ٹریکٹروں اور دوسرے جدید آلات اور طریقوں کا استعمال رفتہ رفتہ زیادہ افراد کا اس پیشہ سے منسلک رہنا مشکل بنا دے گا۔ دس ایکڑ رقبہ کاشت کرنے کے لئے جہاں پہلے پانچ افراد کی ضرورت ہوتی تھی اب دو تین افراد ہی یہ کام بہتر طور پر انجام دینے کے لئے کافی ہوں گے جس کا نتیجہ دیہات کی آبادی کچھ اس وجہ سے اور کچھ بعض دوسری وجوہ سے شہروں کا رخ کرے گی۔ پاکستان کی شہری آبادی میں اضافہ کی رفتار آج کل ۴ فیصد سالانہ ہے جب کہ کل آبادی تقریباً تین فیصد سالانہ کے حساب سے بڑھ رہی ہے۔ جو لوگ دیہات کے ماحول سے اٹھ کر شہروں میں سکونت اختیار کرتے ہیں معاشرتی اعتبار سے ان کی زندگی میں دور رس تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ کل وہ ایک ایسی آبادی میں رہتے تھے جہاں ہر شخص ایک دوسرے کو آبا و اجداد سے جانتا تھا۔ مضبوط روابط میں وہ ایک دوسرے کے ساتھ منسلک تھے اور ہر سو اخلاقی و معاشرتی اقدار کا حامل ماحول ان کی زندگی پر اثر انداز رہتا تھا۔ آج انہوں نے کسی شہر کے محلہ میں کرایہ کا مکان لے کر رہنا شروع کیا اور ماحول اور ہمسایوں کی اجنبیت نے ان تمام اخلاقی اور معاشرتی اقدار کے بندھن ڈھیلے کرنے شروع کر دیئے جن کا پاس انہیں اس سے قبل خدا کے خوف کی وجہ سے نہیں تو خلق کی شرم کی وجہ سے ضرور ہوتا تھا۔ جوان بھائی بہنوں پر مشتمل بڑے بڑے کنبے جو دیہات اور قصبات میں ساتھ رہتے تھے اب چھوٹے چھوٹے خاندانوں کی شکل میں دور دراز اور مختلف مقامات پر رہنے لگے جہاں انہیں حصول معاش کے مواقع حاصل ہوتے ہیں۔

پھر بدلتے ہوئے اقتصادی نظام میں کچھ لوگ اچانک امیر ہو گئے اور بے اندازہ سہولتیں اور مواقع جو انہیں یکایک مل گئے ان کے کردار میں غیر موافق تبدیلیوں کا سبب بنے۔ ان حالات میں پاکستانی معاشرہ میں عام طور پر ایک ایسی فضا قائم ہوتی جا رہی ہے جس میں لوگ جہاں اقتصادی ترقی کے لئے دیوانہ وار کوشش کر رہے ہیں وہاں ذہنی سکون اور اخلاقی استحکام میں کمزوری پیدا ہو جانے کے باعث نئے حالات سے ہرگز مطمئن نہیں اور عام طور پر یہ شکایت سننے میں آتی ہے کہ حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کی اصلاح جلد کی جائے ورنہ خدا معلوم معاشرہ کا کیا حشر ہوگا۔

بقیہ : نفسیاتی مسائل

مخلوط تعلیم

نفسیاتی حقائق کے مطابق مخلوط تعلیم دونوں صنفوں کے لئے باعث پریشانی ہوتی ہے۔ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک کے بھی ماہرین تعلیم کی اکثریت یہ رائے رکھتی ہے کہ مخلوط تعلیم میں طلبہ بہت سے نفسیاتی مسائل اور الجھنوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لڑکیوں کو تعلیم دی جانی چاہئے، لیکن ان کا بنیادی کام گھر سنبھالنا، بچوں کی تربیت کرنا اور خاوند کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم کرنا ہے۔ لڑکیوں کو پہلے تو اس کی تربیت دی جائے، اس کے بعد وہ چاہے کوئی بھی علم حاصل کریں، سائنس، طب اور عمرانی علوم میں اعلیٰ مہارت حاصل کریں [illegible] ہوگا لیکن موجودہ حالات میں لڑکیاں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اپنی زندگیاں برباد کر دیتی ہیں اور ان کی زندگی کا جو اولین مقصد ہے وہ پورا نہیں ہوتا۔ جیسے ایک ڈاکٹر کے لئے ضروری ہے کہ اپنے فن میں مکمل مہارت رکھتا ہو اس کے بعد وہ تاریخ، فلسفہ، مذہب اور دوسرے علوم کا مطالعہ کرے تو یہ اس کی خوبیوں میں اضافے کا باعث ہوگا لیکن اگر وہ اپنے پیشے میں ناکام ہے اور دوسرے علوم میں دسترس رکھتا ہے تو یہ اس کی خوبی نہیں ہوگی۔ لڑکیوں کو بھی اسی قسم کی تربیت دینی چاہئے جس میں ان اولین مقاصد کی تکمیل ہو جو ایک عورت کے لیے ضروری ہوتے ہیں، کیونکہ ان کا کام گھر میں جنت آباد کرنا ہے۔

ہم اس نظامِ تعلیم کے مخالف ہیں

محمد عبدالمالک لادینی نظام تعلیم کا مخالف تھا۔ اس نظام کو بدل کر اسلامی نظام تعلیم نافذ کرنے کے عظیم مقصد کی آبیاری اس نے اپنے خون سے کی، لیکن افسوس کہ ناکامیوں پر ناکامیاں آتی رہیں، مگر آج بھی ہم پر وہی نظام تعلیم مسلط ہے جو پہلے تھا۔ پاکستان کا ہر باشعور نوجوان عبدالمالک کی طرح اس نظام کا مخالف ہے، اور یہ مخالفت اس وقت تک جاری رہے گی جب تک اسے پوری طرح اسلام کے سانچے میں ڈھالا نہیں جاتا اور نئے سانچے کو اسلام میں ڈھالا نہیں جاتا۔ ذیل کا مضمون پاکستان کے طالب علموں کے انہی جذبات کی ترجمانی کرتا ہے

کسی لاگ لپٹ کے بغیر ہم بالکل صاف صاف عرض کرتے ہیں کہ

ہم —— پاکستان کے طالب علم

موجودہ نظامِ تعلیم کے مخالف ہیں —— !

ہم اس کے پہلے دن سے مخالف رہے ہیں اور جب تک اسے تبدیل کرکے ہمارے شایانِ شان تشکیل نہیں دیا جاتا،

ہم اس کی مخالفت کرتے رہیں گے،

اس کے خلاف ہماری آواز بلند ہوتی رہے گی ہم جو اس نظام کا براہِ راست شکار ہیں جو خود اس کے کڑوے کسیلے پھل سمیٹ رہے ہیں۔

آنکھوں دیکھتے اسے گوارا کرلیں؟

کیا فریاد کی لے بھی نہ اٹھائیں ؟

⁂

کہا جاتا ہے ——

تم بس اپنے پڑھنے سے کام رکھو،

نظامِ تعلیم کا غم کیوں کرتے ہو ؟

ہم کہتے ہیں ——

ہماری آنکھوں کے سامنے،

ہمیں تباہ و برباد کیا جائے —— ؟

باعزت اور درخشاں مستقبل کا گلا گھونٹا جائے،

امیدوں کے دیے بجھائے جائیں،

غلامی کی بیڑیاں مضبوط کی جائیں ——

—— اور ہم

تباہ و برباد ہوتے رہیں

اپنی دنیا لٹواتے رہیں،

اپنا دین بگڑنے دیں اور

—— چین کی نیند سوتے رہیں؟

صدائے احتجاج بھی بلند نہ کریں،

اس نظامِ تعلیم کے خلاف !

—— جو ہمیں اپنے دین اور اپنی اقدار سے دور لے جا رہا ہے —— یہ

—— جو ہم میں دنیا کو اسلام کی شمع ہدایت سے منور کرنے کا جذبہ نہیں جگاتا۔

—— جو ہم میں اعلیٰ اخلاقی صفات پیدا نہیں کرتا، نہ دیانت و اخلاق، نہ دلیری و شجاعت، نہ قربانی و سرفروشی۔

—— اور جو ہمیں اچھی تعلیم بھی نہیں دیتا۔

⁂

اس نظامِ تعلیم نے ہم کو دیا کیا ہے ؟

بس ایک ڈگری ——

—— جس کا اعلیٰ سے اعلیٰ مقصد —— دنیاوی آرام و آسائش ہے۔

—— جس کی بلند ترین اخلاقی قدر اپنا مفاد ہے۔

—— جس کے فکر کی آخری سطح —— مغرب کی نقالی ہے ——

اور پھر بھی ہم نے اس نظامِ تعلیم کو سینے سے لگا رکھا ہے

ہم کوئی لگڑی پڑی اور جاگ لگی قوم تھیں گو دوسروں کا پس خوردہ کھائیں اور مگن رہیں۔ ہماری اپنی شاندار روایات ہیں اپنی درخشاں

ہم اپنا ایک الگ منفرد، ممتاز اور برتر وجود رکھتے ہیں،
پھر ہمیں یہ کیا ہوگیا ہے کہ ہم!
اپنے وجود کے تحفظ کی فکر نہیں کرتے
اور دوسری کم تر قوموں کی ظاہری چکا چوند پہ فریفتہ ہو کر،
اپنے کو ان میں گم کیے دے رہے ہیں۔

وقت کا دریا رواں ہے!
یہ کسی کا انتظار نہیں کیا کرتا۔
ہم بہت سوئے، ۲۵ سال کی نیند بہت طویل ہوتی ہے۔
—— موقع ہے کہ اب بھی ہم جاگ جائیں۔
ہم بہت کھو چکے۔
ایک سے دو ہو گئے۔
اسی نظامِ تعلیم کے ہاتھوں ——
موقع ہے کہ اب بھی ہم بیدار ہو جائیں
اور اپنے مستقبل کی فکر کریں ——!
اس سے پہلے کہ ہماری ہستی گم ہو جائے
اور ہماری داستاں تک بھی نہ ہو ——!
داستانوں میں ——!!

تاریخ کی کیسی ستم ظریفی ہے
کہ یہ ملک
جو حاصل ہی اسلامی تہذیب کے قیام کے لیے کیا گیا تھا!
جو حاصل ہی اسلامی کلچر کے قیام کے لیے کیا گیا تھا!
وہاں ۳۱ سال بعد،
ہم طالب علم، اپنے بڑوں کو
جگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ہمارے کئی ساتھی
عبدالمالک سے لے کر ——
ابو محمد تک ——
عبدالوحید سے لے کر ——
سہیل شامی تک ——
اس مقصد کے لیے اپنی جانیں قربان کر چکے ہیں
کہ شاید
ان کی مظلومانہ شہادت قوم کو جھنجھوڑ دینے کا باعث بنے؟
اور آج بھی ——
اسی مقصد کے لیے
سروں پر کفن باندھ کر
مستقبل کو بچ کرتے ہوئے
بزرگوں کو اٹھانے
سوتوں کو جگانے
—— اور جاگتے ہوؤں کو تیز تر گامزن کا درس دیتے ہوئے!
کیا —— کیا ہمارے بزرگ
ہماری اس پکار پہ
—— لبیک نہ کہیں گے؟
—— لہو کی پکار ہے کہ لبیک کہو!
—— لبیک، لبیک!
منزل قریب ہے
اس انقلاب کی
سعادت کی زندگی ——!!
شہادت کی موت ——!

امتیاز عاصی (شعبۂ اردو)

تمام حسرتوں کا لہو چاٹتے رہے
بستی کے لوگ سو گئے ہم جاگتے رہے
اپنے تو اختیار میں محرومیاں ہی تھیں
جو راہ میں ملا اسے بھی بانٹتے رہے
اپنی کسی نگاہ میں بھی تو جگہ نہ تھی

پطرس بخاری

انجام بخیر

(ہندوستان میں ایک استاد کی حالت زار کے بوسیدہ مگر دکھ بھرے بیان کو طنز و ظرافت کے لطیف احساس سے چھیڑا ہے)

منظر

ایک تنگ و تاریک کمرہ جس میں بجز ایک پرانی سی میز اور ایک لرزہ براندام کرسی کے اور کوئی فرنیچر نہیں۔ ایک طرف خالی پیٹی ہے جس پر بے شمار کتابوں کا انبار لگا ہے۔ اس انبار میں سے جہاں جہاں کتابوں کی پشتیں نظر آتی ہیں وہاں شیکسپیئر، ٹالسٹائی، ورڈزورتھ وغیرہ مشاہیر ادب کے نام دکھائی دیے جاتے ہیں۔ باہر کہیں پاس ہی کتے بھونک رہے ہیں۔ قریب ہی کہیں رات اتری ہوئی ہے۔ اس کی میٹھی آواز بھی سنائی دے رہی ہے جس کے گانے والے کی صحت الٰہی ہے۔

پطرس نامی ایک نادار معلم میز پر کام کر رہا ہے۔ نوجوان ہے لیکن چہرے پر گذشتہ تدریس اور حرص ناحق کے آثار صرف کہیں کہیں باقی ہیں۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے ہیں۔ چہرے سے ذہانت پسینہ بن کر ٹپک رہی ہے۔

سامنے لٹکی ہوئی ایک جنتری سے معلوم ہوتا ہے کہ مہینے کی آخری تاریخ ہے۔

باہر سے کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ پطرس اٹھ کر دروازہ کھول دیتا ہے۔ تین طالب علم نہایت اعلیٰ لباس زیب تن کیے اندر داخل ہوتے ہیں۔

پطرس: حضرات اندر تشریف لے آئیے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ میرے پاس صرف ایک کرسی ہے لیکن جاہ و حشمت کا خیال بہت ہیچ خیال ہے۔ علم بڑی نعمت ہے۔ لہٰذا اے میرے فرزندو! اس انبار سے چند ضخیم کتابیں انتخاب کر لو، اور ان کو ایک دوسرے کے اوپر چن کر ان پر بیٹھ جاؤ۔ علم ہی تم لوگوں کا اوڑھنا اور علم ہی تم لوگوں کا بچھونا ہونا چاہیے۔

(کمرے میں ایک پراسرار نور سا چھا جاتا ہے۔ فرشتوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے)

طالب علم: (تینوں مل کر) اے خدا کے برگزیدہ بندے، اے ہمارے محترم استاد ہم تمہارا حکم ماننے کو تیار ہیں۔ علم ہی ہم لوگوں کا اوڑھنا اور علم ہی ہم لوگوں کا بچھونا ہونا چاہیے۔

(کتابوں کو جوڑ کر ان پر بیٹھ جاتے ہیں)

پطرس: کہو اے ہندوستان کے سپوتو! آج تم کو کون سے علم کی تشنگی میرے پاس کشاں کشاں لے آئی؟

پہلا طالب علم: اے نیک انسان! ہم آج تیرے احسانوں کا بدلہ اتارنے آئے ہیں۔

دوسرا طالب علم: اے فرشتے! ہم تیری نوازشوں کا ہدیہ پیش کرنے آئے ہیں۔

تیسرا طالب علم: اے ہمارے مہربان! ہم تیری محنتوں کا پھل تیرے پاس لائے ہیں۔

پطرس: یہ نہ کہو! یہ نہ کہو! خود میری محبت ہی میری محنت کا پھل ہے۔ کالج کے مقررہ اوقات کے علاوہ جو کچھ میں نے تم کو پڑھایا، اس کا معاوضہ مجھے اس وقت مل گیا جب میں نے تمہاری آنکھوں میں ذکاوت چمکتی دیکھی۔ آہ تم کیا جانتے ہو کہ تعلیم و تدریس کیسا آسمانی پیشہ ہے۔ تاہم تمہارے الفاظ سے میرے دل میں ایک عجیب مسرت سی بھر گئی ہے۔ مجھ پر اعتماد کرو اور بالکل مت گھبراؤ۔ جو کچھ کہنا ہے تفصیل سے کہو۔

پہلا طالب علم: (سر نیچا کر کے اور دست بستہ کھڑا ہو کر) اے محترم استاد! ہم علم کی بے بہا دولت سے محروم تھے۔ درس کے مقررہ اوقات سے ہماری پیاس نہ بجھ سکتی تھی۔ پولیس اور سول سروس کے امتحانات کی آزمائش کڑی ہے۔ تو نے ہماری دستگیری کی اور ہمارے تاریک دماغوں میں اجالا ہو گیا۔ مقدس معلم! تو جانتا ہے آج مہینے کی آخری تاریخ ہے۔ ہم تیری خدمتوں کا حقیر معاوضہ پیش کرنے آئے ہیں۔ تیرے عالمانہ تبحر اور تیری بزرگانہ شفقت کی قیمت کوئی ادا نہیں کر سکتا۔ تاہم اظہار تشکر کے طور پر جو کم مایہ رقم ہم تیری خدمت میں پیش کریں، اسے قبول کر کہ ہماری احسان مندی اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔

پطرس: تمہارے الفاظ سے ایک عجیب بے قراری میرے جسم پر طاری ہو گئی ہے۔

(پہلے طالب علم کا اشارہ پا کر باقی دو طالب علم بھی کھڑے ہو جاتے ہیں۔ باہر بینڈ یک لخت زور زور سے بجنے لگتا ہے)

پہلا طالب علم: (آگے بڑھ کر) اے ہمارے مہربان! مجھ حقیر کی نذر قبول کر۔ (بڑے ادب و احترام کے ساتھ اٹھنی پیش کرتا ہے)

دوسرا طالب علم: (آگے بڑھ کر) اے فرشتے! میرے ہدیے کو شرف قبولیت بخش۔ (اٹھنی پیش کرتا ہے)

تیسرا طالب علم: (آگے بڑھ کر) اے نیک انسان! مجھ ناچیز انسان کو ممنون فرما۔ (اٹھنی پیش کرتا ہے)

پطرس: (جذبات سے بے قابو ہو کر رقت انگیز آواز سے) اے میرے فرزندو! خدا کی رحمت تم پر نازل ہو۔ تمہاری سعادت مندی اور فرض شناسی سے میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ تمہیں اس دنیا میں آرام اور آخرت میں نجات نصیب ہو۔ اور خدا تمہارے سینوں کو علم کے نور سے منور رکھے۔ (تینوں اٹھنیاں اٹھا کر میز پر رکھ لیتا ہے)

طالب علم: (تینوں مل کر) اللہ کے برگزیدہ بندے، ہم فرض سے سبکدوش ہو گئے۔ اب ہم اجازت چاہتے ہیں کہ گھر پر ہمارے والدین ہمارے لیے بیتاب ہوں گے۔

پطرس: خدا تمہارا حامی و ناصر ہو اور تمہاری علم کی پیاس اور بھی بڑھتی رہے۔

(طالب علم چلے جاتے ہیں)

پطرس: (دعا میں سر بسجود ہو کر) باری تعالیٰ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے مجھے اپنی ناچیز محنت کے ثمرے کے لیے بہت دنوں انتظار میں نہ رکھا۔ تیری رحمت کی کوئی انتہا نہیں لیکن ہماری کم مائیگی اس سے بھی کہیں بڑھ کر ہے۔ یہ تیرا ہی فضل و کرم ہے کہ تو میرے وسیلے سے اوروں کو بھی رزق پہنچاتا ہے اور جو ملازم میری خدمت کرتا ہے اس کا بھی کفیل تو نے مجھ ہی کو بنا رکھا ہے۔ تیری رحمت کی کوئی انتہا نہیں اور تیری بخشش ہمیشہ ہمیشہ جاری رہنے والی ہے۔

(کمرے میں پھر ایک پراسرار روشنی چھا جاتی ہے اور فرشتوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ کچھ دیر کے بعد پطرس سجدے سے سر اٹھاتا ہے اور ملازم کو آواز دیتا ہے)

پطرس: اے خدا کے دیانتدار اور مخلص بندے! ذرا یہاں تو آئیو۔

ملازم (باہر سے): اے میرے خوش خصال آقا! میں کھانا پکا کر آؤں گا کہ تعمیل تیار ... کا کام ہے۔

ایک طویل وقفہ جس کے دوران میں درختوں کے سائے پہلے سے دگنے لمبے ہوگئے ہیں۔

پطرس: انتظار کی گھڑیاں کس طرح شیریں ہیں۔ کتوں کے بھونکنے کی آواز کس خوش اسلوبی سے بینڈ کی آواز کے ساتھ مل رہی ہے۔

(سر کھجا کر پڑھتا ہے)

پھر اٹھ کر میز کے سامنے بیٹھ جاتا ہے۔ اشرفیوں پر نظر پڑتی ہے۔ ان کو فوراً ایک کتاب کے پیچھے چھپا دیتا ہے۔

پطرس: آہ مجھے زر و دولت سے نفرت ہے۔ خدایا میرے دل کو دنیا کے لالچ سے پاک رکھیو!

(ملازم اندر آتا ہے)

پطرس: اے مزدور پیشہ انسان! مجھے تجھ پر رحم آتا ہے کہ ضیاءِ علم کی ایک کرن بھی کبھی تیرے سینے میں داخل نہ ہوئی۔ تاہم خداوند تعالیٰ کے دربار میں ہم سب برابر ہیں۔ تو جانتا ہے آج مہینے کی آخری تاریخ ہے۔ تیری تنخواہ کی ادائیگی کا وقت سر پر آگیا ہے۔ خوش ہو کہ آج تجھے اپنی مشقت کا معاوضہ مل جائے گا۔ یہ تین اشرفیاں قبول کر اور باقی کے ساڑھے اٹھارہ روپے کے لیے کسی لطیفۂ غیبی کا انتظار کر۔ دنیا امید پر قائم ہے اور مایوسی کفر ہے۔

(ملازم اشرفیاں زور سے زمین پر پھینک کر گھر سے باہر نکل جاتا ہے۔ بینڈ زور سے بجنے لگتا ہے)

پطرس: خدایا! تکبر کے گناہ سے ہم سب کو بچائے رکھ اور ادنیٰ طبقے کے لوگوں کا سا غرور ہم سے دور رکھ!

(پھر کام میں مشغول ہو جاتا ہے)

باورچی خانے میں کھانا جلنے کی ہلکی ہلکی بو آرہی ہے۔ ایک طویل وقفہ جس کے دوران میں درختوں کے سائے پہلے سے تگنے لمبے ہوگئے ہیں۔ بینڈ بدستور بج رہا ہے۔

یک لخت باہر سڑک پر موٹروں کے آکر رک جانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔

تھوڑی دیر بعد کوئی شخص دروازے پر دستک دیتا ہے۔

پطرس: (کام پر سے سر اٹھا کر) اے شخص تو کون ہے؟

ایک آواز (باہر سے): حضور میں غلاموں کا غلام ہوں اور باہر دست بستہ کھڑا ہوں کہ اجازت ہو تو اندر آؤں، اور عرضِ حال کروں۔

پطرس: (دل میں) میں اس آواز سے ناآشنا ہوں، لیکن لہجے سے پایا جاتا ہے کہ بولنے والا کوئی شائستہ شخص ہے۔ خدایا یہ کون ہے؟ (بلند آواز سے) اندر آجایئے۔

(دروازہ کھلتا ہے اور ایک شخص لباسِ فاخرہ پہنے اندر داخل ہوتا ہے۔ گو چہرے سے وقار ٹپک رہا ہے، لیکن نظریں زمین دوز ہیں اور ادب و احترام سے ہاتھ باندھے کھڑا ہے)

پطرس: آپ دیکھتے ہیں کہ میرے پاس صرف ایک ہی کرسی ہے، لیکن جاہ و حشمت کا خیال بہت پوچ خیال ہے۔ علم بڑی دولت ہے۔ لہٰذا اے محترم اجنبی، اس انبار میں سے چند ضخیم کتابیں انتخاب کر لو، اور ان کو ایک دوسرے کے اوپر چن کر ان پر بیٹھ جاؤ۔ علم ہی ہم لوگوں کا اوڑھنا اور علم ہی ہم لوگوں کا بچھونا ہو چکا ہے۔

اجنبی: اے برگزیدہ شخص میں تیرے سامنے کھڑے رہنے ہی میں اپنی سعادت سمجھتا ہوں۔

پطرس: نہیں، کون سے علم کی تشنگی تمہیں میرے دروازے تک کشاں کشاں لے آئی؟

اجنبی: اے ذی علم محترم! گو تم میری صورت سے واقف نہیں، لیکن میں محکمۂ تعلیم کا افسر ہوں اور شرمندہ ہوں کہ میں آج تک کبھی باریابی حاصل کرنے کے لیے حاضر نہ ہوا۔ میری اس کوتاہی اور غفلت کو اپنے علم و فضل کے صدقے معاف کر دو۔

(آبدیدہ ہو جاتا ہے)

پطرس: اے خدا کیا یہ سب وہم ہے۔ کیا میری آنکھیں دھوکا کھا رہی ہیں!

اجنبی: مجھے تعجب نہیں کہ تم میرے آنے کو وہم سمجھو، کیونکہ آج تک ہم نے تم جیسے نیک اور برگزیدہ انسان سے اس قدر غفلت برتی کہ مجھے خود اچھا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن مجھ پر یقین کرو۔ میں فی الحقیقت یہاں تمہاری خدمت میں کھڑا ہوں، اور تمہاری آنکھیں ہرگز دھوکا نہیں دے رہیں۔ اے شریف اور رحم دل انسان، یقین نہ ہو تو میرے چٹکی لے کر امتحان کر لو۔

(پطرس اجنبی کے چٹکی لیتا ہے۔ اجنبی بڑے زور سے چیختا ہے)

پطرس: ہاں اب مجھے کچھ کچھ یقین آگیا، لیکن حضورِ والا! آپ کا یہاں قدم رنجہ فرمانا میرے لیے اس قدر باعثِ فخر ہے کہ مجھے ڈر ہے کہیں میں دیوانہ نہ ہو جاؤں۔

اجنبی: ایسے الفاظ کہہ کر مجھے کانٹوں میں نہ گھسیٹو اور یقین جانو کہ میں اپنی گذشتہ خطاؤں پر بہت نادم ہوں۔

پطرس: (مبہوت ہو کر) مجھے اب کیا حکم ہے؟

اجنبی: میری اتنی مجال کہاں کہ میں آپ کو حکم دوں۔ البتہ ایک عرض ہے۔ اگر آپ منظور کریں، تو میں اپنے آپ کو دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان سمجھوں۔

پطرس: آپ فرمایئے میں سن رہا ہوں۔ گو مجھے یقین نہیں کہ یہ عالمِ بیداری ہے۔

(اجنبی تالی بجاتا ہے۔ چند خدام چند بڑے بڑے صندوق اٹھا کر اندر داخل ہوتے ہیں اور زمین پر رکھ کر بڑے ادب سے کورنش بجا لا کر باہر چلے جاتے ہیں)

اجنبی: (صندوقوں کے ڈھکنے کھول کر) بادشاہ معظم، شاہزادہ ویلز، وائسرائے ہند اور کمانڈر انچیف ان چاروں کے ایما پر یہ تحائف آپ کی خدمت میں آپ کے علم و فضل کی قدردانی کے طور پر لے کر حاضر ہوا ہوں (گڑگڑا کر) ان کو قبول کیجیے اور مجھے مایوس واپس نہ بھیجیے ورنہ ان سب کا دل ٹوٹ جائے گا!

پطرس: (صندوقوں کو دیکھ کر) سونا... اشرفیاں... جواہرات... مجھے یقین نہیں آتا (آنکھیں پونچھنے لگتا ہے)

اجنبی: ان کو قبول کیجیے اور مجھے مایوس نہ لوٹایئے (آنسو ٹپ ٹپ گرتے ہیں)

(گانا — آج موری انکھیاں نہ لاگیں)

پطرس: اے اجنبی تیرے آنسو کیوں گر رہے ہیں؟ اور تو کانپ کیوں رہا ہے؟ معلوم ہوتا ہے تجھے اپنے جذبات پر قابو نہیں۔ یہ تیری کمزوری کی نشانی ہے۔ خدا تجھے تقویت اور ہمت دے۔ میں خوش ہوں کہ تو اور تیرے آقا علم سے اس قدر محبت رکھتے ہیں۔ بس اب جاؤ کہ یہ ہمارے مطالعے کا وقت ہے۔ کل کالج میں اپنے لیکچروں سے ہمیں چار پانچ سو روحوں کو خوابِ جہالت سے جگانا ہے۔

اجنبی: (سسکیاں بھرتے ہوئے) مجھے اجازت ہو، میں بھی حاضر ہو کر آپ کے خیالات سے مستفید ہوں۔

پطرس: خدا تمہارا حامی و ناصر ہو اور تمہارے علم کی پیاس اور بھی بڑھتی رہے۔

(اجنبی رخصت ہو جاتا ہے۔ پطرس صندوقوں کو تھوڑی دیر تک غور سے دیکھتا رہتا ہے اور پھر یک لخت مسرت کی ایک چیخ مار کر گر پڑتا ہے اور مر جاتا ہے۔ کمرے میں ایک پراسرار نور چھا جاتا ہے اور فرشتوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ باہر بینڈ بدستور بج رہا ہے۔)

یہ تعلیم اور مسلم طلبہ

امین احسن اصلاحی

(جناب نے یونیورسٹی کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے مشہور تفسیر "تدبر قرآن" کے مصنف نے فرمایا ـــ)

مسلمانوں کے موجودہ تعلیمی مسئلہ پر گفتگو کرنے سے پہلے میں مختصراً آپ کو اس صورت حال کی طرف توجہ دلاؤں گا جو ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد اس ملک میں پیش آئی آپ کو معلوم ہے کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے جس طرح سیاسی حیثیت سے ہم کو حاکم کی جگہ محکوم اور دولی روائی کی جگہ غلام بنا دیا اسی طرح انقلاب نے علمی اور تہذیبی حیثیت سے بھی ہم کو اپنی سابق مقام سے نکال کر دوسروں کی تقلید اور پیروی کے درجہ تک گرا دیا ۔ اس سے پہلے تک اس ملک میں حاکم تھے اس وجہ سے آپ کے علوم و فنون آپ کی تہذیب اور روایات ہر چیز کو بالادستی حاصل تھی لیکن جب آپ محکوم ہو گئے تو ساری چیزیں بدل گئیں۔ آپ اس ملک میں بے اثر ہو گئیں اور اس قوم کے علوم و فنون کو رہنمائی کی جگہ حاصل ہوئی جس نے اس ملک میں آپ کی جگہ حکومت کی مسند سنبھالی اس صورت حال کے بہت سے نتائج نکلے ان میں سے چند اہم کی طرف مختصراً اشارہ کروں گا ۔

(۱) سب سے پہلی چیز تو غالب کا فطری رعب ہے جب کوئی قوم کسی قوم پر غالب آجاتی ہے تو اس کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ وہ محکوم قوم کے دین، تہذیب، روایات اور علوم و فنون کو بالکل تباہ کر دے، اور اس کی جگہ اپنے دین، تہذیب، روایات اور علوم و فنون کو رائج کر دے دنیا کی پچھلی تاریخ میں ہمیشہ ایسا ہی ہوا ہے اور آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا اسی وجہ سے ملک کے ہر گوشے سے ہمارا اپنا رنگ مٹ گیا

(ب) دوسری چیز جس نے فکری اور نظری اعتبار سے ہم کو حاکم قوم کے آگے بالکل بے بس کر دیا، وہ وہ ہماری مصلحانہ وحشت تھی انگریزوں کے غلبے کے بعد ہماری قوم کے نام نہاد پیشوا اور جوش حال مصلحین نے جس پالیسی میں نجات سمجھی وہ یہی کہ ...

علوم اور ہنر کو ہوا سمجھنا جرم کی

اور ہمارے علمی لیڈروں نے یہ تصور اس زور سے پھیلا کہ تھوڑے دنوں کے اندر اندر ہمارا دین اور ہمارے علوم و فنون سب خود ہماری نظروں میں بے وقعت ہو کر رہ گئے اور حکمران قوم کی ہر چیز کو آہستہ آہستہ اپنایا جاتا تھا، ہم نے پوری چابک دستی کے ساتھ خود اپنے ہاتھوں ان کی دھجیاں اڑا دیں ۔

ظاہر ہے کہ کسی قوم کا مذہب، روایات اگر خود اس کی نظروں میں بے حیثیت ہو جائیں تو پھر دنیا کی کوئی قوت ان کو سنبھال نہیں سکتی، چنانچہ تھوڑے ہی دنوں کے اندر ہم نے اپنے کانوں کی سلم کا یہ اثر دیکھ لیا کہ ہماری قوم کا تقریباً سارا تعلیم یافتہ طبقہ صرف یہ کہ اپنی تمام اصلی خصوصیات اور صفات سے بالکل ناآشنا اور محروم ہو گیا بلکہ وہ اس کی یاد سے بھی شرم محسوس کرنے لگا

(ج) تیسری چیز جس نے خاص طور پر اس ملک میں ہمارے مذہبی شعور کو کچلنے پر ہمارے حکمرانوں کو ابھارا، وہ رد عمل تھا جو شاید کے انقلاب کے بعد ہماری قوم کے مذہبی طبقات نے کیا آپ کو معلوم ہے کہ جس گروہ نے اس ملک میں انگریزوں کے اقتدار کو گوارا نہیں کیا، بلکہ اس کی مخالفت میں جدوجہد کی وہ ہمارے علما کا گروہ ہے اس وجہ سے ہمارے حکمرانوں کو ہماری مذہبی اور قومی روایات اور دینی تعلیم کی طرف سے سخت اندیشہ پیدا ہو گیا اور اس ملک میں وہ اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کے لیے اس بات کو ضروری سمجھنے لگے کہ ہر گوشہ زندگی سے اسلام اور اسلامی روایات کو یک قلم مٹا دیں چنانچہ ایک عرصے تک انہوں نے اسلام دشمنی کے تیرے حد سے سے زیادہ مہم جاری کی کہ خود دینی تحریکات مولانا سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہید کی یاد دلوں میں تازہ کر سکتے ہیں، وہ سب فراموش کر دیے جائیں۔ تاکہ مسلمانوں کو بھی اپنے ماضی کی طرف توجہ کرنے کا کوئی حوصلہ پیدا ہو سکے

ان حالات میں انہوں نے اس ملک کے لیے جو تعلیمی پالیسی تجویز کی وہ لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسی کی صورت میں ظاہر ہوئی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اس ملک میں ایسا نظام تعلیم جاری کیا جائے جو انگریزوں کی گاڑی کھینچنے والے بیل پیدا کرے ۔ اس تعلیمی پالیسی پر یونیورسٹیاں اور کالج قائم ہوئے جن میں آپ تعلیم پا رہے ہیں اس تعلیمی پالیسی کو سرسید مرحوم نے جوں کا توں قبول کر لیا اور اپنی قوم کو دعوت دی کہ نجات اور ترقی کا راستہ انگریزی تعلیم ہی میں ہے، اور حالات نے ان کی اس دعوت کے اندر ایسی کشش پیدا کر دی کہ تھوڑے دنوں کے اندر اندر ہماری قوم کا تمام ذہین طبقہ انگریزوں کے دفاتر میں کلرکی کی جگہ حاصل کرنے کے لیے کالجوں میں پہنچ گیا۔

اس تعلیم نے آپ کو غلامی کے فن سے آشنا کیا، لیکن ایک آزاد قوم کی جو ذمہ داریاں ہوتی ہیں ان کے اٹھانے کی کوئی صلاحیت پیدا نہ کی اس کے ذریعے سے آپ نے دوسروں کے علوم و فنون اور تہذیب کے متعلق تقلیدی طور پر بہت کچھ جانا، لیکن خود اپنے مذہب اور علوم و فنون کی آپ کو ہوا تک نہ لگی اس تعلیم سے دوسروں کے احکام بجا لانے کی صلاحیت تو پیدا ہو گئی لیکن ایک حکمران قوم کے فرائض انجام دینے کے لیے یہ تعلیم بالکل ناکارہ ثابت ہوئی اس تعلیم سے صرف محکومانہ ذہنیت پیدا ہو سکتی ہے دوسرے ترقی یافتہ ممالک میں بھی اس تعلیم نے انسانیت کی کوئی مفید خدمت انجام نہیں دی روح و اخلاق کی تعلیم سے یہ بالکل عاری ہے، اسی لیے اس تعلیم نے انسان کو طاقتور اور چالاک تو بہت بنا دیا، لیکن دیانتدار اور ذمہ دار نہیں بنایا اس نے سائنس کے زور سے ساری دنیا کو ایک ہی مکان تو بنا دیا مگر انسان کو اس میں بھائی بھائی بن کر رہنا نہیں سکھایا اس نے ہر شخص کے ہاتھ میں ایک خونخوار تلوار تو دے دی، مگر جس رہنمائی حق شناسی کی ضرورت تھی وہ نہیں بخشی اس کمی کا نتیجہ وہ فساد فی الارض ہے جس میں ساری دنیا آج مبتلا ہے ۔

بہرحال یہ آپ کی موجودہ ضروریات کے بالکل ناکافی ہے اب اس ملک کے حالات بالکل بدل چکے ہیں اب آپ غلام نہیں، بلکہ آزاد ہیں، اس لیے اس تعلیم سے آپ کی ضروریات پوری نہیں ہو سکتیں

(باقی صفحہ ۲۰۴ پر)

جب ہم پڑھتے تھے

موجودہ صدی کا پہلا دہا تھا جب ہم اپنے گاؤں سے متصل ایک مڈل سکول کی پرائمری جماعتوں میں پڑھتے تھے۔ اس وقت بھی کچی پہلی پکی پہلی کی کوئی تقسیم نہ تھی سیدھی سادی پہلی جماعت تھی۔ پہلی جماعت کے مدرس میاں جی برکت علی تھے جو ہماری مسجد کے اعزازی پیش امام بھی تھے چونکہ صرف پرائمری پاس تھے اس لئے ان کو صرف چھ روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ میری جماعت میں مجھ سمیت صرف تیس لڑکے تھے جو کھدر کے کپڑے ہی پہنتے تھے۔ ان تیسوں کی طرف دیکھ کر میاں جی برکت علی کہا کرتے تھے اور اکثر کہا کرتے تھے کہ جن بچوں کو ابھی سے مول کے کپڑے پہنا کر فضول خرچی کی ترغیب دی جاتی ہے یہ بڑے ہو کر بھلا گھر کیسے چلائیں گے ان کی ساری کمائی تو کپڑوں پر اٹھ جایا کرے گی اور پھر وہ اپنی کھدر کی چادر سے اپنا چہرہ پونچھ کر کہتے یہ بھی دیکھو! کپاس میرے اپنے کھیت میں پیدا ہوئی۔ میری والدہ نے اسے چرخی میں اوٹا۔ رمضان نداف نے اسے دُھنا جو ہر گھر سے ہر فصل پر پانچ سیر دانے لیتا ہے۔ پھر اسی والدہ اور ہمشیرہ نے باری باری اس کو کاتا اور گاؤں کے جلاہے نے اسے بُنا۔ دھوبی نے اس کی پان نکالی اور جب دھل دُھلا کر آیا تو ماں نے کرتہ پگڑی اور تہبند سیا اور چادر میں اڑھائی پاٹ جوڑے اور خود ہی سی! بھلا ہمارا کیا خرچ ہوا؟ تم لوگ چھ پیسے گز کی بمبئی [illegible]، جرمنی سے یہ چار آنے گز کا ململ لیتے ہو۔ چار آنے قمیص کی سلائی اور چار آنے شلوار کی سلائی دیتے ہو۔ بھلا اس فضول خرچی سے کیا فائدہ؟

پہلی جماعت میں ہمیں اردو کا قاعدہ پڑھایا گیا اور تختی پر الف بے لکھنا سکھایا گیا۔ سبز کنڈے سے تختی سیاہ کرنے کا رواج تھا لیکن پہلی جماعت کے طالب علم اس کے مکلف نہیں تھے یہ کام دوسری تیسری جماعت کے طلبہ رضاکارانہ انجام دیتے تھے۔ تختی سامنے رکھ کر حروف لکھے جاتے اور ان کے گرد بٹھائے جاتے۔ استاد ہمیں بتاتے کہ الف کا طول قلم کے حساب سے کتنے نقطوں کا ہونا چاہئے اور بے کا کتنا۔ دائرے کے بارے میں بس اتنا سا ہی تھا اور اس پر گرفت بھی ہوتی تھی۔ دس تک پہاڑے یاد کرنے ضروری تھے۔ حاضری اور چھٹی کا ان دنوں کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ سورج نکلتے ہی مدرسے پہنچنا ہوتا تھا۔ دوپہر کو کھانے کا وقفہ ہوتا تھا۔ گاؤں کے بچے اپنے اپنے گھروں میں کھانا کھانے چلے جاتے۔ دور سے آنے والے بچے اپنا دوپہر کا کھانا ساتھ لاتے تھے اور پاس کے کنوئیں پر کسی درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کر کھاتے۔ کھانے کے بعد پھر پڑھائی شروع ہوتی۔ عصر کے وقت چھٹی کے بعد میدان میں لڑکے جمع ہو کر اپنی اپنی عمر کے مطابق تھوڑی دیر کھیلتے کودتے اور مغرب سے پہلے گھروں کو روانہ ہو جاتے۔

شرارت اور کھیل کود تو ہر دور میں ہوں لیکن اس زمانے کی شرارتوں میں طلبہ آپس میں الجھتے رہتے تھے اور لڑائی اور ایک دوسرے کی شکایت بھی۔ استاد کے احترام کے پیش نظر استاد سے نہیں کرتے تھے۔ استاد ان دنوں دری پر بیٹھتے تھے اور ان کے سامنے دو رویہ طالب علموں کی قطاریں ہوتی تھیں جو گھوٹا ٹاٹ پر بیٹھتے تھے۔ جب تک استاد دری پر بیٹھا رہتا یہی کیفیت رہتی کہ دم بخود رہتے اور پیچھے پیچھے ایک دوسرے کو ٹھوکے دیتے رہتے۔ شرارت کی سزا میں پہلی جماعت میں صرف مرغا بنتے لیکن اوپر کی جماعتوں میں مولا بخش سزا بھی ملتی تھی جو گھوٹا سلیٹ یا تختی کمر پر مار کر دی جاتی تھی، کبھی کبھی پنجی سے بھی ضرب لگائی جاتی تھی پھر استاد سزا دے کر آزاد کر دیتا۔ ایک دن ایک لڑکا خوش خط تھا میں نے حسد کے مارے اس کی دوات میں ریت بھر دی استاد نے اس قدر رول ہاتھ پر مارے کہ ہاتھ سوج گیا روٹی کھانے گھر گیا تو دادی اور اماں نے ملامت کی کہ بائیں ہاتھ سے کھانا مکروہ ہے۔ میں نے عذر کیا کہ دائیں ہاتھ پر بھڑ نے کاٹا تو سوج گیا۔ اتنے میں ایک ہم جماعت آیا تو اس نے سارا بھانڈا پھوڑ دیا۔ دادی اور اماں نے کہا اچھا ہوا تیری سزا یہی تھی۔

دوسری جماعت کے استاد ایک ہندو تھے جن کا بایاں ہاتھ کلائی کے پاس سے سوکھا ہوا تھا لیکن طاقت کے دھنی تھے۔ پہاڑوں کے معاملے میں بہت سخت تھے لیکن اردو میں ان کا علم سماعی نہیں لفظی یا قیاسی تھا۔ مولانا آزاد کی کتاب سے بیماری کا سبق پڑھایا تو لفظ ٹگ ٹٹ کا تلفظ انہوں نے ٹگ بٹ کرایا معائنہ کے لئے ایک بڑے ہی خوش باش اے ڈی آئی صاحب آئے ان کا نام میسر لال تھا طلبہ کو بات بات پر ہنساتے تھے، اردو سننے لگے تو ایک لڑکے نے ٹگ بٹ پڑھا دوسرے نے ٹگ بٹ پڑھا میں نے ڈرتے ڈرتے ٹگ ٹٹ پڑھا۔ وہ بولے! تم استاد سے نہیں پڑھتے کیا؟ میں نے جواب دیا کہ جناب استاد نے تو ٹگ بٹ ہی پڑھایا تھا لیکن میرے چچا نے بتایا کہ لفظ ٹگ ٹٹ ہے وہ کہنے لگے تمہارے استاد سچے ہیں یا چچا؟ استاد بولے کہ یہ لڑکا بہت ناسمجھ ہے۔ اے ڈی آئی صاحب اپنی ہنسی نہ روک سکے اور مجھے ایک پیسہ انعام دے کر اگلی جماعت کی طرف بڑھ گئے۔ کون یقین کرے گا کہ میں نے ایک پیسے کا پونڈا خرید لیا تو شام تک اس کے رس سے پیٹ بھرا رہا۔ دوسری جماعت کے استاد پرائمری کے بعد جے وی کا امتحان بھی دے چکے تھے اس لئے انہیں آٹھ روپے ملتے تھے اور جے وی ہونے پر ان کو بڑا مان تھا۔

چوتھی جماعت سے فارسی شروع ہوتی تھی اور پانچویں جماعت میں گلستان پڑھائی جاتی تھی لیکن تختی اور سلیٹ یہاں بھی بدستور ساتھ تھی۔ قلم بنانے کی مشق کرائی جاتی تھی اور اچھی قلم نہ بنا سکنے پر انگلیوں پر سوٹیاں پڑتی تھیں میرے بائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی پر آج بھی ایک گٹا باقی ہے جو دراصل اسی سزا کی یادگار کے طور پر موجود ہے۔ چوتھی پانچویں جماعت کے استاد ایک ہی تھے۔ انہوں نے میرے دادا کے وقت میں پڑھانا شروع کیا تھا میرے والد بھی ان سے پڑھے۔ انہوں نے پورے تریپن برس اسی سکول میں تعلیم دی۔ فارسی کا مذاق بہت اچھا رکھتے تھے اور جب ہیڈ ماسٹر ان کے کمرے میں آتے تو دونوں فارسی میں باتیں کرتے اور بات بات میں شیخ سعدی نے بھی تو فرمایا ہے یعنی سعدی کے اشعار پڑھتے رہتے۔ ہیڈ ماسٹر لالہ منشی رام بھی انہی کے شاگرد تھے اور میرے والد صاحب کے ہم جماعت تھے لیکن مڈل پاس کرنے کے بعد ایس وی کر چکے تھے اس لئے درجے میں استاد سے بھی بڑھ گئے۔ تاہم وہ ان کا ادب استاد ہی کی طرح کرتے تھے۔

چھٹی جماعت سے مڈل کی پڑھائی شروع ہوتی تھی۔ مضامین یہ تھے اردو کورس، فارسی (بہار دانش) جغرافیہ ہندوستان، تاریخ ہند، الجبرا، جیومیٹری، حساب،

(باقی صفحہ … پر)

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی

تعلیم — بگڑے پہلو

میں ایک ایسے نظام کو کیسے پسند کر سکتا ہوں جو قوم کے لئے تیغِ قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہاں ہاں تیغِ قاتل۔ میں یہ بات پوری ذمہ داری سے کہہ رہا ہوں۔ اس نے پوری قوم کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ کھوکھلا، بالکل کھوکھلا۔ اگر ہم قوم کو صحیح معنوں میں صحت مند بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔

ایک زمانہ تھا کہ مسلمان ترقی کے مدارج پر تھے۔ اس وقت حصولِ علم کے لئے زندگیاں وقف ہوتی تھیں اور علم و فضل کی مجلس پر فخر کیا جاتا تھا۔ دل و دماغ کو منور کرنے کی ہر تحریک، ادبیات اور عمل و عبادت بھی جاری تھی۔ اس برِ عظیم میں جب مغربی تعلیم کا اجرا ہوا تو اس کے متعلق مسلمانوں کا طرزِ عمل ابتدا میں مخاصمانہ تھا اور بعد میں انہوں نے اس تعلیم کو زیادتی کے ایک آلہ قدرت کے طور پر برداشت کرنا۔ اس نے کبھی سامنے کھل کر ہمیں اطمینان، اور کبھی ساری کامل وفاداری حاصل کی۔ آزادی کے بعد یہ طرزِ عمل بدل جانا چاہئے تھا۔

مگر ایسا نہیں ہوا کیونکہ ہمارا نظامِ تعلیم ہماری امانت اور روحانی تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگی حاصل نہیں کر سکا۔ وہ ایک غیر ملکی پودا ہی رہا اور اسی حیثیت سے جاری طور تک رہا۔ اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ ہمارے دلوں میں کوئی تاثر پیدا نہیں کر پایا۔ وہ اب تک روزی کمانے کا آلہ ہے، اور ایک ایسی قوت نہیں بن سکا جو روح کو بلند کر سکے۔ محض ایک مادی لائحہ ہے، اور یہ تہذیب اور سمیت نہیں بن سکا ہے۔ وہ اساسی غیر ... اور ... کسب ہے، حقیقی کرب تو ہاتھ کی محنت ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ ... کی سب ہی کبھی کبھی کمال حاصل کر کے فنی تخلیق کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اب ہم اگر اپنے آپ کو ایسے بھنور میں پھنسا ہوا پاتے ہیں ... تو ہمیں اس پر حیرت و استعجاب نہیں ہوتا۔ البتہ معلوم ہوتا ہے کہ اب ہم ایک ایسے کنارے پر آ گئے ہیں جس سے آگے اندھیرا ہے اور جب تک ہمیں کوئی راہ باہر جانے کے لئے نہیں ملتی ہم کہیں بھی نہیں پہنچ سکتے۔ اگر میں حقیقتِ حال کی طرف توجہ مبذول نہ کراؤں تو اپنے فرض میں کوتاہی کروں گا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس وقت ملک میں اعلیٰ تعلیم پر ایک بحرانی کیفیت طاری ہے۔ باوجود اس کے کہ حکومت نے جامعات کو کثیر رقوم بطور امداد دیں اور اس رقم کو لائق و قابل اساتذہ کے تقرر، اچھی عمارتوں اور ساز و سامان کی بہم رسانی پر صرف کر کے اس کا بہترین استعمال کیا گیا ہے، تعلیمی معیار نہ صرف ناکام ہیں بلکہ انحطاط پذیر ہیں۔

تعلیم کے عام طور پر دو مقصد قرار دیئے جاتے ہیں۔ پہلا مقصد طلبا میں علم کا ذوق پیدا کرنا ہے۔ اس لئے کہ اس زمانے میں علم کی مقدار اتنی بڑھ گئی ہے کہ پورے علم کو طلبا میں منتقل نہیں کیا جا سکتا اور کسی زمانے میں بھی طلبا کو یہ ضرورت نہیں تھی کہ تمام علم منتقل کر دیا جاتا ہو، لیکن اس زمانے میں خصوصیت سے جب دنیا کے تمام حصوں سے ہر فن پر اور علم کے ہر شعبے میں ہزاروں کتابیں چھپ کر ہر ہفتے نکلتی ہیں۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی جامعہ کسی علم کو طالب علموں میں پوری تفصیل کے ساتھ منتقل کر دے اور چونکہ علم کو بالتفصیل منتقل نہیں کیا جا سکتا، اس لئے اب سے کئی سال پہلے سے یہ امر عام طور پر تسلیم ہو چکا ہے کہ استاد کے سامنے صحیح مقصد یہ ہونا چاہئے کہ وہ طالب علم کے دل میں علم کا شوق پیدا کر دے اور اس مضمون سے جو وہ پڑھاتا ہے دلچسپی پیدا کرے۔

دوسرا مقصد یہ ہے کہ وہ طالب علم میں تنقید کی قابلیت پیدا کرے تاکہ جب اس کے سامنے کوئی بیان آئے تو اس کی قدر و قیمت پرکھ لے۔ ظاہر ہے کہ اب اس کثرت سے علمی مباحث پر تحریر کیا جاتا ہے، وضاحت سے ایسے خام خیال بھی سامنے آ جاتے ہیں جن کی تردید لازمی ہوتی ہے۔ اس لئے طالب علم میں مضمون سے دلچسپی اور تنقیدی صلاحیت پیدا کرنے کے دو کام دراصل استاد کے فرائض ہیں اور اس کی ذمہ داری میں شامل ہیں۔ ایک اور اہم ذمہ داری بھی استاد اور ان اداروں پر جو اساتذہ پر مشتمل ہیں، عائد ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ وہ طلبا میں ایسا کردار پیدا کریں کہ جو علم انہیں حاصل ہو رہا ہے اس کا وہ صحیح استعمال کر سکیں اور اس کا غلط استعمال نہ کریں تاکہ علم ان کے لئے باعثِ رحمت ہو اور محاسنِ اکبر بن جائے۔

اگر میں یہ کہوں کہ ہمارے نظامِ تعلیم میں یہ مقاصد پورے ہو رہے ہیں، تو یہ ایک صریح غلط بیانی ہوگی۔ ہمارے پڑھے لکھے افراد اس توقع پر پورے نہیں اترتے کہ وہ معاشرے کے مسائل کی اس اونچ نیچ سے واقف ہوں جس سے واقفیت معاشرے کو دراصل توجہ سے میسر آ سکتی ہے اور جس سے عدم توجہی معاشرے کو بگاڑ سکتی ہے۔ آپ نے کبھی غور کیا کہ اس کا کیا سبب ہے کہ ہمارے ہاں کردار کی یہ خرابی جاہل طبقے تک محدود نہیں ہے، بلکہ ہم میں سے سب سے اعلیٰ ڈگری یافتہ بھی اس مرض میں مبتلا ہیں اور ان سے بھی جس کردار کی توقع کی جا سکتی ہے وہ ان میں نہیں پیدا ہو سکا۔ یہ بالکل ظاہر ہے کہ اگر ہمارے ادارے صاحبِ کردار طالب علم پیدا نہیں کر سکتے تو ان اداروں کی بڑی سخت کوتاہی ہے۔ اور اگر استاد کی صحبت اور تربیت اور تعلیم کا اثر طالب علم قبول نہیں کرتا تو یقیناً کہیں نہ کہیں ہم میں کھوٹ موجود ہے اور اس ملک کی سب سے بڑی ضرورت ہے کہ ہم یہ معلوم کریں کہ وہ کھوٹ کس جگہ ہے۔ ایک استاد کی حیثیت سے ہم نے انتہائی سنجیدگی سے اپنا محاسبہ کیا ہے۔

شاید ہم طلبا میں یہ جذبہ پیدا نہیں کر سکے ہیں کہ وہ ہماری زیادہ عزت کریں۔ اس لئے کہ اپنے روزمرہ کے تدریس کے فرائض پورا کرنے کے بعد ہمیں اتنا وقت نہیں ملتا کہ کوئی نصب العین اپنے شاگردوں کے ذہن نشین کرا سکیں، اور جو کچھ تھوڑی بہت پند و نصیحت کرتے ہیں اس پر بدقسمتی سے ہم خود عمل نہیں کرتے۔ غالباً ہم طلبا میں وہ دلچسپی لینے کے لئے تیار نہیں جو بحیثیت استاد ہم کو لینی چاہئے۔ کبھی کبھی ان جوہروں کا مشاہدہ کرنے کے برعکس جن کی عموماً استادوں سے توقع کی جاتی ہے وہ ہماری خامیوں کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ کبھی کبھی فراخیٔ طبع کی جگہ ہمارے بچکانہ پن کو، محبت کی جگہ بے رخی کو، اور گرم جوشی کی جگہ سرد مہری کو دیکھ کر ان میں ناگواری پیدا ہوتی ہے۔ جن لوگوں کے ذمے نوجوانوں کی تربیت ہے انہیں نہ صرف ان کی ضروریات کو سمجھنا چاہئے، بلکہ خود اپنے رویّے کو ان ضروریات کے مطابق بنانا چاہئے۔ اس میں ہماری

بے قیمتی سرمائے کو اس جوش نے اپنے ہاتھوں سے باہر منتقل کر رہے ہیں کاش ، ہم عقل سے کام لیں۔

آج ہماری حالت یہ ہے کہ ہم ایمان کی بازی لگا کر اپنے بچوں کو انہی درس گاہوں میں بھیجتے ہیں کہ جب وہ وہاں سے نکلتے ہیں تو ان کے دل میں ایمان کا ایک شائبہ بھی باقی نہیں رہتا۔ پھر بھی ہم انہیں وہاں برابر بھیجتے ہیں اس لئے کہ اہمیں، انگریزی زبان آجائے اور وہ ملازمتیں حاصل کر سکیں۔ ہمیں قطعاً اس سے کوئی تعلق نہیں کہ ہماری اولاد کا ایمان اٹھ گیا ، دین اٹھ گیا اٹھ گیا۔ ہمیں بس اس چیز سے تعلق ہے کہ جب یہ ہمارا لڑکا کسی اسکول میں جائے گا تو انگریزی اس طرح سے بولے گا کہ ایک انگریز کا عالم بھی ، نوکری پر موجود رہے وہ مرعوب ہو جائے گا اس کے علاوہ ، اور کوئی مقصد ہمارا نہیں ہوتا اور اس کی خاطر ہم اس کے لئے تیار ہیں کہ ہماری اولاد مسلمان نہ رہے ، یہ کچھ نہیں کہ کیا بات ہے ہمارے دل میں بھی اسلام کی کوئی ہمدردی نہیں ہے اور نہیں برے کاموں سے روکے گی ، اور نیک کاموں کی رغبت دے گی۔

میں ان کوتاہیوں کا سارا الزام معاشرے کے سر تھوپنا نہیں چاہتا میں اس مرض کی صرف یہ عرض کروں گا کہ ہمارے معاشرہ کو جو عارضہ لاحق ہوگیا ہے اس کا بنیادی سبب کیا ہے یہ حال میں اس کا واحد سبب یہ ہے کہ ہم زندگی کی کسی سمت کا کوئی شعور نہیں رکھتے۔ ہم بے مقصد ، بے جادہ و منزل کو لنتی کشتی کہ پھر رہے ہیں ہماری مثال ایک ایسے سیپئے کی ہے جس کا پتوار سلامت نہیں اور جسے موج جہاں چاہے اچھال دے اور جب چاہے غرقاب کر دے ، پھر وجہ یہ ہے کہ ہم اتنے پست سمت ہیں کہ محض حیوانی زندگی کی سطح سے بالاتر کسی اور سطح تک پہنچ کر جینے کی آرزو تک نہیں کر سکتے

یہ حالات بڑے ہی مدد انگیز اور افسردگی پیدا کرنے والے ہیں ، مگر ان کا اظہار ضروری ہو جاتا ہے ان کا مسلسل اعادہ کرکے قوم کے کانوں کو اس آہنگ سے بھر دینا چاہئے کہ وہ بیدار ہوکر خطرے کا احساس کریں اور سد باب کی تدابیر اختیار کریں

**

بقیہ : جب ہم پڑھتے تھے

سائنس اور مساحت کے عملی اسباق جو پرائمری میں صرف زبانی پڑھے تھے۔ ان عملی اسباق میں زمین کی پیمائش ، رقبہ ، جریب کشی ، کراس کا استعمال ، متساوی الاضلاع مستطیلوں ، مثلثوں اور اسٹاف بیٹھے اضلاع والے رقبے کے ٹکڑوں کا رقبہ اور پٹوار کے دوسرے اسباق ، صبح کے وقت خدا کی حمد ، اور اپنے وردھم کی سلامتی کی دعا کے بعد ڈرل ہوتی تھی جس کے کاشن انگریزی میں ہوتے تھے اس کے لئے ایک اسامی ہر مڈل میں ورزش ماسٹر کی ہوتی تھی اور شام کو وہی جمناسٹک کراتے تھے جس میں متوازی بار اور پیرل بار کی مشقیں ضروری تھیں ان سے طلبہ بڑے لطف رہتے تھے لیکن حدِ ادب سے باہر نہیں نکلتے تھے۔

مڈل کی جماعتوں کے لڑکے مدرسے خود اعتمادی سے پڑھتے تھے کہ مڈل پاس کرنے کے بعد یا مدرس بن جائیں گے یا پٹواری اور عموماً اس زمانے میں یہ تعلیم کی حد ہوتی تھی چند گنتی کے لئے شہروں کا رخ کرتے تو ہائی سکولوں میں داخلہ لیتے۔ صورت یہ تھی کہ مڈل پاس لڑکوں کو پہلے دو سال صرف انگریزی کی جونیئر کلاس کا امتحان دینا پڑتا تھا اور پھر نویں اور دسویں کا۔ انبالہ چھاؤنی میں سید محمد شاہ ہائی سکول میں یہ دو سال گذارے تھے کہ انبالہ شہر میں مسلم ہائی سکول قائم ہوا اور وہاں داخلہ لیا۔ یہاں شرارتوں کا میدان سکول کی بہ نسبت بورڈنگ ہاؤس میں زیادہ تھا لیکن یہ شرارتیں بھی آپس تک ہی محدود تھیں آج کے ہائی سکولوں اور کالجوں کو دیکھ کر جی میں آتا ہے کہ کسی طرح میں پھر نصف صدی کے دوسرے دھارے میں لوٹ جاؤں اور پھر بستہ لے کر سکول یا کالج جاؤں اور پھر اپنے ہم جنسوں میں یہ کہہ کر اترانے پھروں کہ

استاد کی چھاتی پہ چڑھے خوب بچھاڑا

لیکن وقت کس کا لحاظ کرتا ہے !

**

بقیہ : مغربی تعلیم اور مسلم طلبہ

اب ضروری ہے کہ آپ کا نظام تعلیم بدل جائے اور اس کی جگہ وہ نظام تعلیم آئے جو آپ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا اپنے کانوں سے سننا اور اپنی عقل سے سوچنا سکھائے جو سب سے پہلے آپ کو مسلمان ہونے کی حیثیت کی ذمہ داریاں سکھائے ، اور پھر اس کائنات پر اس نگاہ سے غور کرنے کی قابلیت پیدا کرے جو ایک مسلم کی نگاہ ہوتی ہے۔

اب صرف وہ نظام تعلیم آپ کے لئے کار آمد ہو سکتا ہے جو خدا شناسی اور خود شناسی پر مبنی ہو جو آپ کو خدا کی صفات ، اس کی مرضیات اور احکام ، اور اس کے نبیوں اور رسولوں کے احکام و تعلیمات سے آشنا کرے ، اور تمام علوم و فنون پر اس ناقدانہ بصیرت کے ساتھ نظر کرنے کی قابلیت بہم پہنچائے جس سے آپ حق و باطل میں ٹھیک ٹھیک امتیاز کر سکیں اور انسان نے علوم و فنون کے نام سے رطب و یابس جمع کر رکھا ہے ، اس کے کھوٹ اور سچ کو الگ الگ کرکے دنیا کو دکھا سکیں۔

**

اسلحہ کا استعمال موٹر سائیکل اور موٹر چلانے کی مشق اور ایسی ہی دوسری تفریحات رائج کی جانی چاہئیں اس کے ساتھ انہیں کسی حد تک فوجی تربیت بھی دی جانی چاہیے۔

اس کے لیے اساتذہ کا انتخاب بھی صرف علمی قابلیت کی بنا پر ہی نہ ہونا چاہیے، بلکہ اس کے تمام اساتذہ اپنے عقائد و نظریات اور اپنی عملی زندگی کے لحاظ سے صالح اور متقی ہونے چاہئیں اس جامعہ کے وہ گہری نگاہ میں کے بعد ایسے اساتذہ کو عالمِ اسلامی کے مختلف ممالک سے منتخب کیا جائے جو اعلیٰ درجے کی علمی قابلیت رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے عقائد و افکار کے لحاظ سے پورے مسلمان ہوں، عملاً احکامِ اسلامی کا اتباع کرنے والے ہوں اور مغربی ثقافت سے شکست خوردہ نہ ہوں، بلکہ میں تو یہ بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اس جامعہ کے لیے جن اساتذہ کو منتخب کیا جائے، ان کے متعلق یہ اطمینان بھی کر لیا جائے کہ ان کے گھر والے بھی حدودِ شرعیہ کی پابندی سے آزاد نہ ہوں اس لیے کہ جامعہ کے حدود میں اگر طلبہ کے ساتھ ایسے اساتذہ رہیں جن کے گھر کی خواتین تبرجِ جاہلیت میں مبتلا ہوں اور جن کے گھر سے نغموں کی آواز بلند ہوتی رہیں، تو طلبہ کو ان سے کوئی اچھا سبق نہ مل سکے گا۔

اس کے طلبہ کو ایسی تربیت دی جانی چاہیے کہ ان میں خصوصیت کے ساتھ حسبِ ذیل اوصاف پیدا ہوں

- اسلام اور اس کی تہذیب پر فخر اور اسے دنیا میں غالب کرنے کا عزم۔
- اسلامی اخلاق سے اتصاف اور اسلامی احکام کی پابندی
- دین میں تعمق اور مجتہدانہ بصیرت۔
- تنگ نظری اور فرقہ بندی سے پاک ہونا۔

ھ۔ تحریر و تقریر، ادب و بحث کی عمدہ صلاحیتیں اور تبلیغِ دین کے لیے مناسب قابلیتیں۔

و۔ جفاکشی، محنت، چستی اور اپنے ہاتھ سے ہر طرح کے کام کر لینے کی صلاحیت۔

ز۔ تنظیم و انتظام اور قیادت کی صلاحیتیں۔

٨۔ اس میں صرف وہ لوگ داخل کیے جانے چاہئیں جو ثانوی تعلیم کے مرحلے سے فارغ ہو چکے ہوں۔ عرب ممالک سے آنے والے طلبہ براہِ راست اس میں داخل ہو سکتے ہیں، لیکن غیر عرب ممالک کے طلبہ اگر عربی زبان میں کافی استعداد نہ رکھتے ہوں تو ان کے لیے کم از کم ایک سال کا کورس الگ ہونا چاہیے، تاکہ انہیں عربی زبان کی کتابوں سے استفادے کے قابل بنایا جا سکے۔

٩۔ اس کی تعلیم کو ٨ سال کے تین مرحلوں پر مشتمل ہونا چاہیے۔ مرحلۂ اولیٰ ٣ سال مرحلۂ ثانیہ تین سال اور مرحلۂ ثالثہ دو سال۔

١٠۔ مرحلۂ اولیٰ میں حسبِ ذیل مضامین کی تعلیم ہونی چاہیے اور ان کو تعلیم کی چار سالہ مدت پر مناسب طریقے سے تقسیم کر دیا جانا چاہیے۔

ا۔ عقائدِ اسلام، اس تفصیل کے ساتھ کہ قرآن و سنت کی رو سے اسلام کے عقائد کیا ہیں اور ان کے حق میں کیا نقلی اور کیا عقلی دلائل ہیں۔ اس سلسلے میں اختصار کے ساتھ یہ بھی بتایا جائے کہ مسلمانوں میں اختلافِ عقائد کیسے اور کس ترتیب سے رونما ہوا ہے اور اسی لحاظ سے دنیائے اسلام میں اس وقت کتنے مذہب پائے جاتے ہیں۔ اس درس کو بیانِ علمی کے حدود سے متجاوز نہ ہونا چاہیے اور حربِ عقائد سے حتی الامکان پرہیز کرنا چاہیے۔

ب۔ اسلامی نظامِ حیات: اس مضمون میں طلبہ کو پورے اسلامی نظام سے روشناس کرا دیا جائے۔ اسلام کی بنا کن اساسی تصورات پر قائم ہے۔ ان تصورات کی بنا پر وہ اخلاق اور سیرت کی تشکیل کس طرح کرتا ہے، پھر گھر اور خاندان سے لے کر معیشت، سیاست اور بین الاقوامی تعلقات تک مسلم سوسائٹی کی زندگی کے مختلف شعبوں کو وہ کن اصولوں پر منظم کرتا ہے اور اس سے پوری اسلامی تہذیب کی کیا شکل بنتی ہے۔

ج۔ قرآن: چار سال کی مدت میں پورا قرآن مختصر تفسیر کے ساتھ پڑھا دیا جائے۔ اس کے لیے تفسیر کی کوئی خاص کتاب مقرر کرنے کے بجائے استاد کو خود کتبِ تفاسیر سے استفادہ کرتے ہوئے اس طرح قرآن کا درس دینا چاہیے کہ طلبہ کتابِ الٰہی کا مقصود و مدعا اچھی طرح سمجھ لیں اور جو شکوک و شبہات ان کے ذہن میں پیدا ہوں وہ رفع کر دیے جائیں۔

د۔ حدیث: اس مضمون میں اجمالاً تاریخِ علمِ حدیث اور اصولِ حدیث اور دلائلِ حجیتِ حدیث سے طلبہ کو ضروری حد تک آگاہ کرنے کے بعد درس کے مجموعوں میں سے کوئی ایک کتاب مکمل پڑھا دی جائے، مثلاً منتقی الاخبار یا بلوغ المرام یا مشکوٰۃ المصابیح۔

ھ۔ فقہ: اس مضمون میں تاریخِ فقہ اور اصولِ فقہ پر ایک ایک مختصر کتاب پڑھانے کے بعد طلبہ کو فقہ کی تعلیم اس طرح دی جانی چاہیے کہ وہ مسائلِ فقہیہ میں مختلف فقہاء کے مذاہب سے بھی واقف ہو جائیں اور ان کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ مآخذِ شریعت سے ائمہ مجتہدین نے کس طرح مسائل کا استنباط کیا ہے۔

و۔ تاریخِ اسلام: اس کا آغاز تاریخِ تحریر ... کیا جائے اور پھر خصوصیت کے ساتھ سیرتِ محمدی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور خلفائے راشدین کے دور کو زیادہ تفصیل کے ساتھ پڑھانے کے بعد مختصراً پوری اسلامی تاریخ سے طلبہ کو روشناس کرا دیا جائے۔

ز۔ علومِ عمرانی (SOCIAL SCIENCE) خصوصاً معاشیات، سیاسیات اور سوشیالوجی۔ ان مضامین کی تعلیم کے لیے ایسے اساتذہ کا انتخاب کیا جائے جو اسلامی نقطۂ نظر سے تنقید کے ساتھ تعلیم دے سکیں، مغربی افکار و نظریات جوں کے توں طلبہ کے ذہن میں نہ اتار دیں۔

ح۔ ادیانِ عالم، خصوصاً یہودیت، عیسائیت، بدھ مذہب اور ہندو مذہب سے اجمالی واقفیت۔

ط۔ جدید مغربی افکار کی مختصر تاریخ اور ان کے مذاہب، خصوصاً مغربی جمہوریت، اشتراکیت اور فسطائیت وغیرہ۔

ی۔ انگریزی، جرمن اور فرنچ میں سے کوئی ایک زبان۔

١٠۔ مرحلۂ ثانیہ میں پانچ فیکلٹیاں ہونی چاہئیں۔ تفسیر، حدیث، فقہ، علم الکلام اور تاریخ۔

١١۔ تفسیر کی فیکلٹی میں حسبِ ذیل مضامین ہونے چاہئیں:

١۔ تاریخ القرآن

- تاریخ علم تفسیر، اور مفسرین کے مختلف مذاہب اور ان کی خصوصیات۔
۲۔ اختلاف قرأت۔
۳۔ اصولِ تفسیر
- قرآن مجید کا تفصیلی اور گہرا مطالعہ۔
- مخالفین کی طرف سے قرآن پر آج تک جتنے اعتراضات کیے گئے ہیں ان کا جائزہ اور ان کے جوابات۔
- احکام القرآن

حدیث کی فیکلٹی میں

- تاریخ تدوین حدیث
- علوم حدیث اپنے تمام شعبوں کے ساتھ۔
- حدیث کی امہات کتب میں سے کوئی ایک کتاب تفصیلی تنقید کے ساتھ ۔۔۔ طریقہ پر احادیث کو پرکھنے کی اچھی طرح مشق ہو جائے۔
- کتب صحاح پر ایک جامع نظر
- حدیث پر مخالفین کی طرف سے اب تک جتنے اعتراضات کیے گئے ہیں ان کا تفصیلی ۔۔۔ جوابات۔

فقہ کی فیکلٹی میں

- اصولِ فقہ۔
- تاریخ فقہ۔

۳۔ فلسفۂ قانون جدید
- رومی و ایرانی قوانین، یہودی شریعت، جدید مغربی قوانین اور اسلامی قوانین کا تقابلی مطالعہ۔
۵۔ فقہائے اسلام کے مختلف مذاہب اور ان کے اصول
۶۔ قرآن و سنت سے براہِ راست استنباط مسائل کی مشق۔
۷۔ اہل سنت کے چاروں مذاہب کی فقہ اور اس کے ساتھ فقہ ظاہری، فقہ زیدی اور فقہ جعفری بھی۔

۱۴۔ علم الکلام کی فیکلٹی میں

۱۔ مبادی منطق
۲۔ فلسفۂ قدیم و جدید۔
۳۔ مسلمانوں میں علم کلام کے آغاز سے اب تک کی تاریخ اور ان مذاہب کی تفصیل جو اندرونی اور بیرونی اثرات سے مسلمانوں کے اندر پیدا ہوئے ہیں
۴۔ علم الکلام کے مسائل اور ان میں قرآن و سنت کی رہنمائی۔
۵۔ اسلام پر مخالفین کے اعتراضات کا تفصیلی جائزہ اور اس کے جوابات
۶۔ تقابلِ ادیان، خصوصاً مسیحیت کی تاریخ ــــــــ اور اس کے علم کلام کا تفصیلی مطالعہ۔
۷۔ مسیحی مشنریوں کا کام اور ان کے طریقے

- تاریخ اسلام کی فیکلٹی

۱۔ فلسفۂ تاریخ، مقصد مطالعۂ تاریخ اور طرزِ مطالعۂ تاریخ قرآن مجید کی رو سے۔
۲۔ فلسفۂ تاریخ کے مختلف مذاہب ابن خلدون سے اب تک۔
- تاریخ عرب و مشرقِ اوسط قبل اسلام۔
- تاریخ اسلام عہد نبوی سے اب تک بلحاظ فکر، علوم، اخلاق تمدن و سیاسیات!
- تجدید و احیائے دین کی تحریکات
- مسلمان ممالک پر مغربی استعمار کے غلبے کی تاریخ اور اس کے اثرات و نتائج۔
- درجۂ ثالثہ میں داخل ہونے والا طالب علم مذکورہ بالا فیکلٹیوں میں سے کسی ایک میں خاص موضوع پر دو سال تک علمی تحقیق کرنے کے بعد کوئی مقالہ پیش کرے گا جس کو اہل علم جانچنے کے بعد اسے سند فضیلت دیں گے۔!
- اس جامعہ کے لیے ایک اعلیٰ درجے کی لائبریری ہونی چاہیے جس میں جامعہ کی مذکورہ بالا ضروریات کے مطابق وسیع پیمانے پر کتابیں فراہم کی جائیں۔!
- ایک کمیٹی کا تقرر اس غرض کے لیے کیا جائے کہ جامعہ کی تعلیم کے مختلف مراحل اور شعبوں کے لیے مناسب کتابوں کا انتخاب کرے۔
- ایک اکاڈمی (ACADEMY) کا قیام اس غرض کے لیے کہ جامعہ کی ضروریات کے لیے مناسب ترین کتابیں تیار کرے۔!

**

ہمارے دینی مدارس

میں اس سحب جان دینی نظامِ تعلیم کے حق میں اپنے جذبۂ اعتراف کو پیش کرتا ہوں کہ نہایت ناسازگار ماحول میں اس نظام نے اپنے آپ کو سالہا سال تک برقرار رکھا ہے وہ استخلاص اور ادارے بڑے ہی قابلِ قدر ہیں جنہوں نے اسلام کے بالکل خلاف کام کرنے والے نظامِ اجتماعی کے دائرے میں بہت ہی کم مدتوں میں دینی تعلیم گاہوں کو چلایا اور روکھی سوکھی کھا کر اور درویشانہ رہن سہن اختیار کر کے ایک بڑی خدمت کے لیے بیٹھ گئے۔ پھر قابلِ داد ہیں وہ فرزندانِ ملت بھی جنہوں نے دنیوی ترقیوں سے قطع نظر کر کے دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے زندگیاں کھپا دیں انہیں قربانیوں کا یہ کم سے کم حاصل ہمارے سامنے ہے کہ کسی نہ کسی درجے میں اسلام کے آثار فضا میں باقی ہیں۔

یہ اعتراف میرے دل میں ہمیشہ رہا اور ہمیشہ رہے گا، مگر اس کے ساتھ ساتھ میں اسے اس دینی نظامِ تعلیم کو ناقدانہ نقطۂ نظر سے بھی دیکھتا ہوں اور بڑی بے چینی سے یہ چاہتا ہوں کہ اس میں تعمیری تبدیلیاں جلد از جلد واقع ہونی چاہئیں ورنہ جو کچھ جس ڈھب سے چل رہا ہے زیادہ دیر نہ چل سکے گا۔ میرے اندر ان سرگرمیوں کے لیے کبھی تنقیص اور تحقیر کا جذبہ نہیں رہا، لیکن میں ان کمزوریوں اور کوتاہیوں سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا جو موجود ہیں اور اگر ان کو زیرِ بحث نہ لایا جائے تو وہ ہمیشہ موجود رہیں گی اور ان کی موجودگی اس عظیم الشان کام کے اصل مقصد کو نقصان پہنچا رہی ہے اور مزید نقصان پہنچائے گی۔ میرا جذبۂ خیر خواہی دامن گیر ہو کر تقاضا کر رہا ہے کہ میں بزرگانِ ملت کو ان کمزوریوں کے ازالے کی طرف اس امید کے ساتھ متوجہ کروں کہ وہ اپنے سے ایک ادنیٰ آدمی کی بات سننے کے لیے اونچا ظرف رکھتے ہیں۔

سب سے پہلے تعلیم کی تمدنی اہمیت کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ انسان سازی کے پروگرام میں سب سے پہلے خاندان، پھر مکتب، اور پھر معاشرہ کا مجموعی ماحول حصہ لیتا ہے۔ مکتب کے اثرات تربیتِ فکر و عمل میں اس بنا پر بہت زیادہ دخیل ہوتے ہیں کہ یہ ادارہ بہ تمام اس مقصد کے لیے وجود میں آتا ہے اور اس کے اندر طلبہ دن کا ایک بڑا حصہ اخذ و اکتساب میں گزارتے ہیں۔ تعلیم ایک نسل کے نظریاتی و تجرباتی سرمائے کو بعد کی نسل تک منتقل کرنے کا ذریعہ ہے۔ متفرق تجربات چونکہ کسی نظریہ ہی کے گرد مجتمع اور مرتب ہوتے ہیں، اس لیے کسی نظامِ تعلیم میں سب سے بڑی اہمیت نظریے کی ہوتی ہے۔ ہر نظریہ ایک خاص طرز کا کردار پیدا کرتا ہے اس وجہ سے ہر نظامِ تعلیم انسانیت کی تعمیر و تشکیل کے لیے ایک سانچے کے طور پر کام کرتا ہے۔ پس تعلیم دراصل زندگی کے فلسفے اور زندگی بسر کرنے کے صحیح اسلوب و فن پر مشتمل ہوتی ہے۔ تعلیم کی تمدنی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ درسگاہ عظیم انقلابوں کی پرورش گاہ ثابت ہوتی ہے اور معلم ایک چلتے ہوئے نظام کو زیر و زبر کر دینے کا وسیلہ بن سکتا ہے۔

تعلیم کی یہی اہمیت تھی جس کے پیشِ نظر ہماری تاریخ میں تعمیر و اصلاح کے داعی جب کبھی سیاست کے دائرے میں خوفناک مزاحمتوں کے سبب پسپا ہوتے ہیں، تو انہوں نے بلاتامل تعلیم کے مورچے سنبھال لیے۔ بنو امیہ کے دورِ استبداد میں اصلاح پسند عناصر نے فقہ و اجتہاد کی مجالس اور اکیڈمیوں کو قائم کیا اور ان کے ذریعے نوجوان طاقت کو اپنے گرد سمیٹا اور ان کے سینوں میں نظریۂ حق اور نظامِ خیر و فلاح کے بیج ڈالنے کا پورا پورا اہتمام کیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ ابنائے علمی اور تحقیقی لٹریچر تخلیق کیا، گو معاشرے کے مجموعی ماحول پر بادیہ انداز ہو رہا ہے۔ اسی طرح تاتاریوں کی تاخت کے بعد جب دوسرا بڑا دھکا تعمیری رجحانات کو پہنچا تو اسی کے ردِ عمل کے تحت تصوف نے ایک نیا محاذ قائم کر دیا۔ یہ خانقاہی نظامِ تعلیم و تربیت تھا۔ اس کا اصل منشا یہ تھا کہ ناسازگار حالات میں عملی سیاست سے الگ تھلگ رہ کر ایسے حلقے منظم کر دیے جائیں، جن میں سچی خدا پرستی، دنیا سے بے نیازی، ایثار و قربانی، حسنِ خلق اور دعوت الی اللہ کا ولولہ موجود ہو۔ گوشہ ہائے خلوت میں بیٹھ کر اس طرح کا سرمایہ محفوظ کرنے کا ایک عبوری دور گزارا جائے اور پھر جب بھی حالات موقع دیں، تو اس سرمائے کو اجتماعی دائرے میں کھپا دیا جائے۔ مگر بدقسمتی سے انفرادی روحانیت کا کیف اصل مقصود سے غافل کا موجب بن گیا اور تصوف اجتماعیت کے مقابلے میں بجائے خود ایک مستقل نظام بن کر رہ گیا۔ اسی طرح ہندوستان میں سلطنتِ مغلیہ کے انہدام کے بعد جب نظامِ حیات کی باگ ڈور پوری طرح الحاد اور سیکولرزم کے قبضے میں چلی گئی، تو دعوتِ اسلامی کے علمبردار مسجدوں اور حجروں میں تعلیمی مراکز کھول کر بیٹھ گئے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ ایک وقت میں دیوبند نے بھی اور ندوہ نے بھی اپنے اپنے طرزِ خیال کے کردار تیار کر کے سیاسی و اجتماعی سرگرمیوں پر بڑا اثر ڈالا ہے، لیکن یہاں بھی وہی ہوا کہ آہستہ آہستہ اصل نصب العین اور اس کے وسیع تقاضے نگاہوں سے اوجھل ہوتے چلے گئے اور ہماری دینی درسگاہیں فقط خطیب، مناظر، مفتی، اور مدرس پیدا کرنے میں لگ گئیں۔

تاہم اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہماری تعلیمی تحریکیں اوّلاً ہمیشہ ایک انقلابی و تعمیری رجحان کے تحت رونما ہوئی ہیں۔ ان کا مقصد نظامِ حق کے ایسے علمبردار پیدا کرنا تھا جو نظریۂ اسلامی کے امانت دار ہوں اور دنیاوی مفاد کو ترک کر کے رضائے الٰہی کے لیے انقلابی تحریک برپا کرنے میں موزوں وقت پر حصہ ادا کر سکیں۔ اب یہ اس ملت کی بدقسمتی ہے کہ آج جب کہ حق و باطل کی کش مکش زوروں پر ہے اور ایک فیصلہ کن مرحلہ درپیش ہے، ہمارے دینی مراکزِ تعلیم اس معرکے کی پشت پناہی کرنے اور اس میں بہترین افراد سے کمک پہنچانے کا فریضہ ادا نہیں کر رہے ہیں۔

اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ دینی مدارس کی روح میں جمود آ گیا ہے اور یہ زندگی کے اسلامی نظریہ و اسلوب کی تعلیم سے طلباء کو کماحقہٗ مالا مال کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہے۔ نیز آئندہ دور اور اجتماعی ماحول کی ضرورت کے مطابق ذہن اور کردار کی تعمیر نہیں ہو پا رہی۔ بس اب کسی تامل کے بغیر اس تعلیمی نظامِ کار پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔ اس پر اگر اس نظام کے کارپردازوں میں سے کچھ بھی تعداد غور و فکر کے لیے تیار ہو تو چار نکات ایسے ہیں کہ جن کو پیشِ نظر رکھ کر دینی مدارس کی موجودہ ہیئت میں تعمیر ...

ایک اجتماعی نظامِ زندگی

ہماری دینی درس گاہوں کے کارپرداز پہلا نکتہ یہ سامنے رکھیں کہ انہیں زندگی کے سیاسی و معاشی مسائل اور تمدنی و اجتماعی معاملات سے کٹے ہوئے انفرادی مذہب کی تعلیم نہیں دینی ہے، بلکہ ایک تحریکی فلسفے اور ایک اجتماعی نظامِ زندگی کی تعلیم دینی ہے۔ بدقسمتی سے اب تک کی تعلیمی سرگرمیاں انفرادی مذہب سکھانے کے اسلوب پر جاری ہیں۔ چند عقائد اور ان کے متعلق کلامی بحثیں، بنیادی عبادات اور ان سے متعلق فقہی مسائل، انفرادی اخلاق و آداب کا ایک ضابطہ اور اس کے متعلق واعظانہ تلقینات، فرقوں کے اعتقادی و فقہی نظام کے مناظرانہ و مجادلانہ طریقِ فکر اور مسلمانوں کے پرسنل لاء کی حد تک بالکل مقلدانہ اور غیر اجتہادی ذہن سے قانون سازی۔ بس ان چیزوں پر ہمارے دینی مدارس کا نظامِ تعلیم مشتمل ہے۔ یہ مذہبی نظامِ تعلیم برسوں کی کاوش کے بعد بھی ایسے افراد تیار کر کے نہیں دیتا جو عالمگیر پیمانے پر زندگی اور تمدن کے وسیع نظریات و مسائل پر ماہرانہ رائے دے سکیں، جن کے پاس اعلیٰ درجے کے عقلی معیارات موجود ہوں اور جو ماحول کی تمام سرگرمیوں میں حصہ لے سکیں اور زندگی سے من حیث المجموع دلچسپی لیں۔

فعال و متحرک انسان

دوسرا قابلِ غور نکتہ یہ عرض ہے کہ کسی بھی نظریہ و فکر کے لیے صرف ایسے افراد کارآمد ہوتے ہیں جو فعّال اور متحرک ہوں اور اپنے نظریات کی برتری کا پورا پورا شعور رکھتے ہوں، مگر ہمارے نقشۂ کار میں کوئی ایسی کوتاہی موجود ہے کہ ہم اسلام کی علمبرداری کے لیے برسوں سے ایک ہی ڈھب کا جو کردار پیدا کر رہے ہیں، وہ فعّال اور متحرک اور ذہنی و فکری برتری کا شعور رکھنے والا نہیں، بلکہ بالعموم گوشہ گیر، سیاست گریز، جامد، منفعل، مضمحل، یاس زدہ، پسپائی پسند اور مسکنت کش ہے۔ یہ اتنے سارے سخت الفاظ صاف شاہد ہے کہ کسی جذبۂ نفرت یا تنقیص سے نہیں کہے جا رہے ہیں، بلکہ امرِ واقعہ کو چونکہ ان کے بغیر واضح نہیں کیا جا سکتا، اس لیے بڑی دردمندی سے عرض کیے جا رہے ہیں۔

آپ خود جائزہ لے کر دیکھیں، تو قلیل سی ایک تعداد کو چھوڑ کر دینی مدارس کے پیدا کردہ انسان کو ہم زندگی کے اجتماعی ہنگاموں سے بالکل منقطع پاتے ہیں۔ وہ موجوں کی کشاکش سے ہٹ کر دور ساحل پر بیٹھا نظر آتا ہے۔ وہ مخالفِ اسلام رجحانات اور انہیں لے کر چلنے والے بااثر طبقات سے مرعوب اور ان کے مقابلے میں کسی حد تک کمتری کے احساس میں مبتلا ہے۔ وہ باطل اور بدی سے دور رہنا چاہتا ہے، مگر اس سے پنجہ آزمائی نہیں کرتا۔ وہ اپنے مشاغل کے ایک محدود دائرے میں پناہ گزیں ہے۔ کاش کہ ہماری دینی درس گاہیں اس حقیقت کو محسوس کر کے اپنے نظامِ کار کو بدل ڈالیں۔

جدید علوم کا مطالعہ

تیسرا نکتہ یہ ہے کہ اسلامی نظام کے لیے جدوجہد کرنا اگر مطلوب ہو تو ہمیں ایسے ذہن کی ضرورت ہے جو دورِ حاضر کے ذہن کو بے تکلفی سے مخاطب کر سکے۔ دورِ حاضر کے ذہن کو اپنی قوم کے دائرے کے اندر بھی اور وسیع ترین الاقوامی دائرے میں بھی مخاطب اور متاثر کرنے کے لیے شرطِ اوّل یہ ہے کہ اس کو سمجھنے اور اس کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔ اس کے علمی اور معلوماتی پس منظر کا احاطہ کیا جائے۔ وہ جس طرح کی کشمکش سے دوچار ہے، اس کا پورا پورا اندازہ ہو اور اس کے سامنے آج جو مسائل جس شکل میں آ گئے ہیں اور ان کے ساتھ جو کچھ استدلال موجود ہے، اس سے داعی باخبر ہو۔ یہ صلاحیت دینی مدارس اپنے طلباء میں نہیں پیدا کر سکتے، جب تک کہ وہ جدید فلسفہ، نفسیات اور سیاسیات و معیشت کے علوم سے انہیں مالا مال نہ کریں اور انہیں مغربی نظامِ حیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ نہ کرائیں۔ اس مقصد کو مروجہ نصاب ہرگز پورا نہیں کر سکتا۔

عجیب بات ہے کہ بار بار ملت کے اصحابِ نظر نے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ دینی مدارس کے نصاب میں ایک بڑی تبدیلی ہونی چاہیے، مگر ہم درسِ نظامی کے چکر سے نہیں نکل سکتے اور نہ اس کے تنگ سے دائرے کو وسیع کر سکتے ہیں۔ درسِ نظامی بڑی ذہنی کاوشوں سے مرتب کیا گیا ہے اور وہ بڑی شے ہے، مگر حالات اور ضروریات نے ایسی نئی مانگیں پیدا کر دی ہیں کہ وہ ان کو پورا نہ کریں، تو جمود چھایا رہے گا۔ زمانہ آگے آگے دوڑتا جائے گا اور ہم پیچھے

... پیچھے گھسیٹتے رہیں گے۔ ہم پیچھے گھسیٹنے والوں کی آواز آگے دوڑنے والی منحرف طاقتیں کبھی نہیں سنیں گی۔ ان کو متاثر کرنے کے لیے ان کے ...

مطابقت کرنا ضروری ...

آج اگر ایک داعی حق نظریہ ارتقا کو نہیں جانتا، اگر وہ ضبط ولادت کے اساسی تصورات سے آگاہ نہیں ہے، اگر وہ تجزیہ نفس کے مختلف مدارس فکر سے بیگانہ ہے، اگر اسے مارکسزم سے آگاہی نہیں ہے، اگر وہ جدید فلسفہ تاریخ سے تعارف نہیں رکھتا، اگر اسے بین الاقوامی سیاست کا شعور نہیں ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ چند عقیدوں، اور عبادتوں اور اخلاقی ہدایات پر وعظ سنا کر نئی نسلوں کو اپنے گرد سمیٹ سکے۔ حال یہ ہے کہ موسمیات اور دنیا کے طبعی جغرافیے سے بھی ہمارا دینی نظام تعلیم طلباء کو بقدر ضرورت واقف نہیں کرتا۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر ہماری کمزوری کی حد یہ ہے کہ ہمارے تیار کردہ افراد اس زبان اور ان اصطلاحات اور اسالیب سے بھی آگاہ نہیں ہیں جو اس دور کے ذہن کے لیے مؤثر ہیں۔ انگریزی تو انگریزی ہم ادبی معیار کی پختہ اردو سے بھی طلباء کو آراستہ نہیں کر رہے ہیں۔

تمدنی زندگی میں مقام

چوتھا نکتہ یہ قابلِ غور ہے کہ کوئی نظام تعلیم اسی صورت میں کامیابی سے چل سکتا ہے، جب کہ وہ اپنے سانچوں میں ایسے انسان ڈھال کر دیتا ہو جو عملاً ایک دورِ تمدن میں اپنی جگہ بنا سکیں۔ ہر نظریاتی نظامِ تعلیم کو کارفرما اور کارکن عناصر تیار کرنا ہوتے ہیں۔ درس گاہوں سے طلبہ نکلیں، تو زندگی کے کارزار تمدن میں کوئی نہ کوئی مقام ان کو طلب کرے۔ ان میں ایسی صلاحیتیں ہونی چاہئیں کہ وہ تمدن کے کسی نہ کسی شعبے کو چلانے کے اہل ہوں۔ وہ میدان میں آئیں تو نظام رائج سے کشمکش کرتے ہوئے بھی معاش کے راستے نکال سکیں۔ زندگی ان کی ضرورت محسوس کرے۔ تمدن میں ان کی مانگ ہو۔ وہ اوّل تو کسی شعبے میں اچھے لیڈر اور کارپرداز ثابت ہوں، ورنہ کم از کم اچھے کارکن ضرور ہوں۔ افسوس ہے کہ ہمارا مروجہ دینی نظام تعلیم ایسے افراد تیار کر کے نہیں دے رہا کہ جو صحافت وادب اور تصنیف وتالیف سے لے کر تجارت وصنعت اور ڈاکٹری، انجینیری اور حساب کاری تک گوناگوں مشاغل کو اپنا سکیں۔ اس وقت کی یہ حالت ہے کہ بارہ بارہ سال تک کی دینی تعلیم پایا ہوا نوجوان اسسٹنٹ تک نہیں بن سکتا کہ وہ حلال کی روزی کما کر اپنے حلقۂ ربط میں زبان وعمل سے دین وعمل کی دعوت دے سکے۔ کل اگر یہاں نظامِ اسلامی کو چلانے کے لیے کارکنوں کی مانگ پیدا ہو تو ہمارا دینی نظامِ تعلیم اس مانگ کو پورا نہیں کر سکتا۔

ان نکاتِ چہارگانہ کو پیشِ خدمت کر کے میں بہت ہی عاجزانہ انداز سے دینی مدارس کے کارپردازوں کی خدمت میں یہ مشورہ رکھتا ہوں کہ وہ کسی ایسے نقشے پر کام کریں کہ طلباء ان کے یہاں دس بارہ سال میں فارغ ہوں، تو وہ ایک طرف اسلام کا ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے ماہرانہ مطالعہ رکھتے ہوں اور دوسری طرف میٹرک یا ایف۔ اے کے درجات کے مساوی انگریزی اور جدید علوم کی تعلیم سے آراستہ ہو کر نکلیں تاکہ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے ان پر پورا میدان کھلا رہے۔ جدید علوم کے حساب کو جوں کا توں لے لینے کے بجائے اسلامی نظریۂ حیات کی روشنی میں ناقدانہ طریق پر مطالعہ کرایا جائے تاکہ مغربی تصورات کی کمزوریاں نمایاں ہوں اور اسلامی تصورات کی برتری کا سکہ ذہنوں میں بیٹھ جائے۔ ایسے کورس تیار کرائے جا سکتے ہیں جو اسلامی اور مغربی تصورات کا ہر دائرے میں تقابلی مطالعہ ہوں اور اسلامی تصورات کا ثبوت ہو اور مغربی تصورات کی تردید!

اس کے ساتھ دینی درس گاہوں کے ماحول کو بھی اس جمود سے نکالا جائے جس میں وہ برسوں سے پڑا ہے۔ طلباء کو سادگی کے ساتھ صاف ستھرے رہن سہن کی تربیت دی جائے تاکہ ان میں عزتِ نفس کا احساس زندہ ہو اور وہ کسی نعباتی الجھن میں نہ پڑیں۔ اس سلسلے میں مالیاتی نظام کو بھی نئے سرے سے استوار کیا جائے۔

**

بقیہ: ہٹلر کا نظریہ تعلیم

دیکھ کر ان دیکھا کر دیتے ہیں وہ دراصل ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں وہ عصمت فروشی کے نتائج آئندہ نسلوں تک منتقل کرنے کے مجرم ہیں کیونکہ آئندہ نسلوں کی حفاظت موجودہ نوجوانوں کی اصلاح کے بغیر کیسے ممکن ہے؟ ہمیں ثقافت کو پاکیزہ بنانا ہے کہ یہ ہم قریب قریب زندگی کے ہر شعبہ میں جاری کرنا ہو گی مثلاً تھیٹر، ہنرِ لطیفہ، لٹریچر، سینما، صحافت اور اشتہارات۔ ان سب سے گندگی کے داغ دھلنے چاہئیں اور ان سب سے قوم کی خدمت اور قوم کی تہذیب کی خدمت کا کام لیا جانا چاہیے۔ قوم کی زندگی کو جدید عشق بازی کی گلا گھونٹ دینے والی خوشبو اور بے ہنگام ناچ، یا نامردانہ منافقت سے یکسر پاک کرنا ہو گا۔ ان سب اقدامات میں مقصد کار اور طریقہ کار دونوں کا تعین فقط قوم کی روح اور جسم کے مفاد کے پیش نظر کرنا ہو گا۔ اوّلین فریضہ نسل کی بقا ہے شخصی آزادی کا حق دوسرے درجے پر آتا ہے۔

**

انسانیت کے محافظوں سے سوال

جہاں دانو! میں پوچھتا ہوں
کہ چشمِ انساں میں آنسوؤں کے ہجوم آخر
بتاؤ کب تک ؟ یہ ٹمٹماتے ہجوم آخر
تمہاری پُر فریب آنکھوں کو روشنی بخشتے رہیں گے ؟
بتاؤ کب تک یہ اونچے محلوں کی اونچی دنیا
یہ برقی لہروں کے قمقموں سے بھڑکتی دنیا
شکستہ کٹیاؤں سے ابھرتے دھوئیں سے آخر الجھ سکے گی ؟

اے وقت بینو! میں پوچھتا ہوں
کہ چند سکوں کی کھنکھناہٹ پہ جس کی بنیاد رکھ رہے ہو
وہ مسکراہٹ، لہو میں ڈوبی ہوئی فضاؤں کی ہچکیوں کو
دبانا چاہے گی تو آخر بھلا وہ کب تک دبا سکے گی

اے کامریڈو! اے سرخ ریچھو! او بے خداؤ!
جو اونچے ہوٹل کے نرم صوفوں کی گود میں صبح شام بیٹھے
جفاکشوں کے لہو کی مانند سرخ کالی کے جام پی کر
غریب دہقان کی بھوک پر تم مگر کے آنسو بہا رہے ہو
سلکی سوٹوں کو پہنے بیٹھے
پھٹے ہوئے چیتھڑوں کی قسمت پہ نوحہ خواں ہو گلے پھلا کر
تمہارے نوحوں تمہارے اشکوں میں اجنبی روح پل رہی ہے
وہ روح جس کے گلابی ہونٹوں میں خوں کی رنگت ملی ہوئی ہے
وہ روح جس کی سیاہ زلفوں سے دمِ اخوت کا گھٹ رہا ہے

تم ـــ اس کے ہاتھوں میں مفلسوں کا خلوص چاہتے ہو بیچ ڈالا
جسے پسینے دکھا کے مفلس کی تم حمیت خریدتے ہو
میں پوچھتا ـــ میں چیختا ہوں ـــ نچوڑ کر اس کی شہ رگ
اے کامریڈو! کرائے کی مرلیو، تم بتاؤ آخر
غریب دہقان کو کب تلک یوں فریب دو گے ؟

" خدا پرستو! "
سیاہ داڑھی کی اوٹ لے کر تقسیم کا حق چرا رہے ہو
او جبوں والو!
کمائی مُردوں کی کھانے والو، قرآں کی عصمت سے کھیلتے ہو
"بزرگ چہرو"!
جو پانچ وقتوں کے عہد و پیماں خدا سے ہر روز باندھتے ہو
انہیں اسی وقت جا کے تنہائیوں میں ہر روز توڑتے ہو
"طویل جُبّو! سیاہ جُبّو! سفید جُبّو!"
میں پوچھتا ہوں۔ یہ عہد شکنی، خدا سے بھی کیا چھپا سکو گے
بشر کو دھوکا تو دے رہے ہو
خدا کو کیسے فریب دو گے ؟

اے کور بینو!
تم اپنے ماضی پہ اک اچٹتی نظر تو ڈالو
میں پوچھتا ہوں اعلان کر کے
خدا کی لاٹھی یا تیغِ مومن سے بچ سک[illegible]

قومی تعلیمی کانفرنس
اسلام آباد (۲، ۳، ۴ اکتوبر ۱۹۷۷ء)
کے موقع پر
طلبہ کی تاریخی
یادداشت
از
عبدالملک مجاہد
ناظمِ اعلیٰ : اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان
چیئرمین ایشین سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن
لیاقت بلوچ
صدر پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین
چیئرمین پنجاب سٹوڈنٹس کونسل

جنابِ چیئرمین اور شرکاءِ کانفرنس

تعلیم کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے؟

طلباء کے نزدیک تعلیم کا بنیادی مسئلہ خود نظامِ تعلیم ہے قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ہی سے یہ مسئلہ بنیادی اہمیت کا حامل رہا ہے کہ یہاں ایک ایسے تعلیمی نظام کو ترویج دیا جائے جو یہاں کی قومی ضروریات اور عوام کی امنگوں اور آرزوؤں کا حقیقی ترجمان ہو۔ ایک غیر ملکی سامراجی قوت کے نافذ کردہ تعلیمی نظام کا جاری رہنا جو اس نے محض اپنی نوآبادیاتی مقاصد کی تکمیل کے لیے رائج کیا تھا ہمارے تمام مسائل اور مصائب کی حقیقی اور بنیادی وجہ ہے۔ اس صورتِ حال کو فروعی یا جزوی اصلاح درست نہیں کر سکتی درحقیقت یہ سارا نظام ہی سرتاپا غلط ہے اس کے مقاصد، زندگی کے بارے میں اس کے تصورات اس کے تعلیمی نقطۂ نظر اس کے تعلیمی ادارے، اس کا طریقۂ امتحان وطریقۂ تعلیم، اس کی فیس و قوائد غرض اس کا ایک ایک پہلو۔ نظریاتی لحاظ سے نظام دیوالیہ ہے، قومی سطح پر ہمارے مقصد آدرشوں اور امنگوں کی نفی ہے اور ثقافتی نقطۂ نظر سے ہماری روایات کے بالکل برعکس ہے اور فنی طور پر غیر اطمینان بخش اور انتہائی سطحی ہے زندگی کا اس کی عظمت اور وقار کا اس نظام سے دور کا بھی تعلق نہیں اگر اس سے کوئی چیز سامنے آ سکتی ہے، تو وہ شکستہ امیدیں پژمردہ روحیں، پریشان شخصیتیں اور یاسیت زدہ صلاحیتیں ہیں۔ کانفرنس کو ہمارے قومی اور مستقل مسائل کا ہمہ گیر جائزہ مطالعہ کرنا چاہیے تھی یہ اس صورتِ حال کے سدھارنے کے لیے کچھ کر سکے گی۔

حکومت کی غیر موزوں پالیسی صورتِ حال کی شدید ابتری کی ذمہ دار ہوگی آپ (کانفرنس) کو ان تمام باتوں کی طرف بھرپور توجہ دینا ہوگی اور صرف اسی طرح اس مسئلہ کا کوئی مفید حل ڈھونڈا جا سکتا ہے

اس مسئلہ کی اہمیت تسلیم کرتے ہوئے اس ملک ان گنت کانفرنسیں ہو چکی ہیں اس پر کئی کمیٹیوں اور کمیشنوں نے کام کیا ہے حتیٰ کہ تقاریر، بیانات، اعلانات کا شمار ہی کیا۔ سفارشات بھی پیش ہوتی رہیں فیصلے بھی ہوئے اور پالیسیاں بھی بنیں لیکن مسئلہ نہ صرف یہ کہ ابھی تک حل نہیں ہوا بلکہ اپنی ہلاکت خیزی کے اعتبار سے خاصا بڑھ بھی چکا ہے۔

تعلیم سے براہِ راست متعلق طبقے یعنی طالب علم برادری کی نمائندگی کرتے ہوئے "اسلامی جمعیتِ طلبہ پاکستان" مسلسل اس مسئلہ کے حل کے لیے جدید بنیادوں پر قومی اور اسلامی نظامِ تعلیم کے لیے جدوجہد کرتی رہی ہے ــــ تاکہ ــــ اسلامی نظامِ تعلیم کے ذریعہ پاکستان کا مستقبل تابناک ہو اور یہاں سیاسی، سماجی اور معاشی استحصال سے پاک اسلامی فلاحی معاشرہ تشکیل پا سکے ــــ ہمیں مسرت ہے کہ اس تصور کی مخالفت رفتہ رفتہ دم توڑ گئی اور گذشتہ کئی سالوں سے نظامِ تعلیم کی نظریاتی تشکیل پر کسی کو اعتراض نہیں رہا۔

ہم نے ــــ

- نظامِ تعلیم کی خرابیوں اور اس کے حل پر طلباء کو ایک آواز کیا۔
- مذاکروں، سیمیناروں، مضامین اور مجلوں غرض ہر ممکن ذریعہ اطلاع کو استعمال کرتے ہوئے ملک بھر کے دانشوروں اور اصحابِ بصیرت کو ہم خیال بنایا
- جلسوں، جلوسوں، مظاہروں اور قراردادوں کے ذریعے ملک بھر کے گوشے گوشے سے یہ مسئلہ اور اس کا حل ہر دور میں اربابِ اختیار کے گوش گزار کیا۔
- پھر اس انقلابی تصورِ تعلیم کی وضاحت کرنے کے لیے ہماری تنظیم نے تفصیلی لٹریچر تیار کیا ہے جو درج ذیل ناموں کے تحت کتابی کی صورت میں STUDENTS PUBLICATION BUREAU سے دستیاب ہے۔

۱۔	تعلیم کا مسئلہ	۲۹۰ صفحات	۱۹۶۵ء
۲۔	تعلیم کی تشکیلِ نو	۹ صفحات	۱۹۶۴ء
۳۔	مخلوط تعلیم	۹۰ صفحات	۱۹۶۶ء
۴۔	نظریۂ تعلیم اور اسلام	۴ صفحات	۱۹۵۵ء
۵۔	اسلامی نظامِ تعلیم اور نفاذ کی عملی تدابیر	۳۵ صفحات	۱۹۵۲ء
۶۔	نظامِ تعلیم میں تبدیلی کیوں اور کیسے؟	۴۴ صفحات	۱۹۶۹ء
۷۔	خواتین یونیورسٹی (جائزہ)	۳۵ صفحات	۱۹۶۶ء
۸۔	ہمارا نظامِ تعلیم	۱۹ صفحات	۱۹۶۷ء
۹۔	"طلبہ کمیشن کی رپورٹ"	۱۴ صفحات	۱۹۶۶ء

- حکومت سے محض مطالبہ کرنے کے بجائے انتہائی مثبت طور پر ہم نے تعلیم کے مسئلہ پر ہر اس حکومت کو اپنی واضح تجاویز اور تفصیلی سفارشات پیش کیں جس نے تعلیم پر کچھ سوچنے ــــ کچھ کرنے کا اعلان کیا۔
- جناب ایس ایم شریف کی قیادت میں NATIONAL EDUCATION COMMISSION شائع ہوئی، تو ہم نے اپنے تفصیلی تنقیدی کام کی رپورٹ مرکزی وزیرِ تعلیم کو ارسال کی۔
- جنابِ جسٹس حمود الرحمٰن کی زیرِ نگرانی بننے والے کمیشن کو جنوری ۱۹۶۵ء میں (EDUCATIONAL PROBLEMS OF PAKISTAN) کے زیرِ عنوان مفصل یادداشت روانہ کی جس کو لیتا در سے چٹاگانگ تک کے طلباء نے صاد کیا۔
- ۱۹۶۷ء میں مرکزی وزارتِ تعلیم کے تحت "نصابیات کی تدوین" کے سلسلہ میں تجاویز طلب کرنے پر نومبر ۱۹۶۷ء میں ایک جامع رپورٹ اسلامی جمعیتِ طلبہ پاکستان کی جانب سے قدرت اللہ شہاب وفاقی سیکرٹری تعلیم کو ارسال کی گئی کہ کس طرح نظریہ پاکستان

...کی تعلیمی پالیسی کو نافذ کرنے کی کوششیں ناکام بنا دیں اور اس کا خاتمہ ... کا حاصل نہ ہونے دیا گیا۔

• نور خاں تعلیمی کمیشن نے جون ۱۹۶۹ء میں انتہائی تفصیلی تجاویز دی گئیں۔ اس کی تعلیمی پالیسی کے اعلان پر دوبارہ تنقیدی جائزے کی مفصل رپورٹ ارسال کی گئی۔

• گزشتہ حکومت نے بھی فروری ۱۹۷۲ء میں تعلیمی کانفرنس منعقد کی۔ تسنیم عالم منظور مرحوم ناظم اعلیٰ اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان نے بحیثیت کی جانب سے مفصل تجاویز پر مشتمل یادداشت وزیر تعلیم جناب پیرزادہ کو پیش کی ——— ہماری کوششوں کو شروع ہی سے تسلیم کیا گیا لیکن پہلی مرتبہ تجاویز کا پرتو ۱۹۶۹ء میں دکھائی دیا ——— جب کہ ۱۹۶۹ء کی نور خاں تعلیمی پالیسی میں تعلیم کی نظریاتی اساس کو واضح طور پر تسلیم کیا گیا۔ نتیجتاً ہم نے اسے اسلامی نظام تعلیم کی طرف پہلا قدم قرار دیا۔ اس کی حمایت میں طلبا نے مظاہرے کیے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کا ایک انتہائی ذہین طالب علم عبدالمالک۔ رناظم ڈھاکہ جمعیت ورکن مرکزی مجلس شوریٰ) کو اسی تعلیمی پالیسی کی حمایت میں NIPA کے ایک مذاکرے میں تقریر کرنے اور ڈھاکہ یونیورسٹی میں لادینی نظام تعلیم کی مخالفت کرنے پر شہید کر دیا گیا۔

۱۹۷۲ء کی تعلیمی کانفرنس میں بھی اس نظریاتی اساس کو ختم نہیں کیا گیا۔ لیکن ان تمام تر کاوشوں کے باوجود عملاً ہمارے نظام تعلیم میں نہ کوئی تبدیلی لائی گئی اور نہ ہی ان پالیسیوں اور طے شدہ امور کے مطابق کوئی اقدامات کیے گئے۔

اب جب کہ ——— پھر ایک مرتبہ نئے سرے سے قومی تعلیمی کانفرنس منعقد ہو رہی ہے۔

• ہم اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے طلبا کی تجاویز آپ کے سامنے رکھ رہے ہیں تاکہ اس طرح جہاں طلبا کی فکر آپ کے سامنے آئے وہیں طلبا کے اس تعمیری کردار کو بھی آپ نوٹ کر سکیں۔

• ہم سمجھتے ہیں کہ نظام تعلیم کی نئے سرے سے تشکیل و تعمیر اب کوئی متنازعہ مسئلہ نہیں ہے نہ ہی اس کی نظریاتی اساس پر کسی طرح کی الجھن باقی ہے ——— اس کانفرنس کا اصل کام واضح اور دو ٹوک پالیسی فیصلوں کا ہے نہ کہ محض الفاظ کے گورکھ دھندے میں الجھانے اور ٹالنے کا۔

• ہم سمجھتے ہیں کہ اس کانفرنس کو اسی بات کا بھی جائزہ لینا چاہیے کہ آخر تعلیم کے مسئلہ پر کی جانے والی گزشتہ تمام پالیسیاں اور سفارشات نافذ کیوں نہ ہو سکیں ——— ؟

اس لیے کہ اصل اور بنیادی مسئلہ اب نفاذ کا ہی نظر آتا ہے۔ قومی زندگی اور تعمیر کے اس انتہائی اہم مسئلہ سے اب یہ مذاق مزید نہیں چلنا چاہیے کہ جو حکومت بھی آئے وہ نئے سرے سے بات شروع کر دے اور جب وہ گزر جائے تو نیا آنے والا پچھلے کام کو یکسر ایک طرف ڈالتے ہوئے نئی عمارت کی تعمیر شروع کرنے کا اعلان فرما دے۔

• ہمارے خیال میں ان پالیسیوں کے نفاذ کی راہ میں مندرجہ ذیل رکاوٹیں حائل رہی ہیں

۱۔ نظام تعلیم کے مقاصد اور ہدف (TARGET) سے نافذ کرنے والے نوکر شاہی کے اداروں کی بیگانگی ——— اور نظریۂ پاکستان کی راہ میں ان کی ذہنی خلیج۔ ان کا مسلکی رجحان!

۲۔ ہر حال ہمارا کا فلسفہ تدریج کہ بعض فوری اقدامات سے پیچیدگیاں پیدا ہوں گی۔ لہٰذا پانچ سال کا یا آٹھ سال کا پیریڈ مقرر کر دیا جائے۔ اس تدریج کے فلسفے کا سہارا عموماً اس بیمار ذہن نے لیا جو ان پالیسیوں اور اقدامات سے اپنے آپ کو ہم آہنگ نہ کر سکا تاکہ تاخیری حربے ... کو استعمال کرکے ... ہوئے لال فیتے کا شکار بنا دیا جائے۔

۳۔ کسی بھی پالیسی یا سفارشات پر عمل کرتے ہوئے اس تبدیلی کے نصب العین یا ہدف کو مستقلاً سامنے نہیں رکھا گیا۔ نتیجتاً وہ اوجھل ہوتا چلا گیا۔

۴۔ پالیسی کو نافذ کرنے والی اور اس کے نفاذ کو چیک کرنے والی کوئی پالیسی مرکزی ہیئت موجود نہیں تھی جو نظام تعلیم کی تبدیلی کی دلی طور پر خواہاں ہو۔ رسمی کارروائی کے طور پر یہ اہم ترین کام ہوتا رہا۔

۵۔ یہ تو ہمارے اندازے ہیں جن کے پاس نہ سرکاری فائلیں ہیں نہ ہدایات کے خفیہ خطوط ——— ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیم کے اس مسئلہ کے بار بار اٹھنے ——— سفارشات اور پالیسی بننے کے بعد یکسر فراموش کر دیے جانے کے عمل پر باقاعدہ تحقیقات ہونی چاہئیں تاکہ متعین واضح طور پر یہ رکاوٹیں سامنے آ سکیں ——— اور ان ناکامیوں کے پیش نظر آئندہ کے لیے بھرپور منصوبہ بندی کی جا سکے۔

بہرصورت آئندہ کسی بھی پالیسی یا سفارشات کے مؤثر نفاذ کے لیے ہماری تجاویز مندرجہ ذیل ہیں۔

تحریکِ نفاذ

نفاذ روایتی انداز میں نہ ہو بلکہ اسے ایک تحریک کی شکل دی جائے۔ اس سلسلہ میں ملک بھر کے دانشوروں اور اساتذہ کا تعاون آپ کے ساتھ ہوگا۔ ہم پاکستان بھر کے طلبہ کا بھرپور تعاون اس مقصد کے لیے پیش کرتے ہیں۔

ابلاغِ عامہ

ابلاغ عامہ کے پروگرام مسلسل ان سفارشات کو عوام کے سامنے لاتے رہیں تاکہ کوتاہیوں پر احتساب کا عمل ہو سکے۔

مرکزی کونسل

اس کے نفاذ اور نگرانی کے کام کو نوکر شاہی کے حوالے کرنے کے بجائے ایک "مرکزی تعلیمی کونسل" کے سپرد کیا جائے جو ملک کے نامور اہل علم، اساتذہ، طلبا اور صحافیوں پر مشتمل ہو۔ اس میں افراد کی تقرری کے وقت ان کے علم، تقویٰ، حب وطن کو ملحوظ رکھا جائے۔

تبادلہ تقرر

اس کے نفاذ کے لیے محکمہ تعلیم میں فعال افراد کا تبادلہ یا تقرر کیا جائے

مزید پیش رفت

اس کانفرنس کے رہنما خطوط پر مختلف کمیٹیوں، کمیشن اور یونیورسٹیوں میں مزید کام جاری رہنا چاہیے اس لیے کہ محض ایک کانفرنس اس گمبھیر مسئلہ کا حل نہیں، پیہم جدوجہد کی ضرورت ہے۔ ان کی تجاویز کو ابلاغ عامہ کے تمام ذرائع سے وسیع تشہیر دی جائے ——— سرکاری طور پر ——— ان تجاویز پر عملدرآمد کے ذریعے اس کام کی مسلسل حوصلہ افزائی ہوتی رہنی چاہیے۔

ماہانہ مجلہ

ایک ماہانہ مجلہ ان تمام کاوشوں اور اس کانفرنس کے FOLLOW UP پروگرام کو سامنے لاتا رہے۔

تعلیمی ٹیکس

مالی وسائل کی دقتوں کا ازالہ ماہانہ ہزار روپے سے زائد ماہانہ آمدنی رکھنے والے فرد پر ۵ فی صد تعلیمی ٹیکس لگا کر کیا جا سکتا ہے

جمعیت متوازی کمیشن

ہماری تنظیم سے متعدد ایسے باصلاحیت طلبا وابستہ ہیں جو آپ کی کانفرنس کے دیئے ہوئے خطوط، بنائے ہوئے کمشنر اور کمیٹیوں کے سواری سٹینڈ کمشنر اور کمیٹیاں تا کہ مسلسل اسلامی تعمیری تجاویز فراہم کر سکتے ہیں۔ اگر اس کانفرنس کے ممبر پر، افرادی وسائل اور دیگر وسائل ہمیں متواتر مہیا کی جائیں، تو انشاءاللہ ہم اس ادارے میں بھی قومی تعمیر میں حصہ لیں گے۔

● محترمی — ! ہم یہ پچاس ہزار سے زائد الفاظ پر مشتمل یادداشت آپ کے حوالے کرتے ہوئے پورے اعتماد سے یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے ایک مرتبہ پھر اپنا فرض ادا کیا ہے — اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو۔ (آمین)

”طلبہ کے نزدیک ہمارے نظامِ تعلیم کا مقصد ایسا پاکستان بنانا ہونا چاہیئے۔ جو بہترین مسلمان بھی اس معاشرے کو دے اور بہترین صاحب علم و فن بھی“

نظامِ تعلیم کا نصب العین

اس مقصد کے لئے ہمارے نظامِ تعلیم میں فوری طور پر مندرجہ ذیل تبدیلیاں لائی جانی چاہئیں

تعلیم گاہوں کا ماحول

تعلیمی اداروں کے موجودہ ماحول کو تبدیل کیا جائے اور اس سلسلے میں ضروری اقدامات کیے جائیں۔ گو مکمل تبدیلی کے لئے کچھ عرصہ درکار ہوگا لیکن ابتدا میں چند مفید اور مؤثر اقدامات کئے جا سکتے ہیں۔ اس وقت رقص اور موسیقی کو قومی ثقافت کا ایک جزو سمجھا جاتا ہے اور مغربی زندگی کے رجحانات بڑھتے جا رہے ہیں، اخلاقی قدروں کو پس پشت ڈالا جا رہا ہے اور روز مرہ کے مواقع سمجھانے کی ضرورت تک محسوس نہیں کی جاتی۔ معمر، ڈرامے اور سحاوت میں مسلم ثقافت کوئی اہمیت نہیں رکھتی، مذہب کو ایک نجی اور انفرادی معاملہ قرار دیا جا رہا ہے۔ یہ رجحان ختم ہونا ضروری ہے۔ ہمارے تعلیمی اداروں کو اس بات کا واضح اور مثبت شعور دیا جانا چاہیئے کہ ہم اول و آخر مسلمان ہیں۔ اگر اس بات کی اہمیت کو قبول کر لیا جائے تو ایسے کئی اقدامات کی سفارش کی جا سکتی ہے جو آسانی سے قابل عمل ہیں۔ اگر ان اقدامات پر سختی سے عمل کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے تعلیمی اداروں کے ماحول ہمارے نظریات کے مطابق نہ ہو۔ اسی طرح مخلوط تعلیم کو بھی ختم کیا جانا چاہیئے ورنہ اگلے مرحلے پر بحث آئے گی۔

(۱۰) ہر ہائی سکول اور کالج میں مسجد کی تعمیر لازمی قرار دی جائے۔

(۱۱) نماز کے اوقات میں کوئی پریڈ نہ ہو۔

(۱۲) طلبہ کے لئے اہتمام اسمبلی

تمام اسکول اور کالجز میں تدریس کا آغاز ”اسمبلی پریئر“ (ASSEMBLY PRAYER) سے ہو جس میں تلاوت کلام پاک بمعہ ترجمہ کوئی سی دس احادیث نبویؐ، قومی ترانے اور پاکستان کا پرچم بلند کرنے سے ہو مناسب اعتبار سے روزانہ یا ہفتے میں دو دن سیرت یا سوانح پر مشتمل ایک واقعاتی تقریر بھی معمولات میں ہوگی۔

(۱۳) قومی لباس

قومی لباس کی اہمیت مسلّمہ ہے حضور اکرمؐ کی معروف حدیث ہے ”من تشبہ بقوم فھو منھم“۔ لہذا ہماری تجویز ہے کہ فوری طور پر ملک کے ہر تعلیمی ادارے سے جہاں پتلون اور ٹائی کوٹ کو لازمی لباس حیثیت حاصل ہے اس حیثیت کو ختم کر دیا جائے۔ بہر یونیفارم کے طور پر کالجز کی سطح پر سفید، ہائی سکولز میں سرمئی رنگ اور پرائمری کلاسز تک طلبہ میں شلوار قمیص کو لازمی قرار دیا جائے۔ خدا کرے کہ وہ وقت جلد آئے۔

جنسی لباس تفاخر کی بجائے ندامت کا باعث ہو۔

(۱۴) بااختیار بورڈ

طالب علم محض تعلیمی ادارے سے نہیں سیکھتا بلکہ اس کا ماحول اس پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کا ماحول اور موجودہ تفریحی سرگرمیاں نوجوانوں کو تعمیر کردار کی جانب نہیں لے جا رہیں۔ یہی وجہ ہے نوجوانوں میں بے راہ روی اور بے مقصدیت اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ اگر ہمیں نئی نسل کی تربیت کا خیال کرنا ہے تو پورے ملک سے عریانی و فحاشی کو خواہ وہ لٹریچر ہو یا ابلاغ عام کے ذرائع میں پوری شدت سے ختم کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ صحت مند تفریحی اور علمی مشاغل کی جگہ دوسرے تفریحی ادارے کو اٹھایا جائے یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ گزشتہ چند سالوں میں طالب علموں کے سب سے زیادہ ٹی وی کا اثر قبول کیا ہے۔

ہماری تجویز ہے کہ ملک کے مسلمہ دانشوروں پر مشتمل ایک بااختیار بورڈ مقرر کیا جائے جو پورے ملک میں ریڈیو، ٹی وی جیسے اداروں کو قومی ضروریات کے پیش نظر رہنمائی بھی اور چیک بھی کرے

نصاب اور درسی کتب

ہمارا نصاب اور درسی کتب نہ صرف مقصدیت کے اعتبار سے غیر واضح ہے بلکہ جدید معلومات سے بھی عاری ہے۔ ان دونوں مقاصد کے لئے مختلف سطحوں پر مختلف کمیٹیوں کی تشکیل کے ساتھ ساتھ مندرجہ ذیل دو تجاویز خاصی موثر ثابت ہوں گی

(۱۵) نصاب پر نظر ثانی

یہ بات بطور اصول اختیار کی جائے کہ پرائمری سکول کی حد تک ہر ۴ سال بعد، ہائی سکول کی حد تک ہر ۳ سال بعد، گریجوایشن اور پوسٹ گریجوایٹ کلاسز کا ہر سال نصاب پر نظر ثانی کر کے جدید ترین معلومات سے آراستہ کیا جائے۔

(۱۶) نصابی کتب – مقابلہ

ہائی سکول تک نصاب کی تمام نصابی کتب مقابلہ کی بنیاد پر مرتب کرائی جائیں، جب کہ ان کتب کے انتخاب (SELECTION) کا فیصلہ سورد کرشش کی بجائے مسلم صاحب بصیرت حضرات کا بورڈ کرے جس کا فیصلہ حتمی ہو۔

(نصاب کے بارے میں تفصیلات آگے ہیں)

اساتذہ

نظام تعلیم میں اس وقت تک کوئی عملی تبدیلی آ ہی نہیں سکتی جب تک کہ اساتذہ کی غالب اکثریت کو نہ بدل دیا جائے۔ بچے اور معصوم ذہنوں پر استاد ایک دائمی اور انمٹ نقش ثبت کرتا ہے۔ اس کے اعتقادات اور اقدار، برتاؤ اور کام طلبہ کے لئے ایک مثال کا کام دیتا ہے۔ اساتذہ کی حالت کو بدلے بغیر ہمارا ہمیں اس منزل تک لاتے بغیر یہ ممکن ہی نہیں کہ طلبا کو اسلامی تعلیمات اور اصولوں کا پیکر بنا دیا جائے۔

اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے یہ اقدامات اختیار کئے جا سکتے ہیں

(۱۷) استاد اور کردار

نئی تقرریوں کے وقت اساتذہ کے کردار اور عمل کو انتہائی اہمیت دی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ امیدوار نے اسلامی شعائر سے اپنی زندگی کو کس حد تک سنوارا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس طرف اگر پوری توجہ دی جائے تو جلد ہی حوصلہ افزا نتائج برآمد ہوں گے اس کے لئے ابتدا میں مثالی اساتذہ پیدا کرنے کے لئے پورے ملک کی بنیاد پر کچھ ماڈل ٹیچرز ٹریننگ کالج بنائے جائیں۔ اگر اس سلسلہ میں معقول سہولتیں دی جائیں اور حکومت حقیقتاً کچھ کرنے کا ارادہ کر لے تو اب بھی ہمارے ملک میں ایسے افراد کافی ہیں جو ان چند اداروں کو اطمینان بخش طریقے پر چلا سکتے ہیں۔ اگر اس کام کو پورے جوش و جذبہ اور خلوص کے ساتھ کیا جائے تو ہم ایسے اساتذہ کے حصول میں کامیاب ہو سکیں گے جو ہماری تعلیمی زندگی پر صحت مند مثبت اور ٹھوس اثرات چھوڑ سکیں۔

(۱۸) ریفریشر کورسز

موجودہ اساتذہ کے لئے اسلامی تعلیمات پر مشتمل ایک ضروری ریفریشر ٹریننگ کورس شروع کیا جائے تاکہ وہ ان تعلیمات سے کما حقہ مستفید ہو سکیں ان کورسوں کا مرکزی نقطہ یہ ہونا چاہیئے کہ اساتذہ میں، ان زندگیوں کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کا جذبہ پیدا ہو۔ زندگی میں یہ انقلابی تبدیلی کوئی مشکل کام نہیں۔ اسلام جن عقائد سے عبارت ہے انہوں نے زندگی میں ہمیشہ انقلاب پیدا کئے ہیں صرف اسی بنیاد پر یہ ممکن ہے کہ زندگی میں تبدیلی کے اس اہم کام کو سرانجام دیا جا سکے اسی طرح ترقی وغیرہ کے معاملہ میں بھی انہی امور کو پیش نظر رکھنا چاہیئے ترقی کی رپورٹوں میں صرف پیشہ ورانہ مہارت ہی نہ ہو بلکہ اساتذہ کا تمام برتاؤ، اخلاقی اقدار اور شعائر اسلامی بھی اس میں اہم جگہ پائے ہیں۔

(۱۹) ڈائری سسٹم

ہیڈ ماسٹر اور ٹیچرز کے لئے ڈائری رکھنا لازمی قرار دیا جائے جس میں مختلف مضامین سے متعلق دوسرے اندراجات کے ساتھ علی الخصوص یہ نوٹ کیا جانا رہے کہ اسلامی فکر کو واضح کرنے کے لئے کیا کام کیا گیا ہے؟ کیا مشکلات پیش آئیں؟ کیا نئے سوالات سامنے آئے؟ اور کن الجھنوں کا کیا حل نکالا گیا؟

لیکن ڈائری سسٹم جبھی سود مند ہو سکتا ہے کہ ڈائریوں کا معائنہ کرنے کا انتظام ہو۔ ہر پرنسپل اور ہر ہیڈ ماسٹر اس کے لئے کوئی موثر صورت نکالے۔ اساتذہ کی ترقیوں کا دارومدار ان کی ڈائریوں اور ان کے کام کی رپورٹوں پر ہونا چاہیئے۔

(۲۰) کانفرنسیں

پرنسپلوں ہیڈ ماسٹروں اور ایک ایک مضمون کے معلموں کی علاق

کانفرنسیں سال میں کم از کم دو بار ہونی چاہئیں، جہاں تعلیمی انقلاب کا موضوع مرکزی حیثیت سے زیرِ بحث لایا جائے۔

(۲۱) مجلہ برائے اساتذہ

اساتذہ کے لئے ایک یا ایک سے زائد ایسے سہ ماہی اور ماہانہ رسائل کا اجراء کیا جائے جن میں اسلامی تعلیمی انقلاب کے سلسلہ میں ابرایہ مقالات کے ذریعے رہنمائی بہم پہنچائی جائے۔

(۲۲) الحاد اور برطرفی

اگر استاد کا رویہ اسلامی خطوط پر تعلیمی انقلاب کے کام میں مضر ثابت ہو تو ترقی روکنے اور تنزل کرنے سے لیکر برطرفی تک کارروائی کی جانی چاہئے۔ خصوصاً اگر استاد کی طرف سے مخالف اسلام نظریات کی حمایت کرنا (یہ کہ محض زیرِ بحث لانا) یا اسلامی تصورات و احکامات کی تضحیک کرنا ثابت ہو جائے تو اسے بطور سزا ہر قسم کے معاوضے سے محروم کر کے برطرف کر دینا چاہئے۔ اگر ریاست کے لئے تخریبی عمل ناقابل برداشت ہے تو نظام تعلیم بھی تخریبی عمل کا روادار نہیں ہو سکتا۔

معاشرے میں استاد کی حیثیت اس کے کردار اور صرف کردار پر منحصر ہے، اس کا کوئی دوسرا بدل ممکن نہیں ہے۔ اونچی تنخواہیں اور سہولتیں ضرور لکھول پر لیکن صرف یہی چیزیں اس عظیم منصب اور عزت کی بنیاد نہیں ہیں جو ہمارے معاشرہ میں استاد کو ہمیشہ حاصل رہی ہے۔ اگر استاد اپنے اندر ایک صالح اسلامی کردار پیدا کریں تو لازماً طلباء کے دل میں ان کی محبت بڑھے گی۔ اس طرح مسلمان معاشرہ میں اساتذہ اور شاگردوں کے یہ مقدس رشتے جو ایک تاریخی روایت ہیں، ایک نئے دور میں داخل ہوں گے۔

متفرق تجاویز

ملی حدثوں کو ابھارنے کے لئے چند متفرق تجاویز

(۲۳) لازمی فوجی تربیت

ہمارا عرصہ دراز سے یہ مطالبہ ہے کہ ہر طالب علم کو کم از کم ایک سال کے لئے لازماً فوجی تربیت دی جائے۔ تاکہ طلبہ جیسی قوت کو جہاں ہنگامی قومی ضروریات کے لئے تیار رکھا جا سکے وہیں ان میں ڈسپلن، حفظانِ صحت اور قومی تحفظ کے احساس کو ابھارا جائے۔ اس معاملہ میں پچھلی حکومت کے دوران ایک سال تک کے لئے لازمی فوجی تربیت کا آغاز ہوا، مگر نامعلوم وجوہات کی بنا پر ختم کر دی گئی۔!

ایک سالہ لازمی فوجی تربیت کے متبادل کے طور پر این۔ سی۔ سی کا آغاز ہوا جو ایک پریڈ کے طور پر محض ۲۰ نمبروں کے حصول کا ذریعہ بن کے رہ گیا ہے۔ نتیجتہً نہ ایک سالہ فوجی تربیت کی ضرورت پوری ہوتی ہے اور نہ ہی جسمانی تربیت اور ڈسپلن حاصل ہوتا ہے پس ہمارا مطالبہ ہے کہ این۔ سی۔ سی کے اس سلسلہ کو ختم کر کے ایک سالہ لازمی فوجی تربیت کو اختیار کیا جائے۔

(۲۴) مسلم اسکاؤٹس

پرائمری اور ہائی سکول کی سطح پر طلبہ کے لئے اسکاؤٹس کی طرح پر ایک فعال ادارے کی ضرورت ہے جسے ایمان اور حب وطن کی بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ خدمتِ خلق کے جذبات اگر طلبہ کے ایمان اور اعتقاد پر استوار ہوں تو کہیں زیادہ مؤثر ثابت ہو سکتے ہیں۔

مثلاً ان کے حلف میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کو شامل کیا جا سکتا ہے۔

(۲۵) قومی تعلق کا ایک ذریعہ سیاحت

(الف) اس بات کا اہتمام کیا جائے کہ ہائی سکول کا ہر طالب علم اپنے ماحول سے باہر کم از کم ایک "ٹور" کر سکے کالج کے ہر طالب علم کو پورے ملک کا دورہ کرنے کے مواقع بہم پہنچائے جائیں۔ ایسے "ٹورز" کے سلسلہ میں ٹرین کا کرایہ فری ہونا چاہئے۔ اس تجویز سے بظاہر اچھا ہوتا ہے لیکن یہ ایک اہم ضرورت ہے۔ اب تک اس سہولت سے زیادہ استفادہ شہری طلبہ کرتے ہیں اور غریب اور دیہاتی طلبہ اس سہولت اور سفر سے محروم رہتے ہیں۔

(ب) یہ محض مختصر تفریحی دورے نہیں ہونے چاہئیں بلکہ یہ پاکستان سے لگاؤ، نظریاتی تربیت کا ایک ذریعہ ہوں، ہر پچیس طلبہ پر ایک استاد لازماً نگراں ہونا چاہئے اور طلبہ کے مضمون کی مناسبت سے قابل دید مقامات مختلف اہم صنعتی کارخانے اور سائنسی اداروں کے "گائیڈڈ ٹورز" پہلے سے طے کئے جائیں۔

(۲۶) فوجی قوت کے مظاہرے

قومی اہمیت کے ایام مثلاً "یوم جمہوریہ پاکستان" ۲۳ مارچ اور ۶ ستمبر وغیرہ کو رسماً منانے کی بجائے ان تمام شہروں میں جہاں فوجی چھاؤنیاں موجود ہیں لازماً فوجی قوت کے مظاہرے کئے جائیں۔

مثلاً، ہائی اسکولز اور کالجز کے طلبہ کو ان ایام میں رخصت دینے کی بجائے اساتذہ کی زیرِ نگرانی ان مظاہروں کو دیکھنا لازمی قرار دیا جائے۔ اس کے ہماری نئی نسل پر نہایت مثبت قومی اثرات مرتب ہوں گے۔

(۲۷) ٹی۔ وی کا استعمال

پرائمری کے لئے دستاویزی فلموں اور مختلف تعلیمی پروگراموں کے ذریعہ، ریڈیو، ٹیلیویژن پر صبح کے اوقات میں کم از کم دو گھنٹے تک نشریات شروع کی جائیں۔ جن میں تعلیمی فلموں اور ڈراموں کے ذریعہ نظریاتی تشخص، قومی تہذیب و تمدن کو رواج دیا اور عظمتِ اسلام، شجاعت اور قومی غیرت و حمیت کو ابھارا جائے۔

ذریعۂ تعلیم

انگریزی کے بجائے اردو کو بحیثیت ذریعۂ تعلیم اپنایا جانے کا اصول

امتحانات میں نقل ایک انتہائی سنگین مرض بن چکا ہے۔ اس مرض کے خلاف ہوا امتحانات کے سلسلے سے پہلے اطلاع عامہ کے تمام ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے مہم چلائی جائے اور ہر امتحان کے ایک ہفتے کے اندر اندر نقل میں ملوث طلبہ اور اساتذہ پر مقرر کردہ سخت سزا دی جائے بلکہ ان کی تشہیر بھی کی جائے۔ تاکہ معاشرہ میں یہ برائی کرنے والا سر نہ اٹھا سکے۔ اس سلسلے میں متعلقہ قوانین پر نظرثانی کی جائے۔ تحقیقات کا طویل عرصہ مجرم کے لئے ہمیشہ مفید ثابت ہوا ہے۔

تعلیم نسواں اور مخلوط تعلیم

نظام تعلیم کو اسلامی اصولوں میں ڈھالنے کے لئے مخلوط تعلیم، مخلوط سوسائٹی، مخلوط مجالس کا خاتمہ بہت ضروری ہے۔ ہماری تہذیبی اقدار سے یہ قطعاً لگا نہیں کھاتی۔ جو مغرب میں اس کی تباہی کے گواہ وہاں کا منتشر نظام خاندان، نظام معاشرے اور نظام اخلاق ہیں۔ مخلوط تعلیم کو قطعاً ختم کیا جانا چاہیئے۔ اگر ہمارے نظریہ حیات اور ہماری اسی تقاضے کا کچھ لحاظ کیا جاتا تو اسے ایک دن کے لئے بھی برداشت نہیں کیا جانا چاہیئے تھا مخلوط تعلیم ہماری آنے والی نسلوں کے کردار کو شدید طور پر متاثر کر چکی ہے اور مستقبل میں اس کے نتائج مزید تشویشناک ہوں گے جتنی جلد ہم اس مصیبت سے چھٹکارا پا لیں اتنا ہی ہمارے مستقبل کے حق میں اچھا ہوگا۔

قومی اور اقتصادی نقطۂ نظر سے بھی مخلوط تعلیم کوئی قابل عمل چیز نہیں۔ ہمارے ہاں کی ایک پڑھی لکھی لڑکی کے فرائض ایک معمولی لڑکی کے فرائض سے قطعی مختلف نہیں۔ محض اندھی تقلید کے نتیجے کے طور پر اس وقت لڑکیوں کی ایک انتہائی قلیل تعداد مردوں کی طرح عملی زندگی میں داخل ہوتی ہے اور اس کو اختیار کرتی ہے اس طرح موجودہ نظام کے تحت ان پر قومی آمدنی خرچ کی جاتی ہے وہ محض ضائع ہو جاتی ہے

علمی استعداد کی کمی اور اخلاقی گراوٹ کی ذمہ داری بہت حد تک مخلوط تعلیم پر بھی عائد ہوتی ہے اس لئے ہم تجویز کرتے ہیں۔ اس کے خاتمہ کیلئے مندرجہ ذیل اقدامات کئے جائیں

(۴۰) دو جامعہ خواتین

کراچی اور لاہور میں دو خواتین یونیورسٹیز کی فوری ابتدا کی جائے۔ دونوں مقامات پر وہاں کے ہوم اکنامکس کالج کو BASE بنایا جا سکتا ہے۔ (مسلسل تجاویز اس مقصد کے لئے قائم کی گئی کمیٹی کو دی جا رہی ہیں) الگ یونیورسٹی ایک بہتر تعلیمی ماحول کی تشکیل میں مدد دے گی بلکہ ان طالبات کی حوصلہ افزائی کا باعث ہوگی جو مخلوط تعلیم کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم سے محروم رہ جاتی ہیں اس سے ہم لڑکیوں کی ایک کثیر تعداد کو تعلیم دے سکیں گے اور ایسی تعلیم جو عام تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی فطرت اور معاشرے کی ضروریات کے عین مطابق ہو

(۴۱) خصوصی سہولیات

خواتین کے لئے تعلیم کی وافر سہولیات فراہم کی جائیں تاکہ ملک میں طالبات کے کالجوں کا جال بچھ جائے

(۴۲) ڈگری تک مخلوط تعلیم کا خاتمہ

ابتدائی کلاسز سے لے کر ڈگری کے برابر تمام کلاسز میں فی الفور مخلوط تعلیم ختم کر دی جائے۔ اس لئے کہ کراچی کے علاوہ بقیہ ملک میں ابھی یہ سہولت کہیں موجود ہے جب کہ کراچی میں خواتین کے تعلیمی ادارے خاطر خواہ موجود ہیں

(۴۳) ایم۔اے کلاسز کا اجراء

کراچی اور لاہور کے علاوہ دوسرے شہروں کے گرلز ڈگری کالجز میں بھی معروف مضامین میں پوسٹ گریجویٹ کلاسز کا اجراء کیا جائے۔

(۴۴) گرلز میڈیکل کالجز

میڈیکل کالجز میں مخلوط تعلیم کے خاتمے کے لئے نئے میڈیکل کالج بنانے کی ضرورت نہیں اگر سندھ اور پنجاب کے کسی ایک میڈیکل کالج کو صرف طالبات کے لئے مخصوص کر کے وہاں کے طلبہ کو دوسرے میڈیکل کالجز میں "مائیگریٹ" کر دیا جائے۔ اس طرح عملاً مزید دو گرلز میڈیکل کالج عمل میں آ جائیں گے جو صوبہ پنجاب و سرحد۔ سندھ اور بلوچستان کی تمام میڈیکل کی طالبات کے لئے کافی ہوں گے۔

(۴۵) خواتین، تربیتی مراکز

اسی طرح ٹیچرز ٹریننگ کالجز کو علیحدہ کر دیا جائے جہاں تک خواتین اساتذہ کی کمی کا تعلق ہے اسے مرد اساتذہ کے تعاون سے عبوری طور پر حل کیا جا سکتا ہے۔

طلباء اور اساتذہ

تعلیم کا سب سے مقدس رشتہ استاد اور طالب علم کا رشتہ ہے بدقسمتی یہ کہ غلامی اور اب غلامانہ نظام تعلیم نے ہمیں اسی اقدار سے اسلئے محروم کیا کہ آج دیگر رشتوں کی طرح یہ رشتہ بھی نہ ہونے کے برابر ہے اور جب شفقت و محبت، احترام و عزت کے یہ رشتے برقرار نہ رہیں تو کیسی تعلیم اور کہاں کی تربیت۔

(۴۶) اساتذہ سے مندرجہ ذیل شکایتیں موجود ہیں

(ا) اساتذہ جو اسی غلط نظام کے تحت اپنی تعلیم اور تربیت کی بنا پر ذمہ داریوں سے فرار اختیار کرتے ہیں۔

(ب) اسکول جیسی اہم ترین اور بنیادی تعلیم کے ذمہ دار اساتذہ تنخواہوں کی کمی کے سبب پریشان اور دیگر معاشی ذرائع کے لئے سرگرداں ہیں۔ پرائمری اسکول لیول پر دینی اساتذہ انہی وجوہات کی بنا پر میسر نہیں آتے۔

(ج) اسکول کے اساتذہ معاشرے میں مناسب معاشی مقام نہ ملنے کے سبب احساس کمتری کا شکار ہیں۔

(د) واضح مقصد سامنے نہ ہونے کے سبب عدم دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں
(س) ایسے کردار اور اداروں سے طلبا کے سامنے خود اپنے احترام کو مجروح کرتے ہیں۔

(۴۷) بیشتر طلبہ سے اساتذہ کو یہ شکایات ہیں

(الف) استاد کے مقام کو محسوس نہیں کرتے
(ب) ڈسپلن کا خیال نہیں کرتے۔ پابندیوں کو برداشت نہیں کرتے
(ج) علم سے دلچسپی نہیں ہے۔ ٹسٹ پیپر اور نقل کا سہارا لیتے ہیں۔
(د) سیاست بازی سے زیادہ دلچسپی ہے وغیرہ

ہمارا خیال یہ ہے کہ طلبا اور اساتذہ کے درمیان تعلق اسی صورت میں درست اور صحیح ہو سکتا ہے کہ جب پورے نظام تعلیم و مقصد تعلیم کی علت اور اس کے بدلنے کو تحریک کی صورت دی جائے۔

(۴۸) بہر صورت چند عبوری تجاویز پیش خدمت ہیں

اساتذہ خود اپنی ذمہ داری اور کردار کا خیال رکھیں۔ باکردار اور مخلص استاد کا ہر سکول، کالج اور یونیورسٹی میں آج بھی بھرپور احترام کیا جاتا ہے۔ شریر سے شریر طالب علم بھی ان کی عزت کرتا ہے

(۴۹) وہ تمام چیزیں جن کا طلبا سے تقاضا کیا جائے ان پر استاد بدرجہ اتم عمل پیرا ہوں۔ مثلاً قومی لباس، کلاس میں گھڑی وقت سے پہنچنا، ڈسپلن کی دیگر چیزیں۔ کراچی یونیورسٹی کی ایک مثال سامنے ہے کہ ۶۹ - ۷۰ - ۷۱ء میں سادہ گاؤن طلبا کے لیے لازمی تھا۔ اساتذہ اپنا گاؤن پہن کر آتے اور طلبا سے گاؤن کی پابندی کرواتے اور تمام یونیورسٹی اس علمی وقار اور ڈسپلن سے ممتاز نظر آتی۔ لیکن ۷۲ - ۷۳ء میں مسلسل سر کلر آتے رہے بار بار ہدایت کی جاتی رہی کہ طلبا گاؤن پہنیں۔ چونکہ اساتذہ خود عمل پیرا نہ تھے لہذا یہ بات ختم ہو کر رہ گئی۔

(۵۰) اساتذہ محنت سے لیکچر تیار کر کے آئیں۔

(۵۱) اساتذہ نہ صرف طلبہ کی سیاست سے بالاتر رہیں بلکہ طلبا کو اساتذہ کی گروہی سیاست میں ملوث نہ کریں۔

(۵۲) اساتذہ کے احترام و مقام کو نصاب اور ذرائع ابلاغ عامہ کے ذریعے طلبہ پر واضح کیا جائے۔

(۵۳) جو طلبا اساتذہ سے بدسلوکی کے مرتکب ہوں، ان کا سختی سے محاسبہ کیا جائے اور بلا تاخیر تنظیمی تادیبی کارروائی کی جائے۔ ایسی کسی بھی کارروائی کو سوچ سمجھ کر کیا جائے اور پھر کسی قیمت پر بھی اسے واپس نہ لیا جائے

(۵۴) باکردار اور ذہین طلبہ کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی جائے

(۵۵) کالج یا یونیورسٹی کی سطح پر جو بھی فیصلے طلبہ سے متعلق کیے جائیں انہیں اعتماد میں لیا جائے۔

(۵۶) اساتذہ و طلبا کے درمیان امور پر غیر جانبداری کا رویہ اپنایا جائے۔

(۵۷) طلبہ کے مذاکرات کے ذریعے ان پر ہی حرف کیے جائیں۔

(۵۸) جو بھی انتظامی (ڈسپلن) فیصلے کیے جائیں ان پر عمل درآمد کیا جائے۔ فیصلے کرتے چلے جانا اور عمل درآمد کا خیال نہ رکھنے سے

لاپروائی کی کیفیت اساتذہ اور طلبہ دونوں کے درمیان پیدا ہوتی ہے

ہم طلبہ کے نزدیک اساتذہ اور طلبا کے رویوں پر آخری بات یہ ہے کہ استاد بالآخر استاد ہے اگر وہ استاد بن رہے، ذمہ دار و باکردار شفیق بھی اور گرم بھی۔ تو یقینا شاگرد کو شاگرد ہی بننا پڑے گا۔

نصاب کا مسئلہ

(۵۹) بنیادی اصلاح کی ضرورت

نصابات کی ترتیب نو کا کام ماضی میں تو بار بار ہوا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ چونکہ نظام تعلیم ہی کا کوئی متعین مقصد اور نصب العین متعین نہ تھا اس لئے یہ کام بالعموم بے نتیجہ ہی رہا اور محض ادھر ادھر کی تبدیلیوں کے سوا کچھ نہ ہو سکا۔ اب جبکہ تعلیمی نظام کو بامقصد بنایا جا رہا ہے نصابات کی صحیح تدوین کو غیر معمولی اہمیت دی جانی چاہیئے۔ استاد کا نمونہ، درس گاہوں کا ماحول اور دوسری تمام باتوں کے اثرات اپنی جگہ لیکن جو کام ایک طالب علم کو سب سے زیادہ دلجمعی سے اور شعوری طور پر کرنا ہوتا ہے وہ نصاب کا مطالعہ ہی ہے۔ اس کے ذہن و فکر اور سوچنے کے انداز پر اس کا گہرا اثر پڑتا ہے اس کا مقصد صرف معلومات فراہم کرنا نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اسے طالب علم کو زندگی کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر بھی دینا چاہیئے۔

ابتدائی تعلیم

ابتدائی تعلیم ہمارے تصور کی بنیاد ہے۔ اس تعلیم میں وہ سب مضامین پڑھائیے جو آج آپ کے پرائمری اسکولوں میں پڑھائے جاتے ہیں اور دنیا بھر میں ابتدائی تعلیم کے متعلق جتنے تجربات کئے گئے ہیں اور آئندہ کئے جائیں اُن سب سے فائدہ اٹھایا جائے لیکن چار چیزیں ایسی ہیں جو اس کے ہر مضمون میں پیوست ہونی چاہئیں۔

(۶۰) اوّل – یہ کہ بچے کے ذہن میں ہر پہلو سے یہ بات بٹھائی جائے کہ یہ دنیا ایک خدا کی سلطنت اور ایک خدا کی قدرت کا کرشمہ ہے۔ یہاں ہم خدا کے بندے کی حیثیت سے مامور ہیں یہاں جو کچھ بھی ہے خدا کی امانت ہے جو ہمارے حوالے کی گئی ہے۔ اس امانت کے معاملے میں ہم خدا کے سامنے جوابدہ ہیں۔ یہاں ہر طرف جدھر بھی نگاہ ڈالی جائے اُدھر آیاتِ الٰہی پھیلی ہوئی ہیں۔ جو اس بات کا پتہ دے رہی ہیں کہ ایک حکمراں ہے جو ان سب پر حکومت کر رہا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ابتدائی تعلیم کے لئے جس وقت بچہ داخل ہو اس وقت سے لے کر پرائمری اسکول کے آخری مرحلے تک دنیا سے اس کو آشنا اور روشناس ہی اس طور پر کیا جاتا رہے کہ ہر سبق کے اندر یہ تصورات شامل ہوں۔ یہ وہ چیز ہے جو بچوں میں اول روز سے اسلامی ذہنیت پیدا کرنی شروع کر دے گی اور اُن کو اس طرح سے تیار کرے گی کہ آخری مراحل تعلیم تک جبکہ وہ ڈاکٹر بنیں گے یہی بنیاد اور یہی جڑ کا کام دیتی رہے گی۔

(۶۱) دوم – یہ کہ اسلام جن اخلاقی تصورات اور اخلاقی اقدار کو پیش کرتا ہے انہیں ہر مضمون کے اسباق میں حتیٰ کہ حساب کے سوالات تک میں طرح طرح سے بچوں کے ذہن نشین کیا جائے وہ جن چیزوں کو نیکی اور بھلائی کہتا

ہے اُن کی قدر اور اُن کے لئے رغبت اور شوق بچوں کے دل میں پیدا کیا جائے اور وہ جن کو برائی قرار دیتا ہے اُن کے لئے ہر پہلو سے بچوں کے دل میں نفرت بٹھائی جائے۔ آج ہماری قوم میں جو لوگ رشوتیں کھا رہے ہیں، جو لوگ بددیانتیاں اور خیانتیں کر رہے ہیں وہ سب انہی درسگاہوں سے پڑھ کر نکلے ہیں اور آگے جا کر وہی اپنی قوم کے ساتھ یہ کچھ بے ایمانیاں کرنے لگے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کو جغرافیہ، حساب اور سائنس کے سبق پڑھائے گئے تھے اخلاق سبق نہیں پڑھائے گئے تھے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ہر طالب علم کو جو تعلیم دی جائے اس کے اندر اخلاقی مضامین شامل ہوں۔ اس کے اندر رشوت خوری کے خلاف شدید جذبۂ نفرت اُبھارا جائے۔ اُس کے اندر حرام طریقوں سے مال کھانے اور کھلانے والوں پر سخت تنقید کی جائے، اور اُس کے بُرے نتائج بچوں کے ذہن نشین کئے جائیں۔ اس کے اندر جھوٹ سے، دھوکہ اور فریب سے، خودغرضی اور نفس پرستی سے، چوری اور جعلسازی سے، بدعہدی اور خیانت سے، شراب اور سود اور قماربازی سے، ظلم اور بے انصافی اور لوگوں کے حق مارنے سے سخت نفرت بٹھائی جائے اور بچوں کے اندر ایک ایسی رائے عام پیدا کرنے کی کوشش کی جائے کہ جس شخص میں بھی وہ ان اخلاقی برائیوں کا اثر پائیں اس کو بری نگاہ سے دیکھیں اور اس کے متعلق برے خیالات کا اظہار کریں۔ یہاں تک کہ انہی درسگاہوں سے فارغ ہو کر اگر کوئی شخص ایسا نکلے جو ان برائیوں میں مبتلا ہو تو اس کے اپنے ساتھی اس کو لعنت ملامت کرنے والے ہوں نہ کہ داد دینے اور ساتھ دینے والے۔ اسی طرح ہم یہ چاہتے ہیں کہ وہ نیکیاں جن کو اسلام انسان کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے اُن کو درسیات میں بیان کیا جائے۔ اُن کی طرف رغبت دلائی جائے۔ اُن کی تعریف کی جائے۔ اُن کے اچھے نتائج تاریخ سے نکال نکال کر بتائے جائیں اور عقل سے اُن کے فائدے سمجھائے جائیں کہ یہ نیکیاں حقیقت میں انسانیت کے لئے مطلوب ہیں اور انسانیت کی بھلائی انہی کے اندر ہے۔ بچوں کو دلنشین طریقے سے بتایا جائے کہ وہ اصل خوبیاں ہیں کیا جو ایک انسان کے اندر ہونی چاہئیں اور ایک بھلا آدمی کیسا ہوا کرتا ہے۔ اس میں اُن کو صداقت اور دیانت کا، امانت اور ایفائے عہد کا، عدل و انصاف اور حق شناسی کا، ہمدردی اور اخوت کا، ایثار اور قربانی کا، فرض شناسی اور پابندیٔ حدود کا، اکل حلال اور ترک حرام کا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کھلے اور چھپے ہر حال میں خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرنے کا سبق دیا جائے اور عملی تربیت سے بھی اس امر کی کوشش کی جائے کہ بچوں میں یہ اوصاف نشوونما پائیں۔

(۶۲) سوم:- یہ کہ ابتدائی تعلیم میں بھی اسلام کے بنیادی حقائق اور ایمانیات بچوں کے ذہن نشین کرا دیئے جائیں۔ اس کے لئے اگر ایک الگ دینیات کے کورس کی ضرورت محسوس ہو تو وہ بنایا جا سکتا ہے لیکن بہرحال صرف ایک اسی کورس پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ ان ایمانیات کو دوسرے تمام مضامین میں بھی روحِ تعلیم کی حیثیت سے پھیلا دیا جائے۔ ہمیں کوشش کرنا چاہئے کہ ہر مسلمان بچے کے دل میں توحید کا عقیدہ، رسالت کا عقیدہ، آخرت کا عقیدہ، قرآن کے برحق ہونے کا عقیدہ، شرک اور کفر اور دہریت کے باطل ہونے کا عقیدہ پوری قوت کے ساتھ بٹھا دیا جائے اور یہ تلقین ایسے طریقے سے ہونی چاہئے کہ بچہ یہ محسوس نہ کرے کہ یہ کچھ دعوے اور کچھ تحکمات ہیں جو اُس سے منوائے جا رہے ہیں بلکہ اُسے یہ محسوس ہو کہ یہی کائنات کی معقول ترین حقیقتیں ہیں، ان کا جاننا اور ماننا انسان کے لئے ضروری ہے اور ان کو مانے بغیر آدمی کی زندگی درست نہیں ہو سکتی۔

(۶۳) چہارم:- یہ کہ بچے کو اسلامی زندگی بسر کرنے کے طریقے بتائے جائیں اور اس سلسلے میں وہ تمام فقہی مسائل بیان کر دیئے جائیں جو ایک دس برس کے لڑکے اور لڑکی کو معلوم ہونے چاہئیں۔ طہارت و پاکیزگی کے احکام، وضو کے مسائل، نماز اور روزے کے طریقے، حرام اور حلال کے ابتدائی حدود، والدین اور رشتہ داروں اور ہمسایوں کے حقوق، کھانے پینے کے آداب، لباس کے حدود، معاشرتی زندگی کے پسندیدہ اطوار، یہ وہ چیزیں ہیں جو ہر مسلمان بچے کو معلوم ہونی چاہئیں۔ ان کو صرف بیان ہی نہ کیا جائے بلکہ ایسے طریقے سے ذہن نشین کرایا جائے جس سے بچے یہ سمجھیں کہ ہمارے لئے یہی احکام ہونے چاہئیں، یہ احکام بالکل برحق ہیں اور ہم کو ایک صاف ستھری اور پاکیزہ زندگی بسر کرنے کے لئے ان احکام کا پابند ہونا چاہئے۔

ثانوی تعلیم

(۶۴) اس کے بعد اب ہائی اسکول کی تعلیم کو لیجئے۔ اس مرحلے میں سب سے پہلی چیز جسے ہم ضروری سمجھتے ہیں وہ یہ ہے کہ عربی زبان کو بطور لازمی زبان پڑھایا جائے۔ اسلام کے اصل ماخذ سارے کے سارے عربی زبان ہی میں ہیں۔ قرآن عربی میں ہے، حدیث عربی میں ہے، ہمارے ابتدائی صدیوں کے فقہا اور علماء نے جتنا کام کیا ہے اُن کی ساری کتابیں بھی عربی زبان میں ہیں۔ اسلامی تاریخ کے اصل ماخذ بھی عربی زبان ہی میں ہیں۔ کوئی شخص اسلام کی اسپرٹ پوری طرح سے نہیں سمجھ سکتا اور نہ پوری طرح سے اُس میں اسلامی ذہنیت پیوست ہو سکتی ہے جب تک کہ وہ قرآن کو براہ راست اس کی اپنی زبان میں نہ پڑھے۔ محض ترجموں سے کام نہیں چلتا۔ اگرچہ ہم چاہتے ہیں کہ ترجمے بھی پھیلیں تاکہ ہمارے عوام الناس کم از کم یہ جان لیں کہ ہمارا خدا ہمیں کیا حکم دیتا ہے لیکن ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں میں کوئی ایسا نہیں ہونا چاہئے جو عربی زبان سے ناواقف ہو۔ اس لئے ہم عربی زبان کو بطور ایک لازمی مضمون کے شامل کرنا چاہتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ ایک شخص جب ہائی اسکول سے پاس ہو کر نکلے تو اس کو اتنی عربی آتی ہو کہ وہ ایک سادہ عبارت کو جو عربی زبان میں لکھی ہوئی ہو اُس کو صحیح پڑھ سکے اور سمجھ سکے۔

(۶۵) اگلا لازمی مضمون اسلامی عقائد کا ہونا چاہئے۔ اس میں طلباء کو نہ صرف ایمانیات کی تفصیل سے آگاہ کیا جائے بلکہ انہیں یہ بھی بتایا جائے کہ ہمارے پاس ان عقائد کے دلائل کیا ہیں؟ انسان کو ان کی ضرورت کیا ہے؟ انسان کی عملی زندگی سے اِن کا ربط کیا ہے؟ ان کے ماننے یا نہ ماننے کے کیا اثرات انسانی زندگی پر مترتب ہوتے ہیں۔ اور ان عقائد پر ایمان لانے کے اخلاقی اور عملی تقاضے کیا ہیں۔ یہ امور ایسے طریقے سے طلبہ کے ذہن نشین کئے جائیں کہ وہ محض باپ دادا کے مذہبی عقائد ہونے کی حیثیت سے ان کو نہ مانیں بلکہ یہ اُن کی اپنی رائے بن جائیں۔

(۶۶) اسلامی عقائد کے ساتھ ساتھ اسلامی اخلاقیات [illegible] تعلیم کی بہ نسبت ثانوی تعلیم میں زیادہ تفصیل اور تشریح کے ساتھ [illegible] کیا جائے

اور تاریخ سے نظریں پیش کرکے یہ بات ذہن نشین کی جائے کہ اسلام کے یہ اخلاقیات محض خیالی اصول اور نظریئے نہیں ہیں بلکہ عملاً اس سیرت و کردار کے لوگ مسلم سوسائٹی میں پائے جاتے رہے ہیں۔ اس تعلیم کے ساتھ ساتھ طلباء میں ایک ایسی ذہنی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی جائے کہ اسلام جن اوصاف کی مذمت کرتا ہے، طلبہ خود ان اوصاف کو برا سمجھیں، ان سے بچیں اور ایسی سوسائٹی میں ان صفات کے لوگوں کو ابھرنے نہ دیں اور اسلام جن اوصاف کو محمود اور مطلوب قرار دیتا ہے ان کو وہ خود پسند کریں، ان کو اپنے اندر نشوونما دیں اور ان کی سوسائٹی میں انہی اوصاف کے لوگوں کی ہمت افزائی ہو۔ میٹرک کے معیار تک پہنچتے پہنچتے ایک بچہ جوان ہو چکا ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں اس کو اسلامی زندگی کے متعلق ابتدائی تعلیم کی نسبت زیادہ تفصیلی احکام جاننے کی ضرورت ہوتی ہے یہاں اس کو شخصی اور ذاتی زندگی، خاندانی زندگی اور تمدن و معاشرت اور لین دین وغیرہ کے متعلق ان تمام ضروری احکام سے عمومی طور سے واقف ہونا چاہیئے جو ایک جوان آدمی کے لئے درکار ہیں۔

(۶۷) تاریخ کی تعلیم میں ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ہمارے ہائی اسکول کا ہر طالب علم نہ صرف اپنے ملک کی تاریخ پڑھے بلکہ اسلام کی تاریخ سے بھی واقف ہو۔ اس کو تاریخ اسلام سے واقف ہونا چاہیئے تاکہ وہ یہ جان سکے کہ اسلام ایک انقلابی تحریک ہے جو ساتویں صدی عیسوی میں یکایک شروع نہیں ہو گئی تھی۔ اس کو سیرت نبوی اور سیرت خلفائے راشدین سے بھی واقف ہونا چاہیئے تاکہ وہ ان مثالی شخصیتوں سے روشناس ہو جائے جو اس کے لئے معیار انسانیت کا درجہ رکھتی ہیں۔ خلافت راشدہ کے بعد سے اس کی تاریخ کا بھی ایک مجمل خاکہ اس کے سامنے آنا چاہیئے تاکہ وہ یہ جان لے کہ مسلمان قوم کن کن مراحل سے گزرتی ہوئی موجودہ دور تک پہنچی ہے۔ یہ تاریخی معلومات نہایت ضروری ہیں جس قوم کے نوجوانوں کو خود اپنے ماضی کا علم نہ ہو اس کے اندر اپنی قومی تہذیب کا احترام بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔

(۶۸) اس تعلیم کے ساتھ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہائی اسکول کے مرحلے میں طلبہ کی عملی تربیت کا سلسلہ بھی شروع ہو جائے۔ مثلاً ہائی اسکول میں کوئی مسلمان طالب علم ایسا نہیں ہونا چاہیئے جو نماز کا پابند نہ ہو۔ طلباء کے اندر ایسی رائے عام پیدا کی جانی چاہیئے کہ وہ اپنے درمیان ایسے طالب علموں کو برداشت نہ کریں جو نماز کے پابند نہ ہوں۔

سائنسی علوم اور اسلام

ہمیں اس سلسلہ میں ایک بنیادی بات تو یہ عرض کرنی ہے کہ اسلامی دینیات کے دائرے سے طبعی علوم کو باہر نہ رکھا جائے۔ ہمارے بعض پڑھے [illegible] یہ تصور پایا جاتا ہے کہ فزکس یا کیمسٹری، زولوجی باٹنی، فلکیات و [illegible] جیسے علوم میں اسلامی اور غیر اسلامی کی کوئی تفریق ممکن [illegible] یہ ہمارا سیکولر ذہن ہے جو موجودہ نظام تعلیم نے تیار کیا ہے اور [illegible] حالات میں خدا کے عمل دخل کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں [illegible] دائرہ ہے جہاں اگر مطالعہ و تحقیق ذہن سے کیا جائے تو انسان [illegible] خدا تک پہنچتا جاتا ہے۔ سائنسی حقائق تلاش نہ اسلامی اور غیر

اسلامی ہوتے ہیں لیکن ان کو پڑھانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ سب قوانین اپنے آپ اور بلا خدا کے نافذ ہیں اور دوسرا یہ نقطہ نظر کہ ان سب کے پیچھے کارفرما اصل قوت خدا تعالیٰ کی ذات ہے۔ ہمیں شعوری طور پر اپنے طلبا کو یہ دوسرا نقطہ نظر دینا ہے بصورت دیگر ہم اس تشکیک اور مذہب بیزاری اور بے اعتقادی کا علاج نہیں کر سکتے جو محض سائنس کو سیکولر ذہن سے پڑھانے سے پیدا ہوتی ہے۔

گزشتہ چند صدیوں میں سائنسی علوم و تحقیقات میں امامت کا شرف ایک ایسے گروہ کو حاصل ہے جو عام طور پر اس کائنات کے لئے کسی خالق کے وجود کا منکر ہے اور ان سارے علوم کو اس پیرائے میں ڈھالا ہے۔ ہمیں ان سائنسی علوم کو اپنے خداپرستانہ سانچے میں ڈھالنا ہے اور ایک ایک مضمون کو اس طرح پڑھانا ہے کہ جدید ترین انکشافات سے بھی واقفیت حاصل ہو۔ خدا اور اس کی حکمت و مصلحت کارفرمائی اور ربوبیت پر ایمان بھی راسخ ہو اور نئی نئی تحقیقات کا جذبہ بھی بیدار ہو۔ سائنسی نصاب میں یہ بنیادی تبدیلی ہمیں مغرب کے آگے مستقل مقلد رہنے کے بجائے اپنا حقیقی قائدانہ مقام حاصل کرنے گی جس کے بعد ہم اپنے طلباء سے سائنسی میدان میں تخلیقی کاوشوں کی توقع کر سکیں گے۔

اس سلسلہ میں ہمیں بنیادی رہنمائی قرآن پاک کی آیات سے ملتی ہے جس نے انفس و آفاق کی آیات کے مطالعہ کے لئے ابھارا بھی ہے اور اس کے لئے صحیح نقطہ نظر بھی دیا ہے۔ ہمارے سائنسی نصابات میں اس نقطہ نظر کو بہ تمام و کمال جاری و ساری ہونا چاہیئے۔ اس میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مختلف سائنسی علوم کے ایسے ماہرین جو مسلمان ذہن رکھتے ہوں اور ان علوم کی اسلامی تشکیل نو سے دلچسپی رکھتے ہوں اور ان کی کچھ نظر قرآن پر بھی ہو۔ ان کو یہ کام سونپا جائے کہ وہ ان نصابات کے لئے بنیادی خطوط متعین کریں اور واضح مثالوں سے بتائیں کہ کس طرح یہ تبدیلی کی جا سکتی ہے تاکہ پھر نصاب کے تمام مراحل کی کتابوں میں یہ انداز سمویا جا سکے ساتھ ہی معارف اسلامی کے شعبوں کو اس طرف خصوصی طور پر متوجہ کیا جا سکے۔

(۶۹) تدوین نصاب کے لئے عمومی خطوط کار

نصابات کے سلسلے میں تدوین کیلئے خطوط کار متعین کئے جائیں محض یہ توقع کہ چونکہ مقاصد میں اسلامی اقدار اور قومی شعور کا تذکرہ ہو رہا ہے اس لئے لامحالہ نصاب بھی انہی مقاصد کے مطابق ہوگا۔ ہماری نظر میں کافی نہیں ہے۔ اس تدوین کا کام لامحالہ انہی افراد کے سپرد ہونا چاہیئے جن پر موجودہ سیکولر نظام کی چھاپ لگی ہوئی ہے اور عین ممکن ہے کہ وہ اپنے ذہن کی وجہ سے پالیسی کے ان مقاصد سے بچتے ہوئے بھی صرف نظر کر جائیں اس کے سدباب کے لئے ضروری ہے کہ تفصیلی DIRECTIVES اس انقلابی پالیسی میں شامل کئے جائیں تاکہ جو کمیٹیاں بنیں وہ اپنے کو اس کا پابند سمجھیں اور اگر کوئی ایسی چیز داخل کی جا رہی ہو جو ان ہدایات کے خلاف ہو تو اسے نکالا جا سکے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیم کے مختلف مراحل کے نصابات کے لئے الگ الگ بنیادی [illegible] مہیا کئے جائیں لیکن سردست ہم مجموعی اشارات دینا چاہتے ہیں [illegible] اور وسیع [illegible] تفصیل [illegible] چھوڑا جا [illegible] کے سلسلے [illegible] علم [illegible] کا [illegible] ہماری [illegible] یہ امر افسوسناک ہے کہ جدید [illegible] سے اس کے مسائل کے سلسلے کوئی مثبت اور تعمیری

جائے۔ ایک ایسے وقت میں جبکہ قوم کی کمی کی وجہ سے توسیع تعلیم کا کام خاطر خواہ نہ ہو رہا ہو۔ اور اساتذہ نہایت ہی کم اور قلیل سی تنخواہوں کی وجہ سے شدید مشکلات میں مبتلا ہیں۔ ایک خاص طبقہ کی تعلیم پر عام آدمی کی آمدنی کا ایک حصہ خرچ ہو رہا ہے۔ بھاری بھاری تنخواہوں پر غیر ملکی اساتذہ کے تقرر قومی مفاد سے منافی ہے۔

ان سکول ایک وجہ سے بھی منفیت سے بھرے ہیں یہ ادارے ملک میں تعلیم کو محدود کر کے ایک خاص طبقے کی سیاسی برتری قائم کر رہے ہیں۔ ان اداروں میں سے ایک بالکل نئی طرح کی پود پیدا کی جا رہی ہے جس سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اس ملک میں آقاؤں کی طرح رہے۔ یہ سامراجیت کے آلہ کار کے طور پر استعمال ہوں گے اور اس سے ملک کے استحکام کو نقصان پہنچے گا۔ اور ان سکول برباد ہو جائے گا پبلک سکول کے ساتھ ایچی سن کالج جیسے اداروں کو شامل سمجھے۔ لہذا ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ اس نظام کو کلیتاً ختم کر دیا جائے اور سرمایہ جو وسائل فراہم ہوں وہ عوام کی تعلیم پر صرف کئے جائیں یہ عوام ہی فی الواقع قوم کی دولت ہیں۔

(۷۶) اپنی تاریخ سے واقفیت

نئی پود کو اپنے ملک کی تاریخ اور پس منظر سے پوری آگاہ ہونا چاہیئے ہمیں علیحدہ مملکت حق و صداقت کی راہ میں ان کی جدوجہد اور سامراجیت سے نجات پانے کے لئے ان کی بے مثال جدوجہد اور قربانیوں سے واقف ہونا چاہیئے۔

ہماری تجویز یہ ہے کہ :-

(الف) نصاب مرتب کرتے وقت اس بات کا خیال رکھا جائے۔

(ب) ان موضوعات پر مختصر لیکن دلکش اور دلچسپ مواد شائع کرنے کے لئے مختلف اداروں کی حوصلہ افزائی کی جائے یہ کام خصوصاً یونیورسٹیوں کے سپرد کیا جا سکتا ہے طلباء ان کتابوں کو ذوق و شوق سے پڑھیں گے۔ اور اس سلسلے میں ضروری معلومات اور پس منظر سے آگاہی حاصل کریں گے

(ج) تعلیمی اداروں کو ایسے موضوعات پر خصوصی پروگرام پیش کرنے کے لئے کہا جائے خصوصاً یوم آزادی اور دوسرے ایسے ہی اہم مواقع پر۔ یہ پروگرام برائے پروگرام نہ ہوں بلکہ ان کا محرک تعلیم و تربیت ہو۔

(د) ہالوں اور گیلریوں کو اہم شخصیات کے اقوال اور ہماری تاریخ کے اس دور کے اہم واقعات کی تصاویر سے سجایا جائے۔

(س) مشرقی پاکستان اور مقبوضہ کشمیر کو ہمارے نصاب و تعلیمی ماحول میں بھرپور مقام دیا جائے۔

(۷۷) عربی تعلیم

قرن اول کی اسلامی روایات وادب اپنے مذہب سے ربط کے ایک ذریعہ کی حیثیت سے اور عربی بولنے والے ممالک سے دوستانہ تعلقات کے لئے عربی زبان کو تعلیمی نصاب میں کم از کم اس حد تک شامل کیا جائے جہاں طالب علم براہ راست قرآن و حدیث کے معانی سمجھ سکے اور اصل ماخذ تک اس کی پہنچ ہو سکے کالجوں میں تعلیم پانے والی موجودہ نسل میں عربی سے ضروری واقفیت پیدا کرنے کے لئے مختصر ڈپلومہ کورس شروع کئے جائیں۔

(۷۸) غیر ممالک میں تعلیم

فی الوقت ہمارے بہت سے طلباء اعلیٰ تعلیم کے لئے غیر ملکی یونیورسٹیوں میں جاتے ہیں اعلیٰ تعلیم کی ضرورت اور اہمیت سے کسی کو انکار نہیں لیکن اس طریقے سے جو سائج برآمد ہوئے ہیں ان کے پیش نظر اس تمام طریقے پر نظر ثانی کی جائے

۷۹ - غیر ملکی تربیت پر زرِ وسیع اخراجات کے باوجود ہم درآمل کلی طور پر آج بھی غیر ملکی یونیورسٹیوں اور تعلیمی اداروں کے محتاج ہیں علم کی کسی بھی شاخ میں ہمارے اپنے ملک میں ایک بھی ایسا قابل ذکر ادارہ نہیں جو اعلیٰ ترین تربیت یافتہ افراد تیار کرنے کا مستقل ذریعہ ہو۔

۸۰ - ہمارے طلباء غیر ملکوں میں ایک طویل عرصے کے قیام کے دوران وہاں کی تہذیب سے ذہنی طور پر اتنے متاثر ہو جاتے ہیں کہ وہ واپسی پر یہاں تہذیب مغرب کے چلتے پھرتے سائے بن جاتے ہیں ان کا نقطہ نظر مادہ پرستانہ ہو جاتا ہے اور وہ اس ملک کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں وہاں کے نسبتاً اونچے معیار زندگی جو آپ کے زیر غور ہوں گے

(۸۱) قومی امور میں طلباء کا کیا رول ہونا چاہیئے ؟

ہمارا سوچا سمجھا نقطہ نظر اور مستقل پالیسی ہے کہ طلباء کو عملی سیاسیات کی الجھنوں میں نہیں پڑنا چاہیئے لیکن اس کے یہ معنی مطلقاً نہیں کہ انہیں قومی امور سے کوئی دلچسپی نہ لینی چاہیئے اس احمقانہ پالیسی کو نہ تو طلباء اور نہ ہی ملک برداشت کر سکتا ہے انہیں اخبارات کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ انہیں چاہیئے کہ مختلف امور پر اظہار خیال کریں، مختلف پالیسیوں کا مطالعہ کریں اور اس طرح اپنا ایک نقطہ نظر کی تشکیل کریں انہیں اپنے وقت پر حکومت چلانے کے لئے سیاسی تربیت تو دینی چاہیئے لیکن ناپختہ ادارے عملی سیاسیات میں ان کو نہیں گھسیٹنا چاہیئے۔ قومی زندگی میں کسی شدید ہنگامی حالت کی بات اور ہے لیکن عام طور پر انہیں اپنے آپ کو حالتاً مستقبل کے لئے تیار کرنے پر لگا رہنا چاہیئے۔

(۸۲) سیاسی پارٹیاں اور طلباء

تمام سیاسی پارٹیوں کو، خواہ وہ صاحب اقتدار ہوں یا نہ ہوں یہ اہم اور بنیادی اصول ماننا اور اس پر سختی سے عمل کرنا چاہیئے کہ وہ کبھی بھی طلباء کو اپنے سیاسی مفادات کے لئے استعمال نہ کریں ان پارٹیوں کو طلباء کی مشکلات اور تعلیمی مسائل سے اپنے مفادات کی خاطر نہیں بلکہ ان کے حل کے لئے دلچسپی لینی چاہیئے انہیں طلباء کے مسائل کے سلسلے میں تحقیقات اور اعداد و شمار جمع کرنے کا کام کرنا چاہیئے انہیں طلباء کو اپنے نقطہ نظر سمجھانے کی آزادی پر کوئی ممانعت نہ ہو لیکن جس بات کی ضرورت ہے وہ نئی نسل کو چھوٹے چھوٹے مقاصد کے لئے غلط طور استعمال نہ کرنے کا شریفانہ معاہدہ ہے بحیثیت شہری کے طلباء کا اپنے کچھ رجحانات رکھنا کوئی بری بات نہیں لیکن سیاست کے اتار چڑھاؤ میں ہمہ گیر قسم کے عمل دخل کے لئے انہیں موزوں وقت کا انتظار کرنا چاہیئے

نظام تعلیم کے سلسلے میں تمام سیاسی جماعتوں پر خواہ وہ صاحب اقتدار ہوں یا نہ ہوں یکساں اور بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ یہ امر افسوسناک ہے کہ چند مستثنیات کے علاوہ کسی نے اس کے مسائل کے سلسلے کوئی مثبت اور تعمیری

کوشش ہیں کی۔

(۸۳) انتظامی امور میں طلبا کا حصّہ

سینیٹ، سنڈیکیٹ میں طلباء کی شرکت سے خوشگوار نتائج برآمد ہوئے ہیں اس سے طلباء میں اپنے مسائل کے لئے افہام و تفہیم کا احساس پیدا ہوا ہے اکیڈیمک کونسل اور ہمسٹر کمیٹیوں میں طلباء کی نمائندگی مزید سود مند ثابت ہوگی۔

(۸۴) غیر نصابی سرگرمیوں میں طلبا کا کیا رول ہونا چاہیئے؟

غیر نصابی سرگرمیوں میں ذوق و شوق سے حصہ لینے کے لئے طلباء کو سہولتیں فراہم کی جانی چاہییں اور ان کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے یہ سرگرمیاں درحقیقت نصاب ہی کا جزو ہیں ان کو اس طرح ترتیب دیا جانا چاہیے کہ وہ طلباء کی صلاحیتوں میں نکھار کا باعث ہوں طلباء میں کھیل کود ادبی، تقریری اور دوسری سرگرمیوں کو نصابی سرگرمیوں کے ساتھ بالکل ہم آہنگ اور مربوط کرکے آگے بڑھایا جائے۔

طلباء یونین ایک نہایت ہی اہم ادارہ ہے اور اسے سیاست بازی سے علیحدہ رکھا جانا چاہیئے۔ انہیں طور پر خود مختار یونینوں کے طلباء کو عملی زندگی کے لئے تیار کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہونا چاہیے، ان کی سرگرمیاں صحت مند ہونی چاہئیں اساتذہ کے ساتھ تعاون کے ساتھ کام کرنا چاہیئے یونین کو ٹریڈ یونین کے طور پر صرف ہڑتالوں کے لئے استعمال کیا جائے کہ کوئی ایسا نہیں آسکتا وہ عوامل معلوم کرکے جنہوں نے بدقسمتی سے یونین کو یہ حیثیت دے دی ہے دور کئے جانے چاہئیں۔

(۸۵) تعلیمی منصوبہ بندی

تعلیم کے میدان میں مناسب منصوبہ بندی نہ ہونے کے سبب طلباء کی ایک بڑی تعداد علم زیور سے آراستہ مگر زنجیرِ بے روزگاری میں جکڑی گلی گلی قریہ قریہ میں ملے گی جس کے سبب تعلیم کے "سپر" (SUPER) ہونے کے تصور کو جو صادق ہی کا نگ رہا ہے اور لوگوں کا تعلیم سے اعتماد اٹھ رہا ہے اس کا سبب میدانِ تعلیم میں منصوبہ بندی کا فقدان ہے کہ کس قدر طلباء یا ماہرین کی کس میدان میں ضرورت درکار ہے؟ اس سوال کا جواب کسی ذمہ دار کے پاس ہے اور نہ ہی اس کی فکر۔ اس لئے ہماری سفارش ہے کہ اس سلسلہ میں مناسب ترین اور فوری منصوبہ بندی کی جائے تاکہ اس خامی کا ازالہ ہو سکے۔

(۸۶) تحفظ روزگار

بے روزگاری دن بدن شدید ترین مسئلہ کے طور پر معاشرے کو گھن کی مانند کھوکھلا کر رہی ہے ڈگریاں ہاتھ میں لئے پڑھا لکھا طبقہ سڑکوں پر مارا مارا پھر رہا ہے اور بلا مبالغہ ہر گریجوایٹ پریشانیٔ روزگار سے دوچار ہے اس مسئلہ سے نمٹنے کے لئے کم از کم ابتدائی طور پر یونیورسٹیوں سے فارغ ہونے والے طلباء کو فوری روزگار مہیا کیا جائے جن کو سخت میرٹ (MERIT) اور کڑے معیار کے بعد ڈگری ملتی ہے۔ دوسرے مرحلہ پر انٹرمیڈیٹ اور ڈگری پاس طلباء کو روزگار کی فراہمی کا اہتمام کیا جائے۔

(۸۷) عمرانی علوم، سوتیلانہ سلوک

یہ بدقسمتی کہئے یا امر واقعہ کہ سائنسی یا فنی علوم کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے ماہرین کی ٹیم کا ملک و ملت کی باگ ڈور سنبھالنے میں بہت کم کردار ہوا کرتا ہے اصل میں قوم کی رہنمائی اور قیادت عمرانی علوم کے ماہرین کے ہاتھ آتی ہے لیکن بد قسمتی سے آج عمرانی علوم (آرٹس سبجیکٹس) کی حیثیت "اچھوت شعبہ جات" کی سی ہے۔ وہیں طلباء کو ان شعبوں کی جانب کھینچنے کی کوشش سے محروم ہیں اس کا بھی سبب حکومت کی جانب سے نا مناسب سرپرستی کا فقدان ہے۔ اس لئے اس میدان میں افراد کار کی تیاری کے لئے جہاں نصاب کے معیار کو بلند کرنا ضروری ہے وہیں داخلے کی شرائط کو بھی سخت کرنا ضروری ہے تاکہ کشش بھی پیدا ہو اور وہیں طلباء ملک کے مستقبل کو سنبھالنے کے لئے اپنی صلاحیتیں وقف کرسکیں۔

(۸۸) فنی تعلیم ۶۰ ٪

ہماری سفارش ہے "نور خان تعلیمی کمیشن" نے بھی ملک میں ۶۰ فیصد فنی تعلیم کے رواج کی تائید کی اور اس پر عمل درآمد کو لازمی قرار دیا فنی تعلیم سے ذیل میں ہمارے نزدیک میڈیکل، انجینئرنگ، اعلیٰ انجینئرنگ ٹیکنالوجی، زرعی، کامرس، قانون، گھریلو مصنوعات وغیرہ ہیں اب ان کے معیار کو بلند کرنے اور زیادہ توجہ دینے کو عام کرنے، بڑے پیمانے کے ساتھ درسگاہیں قائم کیے جائیں۔

ہم یہ تجویز بھی پیش کرتے ہیں کہ بالخصوص ان مشکلات کو دور کرنے کے لئے بھی موثر تجاویز پیش کریں جن سے آج طلباء دوچار ہیں، یہ ہمارا یقین کامل ہے کہ اعلیٰ سطح پر مناسب منصوبہ بندی قوم کا صحیح استعمال اور مشکلات کو دور کرنے کا پختہ عزم ان مسائل کو آسانی حل کر سکتا ہے۔ ہمارے تجربے کے مطابق ان مسائل کے حل نہ ہونے کا سب سے بڑی وجہ ان کو حل کرنے کے لئے کسی ارادہ اور خواہش تک کا نہ ہونا ہے۔

اب ہم اپنی چند مشکلات بیان کرتے ہیں جن کی نوعیت شدید ہے اور مطالبہ کرتے ہیں کہ ان کو دور کرنے کے لئے فوری اقدامات کئے جائیں۔

۸۹- درسی کتب کافی سستے داموں فراہم کی جانی چاہییں دوسری کتب بھی جو ہم چاہتے ہیں کہ ہماری نسل کے زیر مطالعہ رہیں کم قیمتوں پر مہیا ہونا چاہییں اس کے لئے طلباء کے لئے مخصوص پیپر بیک (PAPER BACK) ایڈیشن شائع کئے جاسکتے ہیں صحت مند لٹریچر فراہم کئے بغیر ہم سستے جاسوسی گھٹیا جنسی ادب کی لعنت کا مقابلہ نہیں کرسکتے

۹۰- طلباء کی ایک اور اہم ضرورت یعنی سٹیشنری بھی کم داموں فراہم کیا جانا چاہیئے۔ گزشتہ چند سالوں میں ان ضروریات تعلیم کی قیمتیں کافی بڑھ گئی ہیں اس کو روکا جانا چاہیئے۔ بہتر یہ ہے کہ حکومت ان قیمتوں کا کچھ حصہ خود ادا کرے۔

۹۱- ٹرانسپورٹ کا مسئلہ تمام تر وعدوں کے باوجود ابھی تک حل نہ ہو سکا ہے

۹۲- طلباء کی ایک اور بنیادی ضرورت کپڑے بھی ...

فراہم کئے جانے چاہئیں۔ اس سے ہم طلبا میں میانہ روی اور سادگی پسندی کے رجحان کو بھی پروان دے سکتے ہیں۔ ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے طلبا کے لئے سستی دکانوں کا ایک سلسلہ کھولا جاسکتا ہے جہاں صرف طلبا کو ایسی ضروریات کی تمام اشیا کم قیمت پر مہیا ہوسکیں۔

۹۳ - لائبریریاں زیادہ سے زیادہ تعداد میں کھولی جائیں اور سارے ملک میں ان کا جال پھیلا دیا جائے۔ ہمارا مقصد طلبا میں مطالعہ کی عادت ڈالنا اور ساتھ ہی ساتھ اچھے ادب کا ذوق پیدا کرنا ہونا چاہئے۔ یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہوسکتا جب تک کہ ایسی لائبریریوں کو جو طلبا کو خصوصی سہولتیں دیتی ہوں اچھی کتب فراہم نہ کی جائیں۔ ایسے اقدامات کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہئے جن سے ان غیر ملکی اور ملکی جاسوسی اور گھٹیا جنسی کتب کی بڑھتی ہوئی رو کو روکا جاسکے جو ہماری نسل کو بے اندازہ نقصان پہنچا رہی ہیں۔

۹۴ - تعلیمی اداروں میں کینٹینز کھولے جانے چاہئیں جہاں طلبا کھانا کم قیمتوں پر حاصل کرسکیں۔

۹۵ - طلبا کا رہائشی مسئلہ سال بہ سال شدید ہوتا جارہا ہے۔ ملک کے اہم تعلیمی مراکز میں طلبا کے لئے مزید ہوسٹل تعمیر کئے جانے چاہئیں۔ یہاں تک کہ ہر اس طالب علم کے لئے جگہ فراہم ہوجائے جس کو ضرورت ہے۔

۹۶ - طلبا کے لئے علاج کی خصوصی سہولت نہیں ہے۔ اگر تمام تعلیمی اداروں میں مفت دواخانوں کا بندوبست ممکن نہیں ہے تو طلبا سے برائے نام میڈیکل فیس لی جاسکتی ہے اور اُن کو مکمل طبی سہولتیں فراہم کرنے کے لئے ہیلتھ انشورنس سکیم قسم کی چیز شروع کی جاسکتی ہے۔

۹۷ - تمام یونیورسٹیوں، بڑے شہروں اور قصبوں میں طلبا کو حصول روزگار میں مدد دینے کے لئے دفاتر روزگار قائم کئے جائیں۔ یہ دفاتر اگر منظم اور مربوط طریقہ پر کام کریں تو فارغ طلبا اور مالکان کے پاس ایک مستند رابطہ کا کام سرانجام دے سکتے ہیں۔

۹۸ - ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر قابلیت اور صلاحیت کی بنیاد پر طلبا کو مواقع دیئے جائیں اقربا پروری اور جماعتی مفادات کی وجہ سے نہیں۔

۹۹ - ایم اے اور ایم ایس سی کرنے والے طلبا کو سترھواں گریڈ دیا جائے۔

۱۰۰ - وظائف کی شرح میں ڈیڑھ سو فیصد اضافہ کیا جائے۔

۱۰۱ - دینی مدارس کے نصاب کو بہتر اور سائنٹیفک عصری تقاضوں کے مطابق ڈھالنے اور نظام کو اسلامی بنیادوں پر استوار کرنے کے لئے ہم واضح پروگرام اور وسائل عمل لائحہ عمل رکھتے ہیں۔

آخر میں ہمیں یہ کہنے دیجئے کہ آپ کے پیش نظر جو کام ہے وہ ایک تاریخی کام ہے۔ ۳۰ سال تک اندھیروں میں بے مقصد ٹامک ٹوئیاں مارنے کے بعد آج تمام قوم کی نظریں آپ پر لگی ہوئی ہیں کہ آپ ہمیں بدبختی کی اس کیفیت سے نکال کر ایسی روشن اور محفوظ شاہراہ پر ڈال دیں جس کی منزل پاکستان میں اسلامی تعلیم ہے۔ خدانخواستہ اگر آپ اپنے مشن میں ناکام ہوگئے تو پھر ایک طویل عرصہ تک کوئی اور کوشش نہ کی جاسکے گی اور تاریکی نہ صرف طلبا، بلکہ پورے پاکستان کا مقدر بن جائے گی اور اگر آپ کامیاب ہوگئے تو آپ بھی ایک مطمئن ضمیر کے ساتھ سوچ سکتے ہیں کہ اس ملک کی تعمیر نو میں آپ کا حصہ ہماری تاریخ کا سب سے اہم اور سب سے درخشاں باب ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ آپ اپنی ذمہ داریوں کی اس شدید اور نازک نوعیت سے آگاہ ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ آپ کو سیدھی راہ دکھلائے صحیح سمت کا شعور عطا کرے اور اپنی بے پایاں رحمت سے آپ کو عزم، ہمت اور دانشمندی مرحمت کرے تاکہ آپ قوم کی صحیح راستہ پر رہنمائی کرسکیں۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

سیمسٹر سسٹم کے بارے میں جمعیت کی جانب سے تفصیلی سروے رپورٹ ۵۰ ملی اسکیپ انگریزی صفحات ضمیمہ نمبر ۸ کے تحت ہمراہ دی گئی۔

عزیز طلبہ نے ایف اے کے امتحان میں عرق ریزی سے کام لیتے ہوئے مشکل سوالوں کو جس طرح پانی پانی کیا ہے اس سلسلے میں ہمارے ممتحن دوست ابھی تک ان عزیز طلبہ کی کاوشوں سے مستفیض ہو رہے ہیں۔ مثلاً کل ہی ہمارے ایک دوست نے ہمیں بتایا ہے کہ ان عزیز طلبہ نے محاوروں کو جس طرح جملوں میں استعمال کیا ہے اس سے محاوروں کو سیاق و سباق بدل گیا ہے دونوں پرانے محاوروں کی بالکل ہی جنس سامنے آ گئی ہیں۔ ظاہر ہے یہ کام عوامی سطح پر ہی کرنے کا تھا کیونکہ علمی سطح پر حساب الف الحروف تو یہ مدت سے کام دے ہی رہے تھے

اس سلسلے میں زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، چند مثالوں پر ہی اکتفا کیا جا سکتا ہے، بلکہ یوں کہہ لیں کہ پوری دیگ کھنگالنے کی بجائے اس میں سے چاول کے چند دانے ہی نمونے کے طور پر پیش کر دیے تو اہل نظر کے لیے کافی ہوں گے۔ مثلاً عزیز طلبہ سے کہا گیا تھا کہ وہ "مسیں بھیگنا" کو جملے میں استعمال کریں۔ ایک طالب علم نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے لکھا:

جب اسے اپنے والد کے انتقال کی خبر موصول ہوئی تو اس کی مسیں بھیگ گئیں۔ ظاہر ہے "مسیں بھیگنا" کا یہ استعمال بالکل نادر ہے۔ اس سے قبل یہ ترکیب سے جوانی کی طرف آنے کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا لیکن طالب علم نے ایک جنبش قلم سے "آنکھیں بھیگنا" کے معنی عطا کر دیے۔ اس سلسلے میں ایک اور طالب علم کی کاوش علمی بھی نہایت قابل قدر ہے۔ اس نے "لتے لینا" کرنا ... محاورے کو جملے میں استعمال کیا ہے اور حق ادا کر دیا ہے۔ اس نے لکھا:

جب وہ کمرۂ امتحان میں نقل مارتے ہوئے پکڑا گیا تو اس نے سپرنٹنڈنٹ کے سب لتے تلے کیے ــــ اول الذکر جملے کے استعمال میں لسانی تشکیلات کے اصول کو مدنظر رکھا گیا تھا جب کہ موخر الذکر محاورے کو میں استعمال کرنے والے عزیز طالب علم نے "لتے تلے" کو "مت تریے" کا مفہوم بخش کر اردو اور پنجابی میں فاصلے کم کرنے کی کوشش کی ہے اور ادب میں ایک قابل قدر اختراع ہونے کے ساتھ ساتھ یہ کاوش قومی یکجہتی کے زمرے میں بھی آتی ہے ــــ !

لیکن ان دو محاوروں کا جملوں میں استعمال ایک طرف اور ایک عزیز طالبہ نے جس طرح ایک محاورے کو جملے میں استعمال کیا ہے، وہ اگر دوسری طرف رکھ دیں، تو بھی پلڑا دھری کا بھاری رہتا ہے۔ اس عزیزہ طالبہ نے "کلنک کا ٹیکہ" کو جملے میں استعمال کرتے ہوئے لکھا "ہمارے محلے میں عام لوگوں نے کلنک کے ٹیکے لگوائے، لیکن میں اس روز گھر پر نہ تھی، اس لیے کلنک کا ٹیکہ نہ لگوا سکی"۔ الحمدللہ ہم آج تک اس محاورے کی صرف سطح ہی دیکھتے رہے۔ اس کی دیگر پرتوں پر ہماری نظر ہی نہ جا سکی۔ اب یہ عقدہ ہم پر کھلا ہے، تو ہمارا دلی وطن سے التماس ہے کہ یوں تو قومی سطح پر ہم سب کلنک کا ٹیکہ لگوا چکے ہیں لیکن اگر کوئی بچ گیا ہو تو وہ اور میں کلنک کا ٹیکہ لگوائے کہ اقبال کا سال ہے اور اقبال نے کہا ہے ؎

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں

جیسا کہ ہم شروع میں عرض کیا کہ محاوروں کی دیگ میں سے ہم چند جملوں کے دانے یہاں پیش کر رہے ہیں۔ ان عزیز طلبہ و طالبات نے اس ضمن میں جس کاوش علمی و فکر کاوش ... سے کام لیا ہے اس سے تحقیق کی بالکل نئی راہیں دریافت ہوئی ہیں تاہم سب سے زیادہ متاثر ہمیں "کلنک کا ٹیکہ" والے محاورے کے استعمال نے کیا ہے۔ اس محاورے کو مذکورہ معنوں میں کوئی استعمال نہیں کیا گیا، بلکہ ہمیں یقین ہے کہ طالبہ نے اس ایک تیر سے کئی شکار کیے ہیں۔ ایک طرف تو اس نے گھسے پٹے محاورے کو حیات تازہ عطا کی ہے اور دوسری طرف اس عزیز طالبہ نے چند سطور میں ہمارے پورے نظام یا کم از کم نظام تعلیم پر ضرور طنز کی ہے، اس نے دبے لفظوں میں کہہ دیا ہے کہ یہ نظام تعلیم معاشرے کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔

***

مصنف عارف
(ٹی۔کام)

کہکشاں کے مسافر

البدری

"جناب! میرے بڑے بھائی کو گرفتار کرنے کا حکم دیں" ایک نوجوان نے فوجی افسر سے کہا
"کیوں؟" فوجی افسر تذبذب کے عالم میں اس اجنبی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
"اس کا ہندوستانی افواج اور باغی عناصر سے رابطہ ہے" نوجوان نے جواب دیا
"تمہیں کیسے علم ہوا؟" فوجی افسر نے پوچھا
"وہ اکثر سرحد پار کرکے ہندوستانی چوکیوں پر جاتا ہے اور انہیں پاک فوج کی نقل و حرکت کی خبر دیتا ہے۔ کل رات وہ ہندوستان میں دس دن گزارنے کے بعد واپس آیا ہے۔"

یہ ان دنوں کی بات ہے جب مارچ ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کے حالات بے قابو ہو جانے کے سبب فوج ملک کے باغی عناصر اور ہندوستانی ایجنٹوں کی سرکوبی کر رہی تھی۔
بنگالی نوجوان کے بیان نے فوجی افسر کو حیرت میں ڈال دیا۔
فوجی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کوئی شخص اپنے سگے بھائی کے جاسوسی جیسے سنگین جرم سے پردہ اٹھا سکتا ہے۔ وہ نوجوان کے قومی جذبے سے انتہائی متاثر ہوا اس نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا:
"تمہیں معلوم ہے جاسوسی کا جرم ثابت ہونے کے بعد تمہارے بھائی کو کیا سزا مل سکتی ہے؟" نوجوان نے جواب دیا۔
فوجی افسر نے نوجوان کا مزید امتحان لیتے ہوئے کہا "اگر تمہارے بھائی کو سزائے موت ہو جائے، تو تمہیں افسوس نہیں ہوگا؟"
"جناب، بھائی کی موت کا دکھ کسے نہیں ہوتا، لیکن ایک غدار جو سرے سے تیرہ کروڑ مسلمان بھائیوں سے غداری کر رہا ہو، اس کا مر جانا ہی اچھا ہے جو ناسور پورے جسم کے لیے خطرے کا باعث بن جائے، کیا اسے کاٹ دینا بہتر نہیں؟"
"کیا تمہارے بھائی کی موت پر تمہارے والدین کو دکھ نہ ہوگا؟"
"میرے والد کو فوت ہوئے تین برس بیت چکے ہیں کاش! وہ زندہ ہوتے ان کی موجودگی میں میرا بھائی کبھی یہ روش اختیار نہ کرتا میں اپنی ضعیف ماں کے بارے میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ملک کی سالمیت پر وہ بیٹے کو ترجیح نہیں دے گی۔"
"اچھا تو آج ہی فوجی دستہ بھیج کر اسے گرفتار کرلوں گا۔"
"جی نہیں، ایک غیر مسلح آدمی کو گرفتار کرنے کے لیے فوجی دستے کی ضرورت نہیں۔ مجھے صرف آپ کی اجازت درکار ہے میں اپنے دوستوں کی مدد سے اسے گرفتار کرکے کل صبح آپ کے سامنے پیش کر دوں گا۔"
افسر نے اٹھ کر اس نوجوان بنگالی کو گلے سے لگا لیا۔ ملک کی دو قوتیں یکجا ہوگئیں۔

یہ نوجوان جو ملک و ملت کی خاطر اپنے سگے بھائی کو خود اپنے ہاتھوں قانون کے حوالے کر رہا تھا، مشرقی پاکستان میں ضلع مومن شاہی کے سرحدی علاقے کا رہنے والا تھا اور جمال پور سب ڈویژن کے ایک چھوٹے سے قصبے میں زیرِ تعلیم تھا وہ ایک ہوشیار طالب علم ہونے کے علاوہ ایک وطن شناس پاکستانی اور بلند کردار شہری تھا۔ یہ گفتگو شیر پور میں مقیم ایک فوجی افسر اور اس نوجوان کے درمیان ہوئی تھی
شام کے وقت فوجی افسر اپنے کمرے میں بیٹھا تھا وہ اب بھی اس نوجوان کے بارے میں سوچ رہا تھا اس کی گفتگو کا ایک ایک لفظ اس کے ذہن میں گونج رہا تھا خصوصاً اس نوجوان کے آخری جملے نے اس کے جذبات میں ہلچل مچادی تھی "ایک غیر مسلح آدمی کو گرفتار کرنے کے لیے فوجی دستے کی ضرورت نہیں۔ مجھے صرف آپ کی اجازت درکار ہے میں اپنے دوستوں کی مدد سے اسے گرفتار کرکے کل آپ کے سامنے پیش کر دوں گا۔"
وہ سوچ رہا تھا اس کے دوست کون ہیں جن پر اسے اتنا اعتماد ہے۔ ایسے عظیم کردار انسان کے دوست بھی یقیناً بلند کردار ہوں گے تو کیا یہ نوجوان کسی ایسی مالا کا موتی ہے جس کا ہر موتی اپنی چمک میں ثانی نہیں رکھتا اگر یہ سچ ہے، تو اس سے اور اس کے قابل اعتماد ساتھیوں سے سینکڑوں ایسے کام لیے جاسکتے ہیں جو فوجی دستے کے بغیر بھی پایۂ تکمیل تک پہنچ سکیں یہ خیال آتے ہی فوجی کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی

چند دن بعد شیر پور میں اس نوجوان اور اس کے ساتھیوں کا ایک منظم گروہ "البدر" تیار تھا اور یہ البدر کی پہلی بٹالین تھی جس میں ۳۱۳ کی نفری رکھی گئی تھی بدر کی جنگ میں بھی تو مجاہد ۳۱۳ تھے۔ فوجی افسر کو جیاؤ میں سب سے مشکل پیش آئی وہ یہ سوچ میں پڑ گیا کہ کس کو البدر میں شامل کیا جائے اور کسے روکا جائے کیونکہ سینکڑوں نوجوان ایک دوسرے سے بڑھ کر اس کام میں شامل ہونے کے آرزومند تھے ایک لڑکے کو اس کی کم سنی کی وجہ سے فوجی افسر نے روکنا چاہا، تو کچھ ایسا منظر سامنے آیا جیسے تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہو۔ افسر نے کہا "بیٹا تم ابھی چھوٹے ہو اس لیے تمہیں البدر میں شامل نہیں کیا جاسکتا"
یہ سن کر لڑکا اپنی ایڑیاں اونچی کرکے سینہ تان کر کھڑا ہوگیا اور معصومیت سے بولا "اب تو بڑا ہوگیا ہوں جناب"
فوجی افسر اپنے جذبات پر قابو نہ پاسکا اس کی آنکھیں بھر آئیں اس نے کہا "بیٹا! میں نے غلط کہا تھا تم چھوٹے نہیں ہو، تم کبھی چھوٹے نہ تھے تم نے اس عمر میں آج سے چودہ سو سال پہلے بھی جذبہ دکھایا تھا جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم تین سو تیرہ جانبازوں کے ساتھ کفارِ مکہ سے جہاد کرنے جارہے تھے، تم اس وقت چھوٹے تھے، اب ہو تو تمہیں چھپنا کیسے، وہ جھوٹ کیسا ہے جھوٹا ہوتا تو کمزوری کی علامت ہے اور مومن کبھی کمزور نہیں ہوتا" یہ کہہ کر اس نے کمسن لڑکے کو البدر میں شامل کرلیا۔
شیر پور کی البدر بٹالین نے اپنی مثالی کارکردگی سے سب کو متاثر کیا یہاں تک کہ اس کی اہمیت اعلیٰ فوجی حکام پر بھی عیاں ہوگئی وہ اسے پورے صوبے میں پھیلانے کے متعلق سوچنے لگے جنرل نیازی بذاتِ خود تشریف لائے اور البدر کی اعلیٰ کارکردگی پر مبارک باد دی

چند دن بعد جمال پور سب ڈویژن میں مزید دو بٹالین منظم کی گئیں۔ جذبۂ جہاد سے سرشار

باقی صفحہ ۳۳۰ پر

اخلاص احمد (شعبہ ریاضی)

الفاظ کا طلسم کدہ

ایک اعرابی مکہ کے بازاروں میں یہ صدا لگا رہا تھا:
اے لوگو!
۱۔ میرے پاس وہ چیز ہے جو خدا کے پاس بھی نہیں
۲۔ خدا فتنہ کو ناپسند کرتا ہے، میں جسے سے محبت کرتا ہوں۔
۳۔ میں نصاریٰ کے اقوال کی تائید کرتا ہوں

حضرت عمرؓ کا زمانہ تھا، لوگوں نے شکایت کی، آپ نے سزائے حد نافذ کرنے کا حکم فرمایا۔
اعرابی نے عرض کی۔ امیر المومنین میں نے مطلقاً غلط بیانی نہیں کی
۱۔ میرا قول یہ ہے کہ میرے پاس وہ کچھ ہے جو خدا کے پاس بھی نہیں، میری مراد اس سے بیٹا ہے اور خدا کا کوئی بیٹا نہیں۔ قرآن حکیم میں آیا ہے ماکان اللہ ان یتخذ من ولد سبحانہٗ
۲۔ یہ میرا بیٹا میرے لیے فتنہ ہے، کیونکہ خدا تعالیٰ خود فرماتے ہیں اولاد فتنہ ہے۔
۳۔ اور میں اپنے بیٹے سے محبت کرتا ہوں دوسرے لفظوں میں مجھے فتنہ پسند ہے۔
۴۔ میرا تیسرا دعویٰ ایک صداقت کا اظہار ہے میں نے کہا تھا میں نصاریٰ کے قول کی تصدیق کرتا ہوں اور نصاریٰ کا قول قرآن کریم سے نقل کیا گیا ہے

لیست الیہود علیٰ شئ

یعنی یہود راستی پر نہیں ہیں گویا میں نصاریٰ کے اس قول کی تائید کرتا ہوں
حضرت عمرؓ نے فرمایا میں تجھے الحاد و ارتداد کے الزام سے بری کرتا ہوں، لیکن خبردار اگر آئندہ الفاظ کا یہ مغالطہ آمیز کھیل جاری رکھا تو کڑی سزا ملے گی!
آیئے ایک لمحہ کے لیے سوچیں کہ الفاظ کا ناٹک کیا کچھ کرتا ہے آج تک ہم نے اس ناٹک سے کہاں تک لذت حاصل کی، لیکن جب آنکھ کھل گئی، تو زیاں تھا نہ سود تھا۔
ہمارے ہاں اپنا رد عمل کا جو فقدان ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم نے اب تک الفاظ سے محبت کرنا سیکھی ہے ہم صرف اس امر کے گرویدہ رہے ہیں کہ ان الفاظ کو کون کس سلیقے سے بول سکتا ہے، جو صدیوں کی گردش کے ساتھ ہمارے خون میں رچ بس گئے ہیں۔ آزادی سے پہلے الفاظ کا جادو اپنا جاذب رکھتا تھا اس وقت ہم جن سنگین مرحلوں سے گزر رہے تھے، الفاظ کا سحر جاری حرکت و عمل کے لیے حیاتیں کا کام کرتا تھا، لیکن آزادی کے بعد صورت حال بدل گئی الفاظ کی جگہ اعمال ہونے چاہئیں، لیکن جو لوگ قوم کے ترجمان ہوئے، وہ الفاظ کا طلسم جات تیار کرتے رہے اور یہ ایک دردناک المیہ ہے کہ پاکستانی قوم کو سب سے زیادہ فریب جس چیز سے دیا گیا، وہ الفاظ اور ان کا جادو ہے غور سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کی بساطِ سیاست پر الفاظ کے مہرے بکھرے ہوئے ہیں سیاسیات میں الفاظ کی میناکاری سے جو الفاظ سجائے گئے، ان کی شکل گارا چونا اور آتش ہمارے سامنے ہے ادب میں جو عمل سحر ہوتا رہا، اس کی جھیلیں، دیواریں اور دروازے ہم رنگ سوں سے اوجھل نہیں، غرض پورا سانچہ الفاظ کے کارخانے میں ڈھلا ہے۔
ہمیں کشادہ پیشانی سے اس امر کا اقرار کرنا چاہیے کہ ہم میں جذبۂ خلق کا فقدان ناپید ہے۔ اب تک جذبۂ عمل کا جو مظاہرہ ہوتا رہا، بالخصوص اونچے طبقے نے جو روش اختیار کی، اس میں گردو، کے جذبات زیادہ تھے، یا پھر جو شاید کے حسب نصیب بدلا، تو الفاظ بھی بدلے، لیکن الفاظ کا کھیل بدستور جاری رہا جس کا ذکر ان الفاظ میں ہو رہا ہے۔

مشرقی زبانوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ اس میں الفاظ کی فراوانی سب سے زیادہ ہے بادہ و جام درباری زبان رہی ہے، اس لیے اس قسم کے الفاظ اس میں عام ہیں جن سے محض آوازیں پیدا اور ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہیں مثلاً خطابات اور القابات کا جو انبار اردو میں پایا جاتا ہے، وہ عجیب و غریب ہے یہی وجہ ہے کہ ہم ہر طاقتور چیز کو سلام کرتے وقت الفاظ کے خزانے لٹا دیتے ہیں اور جیسے ہم ادبا سب و کتاب کہتے ہیں، وہ اعرابی کی طرح الفاظ کی متعدد معانی رکھتے ہیں، لیکن جو قومیں زندہ ہوتی ہیں، وہ الفاظ کی نسبت اعمال کو دیکھتی ہیں اور یہی ان کی مد ہے اور اسی میں ان کی ترقی و کمال کا راز مضمر ہے الفاظ سے کھیلنے والی قومیں حباب کی طرح سطح پر ابھرتی ہیں اور پھر جلد ہی محو ہو جاتی ہیں۔

صدائے رفتہ

جامعہ پنجاب کے سابق طلبہ و طالبات کے اُس کلام
کا انتخاب — کہ —— "محور" میں چھپا رہا۔
مدیر

عدیم راوی (دسمبر ۵۹ء)

یوانہ تیرا ہرکا گھر لہر شہیں،
وکون سی ہے طرح جو اس شہر میں نہیں
میں بھر کے جام آرزو میں خواب دل تمام
وہ چیز ڈھونڈتا ہوں جو اس شہر میں ہیں

*

شمیم نیاز (نومبر ۵۸ء)

اس طرح شب انتظار گزری ہے
کتنی بھی ساعت یہ بار گزری ہے
گنا ہے برف تصوّر کی وادیوں میں اٹھی
مگر یہ لوگ مُصر ہیں شب گزری ہے

محمود شام (فروری ۶۲ء)

یہ باغ باغ انجمن، یہ پات پات موتیں
کہاں ملیں گی پھر کہاں
بہ جائے گی کدھر کدھر
بکھر پڑے گی وقت کی گھناؤنی ہوا میں

*

ممتاز حسین (نومبر ۶۰ء)

اک قافلہ دیوانوں کا منزل کو چلا تھا
صحرا کے غزالو! تمہیں کچھ اس کی خبر ہو
اے شب کی خموشی میں بھٹکتے ہوئے تارو
تم کون سی منزل کی طرف گرم سفر ہو

*

عطاء الحق قاسمی (مئی ۶۶ء)

لمحہ بہ لمحہ پھیلتی جاتی ہیں ظلمتیں
دن ڈھل رہا ہے مشرقی اقدار کی طرح
انسان بک رہا ہے عقائد کی طرح مول
سارا جہاں ہے مصر کے بازار کی طرح

امجد اسلام امجد (دمشق ۱۹۶۶)

رکھیے قدم سنبھال کر اُلفت کے دیس میں
رہزن ہر ایک سمت میں رہبر کے بھیس میں

غم ساتھ لے لیا ہے کہ غربت میں کام دے
گڑ جیسے باندھ لے کوئی دہقاں کھیس میں

پتھر سمجھ کے راہ کا، ٹھوکر نہ ماریئے
شیشہ ہوں ٹوٹ جاؤں گا ہلکی سی ٹھیس میں

*

جلیل عالی (۱۹۶۸)

ٹمٹمانے لگے آنسوؤں کے دیئے جگنوؤں کی طرح
دل لبھانے لگی ان دنوں شامِ غم رت جگوں کی طرح

شوق کے سلسلے، وقت کے فاصلے، درد کے رابطے
نقش ہیں سب کے سب یاد کی لوح پر حادثوں کی طرح

*

نزہت الماس (۶۸)

نہ جانے کرن سے رنگوں میں ڈھل چکا ہو گا
اس ایک رنگ سے پہلے جو بھا گیا مجھ کو

مرے شعور نے احساسِ آگہی بخشا
اور آگہی کا یہ احساس کھا گیا مجھ کو

راشد حسین (۱۹۶۷)

اُبلے تیز ہوا آئی تو بکھرے گی سب راکھ
رکھ نہ سکوں گا ڈھیر کی صورت پھر میں اپنی ساکھ

آنکھ سے جیسے مدرا چھلکے مُنہ سے جھڑتے پھول
جو کوئی میری رادھا دیکھے جگ کو جائے بھول

من مندر کے سارے پتھر گائیں دیپک راگ
لمحہ لمحہ پگھلا جاؤں پھیلی جائے آگ

رام سا تھا، کشن سا تھا، بنا تھا میں بھگوان
ایک جنم پر ایسا آیا بن نہ سکا انسان

--- (دوہے)

*

سلیم طاہر (۱۹۷۲)

ہم کو معلوم ہے کیا دستِ حنائی دے گا
قرب بوئیں گے تو وہ فصل جدائی دے

آئینہ سیلم کی بدن کانچ کا دِل پتھر کا
اپنے شہکار کو کون اتنی صفائی دے

جتنے بیٹھے ہیں منڈیروں پر شکستہ پر ہیں
اُڑنے والوں کو بھلا کون رہائی دے

ہمایوں مجاہد
سابق طالب علم شعبہ معاشیات

انتظار

یہ نظم کرنل صدیق سالک (جنگی قیدی) کی داستانِ قفس "ہمہ یاراں دوزخ" کے اقتباس سے متاثر ہو کر لکھی گئی — مدیر

دیکھو ذرا قریب سے
وہ دھندلکے میں شام کے
کسی کی تازہ قبر پر
وہ سر جھکاتے کون ہے ؟
وہ منہ چھپاتے کون ہے ؟
آؤ — سناؤں میں تمہیں
وہ حسرتوں کی داستاں
ان آنسوؤں کا وہ چلن
جو آنکھ سے نہ بہہ سکے
ماں مامتا کی وہ تڑپ
جو بے کلی نہ ہو سکی
سپوت کے فراق میں
وہ رات بھر نہ سو سکی
شاید یہ بات سوچ کر

وہ اشک نہ بہا سکی
کہ ایک اشک بہہ گیا
تو اس کے بیٹے کا عزم
عزم — جو جوان ہے
مورخوں کے قلم نے
ابھی تو ہے ابھارنا —
صحافیوں کے قلم نے
ابھی تو ہے اچھالنا
اس ذرا سی چوک پر
وہ رائیگاں ہو جائے گا
شاید وہ سوچتی رہی
وہ ماں تو ہے مگر اسے
نہ اک "صدیق" عزیز ہے

دشمن پرائے دیس میں
کتنے صدیق اور ہیں
وہ قید ہیں مگر انہیں
غم قفس نہ خوف ہے
اکثر ہوا اگر ذہن پر
اندھی کالی بدلیاں
دامن میں وحشتیں لیے
پکارتی رہیں اُسے
اتنی مہیب پُر خطر
سپاہیوں کے خول میں
وہ پُر سکون ہی رہی
وہ مدتوں سے منتظر
اک آرزو دبائے ہوئے
گاؤں کی کچی سڑک پر
ہر آنے والا دیکھتی
وہ اپنا بیٹا دیکھتی
بڑھی تھی شاید تھک گئی
تھک گئی تو کیا ہوا
اک روز حادثہ ہوا
وہ اپنے چار سُو کھڑے
دُھندلکے چہرے دیکھتی
پتھرا گئی — پتھرا گئی
اور اُس کی پتھرا آنکھ میں
اس وقت بھی تھکا تھکا
کسی کا انتظار تھا —

طالب علم دو پہلو

صلاح الدین شمسی (شعبہ کیمیا)

اگر علم تن پروری کے لیے حاصل کیا جائے، تو یہ سانپ کی طرح ہلاکت خیز ثابت ہوگا اور اگر اس کی تحصیل قلب و نظر کی اصلاح کے لیے ہوگی، تو یہی علم انسان کا دوست اور زندگی کی راہوں میں رہنما اور معاون ثابت ہوگا۔ یہ شعر مشرق کے عظیم ترین مفکر شاعر مولانا روم کا ہے۔ اس شعر میں حقائق کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر پوشیدہ ہے۔ آئیے ذرا غور کریں کہ وہی علم دوست اور زندگی کی راہوں میں ہمارا رہنما ثابت ہوگا، کیونکہ سانپ سے بھی زیادہ ہلاکت خیز ثابت ہو سکتا ہے۔ تو یہ مسئلہ بالکل آسان ہو جائے گا کہ اگر انسان علم کا مقصد محض تن پروری سا یہ کس طرح سانپ سے زیادہ ہلاکت خیز ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ تو ہم جانتے ہیں کہ تن پروری دولت کے حصول کو نصب العین بنائے بغیر نہیں رہ سکتی۔ لہٰذا جب انسان دولت کو اپنا نصب العین بنا لیتا ہے اور ہر چیز کو دوست، دولت اور پیٹ کی کسوٹی پر پرکھتا ہے، تو اس کی انسانیت فنا ہو جاتی ہے۔ وہ دولت کا پرستار ہو کر تمام اخلاقی اقدار کو پامال کرتے پر اتر آتا ہے اور حرام و حلال تمام قیود کو مٹا ڈالتا ہے۔ اسے سود کھاتے شرم آتی ہے نہ شراب جلسے اور رقص جلسے قائم کرتے ہوئے شرماتا ہے۔ نہ گھوڑ دوڑ کے مقابلوں، رمی اور شطرنج کے کھیلوں میں اسے کوئی اخلاقی خرابی نظر آتی ہے۔ یہاں تک کہ یتیموں کا مال کھا جانے اور بیواؤں کا ورثہ غصب کرتے ہوئے بھی ذرا حجاب محسوس نہیں کرتا۔

اس میں شبہ نہیں کہ دولت حاصل کر کے انسان اونچے محلات میں رہ سکتا ہے، اپنا گھر ہر طرح کے سامانِ آرائش سے آراستہ کر سکتا ہے، اپنی خدمت کے لیے باوردی ملازموں کی جماعت رکھ سکتا ہے، اپنا دسترخوان انواع و اقسام کے خوش ذائقہ اور لذیذ کھانوں سے سجا سکتا ہے، اپنی تن پوشی کے لیے ہزاروں سوٹ سلوا سکتا ہے، اسی طرح وہ تعلیم سے دولت کما کر بڑی بڑی ملیں اور کارخانے بنا سکتا ہے، بینکوں کی فلک بوس عمارات اور زبردست تجارتی منڈیاں قائم کر سکتا ہے۔ صاف اور شفاف عمارات تعمیر کر سکتا ہے، بڑے بڑے ریفائنری کیٹ لے سکتا ہے، لیکن ان چیزوں کے باوجود وہ خوشحالی نہیں خرید سکتا۔ وہ معاشرہ جہاں ایسے افراد موجود ہوں جو علم کو صرف دولت کا ماحصل سمجھتے ہوں، روح تعاون سے سرشار نہیں ہو سکتا۔ بحیثیت قوم ملک میں امن و امان قائم نہیں ہو سکتا۔ سب کے لیے یکساں طور پر ترقی کی راہیں کشادہ نہیں ہو سکتیں۔ سب زندگی کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے پر قادر نہیں ہو سکتے۔ مظلوم انصاف حاصل نہیں کر سکتے، کیونکہ علم کا صحیح اثر معاشرے کی بنیاد مہر و الفت اور عدل کے بجائے حسنِ لذت اور مال و زر کی فراوانی پر قائم ہوتی ہے۔ نتیجہ کے طور پر معاشرہ میں کہیں شائیلاک کا کردار ابھرتا ہے، کہیں ذہنیت پیدا ہوتی ہے، کہیں شداد کی سنگدلی رنگ دکھاتی ہے اور کہیں سود خوار مہاجن کا روپ سامنے آتا ہے۔ اس سے نہ صرف دو نسل تباہ ہو جاتی ہے، بلکہ آنے والی نسلیں بھی اس سے نہیں بچ سکتیں۔

حقیقت جو ان ساری باتوں کے بعد سامنے آتی ہے وہ یہی کہ قوموں کے عروج و زوال اور ان کے بقا و استحکام کا انحصار تعلیم پر ہے۔ صحیح تعلیم کے ذریعے ہی ایک قوم اور ایک فرد ترقی کی اعلیٰ بلندیوں سے ہمکنار ہوتی ہے اور تعلیم کے فقدان یا اس کی غلط روش کی وجہ سے ذلت کے گہرے غاروں میں گر جاتی ہے۔ یہ غلط تعلیم ہی ہے جس کی مدد سے سنگ مرمر کی صنعت اور شاہین پیدا کی جا سکتی ہیں اور نئے فکری سانچے میں ڈھلنے کے بجائے ذاتی اور حقیر لالچ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ کے طور پر تعلیم کی مثال اس ابر باراں کی سی ہو جاتی ہے جو اگر کسی زرخیز علاقے میں برسے تو ہر سو آگ جاتا ہے۔ رنگ برنگے پھول اپنی بھینی بھینی خوشبو سے ساری فضا کو معطر کر دیتے ہیں اور یہی ابر باراں جب کسی غلاظت کے ڈھیر پر برستا ہے، تو بدبو کے بھبکے اٹھنے لگتے ہیں۔ یا علم اس تلوار کی سی ہے جو ایک ڈاکو کے ہاتھ میں آ کر دنیا کے لیے مصیبت کا سامان بنتی ہے، لیکن مجاہد فی سبیل اللہ کے ہاتھوں میں آ کر رحمت کا نشان بن جاتی ہے۔

لہٰذا تعلیم کے حصول میں اگر دولت اور شہرت کو ایک ثانوی چیز تصور کر کے ایک اچھا کردار بنایا جائے، تو ہر معرکہ سر کیا جا سکتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ قومیں محض کردار کی بلندی سے پروان چڑھی اور غالب آتی ہیں اور دولت کی کمی اور مادی وسائل کی قلت کے باوجود کردار کے بل بوتے پر کامیاب ہوتی رہی ہیں۔ اخلاقی اوصاف سے مسلح ہو کر میدان مارا جا سکتا ہے۔ بڑی بڑی مشکلات ہمت کے سامنے ہوا ہو جاتی ہیں۔ پیچیدہ سے پیچیدہ قومی مسائل اور معمے کردار کے زور سے حل ہو جاتے ہیں۔ جو قوم کردار کی دولت سے مالا مال ہو، وہ دولت اور مادی وسائل کی کمی کے باوجود غالب و سرفراز رہتی ہے۔ اپنے اخلاقی فضائل سے وہ ایسے امن، ایک ایسے معاشرے کو جنم دیتی ہے جو اخوت، مساوات اور عدل کی بنیادوں پر قائم ہونے کی وجہ سے جنت کا سماں پیدا کر دیتا ہے اور مولانا روم کے بقول علم انسان کا دوست اور زندگی کی راہوں میں رہنما اور معاون ثابت ہوتا ہے۔ لہٰذا علم کا مقصد محض تن پروری انسانیت کا تنزل ہے اور انسان کو قعرِ ذلت میں گرا دیتا ہے۔ جبکہ صحیح حصول انسانیت کی معراج اور عرفان و ایقان کے بام تک بہ آسانی پہنچا دیتا ہے۔

مخلوط نظام تعلیم

طاہرہ عفت (شعبہ تعلیم و تحقیق)

مخلوط تعلیم اُس نظام تعلیم کا ایک جزو ہے جو برّ صغیر میں انگریزوں نے اپنی تہذیب و معاشرت کو مستحکم کرنے کے لیے نافذ کیا تھا مسلمانوں میں مخلوط تعلیم کا باقاعدہ آغاز تقسیم سے پندرہ بیس سال قبل سے ہوا اور مسلمان خاندانوں میں دیگر معاشرتی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اس کا رواج بھی بڑھتا چلا گیا۔ آزادی کے بعد بجا طور پر اس بات کی توقع کی جا سکتی تھی کہ اسلام کے تقاضوں کے مطابق عورتوں کے لیے علیحدہ تعلیمی ادارے قائم کر کے اُن کے لیے معقول و مناسب تعلیم کا انتظام کیا جائے گا۔ جس خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا نام لے کر اور جس کے احکامات نافذ کرنے کا عہد کر کے سرزمین حاصل کی گئی تھی۔ اس کے احکام اس باب میں مشتبہ نہ تھے لیکن اس کے باوجود زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح نظام تعلیم کے دائرے میں بھی اسی رُخ پر حرکت جاری رہی جس رُخ پر انگریز بنیاد ڈال گئے تھے اور آج صورت حال یہ ہے کہ ذہنوں سے مخلوط تعلیم کے ایک برائی ہونے کا احساس مٹتا جا رہا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اسے تعلیم کے ایک ناگزیر جزو کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا ہے۔ بڑے شہروں کی حدود سے آگے نکل کر اب اس کا رواج قصبات اور چھوٹے شہروں میں بھی ہونے لگا ہے اور ہمارے معاشرے کا ہر طبقہ اس سے متاثر ہو رہا ہے۔

مخلوط تعلیم کے جو نتائج رونما ہوتے ہیں وہ قوم کے ہر بہی خواہ بالخصوص تعلیم کے کارپردازوں کے لیے فکرمندی کا باعث ہیں۔ طلباء اور طالبات دونوں ہی کی دلچسپی اس کے اصل مقصد یعنی حصول تعلیم سے کم ہو گئی ہے معیار گر رہا ہے۔ کامیاب ہونے والوں کا تناسب مسلسل کم ہوتا جا رہا ہے اور درس گاہوں میں نظم و ضبط ایک مستقل مسئلہ بن کر رہ گیا ہے دوسری طرف درس گاہوں کے ماحول پر، طلباء و طالبات کی سیرت و کردار پر اور اس کے ذریعے پورے معاشرے پر اس کے مضر اثرات ہو رہے ہیں اور تیسری طرف اس کی وجہ سے عورتوں کے لیے ان کی ضروریات کے لحاظ سے مناسب نصاب کی ضرورت کے احساس کے باوجود اس کے لیے عملاً کچھ نہیں کیا جا سکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرے کے باشعور اور سنجیدہ طبقے کے لیے یہ کبھی قابل قبول نہ تھی۔ مسلمانوں کا معاشرتی نظام اور اُن کا مزاج اُسے کبھی قبول نہیں کر سکتا تھا لیکن عمل کی دنیا میں اس کی پشت پناہ ایک غالب تہذیب اور حکومت کی طاقت تھی۔ جس طرح زندگی کے اور دائروں میں ہم مغلوب ہوتے گئے اور مغرب کی تقلید کرتے گئے، اسی طرح مخلوط تعلیم کو بھی ہم نے نتائج کی پرواہ کیے بغیر نظام تعلیم کا جزو بنا لیا

اصولی اور نظریاتی بنیادوں پر بھی ہماری موجودہ دور کی تحقیقات کی روشنی میں بھی مخلوط تعلیم دینے کا ایک غلط اور نامناسب طریقہ ہے اور شدید مضر اثرات کا باعث ہے لیکن پاکستان کے حالات میں اس کو ملکی و قومی مفاد سے کھلی کھلی بدخواہی کے مترادف ہے۔

ہمارا ملک کتنا ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہو جائے، ہماری تہذیبی اقدار کے پس منظر میں مخلوط تعلیمی اداروں میں عورتوں کو اس طرح کی مساوی حیثیت کبھی بھی نہیں مل سکتی، جیسی کہ مخلوط تعلیم کے نظریے کے تحت ملنی چاہیئے، بلکہ وہ ایک الگ گروہ اور حقیقتہً ایک کمتر و حقیر گروہ کی حیثیت سے تعلیم حاصل کریں گی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک طرف تو وہ مخلوط تعلیم کے فوائد سے بہرہ مند نہ ہو سکیں گی اور دوسری طرف علیحدہ تعلیم کے اپنے فوائد سے بھی محروم رہیں گی اس طرح یہ خود عورتوں کے لیے سراسر نقصان کا سودا ہے۔

پھر غلط تعلیم عورتوں کی تعلیم کی توسیع و اشاعت میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے مسلمانوں کا مزاج، کتنی ہی کوشش کیوں نہ کر لی جائے بحیثیت ایک قوم کے کبھی بھی مخلوط تعلیم سے سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ علیحدہ یونیورسٹی نہ ہونے کی بنا پر ایک بہت بڑی تعداد مخلوط تعلیم والے کی نسبت اعلیٰ تعلیم سے محروم رہنے کو ترجیح دیتی ہے اگر فی الواقع تعلیم نسواں کو ملک کی ترقی کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے اور ایک ایک گھر میں اس کا رواج پیش نظر ہے، تو اگر یہ ہے تو اعلیٰ ترین مراحل تک ان کے لیے علیحدہ اداروں کا بندوبست کیا جائے

اس ضمن میں ایک اور بات بھی خاص طور سے قابل توجہ ہے۔ عورتوں کے لیے ان کے فرائض ذمہ داریوں کے مطابق کوئی علیحدہ نصاب نہیں ہے بلکہ ٹھیک وہی نصاب جو مردوں کو ملازمتوں کے لیے تیار کرتا ہے عورتوں کے لیے بھی رائج ہے۔ اس کو برقرار رکھنے کی بہت بڑی وجہ خود مخلوط تعلیم ہے۔ اگر اس کا رواج ختم کر دیا جائے تو عورتوں کے لیے الگ تعلیمی نصاب مرتب کرنے کی ضرورت عمل نتائج دے گی۔ ان نصابات کی افادیت اپنی جگہ تعلیم نسواں میں فروغ کا باعث ہوگی۔

تعلیم کی اصل افادیت یہ ہے کہ طالب علم اپنی بعد کی زندگی میں اس تعلیم کی بنا پر ملک و قوم کی خدمت زیادہ بہتر طریقہ پر انجام دے سکے قوم کی ترقی کا دار و مدار اسی پر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندہ قومیں اس مد پر بے دریغ روپیہ صرف کرتی ہیں اور اسے ایک طرح سے سماجی سرمایہ کاری سمجھا جاتا ہے۔ ارباب کار کا یہ فرض ہے کہ اسے قوم کے بہترین مفاد میں لگائیں اور یہ دیکھیں کہ اس کی تضیع نہ ہو۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ یونیورسٹیوں اور کالجوں سے فارغ التحصیل ہونے والی طالبات کی ایک انتہائی قلیل تعداد ان کاموں کو انجام دیتی ہے جس کے لیے یہ تعلیم ان کو تیار کرتی ہے بالعموم خواتین ملازمت کا پیشہ اختیار نہیں کرتیں اور جو کرتی ہیں تو ان کی بھی ایک معتد بہ تعداد شادی اور گھر گرہستی کے بعد ملازمت چھوڑ دیتی ہے۔ اس لحاظ سے ہماری قومی دولت کا کوئی نتیجہ اجتماعی دائرہ کار میں نہیں مل رہا اور یہ دولت مسلسل ضائع جا رہی ہے۔ پھر کیا یہ دانش مندی نہیں ہے کہ اس سیدھی سیدھی حقیقت کو تسلیم کر لیا جائے اور خواہ مخواہ طالبات پر طلبہ کے نصاب کے تحت تعلیم پر جو مسلسل دولت ضائع ہو رہی ہے اس کے بچاؤ کی فکر کی جائے

یہ بے پناہ ضیاع اس پس منظر میں اور بھی سنگین ہو جاتا ہے، جب ہم دیکھتے ہیں کہ فی الوقت ہمارے ملک میں جو تعلیمی سہولتیں ہیں وہ مردوں کے لیے بھی کافی نہیں۔ طلبہ کی ایک بہت بڑی تعداد قابلیت، صلاحیت حتیٰ کہ ذرائع و وسائل رکھنے کے باوجود بھی محض نشستوں کی کمی کی وجہ سے تعلیم سے محروم رہ جاتی ہے، گویا صورت حال یہ ہوئی کہ ہر طالب علم خاتون ایک مرد طالب علم کی جگہ تعلیم حاصل کر رہی ہے اور اپنے اوپر وہ ساری رقم خرچ کر رہی ہے، جو درحقیقت مرد طالب علم کا حق ہے اور اس طرح ملک کو اس فائدے سے محروم کر رہی ہے جو اس کے بجائے کسی مرد طالب علم کی تعلیم سے حاصل ہو سکتا تھا قومی تعمیر کے ایک ایسے دور میں جس میں ہمیں تربیت یافتہ افراد کی سخت ضرورت ہے اور ہر شعبہ میں ہمارے پاس ماہرین کا فقدان ہے۔ ان طلبا کو تعلیم سے محروم کرنا قومی ترقی کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ڈالنے کے مترادف ہے۔

پھر یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ گزشتہ سالوں میں ہمارا معیار تعلیم برابر گر رہا ہے اور اس بات سے انکار ممکن نہیں ہے کہ اس کی ایک اہم وجہ مخلوط تعلیم بھی ہے۔ یہ بنیادی طور پر طلبا اور طالبات دونوں کی توجہ اصل تعلیم سے ہٹانے کا سب سے بڑا سبب ہے۔ طالب علموں کا مقصد فریق مخالف کی توجہ کا مرکز بننا ہوتا ہے اور اکثر حالتوں میں تو تعلیمی اداروں کی تمام تر سرگرمیوں کا محور ہی یہ چیز ہو کر رہ جاتی ہے۔ یوں تو تعلیم جو ذہنی یکسوئی کا تقاضا کرتی ہے شدید قسم کے ذہنی انتشار اور عدم توجہی کا شکار ہو جاتی ہے طلبا اور طالبات کے ساتھ اساتذہ کا رویہ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ اکثر مخلوط تعلیمی اداروں میں اساتذہ طلباء اور طالبات کے ساتھ مساویانہ رویہ نہیں رکھتے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ چند جنسی ہیجان رکھنے والے اساتذہ کی وجہ سے پورے طبقے اساتذہ کا وقار مٹی میں مل جاتا ہے جب کہ اس سے ہماری تعلیم بھی براہ راست متاثر ہوتی ہے۔

**

بقیہ: البدری ستارے

"البدر" نے کیا کیا کارنامے سرانجام دیے، یہ ایک طویل داستان ہے، صرف اتنا کہوں گا کہ البدر کے ہوتے ہوئے پوری سب ڈویژن میں کسی تخریب کار یا ہندوستانی ایجنٹ کا گھسنا محال تھا۔ ضلع موس شاہی میں مقیم بریگیڈیئر صاحب کو جمال پور کی البدر پہ اتنا اعتماد تھا کہ وہ اکثر کہا کرتے: میں ہندوستان کو چیلنج کرتا ہوں کہ جمال پور سب ڈویژن میں تخریب کار بھیجے رفتہ رفتہ البدر ہر ضلع میں منظم ہو گئی۔ یہاں تک کہ صوبے بھر میں رضاکار تنظیم وجود میں آگئی جس میں اکثریت البدر گروپ کی تھی ان میں سے اکثر نوجوان بلا تنخواہ عسکری فرائض انجام دے رہے تھے بھاری تعداد کالجوں کے اسلامی ذہن رکھنے والے طلبہ اور مدارس میں پڑھنے والوں کی تھی فوجی حکام طلبہ کو البدر میں شامل کرنے سے پس و پیش کرتے کہ ان کی تعلیم میں حرج ہوگا لیکن طلبہ کا موقف یہ تھا کہ ہمارا مستقبل پاکستان سے وابستہ ہے، اگر پاکستان ہی نہ رہا، تو ہماری تعلیم بے کار ہے
... البدر کی اکثریت بلا تنخواہ فرائض سرانجام دے رہی تھی، اس

کے باوجود کسی موقع پر انہوں نے کوتاہی نہیں برتی۔ ایسے ہی دو سگے بھائی شیرپور کی بٹالین میں تھے، ان میں سے ایک، ایک جھڑپ میں شہید ہو گیا۔ دوسرے بھائی کو چھٹی دی گئی، تاکہ اس کے جنازے میں شریک ہو سکے وہ جنازہ پڑھنے کے بعد فوراً اپنی بٹالین میں حاضر ہو گیا اس کے کمانڈر نے پوچھا "چھٹی ختم ہونے سے پہلے ہی کیوں آ گئے؟" اس نے جواب دیا: جس فرض کی تکمیل کے لیے میرے بھائی نے اپنی جان قربان کی، وہ میرے گھر میں بیٹھ رہنے سے مکمل نہیں ہو سکتا۔ اب اس کی ادائیگی میرے ذمے ہے اس عظیم فرض کو چھوڑ کر گھر بیٹھ رہنا کسی صورت بھی مناسب نہیں۔

البدر کے سرفروش آخر دم تک قوم اور ملک کی بقا کے لیے اپنے فوجی بھائیوں کے شانہ بشانہ لڑتے رہے۔ انہوں نے ثابت کیا کہ مسلمان خواہ بنگالی ہو یا سندھی، پنجابی ہو یا پٹھان، حق کے لیے ایک جسم و جان بن کر لڑتا ہے۔ ان میں سے سینکڑوں نے اپنے فوجی بھائیوں کے ساتھ اپنی جان قربان کر کے اس بات کا ثبوت دیا کہ ان کے دلوں میں جہاد کا جذبہ آج بھی اسی طرح موجزن ہے جیسے چودہ سو سال پہلے مسلمانوں میں تھا۔

سقوط مشرقی پاکستان کے بعد البدر پر کیا گزری اور کیا کیا [illegible] یہ داستان [illegible] کی ہر انصاف پسند آنکھ پُرنم ہے، بلکہ البدر کو مٹا کر انہیں شکست نہیں دی جا سکتی سچائی پر مرنا کبھی شکست نہیں کہلاتی انہوں نے سچائی پر قربان ہو کر ایسی عظیم الشان فتح حاصل کی کہ قیامت تک ہر ظالم ایک سچے انسان سے خائف رہے گا۔

○○○○

پاکستان، عورت، تعلیم

کوکب صدیقی (انڈیانا یونیورسٹی، امریکہ)

خواہشات سے حقائق تک کا سفر بہت ہی طویل اور کٹھن ہوتا ہے۔ ذاتی میلانات، خاندانی رسوم اور طبقاتی تاثرات کو خاص طور پر انسان اصلاح کی جو کوشش بھی کرے معاشرے کی سطح پر عمومی ارتعاش پیدا کرکے ختم ہو جاتی ہیں۔ تعلیم کے میدان میں اگر ہم کوئی تبدیلی لانا چاہتے ہیں، تو ہمیں واضح طور پر معلوم کرنا ہوگا کہ ہمارے ملک کے حقائق کیا ہیں۔ اگر ہم یونیورسٹی کے طالب علم ہیں، تو اس کا قوی امکان ہے کہ ہمارا تعلق کسی متوسط طبقہ سے ہوگا۔ ہم کسی افسر، تاجر، زمیندار، اعلیٰ ملازم، کارخانے دار، معلم وغیرہ کی اولاد ہوں گے۔ اس خاندانی پس منظر کی وجہ سے ہماری خواہشات اور منصوبے متوسط طبقے کی ضروریات اور تمناؤں کی عکاسی کریں گے۔ یہ صورت حال کسی فلسفہ یا نظریہ کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ انسان کی فطری صورت حال ہے کہ وہ جس ماحول میں پلتا بڑھتا ہے ویسے ہی اثرات قبول کرتا ہے۔

اس مختصر مضمون میں پاکستان کا معاشرتی تجزیہ مقصود نہیں ہے، لیکن اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا کہ پاکستان کی آبادی اسی فیصد سے زائد حصہ کسانوں، مفلسوں، مزدوروں اور ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جن کا متوسط طبقہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر ہم اپنے منصوبے بنائیں جن کا فائدہ زیادہ تر متوسط طبقہ کو ہو، تو مجموعی طور پر پاکستانی قوم کو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس تلخ حقیقت کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہئے کہ متوسط طبقے کی حوصلہ افزائی سے اور ان کی تعلیم میں اضافہ سے پڑھے لکھے لوگوں میں بیروزگاری بڑھتی ہے اور ملک چھوڑ کر باہر جانے کا رجحان تقویت حاصل کرتا ہے۔ اگر اسی متوسط طبقہ کی خواتین بھی تعلیم حاصل کریں، تو ایسے خاندانوں کے لیے اونچے طبقہ میں پہنچنے کے امکانات پیدا ہوسکتے ہیں۔ اس محدود سے میدان میں چاہے کتنی ہی کوشش کی جائے اس سے ملک کا مستقبل نہیں سنور سکتا۔ عمرانی سائنس کے ماہرین نے پاکستان جیسے دوسرے ممالک کا جو معاشرتی تجزیہ کیا ہے اس کے اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ ان ممالک میں تعلیم امیر کو امیر تر بنانے کا باعث بنتی ہے اور اوپر کے طبقات کی قوت بڑھاتی ہے۔ تعلیم اس قسم کے معاشرے میں غریب اور امیر کو ایک دوسرے سے مزید دور کر دیتی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ تعلیم بذات خود کوئی برائی ہے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ جب تک تعلیم اور قوم کے مجموعی مفاد کو یکساں نہ کیا جائے تعلیم کا کوئی فائدہ نہیں اور نہ اسے معاشرتی اصلاح کا ذریعہ نہیں بنایا جاسکتا۔

وہی اسلامی تحریک کامیاب کہی جاسکتی ہے جو کہ اسلام کا پیغام عوام تک پہنچا سکے۔ اگر تحریک کے اثرات متوسط یا اونچے طبقوں میں محدود ہوکر رہ جائیں تو ایسی تحریک قوم کے مستقبل کو نہیں بدل سکتی۔ اس کی وجہ قرآن پاک سے آسانی معلوم ہوجاتی ہے۔

"اے محمد، کہو کہ اے انسانو، میں تم سب کی طرف اس خدا کا پیغمبر ہوں جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے۔ اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے، پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبی امی پر جو اللہ اور اس کے ارشادات کو مانتا ہے، اور پیروی اختیار کرو اس کی، امید ہے کہ تم راہ راست پالو گے۔" (الاعراف ۱۵۸)

جب کہ رسول مقبولؐ کو سب انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہے، تو ایسی مسلم تحریک کو کامیاب کیونکر سمجھا جاسکتا جو کہ رسولؐ کے انقلابی پیغام کو تمام انسانوں تک پہنچانے سے گریز کرے اور ایک طبقہ میں اپنی محنت صرف کرتی رہے۔ اسلام ہر ایک کے لیے ہے۔ قرآن اس پر بار بار زور دیتا ہے۔ اوپر کی آیت میں جہاں پیغمبرؐ پر زور دیا گیا ہے اسی طرح نبی کے امی ہونے کا خاص ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نبی امی کو بھیج رہا تھا جس کا کام آگے یہ تھا کہ تمام انسانوں کو پڑھائے۔ سورہ سبا میں بھی نبوت کے عام ہونے کا ذکر ہے

"اور (اے نبی) ہم نے تم کو تمام ہی انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں" (سبا ۲۸)

قرآن کا حامل رسولؐ تمام انسانوں ہی کے لیے نہیں بلکہ تمام جہانوں کے لیے بھیجا گیا تھا

"اے نبی، ہم نے تو تم کو تمام کائنات کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔" (الانبیاء ۱۰۷)

اب اگر ہمارا پیغام کوٹھی والوں اور کار والوں، ملکیت والوں اور سفید پوشوں تک تو پہنچ رہا ہو لیکن ہم پسے ہوئے طبقوں، خاک اور دھول میں کام کرنے والوں، جن کے پاس دنیا میں سوائے دو بازوؤں کی طاقت کے اور کچھ بھی نہیں، سے ہاتھ ملانے اور انہیں ساتھ بٹھانے سے ہی جھجک محسوس کرتے ہوں، تو یہ کہنا درست ہوگا کہ ہم اسلام اور اپنے ساتھ انصاف نہیں کر رہے۔

پاکستانی قوم کے پسے ہوئے طبقوں میں سب سے مظلوم طبقہ اس قوم کی عورتوں کا ہے اور یہ طبقہ تعداد میں ملک کی تقریباً نصف آبادی پر مشتمل ہے۔ مسلمان عورت جس قسم کے افراط و تفریط کی شکار ہے اس کی طرف اس صدی کے مجدد نے تقریباً بیس سال قبل اشارہ کیا تھا۔ "پردے کی شرعی حدود معلوم نہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے ایک گروہ نے تو اس قدر آزادی اختیار کرلی کہ اپنی عورتوں کو نیم برہنگی کی حد تک لے گئے اور دوسرے گروہ نے انہیں گھر کی چار دیواری میں اس طرح قید کردیا کہ صوبہ بہار میں مسلمانوں کے قتل عام کے وقت بھی ان کی عورتیں ڈولی کے بغیر گھر سے نہ نکل سکیں۔ یہ دونوں طریقے غلط ہیں" (روداد حصہ پنجم صفحہ ۱۲) ان دو گروہوں کے علاوہ بے شمار مسلمان عورتیں دیہاتوں میں کام کرتی ہیں اور آدمیوں کا ہاتھ بٹاتی ہیں لیکن ان کی حالت تقریباً مردوں کی لونڈیوں کی سی ہوتی ہے۔ اس صورت حال کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ عورتیں اسلام میں اپنے مقام اور حیثیت سے ناواقف ہیں۔ ۴۲ سال قبل اسی مجدد

نے تحریکِ اسلامی سے وابستہ خواتین کو ہدایت دیتے ہوئے حصولِ علمِ دین پر زور دیا تھا

"اولین ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ اپنے آپ سے زیادہ سے زیادہ واقفیت حاصل کریں۔ نہ صرف قرآن سمجھ کر پڑھیں، بلکہ کچھ نہ کچھ حدیث اور فقہ کا مطالعہ بھی کریں۔ نہ صرف دین کی مبادی باتوں اور ایمان کے تقاضوں کو جانیں، بلکہ یہ بھی معلوم کریں کہ آپ کی ذاتی زندگی، گھر کی زندگی، خاندان کی زندگی اور عام معاشرتی زندگی کے بارے میں دین کے احکام کیا ہیں۔ احکامِ دینی سے عورتوں کی عام ناواقفیت ان اسباب میں سے ایک اہم سبب ہے جن کی بدولت مسلمان گھروں میں غیر شرعی طریقے رائج ہوئے ہیں بلکہ جاہلیت کی رسموں تک نے راہ پالی ہے۔ آپ کو سب سے پہلے خود اسی خامی کو رفع کرنے کی طرف توجہ کرنی چاہیے" (ہدایات صہ ۳۵)

یہاں ایک بات وضاحت طلب ہے۔ حصولِ علم ہر مسلمان عورت پر فرض ہے، حدیث میں آیا ہے کہ طلبِ علم ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے" (بیہقی) اگر اس وقت ملک میں عورتوں کی اکثریت طلبِ علم کے مبادی ذرائع سے محروم ہے، تو ایسی حالت میں بھی ہمارا اسلامی انقلاب کا خواب پورا ہونا بہت کٹھن کام ہے۔

پاکستان کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ عورت کو اس کا صحیح مقام دیا جائے۔ اس ضرورت کا احساس پیدا کرنے کے لیے معاشرتی تجزیہ بہت اہم ہے تاکہ واضح طور پر معلوم ہو سکے کہ پاکستانی عورت کس حد تک مظلوم ہے۔ اگر ہم ہر طبقہ کے ردِ عمل کو شکار ہوکر مروّجہ رسم و رواج کو اور عورت کی موجودہ صورتِ حال کو اسلامی سمجھنے لگیں، تو یہ اسلام کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ مغرب زدہ طبقہ جو محض پروگرام عورت کی ترقی کے نام پر پیش کرتا چلا آرہا ہے ایسا نہ ہو کہ ہم محض اس کی تردید میں لگے رہیں اور خود کوئی مثبت پروگرام نہ پیش کر سکیں۔ مسلمان عورت کے لیے ضروری ہے کہ اسلام کے رنگ میں رنگ جائے۔ لیکن نہیں ماننا پڑے گا کہ یہ رنگ دقیانوسی روایات سے بالکل مختلف ہے اور مغربیت زدہ آزادی سے بھی اس کا کوئی تعلق نہیں۔ مسلمان عورت نہ تو کسی کی لونڈی بن کر رہے اور نہ بے مہار ہو کر گزارا کرے، اسے اس قابل ہونا چاہیے کہ اپنی انفرادی حیثیت میں ایک انسان کی تمام خوبیوں کے ساتھ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکے۔ مولانا مودودی نے تشکیلِ پاکستان کے موقع پر برملا کہا تھا کہ "اس وقت ملک میں ایسے حالات پیدا ہو رہے ہیں کہ عورتوں کو اس کے لیے تیار ہونا چاہیے کہ بوقتِ ضرورت اپنی حفاظت خود کر سکیں، ایک جگہ سے دوسری جگہ خود منتقل ہو سکیں اور مصیبت کے وقت مردوں کے لیے بار اور رکاوٹ بننے کی بجائے ان کی قوت میں اضافہ کرنے کا موجب ہوں" (روداد حصہ پنجم)۔ اور یہی بات یہ ہے کہ آزادی ملنے کے بعد اب تک بھی بعینہٖ حالات ہیں۔۔۔!! اس لیے ضروری ہے کہ خواتین کی تعلیم میں انفرادیت ہو، تعلیم ہو، جو اس ترقی پذیر ملک میں اپنا مثبت کردار ڈال سکے ۔۔

**

بقیہ

موت کے ہدایت نامے

اس قسم کی تعلیم پانے کے ساتھ کھلا خطرہ یہ ہے کہ آپ کو میسر آتی ہے جس ماحول میں آپ گھرے رہتے ہیں اور عملی زندگی کے جن لوگوں سے آپ کو واسطہ پیش آتا ہے، ان میں مشکل ہی سے کہیں اسلامی کیریکٹر اور اسلامی طرزِ عمل کا نشان پایا جاتا ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جن لوگوں کو علمی حیثیت سے اسلامی تربیت دی گئی ہو وہ درست تو نہیں ہیں کہ خود بخود مسلمان بن کر اٹھیں، ان پر دینی ماحول تو نہیں ہوتی کہ خود بخود ان کے دل میں علمِ دین ڈال دیا جائے۔ وہ پانی اور ہوا سے تو اسلامی تربیت اخذ نہیں کر سکتے۔ اگر وہ فکر اور عمل دونوں حیثیتوں سے غیر اسلامی نشان رکھتے ہیں تو یہ ان کا قصور نہیں، بلکہ اس درس گاہوں کا قصور ہے جو موجودہ نظامِ تعلیم کے تحت قائم کی گئی ہیں۔ درحقیقت یہ میرا وجدان ہے جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس درس گاہوں میں دراصل آپ کو ذبح کیا جاتا ہے، اور اس ملک کی قبر کھودی جاتی ہے جس کے نونہال آپ ہیں۔ آپ نے جس سوسائٹی میں جنم لیا ہے جس کے خرچ پر تعلیم پائی ہے جس کی فلاح کے ساتھ آپ کی فلاح اور جس کی زندگی کے ساتھ آپ کی زندگی وابستہ ہے اس کے لیے آپ بیکار بنا کر رکھ دیے گئے ہیں۔ آپ کو صرف یہی نہیں کہ اس کی فلاح کے لیے کام کرنے کے قابل نہیں بنایا گیا، بلکہ دراصل آپ کو باضابطہ اور منظم طریقے پر ایسا بنا دیا گیا ہو کہ بلا ارادہ آپ کی ہر حرکت اس ملک کے پیسے پیسے کا سامان ہو حتیٰ کہ آپ کی خیرخواہی کے لیے

بھی کچھ کرنا چاہیں تو وہ اس کے حق میں مضر ثابت ہو۔ اس لیے کہ آپ کی نظر سے نہ صرف اور اس کے اسلامی اصولوں تک سے بیگانہ رکھے گئے ہیں اور آپ کی پوری ذہنی تربیت اس نقشہ زندگی کی ہے جو صرف اسلام کے نقشہ کے بالکل برعکس ہے

اسی بس پر بس کو اگر آپ سمجھ لیں اور اگر آپ کو پوری طرح احساس ہے کہ فی الواقع کس قدر خطرناک حالت کو پیدا کر کے آپ کو کارزارِ زندگی کی طرف جانے کے لیے چھوڑا جا رہا ہے تو مجھے یقین ہے کہ آپ کچھ نہ کچھ تلافی مافات کی کوشش ضرور کریں گے۔ پوری تلافی تو ساری اب بہت مشکل ہے تاہم میں آپ کو تین باتوں کا مشورہ دوں گا جس سے آپ کافی فائدہ اٹھا سکتے ہیں

(۱) جہاں تک ممکن ہو سکے عربی زبان سیکھنے کی کوشش کیجیے، کیونکہ اسلام کا ماخذ اصلی یعنی قرآن اسی زبان میں ہے اور جب تک آپ اس کی اصلی زبان میں نہ پڑھیں گے اسلام کا نظام فکر کبھی آپ کی سمجھ میں پوری طرح نہ آسکے گا۔ عربی زبان کی تعلیم کا ایسا ہی سہل طریقہ اب کثرت سے رائج ہو گیا ہے کہ باقاعدہ تعلیم سے آپ چھ مہینے میں اتنی عربی سیکھ سکتے ہیں کہ قرآن کی عبارت سمجھنے لگیں

(۲) قرآن مجید، سیرتِ رسولؐ اور صحابہ کرامؓ کی زندگی کا مطالعہ اسلام کو سمجھنے کے لیے ناگزیر ہے۔ میں آپ سے اپنی زندگی کے ۱۲، ۱۵ سال دوسری چیزوں کے پڑھنے میں صرف کیے ہیں، ان سے آدھا بلکہ چوتھائی وقت ہی اس چیز کو سمجھنے میں صرف کر دیجیے جس پر آپ کی ملت کی اساس قائم ہے اور جس کے جانے بغیر آپ اس ملت کے کسی کام نہیں آ سکتے

(۳) جو کچھ کھلی اور بری رائے آپ نے ناکافی اور منتشر معلومات کی بنا پر اسلام کے متعلق قائم کر رکھی ہے اس سے اپنے ذہن کو خالی کر کے اس کا باقاعدہ مطالعہ (SYSTEMATIC STUDY) کیجیے پھر جس رائے پر بھی آپ پہنچیں گے وہ قابلِ وقعت ہوگی۔ تعلیم یافتہ آدمیوں کے لیے کسی طرح موزوں نہیں ہے کہ وہ کسی چیز کے متعلق کافی معلومات حاصل کیے بغیر رائے قائم کریں۔ اب میں اس دعا کے ساتھ اپنا خطبہ ختم کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی مدد کرے اور آپ کو اس خطرے سے بچائے جس میں آپ پھنسا دیے گئے ہیں۔

شعیب احمد (شعبہ تاریخ)

امتحانات میں دھاندلیاں

موجودہ دور میں آئے دن امتحانات میں دھاندلیوں اور بدعنوانیوں کے واقعات سننے میں آ رہے ہیں مگر افسوس کہ اس سلسلے میں کوئی مؤثر اقدام نہ جانے کس مصلحت کی بنا پر نہیں اٹھایا گیا۔ ان بدعنوانیوں نے دیانتدار، فرض شناس اور اعلیٰ شہرت کے حامل اساتذہ سے معاملات میں کام کرنے کا مکمل طور پر راستہ بند کر دیا ہے اور ان کی جگہ نااہل، پیشہ ور اور راشی ہونے کا سلسلہ شروع کر دیا ہے جس سے امتحانات کا تقدس بُری طرح مجروح ہو چکا ہے۔ علاوہ ازیں امتحانات میں ایسے واقعات منظر عام پر آ چکے ہیں جن کا اگر فی الفور سد باب نہ کیا گیا تو ان کی اہمیت و افادیت مکمل طور پر ختم ہو کر رہ جائے گی۔

تعجب ہے کہ امتحان سے قبل کسی پرچے کا آؤٹ ہونا، امتحانی عملے کے ساتھ دو بدو امتحان میں بدسلوکی اور غنڈہ گردی یا امتحانی مرکز سے باہر پرچہ حل کر کے جواب کی کاپی اندر بھیجنا اور کمرۂ امتحان میں تمام امیدواروں کا کھلم کھلا نقل کرنا۔ ایسے واقعات کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔ یہ ذمہ داری جس پر بھی عائد ہو اس کے خلاف آج تک کارروائی کو عمل میں کیوں نہیں لایا گیا۔ اب یہ اخلاقی مکمل عروج پر ہے اور اسے مسلسل ختم کرنے کی کوشش تو کی گئی مگر بے سود۔ اب جس تیزی سے حالات بگڑتے جا رہے ہیں اسی تیزی سے ان کی اصلاح ناممکن ہے۔ معاشرہ اصلاح کی راہ اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں۔ عمل پیرا ہو جائے اور کچھ اہل علم، محب وطن اور اعلیٰ سوچ کے حامل اہل اقتدار محسوس کرنے لگے ہیں کہ اگر حالات کو درست نہ کیا گیا تو اس ملک کا تعلیمی ڈھانچہ بُری طرح مجروح ہو کر رہ جائے گا۔ اس قسم کے تمام بدعنوانیوں کی ذمہ داری متعلقہ ثانوی بورڈوں اور یونیورسٹی کی انتظامیہ پر عائد ہوتی ہے۔ انتظامیہ کی باہمی چپقلش کے نتیجہ میں اس قسم کے واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اگر ان کی وجوہات پر غور کیا جائے تو وہ درج ذیل ہیں۔

(۱) یونیورسٹیوں اور ثانوی تعلیمی بورڈوں کے تمام انتظامی عہدوں پر قابل، تجربہ کار اور اعلیٰ کردار کے حامل افراد کی تقرریوں کو عمل میں لایا جاتا اور یہ تعیناتی صرف ایک مخصوص عرصے کے لئے کی جائے۔ جب یہ عرصہ پورا ہو جائے تو متعلقہ افسر کو فوراً اس اسامی پر سے تبدیل کیا جاتا۔ عرصہ پورا ہونے کے بعد کسی قسم کی ملازمت میں توسیع ہرگز نہ کی جاتی۔

(۲) ملازمین کی گروہ بندی میں برسر اقتدار پارٹی کا ایک گروہ کا ساتھ دینا اور اس کی جائز ناجائز مدد کرنا۔

(۳) غلط کاریوں میں مصروف ملازمین کی باز پرس نہ کرنا اور ان کا محاسبہ نہ کرنا۔

(۴) اساتذہ میں گروہ بندی [illegible] کی بدولت پیشہ تدریس کا وقار مجروح ہونا اور طلبہ کا اساتذہ کے بارے میں کسی غلط فہمی میں مبتلا ہونا جس سے طلبہ کے دلوں میں اساتذہ کا وقار اور قدر و منزلت باقی نہ رہے۔

(۵) والدین کا اپنے بچوں پر صحیح کنٹرول نہ ہونا اور بجائے انہیں سیدھے راستے پر چلانے کے انہیں ناجائز ذرائع سے امتحان میں پاس کرانا۔

(۶) طلبا میں بڑھتے ہوئے سیاسی رجحانات، گروہ بندی اور دھڑے بندیوں کے سبب تعلیمی امور پر کم توجہ دینا اور امتحان کے موقعوں پر ناجائز راستوں کی تلاش کرنا۔

(۷) معاشرہ میں بدعنوانی کے رجحان کا بڑی تیزی سے بڑھنا

(۸) سفارشوں کے ذریعے ممتحنوں کی بھرتی اور سنٹر سپرنٹنڈنٹوں اور دیگر عملے کا تقرر عمل میں لانا۔

یہ وہ بدترین عوامل ہیں جن کی بدولت بورڈوں اور یونیورسٹیوں کے سطح امتحانات میں دھاندلیاں، بددیانتی اور بدعنوانیوں کو فروغ ملا۔ کسی سطح پر بھی ان کا مناسب سد باب نہ کیا گیا جس سے شعبہ امتحانات کی اصلاح نہ کی جا سکی اور امتحانات کا تقدس بُری طرح مجروح ہوا۔ چنانچہ اس شعبہ میں تعینات افسران اور ان کے عملے نے من مانیاں کیں۔ اپنی مرضی اور پسند کے لوگوں کو سنٹر سپرنٹنڈنٹ تعینات کیا، خواہ وہ سراسر نااہل اور ناقابل ہی کیوں نہ ہو۔

مجھے ایک امتحان شروع ہونے سے تقریباً تین چار روز قبل شعبہ امتحانات کے ایک ذمہ دار افسر سے ملاقات کا موقع نصیب ہوا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ صاحب صبح سے لے کر شام ۸ بجے تک تو اپنے دفتر سے غائب اور پھر ۸ بجے شام دفتر کا کام شروع کیا اور رات کے گیارہ بجے تک تقرریوں کے سلسلہ میں ہمہ تن مشغول رہے۔ لوگوں کا تانتا بندھا ہوا ہے اور ہر ایک کو رات ۸ بجے کا وقت دیا ہوا ہے۔ جو کوئی آیا اس نے خاموشی سے کان میں کوئی بات کہی۔ بعد ازاں ان سے ایک چٹ لے کر ان کی برانچ کے ایک ذمہ دار فرد سے ملا، اپنا آرڈر لیا اور غائب ہو گیا۔ مگر اس کے مقابلے میں وہ دیانتدار، تجربہ کار اور فرض شناس افراد جو کہ امتحانات میں کام کرنا ہی اپنے لئے عزت تصور کرتے ہیں۔ انہیں کیا ضرورت ہے کہ وہ رات کے گیارہ بجے تک ذلیل و خوار ہوتے رہیں، حالانکہ یہی صاحب عرصہ دو سال سے اس اہم کلیدی آسامی پر جلوہ افروز ہیں۔ اس سے پہلے سال انہوں نے اپنے فرائض منصبی کو بطریق احسن سرانجام دیا۔ نہ جانے اس سال انہیں کن مشکلات و حالات سے دوچار ہونا پڑا۔

ایک اور واقعہ پیش خدمت ہے۔ راقم کو ایک امتحان میں بطور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کام کرنے کا موقع ملا۔ جس دن امتحان شروع ہو رہا تھا اس سے ایک دن قبل میری تقرری عمل میں لائی گئی۔ بدیں وجہ میں اسی دن سنٹر پہنچ گیا۔ میرے سپرنٹنڈنٹ سنٹر جو کہ ایک ریٹائرڈ ٹیچر تھے۔ شکل و صورت سے بڑے بھاری اور پرہیزگار معلوم ہوتے تھے۔ ان کی رہائش تو سنٹر کے اندر تھی مگر ان کے خورد و نوش کا تمام انتظام ایک امیدوار کے ہاں تھا۔ اس امیدوار کو انہوں نے مکمل طور پر آزادی دے رکھی تھی۔ جب میں نے ایسا کرنے سے قطعی طور پر انکار کر دیا تو انہوں نے راتوں رات شعبہ امتحانات کے سربراہ سے فون پر رابطہ قائم کر لیا اور میرے بارے میں یہ شکایت کی کہ یہ میرے ساتھ قطعاً تعاون نہیں کر رہا ہے لہٰذا اسے فارغ کر دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے میرے سپرنٹنڈنٹ کو فون پر ہی منظوری دے دی۔ چنانچہ اگلے دن مجھے انہوں نے فون کا حوالہ دے کر سنٹر سے فارغ کر دیا۔ جب میں نے شعبہ امتحانات کے سربراہ سے فون پر رابطہ قائم

(مسعود صداقت)

سیمسٹر کی ایک دوپہر

اس نے آتے ہی کتابیں زور سے ڈیسک پر پٹخ دیں
میری سمجھ میں تو خاک نہیں آرہا ٹیسٹ لاؤں گا"
"بیٹھ جاؤ پیارے بیٹھ جاؤ ابھی سارا دماغ درست کیا جاتا ہے"
فیاض نے اسے تسلی دی۔ ہاں ٹونی اب تم ذرا جلدی سے فیس کی وہ غزل سنا دو"
"کون سی؟"
"بھئی وہ کسی جھیل سی موسم گل ہے، تمہارے نام پر آنے کا نام"
ٹونی پہلے سری اور میں ابھی گلا پھاڑنے ہی والا تھا کہ اسے ایک دم شاک سا لگا، پھر وہ مڑ کر بھاگتا ہوا جھاڑیوں کے پیچھے غائب ہو گیا
"عاصمہ" فیاض نے مخاطب کیا "تم تو اس کی حماقتوں کی رازدار ہو نا"
"ساؤ مجھے کیا تک رہی ہو"
"وہ وعدہ سے ٹیکس وصول کرنے گیا ہے"
"کیا؟" ان سب کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا
ٹونی جھاڑیوں کے پیچھے سے نمودار ہو کر دوبارہ ادھر آ رہا تھا اس کے ہاتھوں میں تین روپے تھے

ذلیل آدمی، تو نے یہ حرکتیں کب سے شروع کیں" شکیل دھاڑا
"امیر احمد نکالو"
"اب استاد کی یہ عزت رہ گئی ہے، تو اس سے غنڈہ ٹیکس وصول کرتا ہے"
اچھا اب عاصمہ کم بخت نے تم لوگوں کو مس گائیڈ کیا ہے، ٹھہرو میں تمہیں بتاتا ہوں"
ٹونی عاصمہ کے پیچھے بھاگا سب اپنی کتابوں اور نوٹس پر جھکی ہوئی لڑکیوں نے اس گروپ کو سر اٹھا کر ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھا جو دیر سے ہلڑ بازی میں مصروف تھا۔
یہ سردیوں کے دن تھے سمسٹر کے کپرہینسو ٹیسٹ۔ مدارس کراں سب کے سروں پر بارل ہو گئے تھے لان پہ دھوپ بکھری تھی اور لڑکے لڑکیوں کی ایک بڑی تعداد ٹہل ٹہل کر سوال یاد کر رہی تھی

ٹونی ان دنوں تم مجھے بالکل ہی لفٹ نہیں دیتے" عاصمہ رجسٹر کی تاریخ تھامے ہوئے کہہ رہی تھی،
"دیکھو ٹونی! اب ہم فائنل میں ہیں بس آخری ہی سال ہے نا"
سب ہم چلے جائیں گے پھر تم مجھے نہیں ملو گے پورا گروپ بکھر جائے گا اور ۔ ۔ ۔ اور پھر سامنے ہماری انگیجمنٹ ہونے والی ہے

کیا یہ بالکل ٹھیک بات ہے ٹونی؟
ٹونی غور سے اس لڑکی کو دیکھتا رہا جو اس وقت کتنی سادہ اور معصوم لگ رہی تھی۔
تم جیسی لڑکیاں کتنی احمق اور رومانٹک ہوتی ہیں، بس ذرا سی چپقلش آئی اور دھڑام سے گر پڑیں
تم لڑکے کتنے ذلیل اور کمینے ہوتے ہو میرا بس چلے، تو چوراہے پہ تم لوگوں کو سنگسار کرا دیتے ہوئے لگاؤں کو سوتن بنا دے جائیں"
بس ابھی تو تم بہت اداس ہو جانے والی گفتگو کر رہی تھیں"
ٹونی کے ہونٹوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ آئی عاصمہ کا جی چاہا کہ اس ٹونی کے بچے کا گلا گھونٹ دے
یہ تم لوگ کیا کانسپریسی کر رہے ہو، چلو ادھر آؤ فیاض نے پیچھے کر دونوں کو بلایا۔ سب ہی دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے قریب آ گئے۔
بھئی عاصمہ کہہ رہی تھی کہ چونکہ ہم لوگوں کا فائنل ایئر ہے اس لیے وہ مجھے یعنی صرف ٹونی کو ایک علاوہ روڈ، دارسے لنچ کی دعوت دینے والی ہے۔ میں نے کہا
یہ جھوٹ بک رہا ہے، میں نے "عاصمہ نے بات کاٹی۔ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی ہے"
"عاصمہ اور ٹونی" شکیل جو دیر سے ان دونوں کی نوک جھونک دیکھ رہا تھا آہستہ سے بولا، اور سب اس لیے چونک پڑے، کیونکہ شکیل کی آواز معاملہ کے قول کے مطابق بات کو سڑکوں پر جاگ جاگ کر پہرہ دینے والے چوکیداروں جیسی تھی۔
میں یہ کہہ رہا تھا کہ کیا تم دونوں کی میرج نہیں ہو سکتی۔"
اس عجیب سوال پر وہ سب پریشان سے ہو گئے تھے عاصمہ کا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔ البتہ ٹونی مسکرا رہا تھا ایک طنزیہ مسکراہٹ۔
ٹونی تم مرد ہو، میں تم سے یہ سوال کرتا ہوں"
شکیل بیٹے، کیا اب تک تم نے سمسٹر ٹیسٹ دیے اور میرج کرنے میں کوئی فرق محسوس نہیں کیا
میرج کا تعلق پوری لائف سے ہوتا ہے احمق! پوری لائف سے!"
تو میں کب کہہ رہا ہوں کہ آدھی لائف سے ہوتا ہے، میرا سوال یہ ہے کہ تم عاصمہ سے شادی کیوں نہیں کر لیتے
"کیوں میں پاگل ہوں کیا، جو اس سے شادی کر لوں"
"تم دونوں میری انسلٹ کر رہے ہو" عاصمہ کی آواز شدت جذبات سے بھرا گئی۔
پلیز عاصمہ پلیز ایک منٹ ہولڈ کرو، ہاں تو عاصمہ میں کیا رائے ہے"
اور تم میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں پیارے ٹونی" شکیل کے لہجے میں کاٹ تھی۔

(باقی صفحہ ۲۴۲ پر)

طالبات، اعلیٰ تعلیم۔ وقت کا زیاں؟

عابدہ جلیل — شعبہ ہاشمی

"ایک صحت مند جسم میں صحت مند دماغ پیدا کرنے کا دوسرا نام تعلیم ہے" ارسطو کے اس قول سے ہم یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ کسی قوم کی نوجوان نسل کی تعلیم اس ملک کی ترقی اور خوشحالی میں کس قدر اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی قوم کی ترقی و خوشحالی کا اندازہ لگانا ہو تو اس قوم کے نوجوانوں کی تعلیمی کیفیت اور معیار کو دیکھنا چاہیئے۔ تعلیم کی اس اہمیت کے پیش نظر ہر ملک یہ کوشش کرتا ہے کہ اس کے نوجوان بہتر سے بہتر طریقے سے [تعلیم] حاصل کریں۔ اس مقصد کے لیے وہ ملک ایک تعلیمی ڈھانچہ مرتب کرتا ہے جو اس ملک کی تہذیب و تمدن، تاریخی روایات اور تاریخی حقائق سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ موجودہ دور میں چند بڑی طاقتوں کے دنیا پر اقتدار سے دنیا کے بیشتر ترقی یافتہ ممالک اپنے طالب علموں کو یہ سہولت فراہم کرنے سے قاصر ہیں۔ ان ترقی یافتہ ممالک نے اپنا تعلیمی ڈھانچہ ان بڑی طاقتوں کے تعلیمی نظام کے مطابق بنایا ہے جس کی بدولت ان ممالک میں تعلیم اگر طلبہ و طالبات کے لیے نقصان دہ ثابت نہیں ہوتی تو سودمند بھی نظر نہیں آتی۔ بدقسمتی سے ہمارا ملک بھی ان ممالک میں سے ایک ہے۔ موجودہ دور میں اس نظام تعلیم نے جس طبقہ کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے، وہ خواتین ہیں۔

موجودہ دور میں دنیا تین بڑے گروہوں میں بٹی ہوئی ہے جن کی روایات و اقدار، تہذیب و تمدن، ثقافت و معاشرت سب سے جدا جدا ہے۔ یہ تین گروپ عیسائی اور کافر یا ہندو، مسلمان ہیں، اور تیسرے لادینی عناصر ہیں۔ سب سے پہلے میں عیسائی دنیا میں طالبات کی اعلیٰ تعلیم پر بحث کروں گی۔ عیسائی دنیا کے کم و بیش ہر حصہ میں موجود ہیں لیکن ان کی اکثریت دنیا کے مغربی حصہ پر ہے۔ مغربی دنیا میں طالبات کو طلبہ کے برابر تعلیم حاصل کرنے کے مواقع ہی حاصل نہیں بلکہ ان کی تعلیم بھی ایک جیسی ہے۔ مغرب میں طالبات تعلیم کا حصول شوقیہ ہی نہیں کرتی بلکہ انہیں ملکی معیشت میں ہاتھ بٹانے کا بھی پورا پورا احساس ہوتا ہے اور وہ اعلیٰ تعلیم سے فارغ ہوتے ہی ملازمت اختیار کر لیتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس طبقہ سے بڑی بڑی قابل عورتیں ابھریں۔ مادام کیوری، ہیلن کیلر، فلورنس نائٹنگل اور کئی دوسری قابل ذکر ہیں لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ عموماً ملازمت پیشہ خواتین کی اولادیں ہوسٹل میں پروان چڑھتی ہیں۔ نہ انہیں ماں کی محبت ملتی ہے اور نہ باپ کا پیار۔ پیار و محبت سے محروم یہی نسلیں جب بڑی ہوتی ہیں تو اس مشینی زندگی [کے] خلاف ردعمل کی بدولت حیوانہ زندگی اختیار کر لینا چاہتی ہیں۔ انسانی، اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہو جانا چاہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج مغرب ایک بدترین اخلاقی بحران سے دوچار ہے جو اس کے زوال کی نشاندہی کر رہا ہے۔ اسی موقع کے لیے شاید اقبال نے کہا تھا ؎

کیا یہی ہے مغربی معاشرت کا کمال
مرد بے کار و زن تہی آغوش

اور اس کا واحد سبب مجھ ناچیز کی عقل میں موجودہ تعلیمی نظام کی فارغ التحصیل طالبات نظر آتی ہیں۔

دنیا کا دوسرا گروہ یہ مسلمان ہیں جو ایشیا کے ایک بڑے حصے پر چھائے ہوئے ہیں۔ ان کی روایات و اقدار کی بنیاد اسلام پر مبنی ہے۔ اسلام تعلیم کے حصول پر جس قدر زور دیتا ہے وہ کسی اور مذہب میں نہیں۔ جس طرح اسلام اور دوسرے معاملات میں مرد اور عورت کو مساوی حقوق دیتا ہے، اسی طرح تعلیم کا حصول بھی دونوں کے لیے یکساں طور پر مواقع فراہم کرتا ہے، لیکن ساتھ ساتھ اسلام نے مرد اور عورت کے فرائض کو مکمل طور پر جدا رکھا ہے۔ اگر ایک طرف عورت کو بیٹی، بہن، بیوی اور ماں کی ذمہ داریاں سونپی ہیں تو مرد کو بیٹے، بھائی، باپ اور شوہر ہونے کی ذمہ داریاں اس سختی کے ساتھ سونپی گئی ہیں جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ فرائض کے اس جداگانہ انداز سے جداگانہ تعلیم و تربیت کا تصور ابھرتا ہے۔ یہی اسلامی روایات کی بنیادی کڑی ہے، لیکن اگر ہم اسلامی ممالک کی تعلیمی نظام کا جائزہ لیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ کسی بھی ملک میں طالبات کے لیے جداگانہ نظام تعلیم نہیں ہے جس کی بدولت اکثر ممالک میں طالبات شغل علم سے قطعی طور پر محروم ہیں جیسے سعودی عرب، عراق، افغانستان اور دوسری طرف چند ممالک ہیں جیسے ایران، ترکی، وغیرہ وغیرہ جہاں اسلامی روایات و شعائر [کو] پیچھے ڈال دیا گیا ہے۔ یہ ممالک آہستہ آہستہ اخلاقی بحران کا شکار ہوتے جا رہے ہیں۔ دنیا کا تیسرا گروپ لادینی طاقتیں ہیں جو نہ صرف خدا کی منکر ہیں بلکہ انسانی پابندیوں اور اخلاقی رواج کی یکسر مخالف ہیں۔ ان ممالک میں طالبات سے وہ کام بھی نہیں لیے جاتے۔ اگرچہ کہ یہ ممالک مادی طور پر خوشحال ہیں لیکن ان میں حکومت اور نظام تعلیم کے خلاف ایک عام رجحان پایا جاتا ہے کہ اکثر طلبہ و طالبات روس سے بھاگ بھاگ کر امریکہ میں پناہ لینے میں مجبور ہو جاتے ہیں۔

طالبات کی تعلیم سے متعلق موجودہ دور کا یہ سرسری خاکہ تو اس موضوع پر یہ ضروری ہے کہ ہم خود اپنے ملک میں بھی طالبات کی اعلیٰ تعلیم کا جائزہ لیں۔ ہمارے ملک میں [تعلیم] حاصل کرنے والی بمشکل ۲۵٪ طالبات ملازمت سے منسلک ہوتی ہیں اور بقایا ۷۵٪ طالبات خانگی زندگی بسر کرنے میں مشغول ہو جاتی ہیں۔ درحقیقت ہمارے ملک [میں] صرف چند فیصد طالبات ایسی ہوتی ہیں جو شوقیہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرتی ہیں ورنہ زیادہ تر طالبات اچھا رشتہ نہ ملنے کے سبب اپنی تعلیم کو ایک مدت تک جاری رکھتی ہیں یا رشتہ ڈھونڈنے کے لیے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے آتی ہیں۔

نظامِ امتحانات ۔ لمحۂ فکر

بشیر احمد (شعبۂ عمرانیات)

امتحانات ہمارے نظامِ تعلیم کا سب سے اہم اور بنیادی فیچر ہیں۔ غالباً جب امتحانات کا آغاز ہوا ہوگا تو یہ نظامِ تعلیم کے ایک جزو کی حیثیت رکھتے ہوں گے، لیکن اب صورتِ حال یہ ہو گئی ہے کہ امتحانات اصل میں اور باقی نظامِ تعلیم اس کی فروع۔ تعلیم کا پورا نظام، سال کے مختلف حصوں میں پڑھائی، مختلف ادارے، طالب علم اور اساتذہ کی دلچسپی، اتار چڑھاؤ، کتابوں کی خرید و فروخت، اہم اور غیر اہم کا تعین غرض سب کی بنیادی اور فیصلہ کن قدر امتحانات ہو گئی ہے۔

اس میں بہت دخل ہمارے ملکی نظام کو حاصل ہے جو ڈگری کے بغیر روزگار کو تسلیم نہیں کرتا۔ ہمارے ہاں یہ طریقہ معاش کے لیے ڈگری کی شرط انگریزوں کے ساتھ آئی، اپنی تعلیم کو رواج دینے کے لیے انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ انہی کے نظام کے ڈگری یافتہ نوجوان معاش کی دوڑ دھوپ میں منتخب کیے جائیں گے۔ اس کا یہی نتیجہ ہونا تھا اور ہوا کہ ڈگریوں کی ہوا چل گئی۔ آج کے ترقی یافتہ ممالک میں خود جرمنی میں باعزت ملازمت کے لیے ڈگری اس طرح ناگزیر نہیں ہے جیسے ہمارے ملک میں ہے۔ ہمارے ہاں تو اب صورتِ حال یہ ہے کہ کوئی کتنا ہی قابل کیوں نہ ہو، اگر ڈگری یافتہ نہ ہو تو اسے اہل تسلیم نہیں کیا جاتا اور اگر کوئی ڈگری ہو خواہ کیسا ہی نالائق کیوں نہ ہو، اسے اہل تسلیم کیا جاتا ہے۔ خود ہندوستان میں انگریزوں سے پہلے یہ صورتِ حال نہ تھی اور تحریر و مہارت اصل تھے نہ کہ کچھ خاص کورسوں کی کسی نہ کسی طرح تکمیل۔ ڈگریوں کے لیے اس عام رش اور اس کے حصول کے لیے ہر طرح کے ناجائز ذرائع کا بے باکانہ استعمال اسی لیے ہے۔ اگر کسی طرح ڈگری کو محض تعلیم اور قابلیت کی نشانی رہنے دیا جائے اور روزگار بغیر اس کے بھی فراہم ہو جائے، تو شاید بہت خوش گوار تبدیلی رونما ہو۔ غالباً اسی کے پیشِ نظر ۱۹۵۴ء میں اس وقت کے وزیرِ تعلیم ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے کہا تھا:

"ویسے گریجویٹس کی تعداد میں اضافہ جو ایک یونیورسٹی کی تعلیم سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے، ملک کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا رہا۔ یہ صورتِ حال اداروں کے جھوٹے احساس کی بدولت ہے۔ ایک حد تک حکومت بھی چھوٹی چھوٹی آسامیوں کی بھرتی کے لیے بھی کلرکی ڈگری کی شرط عائد کر کے اس کی ذمہ دار ہے۔ درآنحالیکہ سوائے بہت ہی اونچے عہدوں کے لیے یونیورسٹی ڈگری کی کوئی ضرورت نہ ہونی چاہیے۔"

عملاً جو حالت برقرار ہے وہ بہر حال یہی ہے کہ ترقی کی نشانی بھی گریجویٹس کی تعداد کا زیادہ ہونا ہے۔ تعلیم کی اشاعت اس بنا پر جانچی جاتی ہے کہ کتنے لوگوں کو ڈگری دی گئی۔ ہمارا پورا نظامِ تعلیم ان ڈگریوں ہی کی تلاش میں انہی کے گرد گھوم رہا ہے۔ سال بسال ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اور ہر یونیورسٹی ایک فیکٹری کی طرح ہر سال کچھ گریجویٹس ڈھال کر زندگی کے میدان میں داخل کر دیتی ہے۔

ڈگریوں کی اس غیر معمولی غیر فطری اہمیت نے پورے نظامِ تدریس کو مفلوج کر دیا ہے۔ تدریس کا مفہوم طالب علم میں قابلیت پیدا کرنا، مضمون کو سمجھانا اور اظہارِ خیال کی صلاحیت پیدا کرنا نہیں رہا ہے، بلکہ امتحانات پاس کرا دینے کے قابل بنا دینا ہے۔ جس استاد کی جتنی فیصدی اچھی ہو، وہ کامیاب رہا ہے اور جو اچھی فیصدی نہ دے سکے وہ ناکام ہے۔ فطری طور پر استاد اپنی ساری صلاحیت امتحان کے نقطۂ نظر سے صرف کرتا ہے اور طالب علموں کو سمجھانے کا خواہ مخواہ کا فعل سمجھ کر اس سے باز رہتا ہے۔ طالب علم بھی ابتدائی کلاسوں میں کچھ نصاب کے مطابق تیاری کرتے ہیں، لیکن آہستہ آہستہ انہیں اس حقیقت کا اندازہ ہو جاتا ہے اور وہ بھی پرچوں کی مدد سے سطحی مطالعہ پر اتر آتے ہیں۔ یہ کوئی نظری بات نہیں ہے۔ آج ہماری ہر درس گاہ میں ابتدائی جماعتوں سے لے کر یونیورسٹی کی اعلیٰ ترین جماعتوں تک یہی عالم ہے۔

اس کے نتیجے میں پورا نظامِ تدریس جڑ سے کھوکھلا ہو گیا ہے۔ درس گاہوں سے تعلیم و تعلم کی غرض تقریباً ہی ختم ہو گئی ہے۔ تدریس جیسا مقدس فریضہ اوّل تا آخر خالص کاروباری انداز سے انجام پا رہا ہے۔

نظامِ امتحانات کی اہم خرابیاں

اگر غور کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ نظامِ امتحانات: (۱) سال کے بیشتر حصہ میں سستی و لاپروائی، استاد اور طالب علم دونوں کی طرف سے۔ (۲) کلاس روم میں لیکچر کے بجائے نوٹس دینے اور لکھنے کے رواج کا۔ (۳) خلاصوں، مددگار اور گائیڈ قسم کی کتابوں کے رواج کا اصل ذمہ دار ہے۔

دوسری جانب یہ (۱) طالب علموں کی توجہ اصل نصاب سے ہٹا کر چند مخصوص سوالوں پر مرکوز کر دیتا ہے۔ اکثر کے پاس نصاب نہیں ہوتا بلکہ گیس

چار سال کے پرچے ہر ایک کے پاس مل جاتے ہیں (۲) طالب علموں میں تخلیقی فکر اور تنقیدی ذوق کی آبیاری نہیں کرتا مقصد امتحان پاس کرنا ہوتا ہے۔ وہ اس کے بعد ہی زیادہ اچھی طرح پاس ہو جاتا ہے (۳) سطحی مطالعے کی ہمت افزائی کرتا ہے جو امتحان کے بعد بآسانی ذہن سے فراموش ہو جاتا ہے اور طالب علم کی عمومی قابلیت میں بہت کم اضافے کا باعث ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ سندوستان کے ثانوی تعلیمی کمیشن (۵۳ — ۵۲) نے ان امتحانات کے بارے میں یہ رائے دی،

"امتحانات کے بارے اساتذہ کی آزادیٔ عمل کو ختم کر دیا ہے۔ نصاب کو زنگا بند جامد بنا دیا ہے، بے جان اور میکانکی طریق ہائے تعلیم کی ہمت افزائی کی ہے تخلیقی شوق کی حوصلہ شکنی کی ہے، اور تعلیم میں غلط اور غیر اہم چیزوں کو غیر ضروری اہمیت دے دی ہے۔"

امتحانات کا اصل مقصد مہارتِ علم اور اہلیت کا امتحان پاس کرنا ہوتا ہے موجودہ طریقے میں ایک مقررہ تین گھنٹوں میں کوئی سے دس سوالوں کے ذریعے طالب علم کی سال بھر کی محنت کی جانچ کی جاتی ہے۔ یہ طریقہ بذاتِ خود طالب علم کی قابلیت کے اظہار کا صحیح طریقہ نہیں ہے اور اس میں کم قابلیت رکھنے والے کے زیادہ اظہار اور زیادہ قابلیت رکھنے والے کے کم اظہار کی پوری گنجائش ہے، اس پر مستزاد ان کاپیوں کا جانچا جانا ہے۔ فرض کر لیجئے کہ ممتحن بہت محنت اور ایمانداری سے یہ کہتا ہے تب بھی کسی ۲ کاپیوں کو ایک معیار سے جانچا ناممکن ہے اور بہت سارے ممتحن ہونے کی صورت میں تو اساکر عملاً ہوتا ہے کہ ہر کاپی الگ معیار سے جانچی جائے گی۔ امتحان کے نتیجے کا سارا انحصار ایک دوسرے کے تقابل پر ہی ہوتا ہے اس طرح صحیح۔ اصل قابلیت کا ایک بالکل دوسرا عکس ہو جاتا ہے جو طلبہ امتحان دینے کے رموز کو پا لیتے ہیں، وہ کم قابلیت سے بھی زیادہ نمبر حاصل کر لیتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں امتحان کسی مضمون میں طالب علموں کی تقابلی قابلیت کا نہیں، بلکہ یہ مخصوص سوالوں کا ایک ڈیڑھ گھنٹہ دو دن میں نمبر لکھنے یا نہ لکھنے کا ہوتا ہے۔

اس کا یہ نتیجہ ہے کہ امتحان کا پورا انحصار رٹ لینے پر اور یادداشت پر ہو گیا ہے معاملہ در حصل اس بات میں ہوتا ہے کہ کون زیادہ یاد رکھتا ہے۔ عدد اً طالب علم اس دائرے کو محدود سے محدود تر کرنے کی کوشش کرتا ہے، زیادہ کتابوں کو ہاتھ نہیں لگاتا، اکثر تو نوٹس سے کام چلا لیتے ہیں۔ حافظہ اور یادداشت اصل معیار ہو جانے میں وہ ذہین سمجھدار نوجوان جو رٹنے سے بھاگتے ہیں، اکثر مضمونوں میں اچھے نمبر نہیں لے سکتے۔ اس کے نظام تعلیم اور ملکی زندگی پر دو اہم اثرات ہو رہے ہیں۔

۱۔ تعلیم کا اصل مقصد ذہنوں کو سوچنے اور تنقید کرنے کی تربیت دینا ہوتا ہے دنیا کے کسی بھی فلسفہ تعلیم کی یہ بنیادی غرض وغایت لکھی ملے گی ساری مساعی اسی پہ ہوتی ہیں علم و فکر کے میدان میں اور تحقیقی کاموں میں قیادت اسی قوت پر منحصر ہے، بلکہ انسان کو انسان بنانے والی چیز یہی ہے ہمارے نظام امتحانات نے تعلیم کے اس اصل مقصد ہی کو فوت کر دیا ہے۔

۲۔ ڈگری مہارتِ علم کے ساتھ لازم و ملزوم نہیں رہی ہے مہارتِ علم ایک الگ مسئلہ ہے جس کا ڈگری سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، طالب علم اپنے ذاتی شوق سے حاصل کرے تو کرے، ڈگری اس کے ساتھ مشروط نہیں ہے ڈگری ہولڈرز کا ایک الگ طبقہ سا پیدا ہو گیا ہے جسے قابلیت ہو یا نہ ہو ڈگری کی بنیاد پر ہر میدان میں آگے بڑھنے کے مواقع ملتے ہیں۔ دوسری طرف کوئی کتنی ہی قابلیت کا مظاہرہ کیوں نہ کرے، اس کا مادی فائدہ وہ ڈگریوں میں اضافے کے بغیر حاصل نہیں کر سکتا

رازہائے نخشا

یہ خرابیاں تو اس نظام امتحانات میں بعینہٖ موجود ہیں۔ اگر اس کو ایمانداری سے چلایا جائے، تو بھی ان خامیوں سے مفر نہیں لیکن ہمارے ملک میں حالت کچھ زیادہ ہی دگرگوں ہے۔ زندگی کے اور میدانوں کی طرح اخلاقی قدروں کا لحاظ یہاں سے بھی اٹھ گیا ہے کسی کے دیکھنے اور جاننے کا اور کسی دن اپنے کیے کا جواب دینے کا احساس بھی زندگی سے خارج ہو چکا ہے۔ اصل نصب العین معاشی خوشحالی اور مادی منفعت ہے اور اس کے حصول کے لیے جس کو جیسا موقع ملے، کسی کو کسی چیز سے دریغ نہیں، زندگیوں سے محنت کرنے اور ذمہ داری سے کام کرنے کا رجحان ختم ہوتا جا رہا ہے۔ استاد اور شاگرد، شاگرد کے والدین اور امتحانوں کے منتظمین الا ماشاء اللہ سب ہی بلا تکلف اپنی کسی منفعت کے لیے بڑے سے بڑے اصول کو توڑ دیتے ہیں۔ بلکہ اصول تو اب ٹوٹنے رہتے ہی نہیں ہیں، اب کچھ اور اصول وضع کر لیے گئے ہیں جن کے مطابق اب برائی کو برائی سمجھنا بھی چھوڑ دیا گیا ہے ؎

کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

امتحانات سے کامل اپنے ہر مرحلے پر اس کمیت کا شکار ہے، بدعنوانیوں میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ سرے خیالہ مصوبے میں ہمارے منصوبہ کاروں کو اس کا اعتراف کرنا پڑا ہے کہ

"گذشتہ دس سال میں ناجائز ذرائع کا استعمال مسلسل تیزی سے بڑھ رہا ہے" (صفحہ ۱۷۹)

یہ بدعنوانیاں اور ناجائز ذرائع کس طرح ہر مرحلے پر ظہور پذیر ہوتے ہیں اس کا اندازہ ہر اُس شخص کو ہے جسے کسی بھی حیثیت سے اس نظام سے واسطہ پیش آ رہا ہے۔

بہت پہلے ماضی میں یہ بدعنوانیاں بہت محدود ہوتی تھیں اور ان پر بیکڑ ہی ہوتی تھی، لیکن اب یہ عام ہوتی جا رہی ہیں اور ان پر بیکڑ بھی ختم ہوتی جا رہی ہے کسی ایک تعلیمی بورڈ یا یونیورسٹی میں نہیں ہر جگہ ایک ہی داستان ہے۔

پرچہ کا تقدس ختم ہو گیا ہے خود مرتب کرنے والے یا نظر ثانی (MODERATE) کرنے والے یا اس سے آگے کسی مرحلے پر پرچے آؤٹ ہو جاتے ہیں۔ اچھے اچھے ذمہ دار لوگ یہ کام بلا تکلف سرانجام دیتے ہیں۔ یونیورسٹیوں میں یہ کام زیادہ سلیقے سے ہو رہا ہے اور بورڈ کی باتیں اخباروں میں آ جاتی ہیں گذشتہ سال لاہور بورڈ کے جو واقعات کھل کر سامنے آ گئے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ماضی میں بھی کیا کچھ ہوتا رہا ہوگا۔ اب یہ وبا اتنی عام ہو گئی ہے کہ بعض جعلی طلبا شروع سال ہی سے جانتے ہیں کہ ان کا پرچہ آؤٹ ہو جائے گا کئی سالوں سے یہ عمل جاری ہے اور ہر سال اس کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ بحیثیت مجموعی اس نے محنتی طلبا کے محنت کرنے کے رجحان کو شدید دھچکا پہنچایا ہے اس سے ان کی حوصلہ شکنی ہوئی ہے اور آئندہ وہ محنت کو حماقت سمجھ کر اپنا وقت پرچہ معلوم کرنے میں صرف کرنا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔

کمرۂ امتحان میں بدعنوانیوں کا رواج بھی برابر بڑھ رہا ہے لاہور بورڈ کے صدر نے خود یہ تسلیم کیا ہے کہ ۲۵ فی صد طلبا ناجائز ذرائع استعمال کرتے ہیں ایسی مثالیں بھی ہیں کہ خود نگران حضرات نے مدد فراہم کی ہے نگران حضرات امتحانات کو دیانت داری سے منعقد کرانا اپنا فرض نہیں سمجھتے بلکہ بدعنوانیوں سے صرف نظر کرنے یا معمولی ڈانٹ ڈپٹ کر کے چھوڑ دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔ نگران حضرات کے پاس سفارشیں بھی آتی ہیں کہ اپنے کمرے میں فلاں نمبر کا خیال رکھیے گا اس کا اثر یہ ہے کہ جو ایک دفعہ نقل کرتا ہے وہ پھر مستقل اسی کو ذریعہ بنا لیتا ہے ایک کمرے میں جب ایک طالب علم چھوڑا جاتا ہے، تو دوسروں کی بھی ہمت بندھتی ہے اور اس طرح یہ سلسلہ سال بسال بڑھتا جا رہا ہے اور طلبہ نقل کرنے کو برا اخلاقی نہیں سمجھتے اور استاد چھوڑ دینے کو رحمدلی اور ہمدردی سمجھتے ہیں۔ اس سلسلے میں جو آنکھوں دیکھے واقعات سننے میں آئے ہیں ان پر شاید یقین نہ آئے کمرہ بند کر کے بلیک بورڈ پر سوال حل کر دینا اور کتابیں تک استعمال کرنے کی اجازت دینے کے واقعات کراچی میں ہو چکے ہیں۔

تیسرا مرحلہ کاپیوں کے جانچنے کا ہوتا ہے۔ آج کل یہ بات کھلا راز ہوتی ہے کہ کس کی کاپیاں کس کے پاس گئی ہیں امتحان ختم ہونے کے بعد اب یہ کام شروع ہوتا ہے کہ متعلقہ ممتحن تک کوئی رسائی ڈھونڈی جائے، چنانچہ ممتحن کے پاس رول نمبروں کی فہرست بھی پہنچنا شروع ہو جاتی ہے والدین کو اس مقصد کے لیے اپنے بچے کے ساتھ گھومنے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتی۔ محکمہ تعلیم کے اعلیٰ ترین افسران تک کو اپنے اولاد کے لیے یہ کام کرنے میں تکلف نہیں ہوتا اب حال حال ہی ایسے استاد رہ گئے ہیں جو اس معاملے میں دیانت داری کے اصول پر سختی سے قائم ہیں، ورنہ خود ان کے ہم پیشوں میں یہ وبا اتنی عام ہے کہ الٹا وہ ہی نشانہ گفتگو بنتے ہیں اب یہ شک ہونے لگا ہے کہ بااثر حضرات ہر مضمون کے ممتحن تک پہنچ کر اپنے صاحبزادے کو پاس ہی نہیں کراتے ہیں، بلکہ فرسٹ ڈویژن حتیٰ کہ پوزیشن تک دلوا لیتے ہیں۔

پھر جو کاپیاں بغیر کسی مفاد کے جانچی جاتی ہیں، وہ اتنی غیر ذمہ داری اور لاپرواہی سے جانچی جاتی ہیں کہ امتحان کا مقصد بالکل ہی دم توڑ دیتا ہے۔

ماہرین ۱۵۰ صفحے کی کاپی دیکھنے میں دو ڈھائی منٹ سے زیادہ نہیں لیتے۔ ایک اور رواج اور یہ بھی بہت عام ہے، کاپیاں خود دیکھنے کے بجائے اپنے کسی مخصوص شاگرد سے دکھوا دینے کا ہے۔ اس طرح اس کا امکان بہت کم رہ جاتا ہے کہ طالب علم نے جیسا کچھ لکھا ہے اس کے مناسب سے ہی اس کو نمبر ملیں اور آخری مرحلہ امتحانی اداروں میں نتائج کی ترتیب کا ہے گراں رقوم پر نمبر بڑھوانے اور ڈویژن تبدیل کروانے کے واقعات کبھی کبھی سامنے بھی آ جاتے ہیں لاپرواہی اور بدانتظامی کی بنا پر بھی طلبا کے ساتھ بڑی ہولناک زیادتیاں ہوتی رہی ہیں۔

ان عملی خرابیوں نے، ان کی وجوہات خواہ کچھ ہی ہوں، امتحانات کا اصل مقصد بالکل ہی ختم کر دیا ہے۔ کثیر رقوم کے خرچ سے پورے ملک میں یہ نظام چلایا جا رہا ہے، لیکن اس کی حقیقت ایک ڈھونگ سے زیادہ نہیں رہ گئی ہے۔ امتحانی اداروں کی ساکھ ختم ہو چکی ہے اور عوام کو ان پر یہ اعتماد نہیں رہا ہے کہ وہ دیانتداری سے امتحان لینے کا فرض سرانجام دے رہے ہیں یہ طریق امتحان جو طلبا کی مہارت و قابلیت جانچنے کے لئے خود ہی ایک ناقص طریقہ ہے۔ ان بدعنوانیوں کی بنا پر بالکل ہی ناکارہ ہو گیا ہے۔ تمام ملک پر اس کے تشویشناک اثرات پڑ رہے ہیں کہ جو کچھ تھوڑا بہت پڑھائی اور محنت کا رجحان باقی رہ گیا ہے وہ بھی ختم ہو رہا ہے اور دل گرفتہ ہو ہو کر ہر سال بدعنوانیوں کا ذریعہ اختیار کرنے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔

یہ صورت حال ہمارے ماہرین تعلیم کو غور و فکر کی دعوت دیتی ہے حکومت کی مختلف کمیٹیاں اس مسئلے پر اظہار رائے تو کر رہی ہیں، لیکن کسی نے بھی غور و فکر کا حق ادا نہیں کیا ہے قومی تعلیمی کمیشن نے ۷۵ فی صدی داخلی نمبروں کا جو نظام شروع کرایا ہے، وہ بھی بدعنوانیوں کی آماجگاہ بن چکا ہے ضرورت ہے کہ سارے ملک سے تعلیمی اداروں کے اساتذہ و طلبا اور امتحان سے متعلق دیگر تجربہ کاروں سے معلومات حاصل کی جائیں اور مکمل اعداد و شمار جمع کیے جائیں پرچوں کے نصاب سے باہر ہونے سے لے کر کاپیاں بدل جانے تک کی شکایات پر تحقیقات کی جائے اور پھر اس کا مطالعہ کیا جائے۔ مشتبہ امیدواروں کے بارے میں

معلومات حاصل کر کے خصوصی شعبات کی جائے اور اس طرح اس مسئلے کی صحیح نوعیت حقائق کی بنیاد پر متعین کی جائے۔ ساتھ ہی ساتھ دوسرے ملکوں کے امریکہ و برطانیہ ہی کے نہیں بلکہ ایسے چھوٹے ملکوں کے نظامِ امتحانات کا جن کا نظام امریکہ و برطانیہ کی نقالی پر مبنی نہیں ہے، مطالعہ کیا جائے اور دیکھا جائے کہ انہوں نے طلبا کی قابلیت کو پرکھنے کا کیا طریق کار اختیار کیا ہے؟ شاید اس مطالعے کی روشنی میں کوئی بہتر نظام تجویز کیا جا سکے۔ فوری طور پر جس امر کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہر ممکن سختی استعمال کر کے خواہ اس کی آنچ بڑوں پر آئے، بدعنوانیوں کا سدباب کیا جائے تاکہ طلبا اور عوام کا امتحانی اداروں پر اعتماد بحال ہو سکے۔

یہ تمام تجاویز صورت حال کی اصلاح میں غیر معمولی مدد دے سکتی ہیں، لیکن سب سے بنیادی حقیقت یہ ہے کہ نظام کی اصلاح کے ساتھ ساتھ افراد کے سیرت و کردار کی اصلاح کی طرف اولین توجہ دی جائے۔ اپنے آخری تجزیے میں مسئلہ اخلاقی مسئلہ بھی ہے اور جب تک استاد، طالب علم اور امتحانی عملہ ہر ایک میں اخلاق کی پابندی اور آخرت کا خوف پیدا نہ ہو، ان بدعنوانیوں کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ جو آج تعلیمی نظام کے رستے ہوئے ناسوروں کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ کیا اربابِ تعلیم اب بھی ان ناسوروں سے ہمارے جسم کو پاک کرنے کی فکر نہیں کریں گے؟

**

بقیہ طالبات کی اعلیٰ تعلیم

جہاں تک ملازمت پیشہ خواتین کا مسئلہ ہے، وہ ایک بحث طلب موضوع ہے لیکن یہ دیکھا گیا ہے کہ خانگی زندگی بسر کرنے والی اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین تہذیب، سلیقہ اور شعور میں کسی طرح بھی ان خواتین کا مقابلہ نہیں کر پاتیں جنہوں نے اگرچہ یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم تو حاصل نہیں کی ہوتی ہے لیکن اپنے بزرگوں سے تربیت یافتہ ہوتی ہیں۔ یہ کہنے میں مجھے کوئی عار نہیں کہ موجودہ دور میں اعلیٰ تعلیم ملازمت میں تو معاون ثابت ہو سکتی ہے لیکن گھریلو زندگی گزارنے میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ مثلاً ارضیات، تاریخ، فلسفہ وغیرہ کی اعلیٰ تعلیم یافتہ طالبات لیکچرار تو بن سکتی ہیں لیکن وہ ایک اچھی بیٹی، بہن، بیوی اور ماں کا کردار بہتر طریقہ پر ادا نہیں کر پاتیں جو کہ ان کا اولین فرض ہے، علاوہ ازیں ان کی ایک طویل مدت تک حاصل کی ہوئی یہ تعلیم ضائع ہو جاتی ہے۔

ان حقائق کے پیش نظر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ موجودہ دور میں طالبات کی اعلیٰ تعلیم اگر ایک طرف وقت کا زیاں ہے تو دوسری طرف انسانی صلاحیات و احساسات کے ساتھ ظلم بھی ہے۔ ساتھ ساتھ میں یہ بھی کہنا چاہوں گی کہ مرد اور عورت کے حقوق ہر حال میں مساوی ہیں، دونوں کو تعلیم کے یکساں مواقع فراہم کئے جانے چاہئیں۔ لیکن طالبات کی اعلیٰ تعلیم کا ڈھانچہ ان خطوط پر کرنا پڑے گا جو فطری اصولوں کے عین مطابق ہو۔ جو خواتین کو اس قابل تو کر سکے کہ وہ ایک بہترین بہن، ماں، بیٹی اور بیوی بن کر اپنے گھروں کو جنت بنا سکیں، جو اپنی آنے والی نسلوں کی صحیح تربیت کر سکیں اور انہیں اپنی تہذیب و ثقافت کے مطابق پروان چڑھائیں، جو معاشرہ کی اخلاقی برائیوں کو دور کر سکیں۔ لیکن جن سے ان کے ناتواں کندھوں پر ملکی معیشت کا براہِ راست بوجھ لاد کر ان پر ظلم نہ کیا جائے۔

**

بقیہ : مریم جمیلہ سے انٹرویو

بہت سی پاکستانی ماؤں کو میں نے دیکھا ہے کہ انتہائی پابندی سے نماز ادا کرتی اور تمام مذہبی فرائض پورے کرتی ہیں لیکن اپنے بچوں سے ایسا کرانے میں بُری طرح ناکام رہتی ہیں۔ یہ ایک بدترین خرابی ہے جس میں مخلص مسلمان گرفتار ہیں کہ قرآن کو سرسری اور رسمی طور پر پڑھا جاتا ہے، اس کے معانی و مطالب پر چنداں توجہ نہیں دی جاتی اور قرآن ایسی عملی کتاب جس میں زندگی کے ہر شعبے کے لیے احکام اور ہدایات موجود ہیں، اس کی بے فہم تعلیم سے کوئی اچھا نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ اگر مسلمان کو قرآن معانی اور تشریحات کے ساتھ سمجھایا جائے اور اس کے ترجمے کو عملی جامہ پہنایا جائے تو دنیا ایک ایسے حقیقی انقلاب کی تجربہ گاہ بن جائے کہ گذشتہ سارے انقلاب اس کے سامنے ماند پڑ جائیں۔

**

نومسلمہ

اسلام کی طالبہ

مریم جمیلہ سے
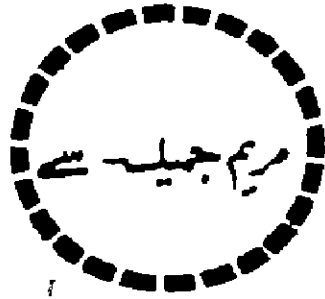
مکالمہ

سوال :- آپ کا بچپن کس طرح کے ماحول میں گذرا۔ آپ نے کس قسم کی تعلیم حاصل کی اور اس نے آپ پر کیا اثر کیا؟

مریم :- میں نے اپنا بچپن، ایام بلوغت اور نوجوانی کا سارا زمانہ لارچ مونٹ کے قصبے میں گذارا جو نیویارک کے شہر کے نواح میں ایک مقام ہے، یہ ایک خالص امریکی ماحول تھا۔ جس یہودی گھرانے میں میں نے آنکھ کھولی اس نے بھی مکمل طور پر امریکی طور طریقے اپنا لیے تھے ہمارا خاندان دوسرے امریکن گھرانوں سے اس لحاظ سے ممتاز تھا کہ ہم لوگ رشتوں کے پختہ بندھنوں میں بندھے ہوئے تھے طلاق اور علیحدگی کا میرے گھرانے میں تصور تک نہ تھا اور میرے والدین آپس میں اور اپنے بچوں کے ساتھ بے پناہ محبت کرتے تھے میرا خاندان اپنے ماحول میں قابل احترام سمجھا جاتا تھا۔ ہمارے اندر لڑائی جھگڑا نام کو بھی نہ ہوتا نہ کبھی گالیاں اور لغو باتیں ہمارے گھر میں سننے میں آئیں میرے اکثر رشتہ دار کامیاب ازدواجی زندگی گذارتے تھے، اور میرے خون کے رشتہ داروں میں کبھی کوئی کسی جرم میں ملوث نہیں ہوا، نہ ہی ہماری نوجوان نسل کسی بداخلاقی کی مرتکب ہوئی یہ سب لوگ نہایت نکھرے اور سلجھے ہوئے مذاق کے مالک ہیں، اور اپنے بچوں میں اعلیٰ علمی مذاق کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

تعلیم میں نے پبلک اسکولوں میں پائی۔ جہاں مکمل طور پر لادینیت کی تعلیم دی جاتی تھی اٹھارہ برس کی عمر میں جب میں ہائی اسکول (بارہ جماعت تک) کی تعلیم مکمل کر چکی تھی، تو میں نے نیویارک یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ مگر اسی دوران میں سخت بیمار ہو گئی، لہٰذا تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ میں کالج کی کوئی ڈگری حاصل نہ کر پائی۔ میں نے جن اسکولوں میں تعلیم حاصل کی وہ اپنے تعلیمی معیار کے لحاظ سے بہترین تصور کیے جاتے تھے۔ ان کا طریقۂ تعلیم مؤثر اور نظم وضبط نہایت معقول تھا۔ لیکن یہاں پر کسی قسم کی مذہبی تعلیم نہ دی جاتی تھی۔ بالفاظِ دیگر میں نے ان اسکولوں میں زبان، ادب، تاریخ، سائنس، ریاضی اور آرٹ ہر چیز سیکھی، مگر کچھ نہ سیکھا تو خدا کے متعلق، لیکن والدین کی حوصلہ افزائی بیحد حساس قوت تخیلہ اور جبلت تجسس اور بلند ترین روحانی چیزوں کے بارے میں پیاس، یہ وہ عوامل تھے جن کی وجہ سے میں نے اسکولوں کے زمانے میں بھی نصاب ہی پر اکتفا نہ کیا، بلکہ نصاب کے علاوہ دوسرے علوم کی طرف بھی توجہ دی خدا کے فضل وکرم سے اسلام کے متعلق جو تعلیم میں نے حاصل کی یہ قطعاً میری اپنی جدوجہد اور دلچسپی کا نتیجہ تھا۔

سوال :- آپ کے بعد کی زندگی میں آپ کا ماحول آپ پر کس طرح اثر انداز ہوا، اور اس کے نتائج کیا برآمد ہوئے؟

مریم :- اس میں کوئی شک نہیں کہ میں جس ماحول میں رہتی تھی کہنے کو تو اس میں پوری طرح شامل تھی لیکن دراصل میں کبھی اس کا حصہ نہ بن سکی دوسری تہذیبوں کی دوسری قوموں کے لیے اور ممالک کے طور طریقوں اور نظام ہائے حیات کے متعلق ایک طویل مطالعے سے میرے اندر اپنے ماحول کے خلاف ایک تنقیدی جذبہ سر اٹھانے لگا مجھے فریب بدکاری غرور اور دولت کی جھوٹی نمائش سے ہمیشہ نفرت رہی اور سنجیدگی اور قناعت ہی میرا وطیرہ رہا ہے، اسی لیے میں نے کبھی شراب کا ایک قطرہ نہیں چکھا، نہ دوسری نشہ آور چیزوں میں دلچسپی لی۔ اسی طرح اپنی جوانی کے سلسلے میں بھی مخالف جنس سے ہر نوع کے تعلقات سے گریزاں رہی میری تنہائی میں بھی میرے لیے ذاتی دلچسپی کا سامان موجود تھا، اور میں اپنی تنہائی پر قانع اور مطمئن تھی۔ جدید نسل تفریح اور انبساط کے جن مصنوعی ذرائع مثلاً فلم ریڈیو، ٹیلی ویژن تھیٹر اور ناچ گانوں پر انحصار کرتی ہے میں ان سے بے نیاز تھی۔

سوال :- کیا آپ اپنی زندگی کا ناقابل فراموش تجربہ بتائیں گی؟

مریم :- میری زندگی کا بے حد تلخ اور تکلیف دہ تجربہ ۱۹۵۳ء کی سرگرمیوں میں مجھ پر ایک شدید بیماری کا اچانک حملہ تھا اس وقت میری عمر انیس

سال تھی، اور تقریباً یہی زمانہ تھا جب پہلے میرا قرآن سے تعارف ہوا جس نے روحانی دُنیا کی صداقتوں کے بارے میں میری آنکھیں کھول دیں۔ میری بیماری ڈاکٹروں نے لاعلاج قرار دے دی تھی مگر اس بیماری اور قرآن دونوں نے مل کر مجھے ایک ناقابل فراموش سبق سکھایا، اور وہ یہ تھا کہ کسی چیز کو یہاں بقا نہیں، اور کامیابی اور ترقی کا جو طلسماتی جال ہم نے اپنے گرد بن رکھا ہے ایک خوشنما دھوکا ہے جو بالآخر موت کے دروازے پر ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے۔ غمزدہ انسانوں کی اکلوتی اُمید خدا تعالےٰ کی عبادت ہے جس میں سکون و انبساط کا حقیقی راز پنہاں ہے۔ یہی وہ ذریعہ ہے جس کے ذریعہ باری تعالےٰ ہمیں اپنے رحم و کرم سے نوازتا ہے۔ ہماری خطاؤں سے درگذر کرتا ہے اور ہمیں بہشت بریں کی بشارت دیتا ہے اس جنت کی بشارت جہاں ہم اپنے عزیزوں دوستوں اور ہر عمر کے نیک اور برگزیدہ لوگوں کے ساتھ رہیں گے۔ یہ کس قدر حیرت انگیز اور ولولہ انگیز مصاحبت ہوگی جس کے بارے میں قرآن شریف ہمیں بتاتا ہے:

"یقیناً اللہ تعالےٰ کا قرب ہمارے دلوں کو شادمانی عطا کرے گا"

سوال:۔ اسلام قبول کرنے کے بعد پردے کی پابندی سے جو مسائل پیدا ہوئے وہ آپ نے کس طرح حل کئے؟

مریم:۔ میں نے ۱۹۶۱ء میں امریکہ میں اسلام قبول کیا اور اس کے فوراً بعد ہی نہایت پاکیزہ اور سادہ لباس پہننا شروع کر دیا مگر میرا لباس ماحول کے اس قدر مخالف بھی نہ تھا کہ لوگوں کیلئے عجوبہ ہوتا۔ اسی طرح میں نے ہر قسم کے زیورات کا استعمال ترک کر دیا۔ لپ اسٹک اور دوسرے غازے وغیرہ جو مجھے پہلے اپنے والدین کی دلجوئی کے لیے استعمال کرنے پڑتے تھے، اگرچہ میں نے کبھی انہیں جنس مخالف کے التفات کے حصول کا ذریعہ نہیں بنایا، اب میں نے بالکل ہی چھوڑ دیئے، پھر بھی برقعہ پہننا اس ماحول میں ناممکنات میں سے تھا اور مجھے زندگی کی گاڑی کھینچنے کے لیے مزاج کے خلاف اس کے بغیر ہی کام چلانا پڑا۔ ساتھ ہی ساتھ جب کبھی مجھے کسی مردانہ یا مخلوط مجلس میں شرکت کا اتفاق ہوتا تو میں اسلام کے موضوع پر بحث کرنا اور تبلیغ کے فرائض انجام دینے کی پوری کوشش کرتی۔ آٹھ برس پہلے پاکستان آنے کے فوراً بعد میں نے برقعہ کا استعمال شروع کر دیا۔ اب جب بھی مجھے گھر سے باہر جانے کا اتفاق ہوتا ہے تو برقعہ اوڑھتی ہوں۔ ہمارے یہاں نوکر نہیں ہے اس لیے سودا سلف اور دوسری ضروریات زندگی کے لیے مجھے اپنے مقامی بازار تک بھی جانا پڑتا ہے اسی طرح میں پڑوس میں اپنی سہیلیوں سے ملنے بھی چلی جاتی ہوں۔ گھر سے باہر بغیر برقعے کے میں خود کو عریاں خیال کرتی ہوں۔

میں پردے میں پختہ یقین رکھتی ہوں، کیونکہ اسلام کی دوسرے مذاہب پر برتری اسی وجہ سے ہے کہ قرآن و سنت صرف بے حیائی اور بدکاری پر پابندی لگانے ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ بے حیائی اور بدکاری کے اسباب کو بھی ختم کرتے ہیں۔ اسلامی معاشرے کی حفاظت کے لیے یہ امر بے حد ضروری ہے کہ مرد و زن کے آزادانہ اختلاط پر پابندی عائد کر دی جائے، ہند و پاک کے راسخ العقیدہ خاندانوں میں پردہ صدیوں سے احکام شریعت میں ایک شدید ترین اہمیت کا حامل خیال کیا جاتا رہا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو گھر سے باہر جانے کی اجازت صرف اس شرط پر دی ہے کہ وہ مناسب لباس پہن کر جائیں اور شریفانہ طریقے سے چلیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ عورتیں مسجد بھی جا سکتی ہیں اگرچہ ان کے لیے گھر میں نماز پڑھ لینا بھی درست ہے۔ اس طرح جب عورتیں گھر کے دھندوں سے فارغ ہو جائیں تو انہیں اپنی سہیلیوں اور رشتہ داروں سے ملنے کی بھی اجازت ہے اسی طرح وہ شادی کی تقاریب میں بھی شریک ہو سکتی ہیں۔

سوال۔ آج کل آپ کی بسر کیسے ہو رہی ہے، کیا آپ زندگی کے اس ڈھب سے مطمئن ہیں؟

مریم:۔ میں نے اپنے اوقات کو پڑھنے لکھنے، اپنے تین بچوں اور گھر کی دیکھ بھال میں برابر بانٹ رکھا ہے میں وقت کی قیمت جانتی ہوں اور اسے گنوار پنے سے ریڈیو یا ٹیلی ویژن پر ضائع نہیں کرتی۔ پاکستان میں آتے ہوئے مجھے آٹھ سال بیت گئے۔ اس پوری مدت میں کبھی سینما ہاؤس نہیں گئی، اور نہ کبھی اس خرافات سے جسے تفریح کا نام دیا جاتا ہے لطف اٹھانے کے لیے میرے دل میں ہلکی سی خواہش ہی پیدا ہوئی۔ تین پیارے پیارے شریر اور تندرست بچے کسی بھی ماں کو ہر روز چوبیس گھنٹے کی تفریح مہیا کر سکتے ہیں پھر بھی جب

مزید دل بہلانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو اپنے نو سالہ پالتو طوطے سے دل بہلا لیا کرتی ہوں جو آٹھ سال سے میرے پاس موجود ہے خدائے رحیم و کریم کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے میرے سارے فکر اور دلدر دور کر دیئے، اور میں اپنے شوہر بچوں اور اپنی مطالعاتی زندگی سے بے حد مطمئن ہوں۔ جس بیوی کا شوہر خوش اور مطمئن ہو اس کے لیے اس دنیا میں اس سے زیادہ کوئی چیز باعث اطمینان نہیں ہو سکتی اور حقیقی اور ابدی مسرت تو اس وقت نصیب ہوتی ہے جب مرتے مرتے خدا تعالیٰ انسان کے اعمال کو اپنی قبولیت اور رضامندی سے سرفراز کرتے ہیں۔ بس یہی کچھ ہے جس کی میں تمنائی ہوں۔

سوال ۔ آپ اپنے بچوں کو کون سی تعلیم دلا رہی ہیں اور اس تعلیم کے آپ کے بچوں پر کیا اثرات پڑ رہے ہیں؟

مریم ۔ اپنے بچوں کی تعلیم اور ان کے مستقبل کی فکر ہمیشہ مجھے متفکر اور مضطرب رکھتی ہے میرے دو بچے اسکول جاتے ہیں مگر میں اردو اور انگلش دونوں قسم کے اسکولوں سے مطمئن نہیں ہوں جہاں انتہائی گھٹیا اور لادینیت پر مبنی انگریزی علوم کی تدریس ہوتی ہے اور یہ تعلیم ہر مثبت رجحان کی دشمن ہے، اسی لیے میں چاہتی ہوں کہ اپنے بچوں کو گھر پر پڑھاؤں جس طرح خود میں نے پڑھا ہے۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں بمشکل چند اسکول ایسے ملیں گے جہاں طلبہ کو کما حقہ، اسلام کی تعلیم عصری تقاضوں کے مطابق دی جاتی ہو۔ میرے شوہر تو دن رات جماعت اسلامی کے کاموں میں مصروف رہتے ہیں اور بچوں کی تربیت کے لیے ان کے پاس وقت ہی نہیں بچتا، لہٰذا تمام ذمہ داری تنہا مجھ پر پڑتی ہے خدا مجھے اس عہدہ برآ ہونے کے لیے قوت و صلاحیت عطا فرمائے اس ناسازگار فضا اور ناموافق حالات میں بچوں کے مستقبل کے بارے میں مجھے دھڑکا لگا رہتا ہے اور خدا سے ہر وقت دعا مانگتی رہتی ہوں کہ وہ انہیں راست عقیدے کے ساتھ اپنے مذہب پر قائم رکھے

سوال آپ اپنی مسلمان بہنوں کے نام کیا پیغام دینا چاہتی ہیں؟

مریم اس وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ تمام ذہین، قابل، مستعد اور مخلص مسلمان بہنیں چاہے وہ کسی گروہ یا قبیلے سے تعلق رکھتی ہوں ایک موثر اور فعال تحریک منظم کریں جس میں اپنے بچوں کو بھی شامل کر لیں، اگرچہ ماؤں کی اپنے بچوں کو اسلامی تربیت دینے کے لیے انفرادی کوششیں بھی قابل قدر ہیں، خصوصاً ان حالات میں جب گھروں سے باہر خوفناک برائیوں کا راج ہے مگر جو مسلم خواتین بالوقع اسلامی قانون کا احترام اور اجراء چاہتی ہیں، میں سمجھتی ہوں کہ وہ باہم متحد ہو کر کوشش کریں اور اپنے بچوں کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنائیں ہم اپنے بچوں سے کیسے یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ بڑے ہو کر اسلام سے محبت کریں گے جبکہ ان کو اسکولوں میں دی جانے والی تعلیم اور وہ تعلیم جو گلیوں اور بازاروں میں حاصل کرتے ہیں انہیں اسلام سے بغاوت پر آمادہ کرتی ہے اگر ہم یہ عذر لنگ پیش کریں کہ ہم گھر کے دھندوں، اپنے خاندان اور ذاتی مسائل میں اتنے الجھے ہوئے ہیں کہ اس مسئلے پر توجہ نہیں دے سکتے تو ہمیں اپنے بچوں سے فیس زدگی، سینما بینی، رقص و سرود اور کھیل کود کے کاموں کے سوا کسی چیز میں دلچسپی لینے کے متعلق کوئی خوش فہمی نہیں رکھنا چاہیئے۔ وہ یہ کام اس لیے نہیں کریں گے کہ ان کی فطرت خراب ہے، بلکہ اس لیے ان کا ماحول انہیں یہی کچھ سکھاتا ہے، اور اس کا کوئی بہتر متبادل ہمارے پاس نہیں اس مشکل کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ خواتین جو مخلصانہ طور پر اسلامی تہذیب کے احیاء کی متمنی ہیں، انہیں چاہیئے کہ وہ خود متحد اور منظم ہوں اور اپنی متحدانہ کوشش سے ایسے اسلامی پرائمری اسکول قائم کریں جن میں ہم اپنے بچوں کو قرآن کے احکام، حضور کے ارشادات اور اسلاف کی زندگیوں سے آشنا کر سکیں، اور عربی زبان کی ابتدائی تعلیم دلا سکیں نہیں نماز اور وضو کا طریقہ سکھایا جائے، انتہائی محبت اور دلنشیں انداز سے اس کے معانی اور مطالب بھی سکھائے جائیں کلاسیں گھروں پر بھی لگ سکتی ہیں۔ اسلامی کتابیں اس ملک میں سستی ہیں، اس لیے یہ کام کچھ زیادہ روپے پیسے کا مطالبہ نہیں کرتا، البتہ اچھی تنظیم، وقت، قوت کار، تدابیر اور حکمت ضروری ہے۔

(باقی صفحہ ۲۹۴ پر)

پروفیسر فروغ احمد (شعبۂ اردو)

"ٹریڈیشن"

* * *

جس کالج کو سب سے پہلے میں نے دیکھا وہ تھا کلکتے کا سٹی کالج۔ دیر ہو جانے کے سبب اسلامیہ کالج کلکتہ میں داخلہ نہ مل سکا تھا۔ سٹی کالج میں ہندو اساتذہ اور طلبہ کی اکثریت اور اس وجہ سے ہندو ثقافت کے غلبے نے طبیعت کو بہت جلد ہی اچاٹ کر دیا۔ ۱۹۴۲ء میں جاپانی بمباری کا خطرہ درپیش ہونے کے سبب کلکتے کی تمام درسگاہیں غیر معینہ عرصے کے لیے بند ہو گئیں تو سلسلۂ تعلیم سال بھر سے زیادہ عرصے تک منقطع رہا۔ ۱۹۴۴ء میں ایک دوست کے مشورے پر علیگڑھ جانے کا مصمم ارادہ کر لیا اور والد صاحب مرحوم نے اس کی منظوری دے دی۔

علیگڑھ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر جب ٹرین رکی، تو وہاں علیگڑھ کٹ شیروانیاں اور ترکی ٹوپی میں ملبوس متعدد جوان بازوؤں پر سرخ بلّے لگائے ہوئے باوقار انداز میں کھڑے تھے۔ ان بلّوں پر لکھا تھا PROCTOR ——— میں سمجھا یہ نوجوان شاید پولیس والوں کے استعمال کے لیے مقرر ہوتے ہیں۔ مع ساز و سامان دست بدست گیٹ سے ہوتا ہوا ایک تانگے تک پہنچا۔ یونیورسٹی چلو میں نے تانگے والے سے کہا۔ اس نے مڑ کر پوچھا "کن مارک؟" مجھے کیا معلوم تھا کہ "کن مارک" اور "کی مارک" کیا ہے۔ اس لیے میں نے کہا ہاں اس چلے چلو یونیورسٹی۔ علیگڑھ کا تانگے والا سمجھ گیا کہ میں نووارد ہوں۔ بہرحال اس نے بقول خود "کن مارک" ہی پہنچا کر دم لیا۔ معلوم ہوا کہ یہ سر سید ہال کا مشرقی دروازہ ہے یعنی "ایس ایس ایسٹ"۔ باب اسحاق سے داخل ہو کر اندر پہنچا تو پرووسٹ آفس کے ہیڈ کلرک نے فوری طور پر ایک کمرے میں جگہ دلوائی۔ داخلے کا مرحلہ بعد میں طے ہوا اور اب میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا طالب علم تھا۔

کمرے میں پہنچتے ہی سب سے پہلے باتھ روم کی فکر ہوئی۔ وہاں ہر کمرے میں الگ اٹیچڈ باتھ روم تھا لیکن وہ لغوی معنوں میں صرف باتھ روم ہی ہوتا ہے یعنی غسل خانہ۔ پانی پینے کے لیے نلکے کی ٹونٹی کھولی تو پانی ندارد۔ گھڑا ابھی نظر آیا خالی ہی پڑا تھا۔ لوٹا اٹھایا اور روم بیرر سے پانی کے لیے دریافت کیا تو انہوں نے ایک راستہ دکھاتے ہوئے اوپر کی طرف اشارہ کر دیا۔ اندر وارڈن صاحب کا کمرہ تھا (وہ ہسٹری کے پروفیسر تھے)۔ اندر پہنچ کر انہیں سلام کیا اور پانی کے لیے کہا، تو وہ مسکرا دیے اور اپنے باتھ روم میں ایک گھڑے سے پانی لینے کی اجازت دے دی۔

مجھے اور تو روم بیرر برآمدے میں کھڑے ہنس رہے تھے۔ اب میں سمجھ گیا کہ وارڈن صاحب کیوں مسکرائے تھے گویا یہ پہلی "ایکٹیویٹی" (ACTIVITY) تھی جو علیگڑھ میں میرے ساتھ کی گئی۔ پانی کسی اور کمرے سے بھی دلوایا جا سکتا تھا۔ 'ایکٹیویٹی' علیگڑھ کی خاص ——— چیز ہے اور وہاں کی یہ ایک مخصوص اصطلاح ہے یعنی وہ حرکت جو نوواردوں اور جونیئروں کے ساتھ کی جاتی ہے اور علیگڑھ ٹریڈیشن کے مطابق یہ بالکل روا ہے۔ بہرحال جب میں نے بیت الخلاء کے بارے میں دریافت کیا تو ایک صاحب نے یوکلپٹس کے درختوں سے گھرے ہوئے ٹرنیسالاں ماضی میں چند گز جا کر چھوٹی چھوٹی عمارتوں کی طرف اشارہ کیا۔ جی؟ وہاں؟ وہ تو ——— میری بوکھلاہٹ کو وہ بھانپ گئے اور بولے جی ہاں وہ سارے کے سارے بیت الخلاء ہیں۔ مگر جا کر ان میں سے ایک بھی مجھے اور میں بڑی اکر ... سے اُدھر نکلا تو پیچھے متعدد فیصلے مختلف شہروں میں طے ہوئے۔ لیکن میں کچھ اساتذہ جو اس چھوڑ رہا تھا کہ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا ... دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ "بانگ درا" میں جو اقبال کی ایک نظم "طلبائے علیگڑھ کالج کے نام" ہے تو اس میں ایک جگہ جب کلیسا کا فقرہ آتا ہے مگر اقبال کی ایک مراد یقیناً علیگڑھ کے ان کلیسا ما بیت الخلاؤں سے تو نہیں تھی۔

شہر سے باہر ریلوے لائن کے جانب شمال، تقریباً بیس مربع میل میں پھیلی ہوئی یونیورسٹی ایک چھوٹی سی مہذب اور ماڈرن دینی مسلم ریاست کا منظر پیش کرتی ہے۔ وہاں بار بار "علیگڑھ ٹریڈیشن" کا فقرہ کانوں سے ٹکرایا ——— خوب و زشت کا معیار بھی تھا۔ ہر وہ شے معقول جو اس کے مطابق ہو اور ہر وہ شے نامعقول جو اس کے منافی ہو ——— ویسے "علی گڑھ ٹریڈیشن" میں رخنے پڑنے شروع ہو گئے تھے تاہم قوم کی اکثریت ان رخنوں کے اثر سے بڑی حد تک محفوظ تھی۔ کیا اساتذہ اور کیا طلبا، عموماً ایک ہی یونیفارم میں — یعنی علیگڑھ کٹ شیروانی (گرمیوں میں سفید یا بادامی اور جاڑوں میں سیاہ) اور سر پر ترکی ٹوپی جس کی جگہ اب جناح کیپ لے رہی تھی۔ اس یونیفارم کے سبب طلبا یا طلبہ یا اساتذہ

جنرل ڈائلک کے خلاف طلبائے علیگڑھ نے عظیم الشان جلوس نکالا۔ آگے آگے ڈائلک کا مصنوعی جنازہ تھا اور اہل جلوس "ڈائلک ہائے ہائے" کا نعرہ لگا رہے تھے۔ ضلع کچہری کے سامنے اس جنازے کو آگ لگا دی گئی۔ شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد جب مولانا ابوالکلام آزاد کلکتہ جاتے ہوئے علیگڑھ اسٹیشن سے گزر رہے تھے تو یونیورسٹی کے تمام طلبہ نے اسٹیشن پر ان کے خلاف مظاہرہ کیا۔ ایسا ہی مظاہرہ وہ جنگ کے آخری دنوں میں شیر بنگال مولوی فضل الحق کے خلاف کر چکے تھے، جو مسلم لیگ سے ناطہ توڑ کر وائسرائے کی ڈیفنس کونسل کے رکن بن گئے تھے۔ یہ تمام مظاہرے حدود میں رہتے۔ دور دور تک پولیس کی صورت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ صرف ایسے پراکٹر تھے اور محترم اساتذہ تھے جن کے ہوتے ہوئے کسی پولیس کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔ پھر وائس چانسلر کے خلاف (ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم) کے خلاف ایک زبردست مظاہرہ ہوا۔ مظاہرین وائس چانسلر کی معزولی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اس موقع پر بھی صرف پراکٹر اور اساتذہ نے مظاہرین کو حدود سے تجاوز نہ کرنے دیا۔ سچ یہ ہے کہ علیگڑھ میں پراکٹوریل سسٹم جہاں روزمرہ ڈسپلن کا ذمہ دار رہا ہے وہاں غیر معمولی حالات میں بھی اجتماعی نظم و ضبط کا ضامن رہا ہے۔ اس کی کامیابی کا راز صرف علیگڑھ ٹریڈیشن ہے اور اس ٹریڈیشن کا احترام۔ تاہم اس سے قطع نظر نہیں کیا جا سکتا کہ پراکٹوریل سسٹم کا ڈھانچہ طلبہ کی رائے عامہ سے استوار نہیں ہوتا، بلکہ صرف وہاں کی ہیئت حاکمہ کی خوشنودی ہی اس کی واحد اساس ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے نظام میں ارتقاء اور برتری کا حصول کن راہوں سے ہوا کرتا ہے۔

لہٰذا عام طلبہ کے کردار میں اگر کچھ خرابیاں راہ پاتی ہیں تو وہ خرابیاں بدرجہا سنگین شکل میں دوسرے اقامتی دارالعلوموں میں راہ پا سکتی تھیں، کیونکہ ان دارالعلوموں میں علیگڑھ ٹریڈیشن جیسی خود احتسابی، روک اور توازن کی حامل خوبصورت روایات موجود نہیں ہیں۔ ہاں اگر تحریک علیگڑھ ہی جیسی کسی تعلیمی اور سماجی تحریک کے طویل تعمیری عمل کے نتیجے میں کوئی ادارہ وجود میں آتے تو پراکٹوریل سسٹم وہاں کارآمد ہو سکتا ہے بلکہ بہتر حالات میں اسے ان خرابیوں سے بھی پاک رکھا جا سکتا ہے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔

مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے نصاب تعلیم میں کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے، جسے ہم اس کا طرۂ امتیاز قرار دے سکیں، سوائے اس کے کہ دینیات (THEOLOGY) کا لازمی کورس ہے، جو بی اے، بی ایس سی تک لازمی ہے۔ مسلمان طلبہ کے لیے سنی تھیالوجی یا شیعہ تھیالوجی اور غیر مسلم طلبہ کے لیے مسلم ہسٹری کا لازمی متبادل نصاب۔ تعلیم وہاں غیر مخلوط ہی، ان معنوں میں کہ طالبات کا کالج الگ ہے۔ اگر وہ طلبہ کے کلاس روم میں آتیں، تو بند رکشوں میں ہوتیں اور گیلری کی پچھلی نشستوں پر طلبہ کے پیچھے بیٹھتیں۔ آتے جاتے، راہ چلتے اور برآمدوں سے گزرتے ہوئے خوش طبعی کے اکا دکا واقعات ہو جاتے، لیکن شائستگی کے حدود پامال نہ ہوتے۔

علی الصباح ناشتے سے پہلے، لازمی ملٹری ٹریننگ میں ملایا تو حاضری میرے لیے ایک غیر متوقع تجربہ تھا۔ علیگڑھ کی جاڑے والی سخت ترین سردیوں میں بھی نرم بستر چھوڑ کر پریڈ گراؤنڈ میں پہنچنا اور "لیفٹ رائٹ کرنا" لہو گرم رکھنے کا تھا اک بہانہ"

جمہوری اور پارلیمانی اداروں کی تربیت یونین کے انتخابات اور یونین ہال کے اجلاسوں میں ہوتی تھی۔ تقریروں کے دوران ہوٹنگ اور تالیوں کا وہاں ایک مخصوص طرز ہے، جو کہیں اور نہیں۔ وہاں تالیوں میں وقفہ دے کر بجایا جاتا تھا، جو ملٹری پریڈ میں "لیفٹ رائٹ" کرتے ہوئے قدم سے قدم ملانے میں کر پاتا۔ وہاں کی زندگی کے ہر شعبے میں یک جہتی و ہم آہنگی کا پورا حق ادا کیا جاتا ہے۔

ہر قسم کے کھیلوں اور تفریحات کی آزادی کے علاوہ فٹ بال، ہاکی، کرکٹ [illegible]
کے مقابلے اسی کثرت سے ہوتے کہ علیگڑھ کے کھلاڑیوں نے گھڑ سواری، تیراکی، نشانہ بازی وغیرہ سے لے کر بین الکلیاتی اور بین الجامعاتی سطح تک اپنی برتری کا خوب خوب مظاہرہ کیا۔ جہاں تک سیکھنے سکھانے کا تعلق ہے، وہاں کتابوں کے کیڑے کی بھی کمی نہیں۔ کلاس روم لیکچر سے زیادہ مہمان اسکالرز اور خود اساتذہ کے توسیعی لیکچر ہم بڑے شوق سے سنتے۔ مہمان اسکالرز ابوالحسن ندوی، مفتی محمد شفیع، خواجہ کمال حسن، عزام پاشا، ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر ٹوائن بی اور راجہ گوپال اچاریہ کے لیکچر ہم نے یکساں ذوق شوق سے سنے۔ یونیورسٹی کے اساتذہ میں ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم، ڈاکٹر ہادی حسن مرحوم، ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم، پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم، پروفیسر ابراہیم قریشی، ڈاکٹر آر اے چودھری اور پروفیسر الف جے فیلڈن کے لیکچر ایسے نقوش ذہنوں پر چھوڑتے ہیں، مٹ نہیں سکتے۔ "الف جے فیلڈن یعنی" [illegible] کا نام اردو میں ترجمہ کیا جائے تو حافظ محمد ہے اور کافی مشہور بھی یعنی "فتح جنگ میدانی"۔ پرو وائس چانسلر پروفیسر اے بی اے حلیم (A B A HALIM) جو "آبا حلیم" کہا جاتا تھا، "آبا محض" کی بنا پر نہیں، بلکہ اس بنا پر بھی کہ ڈسپلن کے معاملے میں وہ آبا ہی کی طرح سخت تھے۔ طلبہ نے اپنے جن اساتذہ کا جو نام رکھ دیا اسی نام سے وہ مشہور ہوا۔ مثلاً ایک نام ہے "قاری محمود"۔ قاری ان کے نام کا کوئی خاندانی جزو نہیں تھا۔ نہ وہ قرآن شریف کے قاری تھے۔ وہ ہمیں شیکسپیئر کا ڈراما پڑھاتے تھے اور ڈرامے کو ادا کرنے کا طرز ان کا ایسا شاندار تھا کہ لڑکوں نے ان کا نام ہی رکھ دیا "قاری محمود"۔ اساتذہ کا تذکرہ ایسا ہے کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ اساتذہ پرستی کا الزام بھی میں اپنے سر لینا نہیں چاہتا۔ اس لیے اس قصے کو یہیں ترک کرتا ہوں۔

ایک خصوصیت جو علیگڑھ میں مجھے بے حد نمایاں محسوس ہوتی، وہ تھی رواداری۔ سنی تھیالوجی اور شیعہ تھیالوجی کی تفریق کے باوجود وہاں شیعہ سنی تعصب کہیں نام کو بھی محسوس نہ ہوتا۔ یونیورسٹی کی ایک ہی جامع مسجد میں دونوں فرقے نماز پڑھتے، جماعتیں بے شک الگ الگ ہوتیں۔ پہلے سنیوں کی، اس کے بعد شیعوں کی۔ جسے وہاں کی زبان میں سکنڈ شو کہا جاتا تھا اور اس پر ہم دونوں محظوظ ہوتے تھے۔ یہ تو فرقہ وارانہ رواداری کی بات ہوتی۔ سیاسی اختلافات بھی وہاں معاندانہ شکل اختیار نہ کرتے۔ گھٹن محسوس نہ ہوتی، دوسرا خیال تو کبھی تو تکار تک کی نوبت نہ آتی۔ انتخابات کی گرماگرمی میں بھی تصادم کی کوئی واردات میں نے اپنی چار سالہ زندگی میں وہاں نہیں دیکھی۔ میرا تعلق حلقہ ہمدردان جماعت اسلامی سے تھا لیکن میں مسلم لیگ کی تحریک پاکستان میں بھی عملی دلچسپی لیتا۔ میں ۱۹۴۶ء کی بات کر رہا ہوں۔

اساتذہ میں ہر عقیدے کے اساتذہ تھے۔ ایسے سیکولر ذہن والے حضرات بھی [illegible] سے بیگانے اور بے دردی رہے۔ تقسیم برصغیر کے ہنگاموں کے سبب میرا تعلیمی سلسلہ ایک سال منقطع رہا۔ بی اے کی تکمیل کے لیے جب میں دوبارہ ۱۹۴۸ء میں علیگڑھ پہنچا تو عام فضا میں کوئی خاص تبدیلی محسوس نہیں کی۔ ایک طرف رواداری کا یہ عالم، دوسری طرف تہذیبی حق خود اختیاری کا ایسا گہرا ارتکاز کہ یونیورسٹی کے نام سے "مسلم" کا لفظ خارج کرانے کی کوئی سرکاری مہم آج تک کامیاب نہ ہو سکی۔ رواداری اور تعصب کا یہ خوش گوار امتزاج علیگڑھ ٹریڈیشن کا خاص وصف ہے جس کے عطا کردہ حسن توازن کی بدولت علیگڑھ ٹریڈیشن کی بعض کمزوریاں سنگین شکل اختیار نہیں کرتیں۔ پاکستان آنے کے بعد اطلاع ملی کہ جب پروفیسر آل احمد سرور نے وہاں مخلوط مجالس اور ناچ رنگ کی طرح ڈالنے کی کوشش کی، تو رشید صاحب مرحوم نے یہ فقرہ چست کیا "لوگ دارالعلوم کو دارالسرور بنانے چلے ہیں"۔ اور پھر سرور صاحب کی ایک نہ چلی۔ محض ایک فقرے نے وہ کام کر دکھایا جو شاید کسی جابر حکمران کے حکم امتناعی سے بھی نہیں ہو سکتا۔ رشید صاحب علیگڑھ کے نفس ناطقہ تھے اور اب آگے کا حال اللہ کو معلوم ہے۔

***

جامعہ خواتین نصابی گروپس

> جامعہ خواتین کا بڑا مسئلہ نصابی مضامین کی ترتیب اور اس کے بعد تدریس کا ہے۔ نئی نصابی کتب کی تیاری کے لیے دو چار سال کا زمانہ چاہیے پہلے مستقل نصابی خاکہ بنے، پھر اس کے مطابق کتابیں لکھی جائیں اس لیے اور ضروری کام کا لائحہ عمل ابھی سے تیار ہونا چاہیے
> (ترجمان القرآن)

ہمارا خیال ہے کہ ان الگ الگ مضامین کو بھی جامعہ خواتین میں آسانی شروع کیا جا سکتا ہے اس سے کام کا آغاز کر دیا جائے

مضامین

مضامین کے حسب ذیل گروپ تو سامنے آ رہے ہیں

۱۔ فلسفہ گروپ

الٰہیات، نفسیات، فلسفہ اخلاق، فلسفہ تعلیم (تعلیمی نفسیات)، فلسفہ تمدن و سیاست، عمومی نفسیات، فلسفہ جرم و سزا، وغیرہ۔

۲۔ سائنس گروپ

فزکس، کیمسٹری، فرمالوجی، بیالوجی، بائیو کیمسٹری، شماریات، ریاضی، جغرافیہ طبعی و اقتصادی وغیرہ

۳۔ انسانیات

تاریخ، تاریخ اسلام، تاریخ عالم اسلام (موجودہ — مغربی امپیریلزم کے ظہور سے اب تک) — تاریخ تحریکات اسلامی، برصغیر کی تاریخ، تاریخ پاکستان، سوشیالوجی، اقتصادیات، پولیٹیکل سائنس، قانون

۴۔ لسانیات

اردو، پنجابی، پشتو، سندھی، بلوچی، انگریزی، فارسی، عربی، روسی، چینی وغیرہ، ہندی، سنسکرت، بنگلہ، تامل، نیپالی وغیرہ، عربی، فارسی، ترکی، سواحلی وغیرہ

۵۔ اسلامیات

تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ اسلام اور تاریخ امت محمدیہ (دور نبوت اور خلافت ادوار مابعد)، اسلام اور دوسرے مذاہب کا تقابلی مطالعہ، جدید مادی تحریکات کا مطالعہ، ماضی اور حال کی اسلامی تحریکات کا مطالعہ

اسلامی نقطہ نظر سے تہذیب جدید کا ناقدانہ مطالعہ۔

۶۔ انتہائی لازمی اور بنیادی مضمون بعنوان اسلامی حکمت حیات

یہ مضمون تعلیم کے ابتدائی درجے سے شروع ہو کر اوپر تک جائے گا اور تمام علوم و فنون کے ساتھ یہ انتہائی لازمی ہوگا اس مضمون کا مقصد طلبہ و طالبات کے ذہن و کردار کو اسلام سے ہم آہنگ کرانا ہے۔

اس مضمون میں اسلام کے بنیادی طرز فکر (عقائد، عبادات، اخلاقیات اور حدود حلال و حرام) کے علاوہ اسلامی سیاست، اسلامی معاشرت اور اسلامی معیشت کے پورے پورے خاکے بیان ہوں گے تفسیر، حدیث، فقہ اور کلام وغیرہ علوم کے مسودہ کا معلومات دی جائیں گی ملت اسلامیہ کی سیاسی تاریخ کے ساتھ ساتھ علوم و افکار کی تاریخ اور فرد سے ہی کا نمونہ اور پس منظر میں پیدا ہونے والے تغیرات حدید خیالات کے سامنے لائے جائیں گے ماضی اور حال میں برپا ہونے والی احیائے اسلام کی تحریکات کو پیش کیا جائے گا موجودہ دنیا میں غالب قوتوں اور جدید تہذیب اور اس کی پیدا کردہ سیاسی و معاشی تحریکات کے مقابلے میں اسلام کی دعوت کو ابھارنے اور تحریکی انداز پر کام کرنے کے لیے رہنمائی دی جائے گی ملت اسلامیہ کی اہم تاریخی شخصیتوں اور ان کے کارناموں کا بیان ہوگا اور دور حاضر میں عالم اسلام کی ممتاز شخصیتوں کا تعارف کرایا جائے گا اہم اداروں اور کتابوں پر نظر ڈالی جائے گی

اس مضمون کا دوسرا جزو پاکستان اسٹڈیز یا مطالعہ پاکستان ہوگا جو پہلے سے رائج ہے

اس مضمون کا تیسرا جزو خواتین کے لیے خاص طور پر مرتب کرنا ہوگا اس جزو میں خواتین کے مقام و منصب اور حقوق و فرائض پیش کیے جائیں گے۔ دائرہ زوجیت اور فریضہ امومت کے متعلق اسلامی حکمت اور اس کے ساتھ احکام مذکور ہوں گے تاریخ اسلام میں قرون اولیٰ سے اب تک خواتین کے ایمانی و اخلاقی اور علمی و فکری اور تعلیمی و تصنیفی کارنامے پیش کیے جائیں گے، مغرب

ہاسٹل میں پڑھنا

ہم نے کالج میں تعلیم تو ضرور پائی اور رفتہ رفتہ بی۔ اے بھی پاس کر لیا لیکن اس نصف صدی کے دوران میں جو کالج میں گزارنی پڑی ہوسٹل میں داخل ہونے کی اجازت ہمیں صرف ایک دفعہ ہی ملی۔

خدا کا یہ فضل ہم پر کب اور کس طرح ہوا۔ یہ سوال ایک داستان کا محتاج ہے۔

جب ہم نے انٹرنس پاس کیا تو مقامی سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب خاص طور پر مبارک باد دینے کے لیے آئے۔ قریبی رشتہ داروں نے دعوتیں دیں۔ محلے والوں میں مٹھائی بانٹی گئی اور ہمارے گھر والوں پر یک لخت اس بات کا انکشاف ہوا کہ وہ لڑکا جسے آج تک اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے ایک بیکار اور نالائق فرزند سمجھے رہے تھے، دراصل لامحدود قابلیتوں کا مالک ہے جس کی نشوونما پر بے شمار آنے والی نسلوں کی بہبودی کا انحصار ہے۔ چنانچہ ہماری آئندہ زندگی کے متعلق طرح طرح کی تجویزوں پر غور کیا جانے لگا۔

تھرڈ ڈویژن میں پاس ہونے کی وجہ سے یونیورسٹی نے ہم کو وظیفہ دینا مناسب نہ سمجھا۔ چونکہ ہمارے خاندان نے خدا کے فضل سے آج تک کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا اس لیے وظیفے کا نہ ملنا بھی خصوصاً ان رشتہ داروں کے لیے جو رشتے کے لحاظ سے خاندان کے مضافات میں بستے تھے، فخر و مباہات کا باعث بن گیا اور مرکزی رشتہ داروں نے تو اس کو پاس وضع اور حفظ مراتب سمجھ کر ممتحنوں کی شرافت و نجابت کو بے انتہا سراہا۔ بہرحال ہمارے خاندان میں فالتو روپے کی بہتات تھی اس لیے بالاتفاق یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ نہ صرف ہماری بلکہ ملک و قوم اور شاید بنی نوع انسان کی بہتری کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایسے ہونہار طالب علم کی تعلیم جاری رکھی جائے۔

اس بارے میں ہم سے بھی مشورہ لیا گیا۔ عمر بھر میں اس سے پہلے ہمارے کسی معاملے میں ہم سے رائے طلب نہ کی گئی تھی، لیکن اب تو حالات بہت مختلف تھے۔ اب تو ایک غیر جانبدار اور دیانتدار مصنف یعنی یونیورسٹی ہماری بیدار مغزی کی تصدیق کر چکی تھی۔ اب بھلا ہمیں کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ ہمارا مشورہ یہ تھا کہ ہمیں فوراً ولایت بھیج دیا جائے۔ ہم نے مختلف لیڈروں کی تقریروں کے حوالے سے یہ ثابت کیا کہ ہندوستان کا طریقۂ تعلیم بہت ناقص ہے۔ اخبارات میں سے اشتہار دکھا دکھا کر یہ واضح کیا کہ ولایت میں کالج کی تعلیم کے ساتھ ساتھ فرصت کے اوقات میں بہت تھوڑی تھوڑی فیسیں دے کر بیک وقت جرنلزم، فوٹوگرافی، تصنیف و تالیف، دندان سازی، عینک سازی، ایجنٹوں کا کام غرضیکہ بے شمار اور کم خرچ بالانشیں پیشے سیکھے جا سکتے ہیں اور تھوڑے عرصے کے اندر انسان ہرفن مولا بن سکتا ہے۔

لیکن ہماری تجویز کو فوراً رد کر دیا گیا کیونکہ ولایت بھیجنے کے لیے ہمارے شہر میں کوئی روایات موجود نہ تھیں۔ ہمارے گردونواح میں سے کسی کا لڑکا ابھی تک ولایت نہ گیا تھا۔ اس لیے ہمارے شہر کی پبلک وہاں کے حالات سے قطعاً ناواقف تھی۔

اس کے بعد پھر ہم سے رائے طلب نہ کی گئی اور ہمارے والد، ہیڈ ماسٹر صاحب اور تحصیلدار صاحب ان تینوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں لاہور بھیج دیا جائے۔

جب ہم نے یہ خبر سنی، تو شروع شروع میں ہمیں سخت مایوسی ہوئی، لیکن جب ادھر ادھر کے لوگوں سے لاہور کے حالات سنے، تو معلوم ہوا کہ لندن اور لاہور میں چنداں فرق نہیں۔ بعض واقف کار دوستوں نے سینما کے حالات پر روشنی ڈالی، بعض نے تھیٹروں کے مقاصد سے آگاہ کیا، بعض نے ٹھنڈی سڑک وغیرہ کے مشاغل کو سلجھا کر سمجھایا، بعض نے شاہدرے اور شالامار کی ارمان انگیز فضا کا نقشہ کھینچا۔ چنانچہ جب لاہور کا جغرافیہ پوری طرح ہمارے ذہن نشین ہو گیا تو ثابت یہ ہوا کہ خوشگوار مقام ہے اور اعلیٰ درجے کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بے حد موزوں۔ اس پر ہم نے اپنی زندگی کا پروگرام وضع کرنا شروع کر دیا جس میں لکھنے پڑھنے کو گو ضرور دخل دیا گیا، لیکن ایک مناسب حد تک، تاکہ طبیعت پر کوئی ناجائز بوجھ نہ پڑے اور فطرت اپنا کام حسن و خوبی کے ساتھ کر سکے۔

لیکن تحصیلدار صاحب اور ہیڈ ماسٹر صاحب کی نیک نیتی یہیں تک محدود نہ رہی۔ اگر وہ صرف ایک عام اور مجمل سا مشورہ دے دیتے کہ لڑکے کو لاہور بھیج دیا جائے، تو بہت خوب تھا، لیکن انہوں نے تو تفصیلات میں دخل دینا شروع کر دیا اور ہوسٹل کی زندگی اور گھر کی زندگی کا مقابلہ کر کے ہمارے والد پر یہ ثابت کر دیا کہ گھر پاکیزگی اور طہارت کا ایک کعبہ اور ہاسٹل گناہ و معصیت کا ایک دوزخ ہے۔ ایک تو تھے وہ چرب زبان، اس پر انہوں نے بے شمار غلط بیانیوں سے کام لیا، چنانچہ گھر والوں کو یقین سا ہو گیا کہ کالج کا ہاسٹل جرائم پیشہ اقوام کی ایک بستی ہے اور جو طلبہ باہر کے شہروں سے لاہور جاتے ہیں اگر ان کی پوری طرح نگہداشت نہ کی جائے، تو وہ اکثر یا تو شراب کے نشے میں چور سڑک کے کنارے کسی نالی میں گرے ہوئے پائے جاتے ہیں یا کسی جوئے خانے میں ہزارہا روپے ہار کر خودکشی کر لیتے ہیں یا پھر فرسٹ ایئر کا امتحان پاس کرنے سے پہلے دس بارہ شادیاں کر بیٹھتے ہیں۔

چنانچہ گھر والوں کو یہ سوچنے کی عادت پڑ گئی کہ لڑکے کو کالج میں تو داخل کیا جائے، لیکن ہاسٹل میں نہ رکھا جائے۔ کالج ضرور، مگر ہاسٹل ہرگز نہیں۔ کالج مفید، مگر ہاسٹل مضر۔ وہ بہت ٹھیک، مگر یہ ناممکن۔ جب انہوں نے اپنی زندگی کا نصب العین ہی یہ بنا لیا کہ کوئی ایسی ترکیب سوچی جائے جس سے لڑکا ہاسٹل کی زد سے محفوظ رہے، تو کسی ترکیب کا سوجھ جانا کیا مشکل تھا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ چنانچہ از حد غور و خوض کے بعد لاہور میں ہمارے ایک ماموں دریافت کیے گئے اور ان کو ہمارا سرپرست بنا دیا گیا۔ میرے دل میں ان کی عزت

...کرنے کے بہت سے طریقوں کو دریافت کرنا ہی سے تھا پر یہ بات ثابت کیا کہ وہ واقعی میرے ماموں ہیں مجھے بتایا گیا کہ حقیقت میں ایک شریف آدمی تھا، تو وہ مجھ سے بے انتہا محبت کیا کرتے تھے چنانچہ فیصلہ ہوا کہ ہم پڑھیں کالج میں اور رہیں ماموں کے گھر۔

اس سے تحصیل علم کا جو ایک ولولہ سا ہمارے دل میں اٹھ رہا تھا وہ کچھ بیٹھ سا گیا ہم نے سوچا یہ ماموں لوگ ایسی سرپرستی کے زعم میں والدین سے بھی زیادہ احتیاط برتیں گے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے دماغی اور روحانی ترقی کے پھلنے پھولنے کا موقع نہ ملے گا اور تعلیم کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا چنانچہ یہی ہوا جس کا ہمیں خوف تھا ہم روز بروز مرجھاتے چلے گئے اور ہمارے دماغ پر چھچھوندریں سی چھوٹنے لگی سینما جانے کی اجازت کبھی کبھار مل جاتی تھی، لیکن اس شرط پر کہ بچوں کو بھی ساتھ لیتا جاؤں اس قسم میں بھلا سینما سے کیا اثر کر سکتا تھا تھیٹر کے معاملے میں ہماری معلومات اندر سبھا سے آگے نہ بڑھنے پائیں تیرنا ہمیں نہ آیا کیونکہ ہمارے ماموں کا ایک مشہور قول ہے کہ ڈوبتا وہی ہے جو تیراک ہے۔ جسے تیرنا نہ آتا ہو وہ پانی میں گھستا ہی نہیں گھر پر آنے جانے والے دوستوں کا انتخاب ماموں کے ہاتھ میں تھا کون کتنا ملنا ملاتا ہے اور وہ کتنے لیے کیے جائیں اس کے متعلق ہدایات بہت کڑی تھیں سنتے ہیں دربار گھر خط لکھنا ضروری تھا سگریٹ غسل خانے میں چھپ کر پیتے تھے گانے بجانے کی سخت ممانعت تھی۔

یہ سپاہیانہ زندگی نہیں راس نہ آئی لے تو دوستوں سے ملاقات بھی ہو جاتی تھی سیر کو بھی چلے جاتے تھے جس وقت بھی ملتے تھے، لیکن وہ جو زندگی میں ایک آزادی، ایک فراخی ایک فارغ البالی ہونی چاہیے وہ ہمیں نصیب نہ ہوئی رفتہ رفتہ ہم نے اپنے ماحول پر غور کرنا شروع کیا کہ ماموں جان عموماً کس وقت گھر میں سوتے ہیں کس وقت باہر جاتے ہیں کس کمرے سے کس کمرے تک جانے کی آواز سنائی نہیں دیتی کس دروازے سے کمرے کے کس کونے میں جھانکنا ممکن ہے گھر کا کون سا دروازہ رات کے وقت باہر سے کھولا جا سکتا ہے کون سا ملازم سوالوں سے کون سا ٹکٹ حلال ہے عجیب تجربے اور مطالعے سے ان باتوں کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا، تو ہم نے اس زندگی میں بھی نشوونما کے لیے چند گنجائشیں پیدا کر لیں، لیکن پھر بھی ہم روز دیکھتے تھے کہ ہاسٹل میں رہنے والے طلبا کس طرح اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر زندگی کی شاہراہ پر چل رہے ہیں ہم ان کی زندگی پر رشک کرنے لگے ایسی زندگی کو شدت سے حاصل کرنے کی خواہش ہمارے دل میں روز بروز بڑھتی گئی ہم نے دل سے کہا۔ والدین کی نافرمانی کسی مذہب میں جائز نہیں، لیکن ان کی خدمت میں درخواست کرنا ان کے سامنے اپنی ناقص رائے کا اظہار کرنا ان کو صحیح واقعات سے آگاہ کرنا یہ از بس فرض ہے اور دنیا کی کوئی طاقت مجھے اپنے فرض کی ادائیگی سے باز نہیں رکھ سکتی۔

چنانچہ جب گرمیوں کی تعطیلات میں میں وطن کو واپس گیا تو چند مختصر مگر جامع اور موثر تقریریں اپنے دماغ میں تیار رکھیں گھر والوں کو ہوسٹل پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ وہاں کی آزادی نوجوانوں کے لیے از حد مضر ہوتی ہے اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے مبرا واقعات ایسے تصنیف کیے جن سے ہاسٹل کے قواعد کی سختی ان پر اچھی طرح روشن ہو جائے سپرنٹنڈنٹ صاحب کے ظلم و ستم کی چند مثالیں رقت انگیز اور ہیبت خیز پیرائے میں سنائیں آنکھیں بند کر کے ایک آہ بھری اور بے چارے اشفاق کا واقعہ بیان کیا کہ ایک دن شام کے وقت بے چارا ہاسٹل کو واپس آ رہا تھا۔ چلتے چلتے پاؤں میں موچ آ گئی دو منٹ دیر سے پہنچا صرف دو منٹ لیکن صاحب اس پر سپرنٹنڈنٹ صاحب نے فوراً تار دے کر اس کے والد کو بلوایا پولیس سے تحقیقات کرنے کو کہا اور مہینے بھر کے لیے اس کا جیب خرچ بند کر دیا توبہ ہے یا الٰہی!

لیکن یہ واقعہ سن کر گھر کے لوگ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے مخالف ہو گئے، ہاسٹل کی خوبی ان پر واضح نہ ہوئی پھر ایک دن موقع پا کر بے چارے محمود کا واقعہ بیان کیا کہ ایک دفعہ تماشہ اعمال پہ چارا سینما دیکھنے چلا گیا، قصور اس سے یہ ہوا کہ ایک روپے والے درجے میں جانے کی بجائے وہ دو روپے والے درجے میں چلا گیا بس اتنی سی فضول خرچی پر اسے عمر بھر کو سینما جانے کی ممانعت ہو گئی ہے۔

لیکن اس سے بھی گھر والے متاثر نہ ہوئے ان کے رویے سے مجھے فوراً احساس ہوا کہ ایک روپے اور دو روپے کی بجائے آٹھ آنے اور ایک روپیہ کہنا چاہیے تھا۔

انہیں ناکام کوششوں میں تعطیلات گزر گئیں اور ہم نے پھر ماموں کی چوکھٹ پر آ سجدہ کیا۔

اگلی گرمیوں کی چھٹیوں میں جب ہم پھر گھر گئے، تو ہم نے ایک نیا ڈھنگ ایجاد کیا۔ دو سال تعلیم پانے کے بعد ہمارے خیالات میں پختگی سی آ گئی تھی پچھلے سال ہاسٹل کی حمایت میں جو دلائل ہم نے پیش کی تھیں وہ اب ہمیں نہایت بودی معلوم ہونے لگی تھیں اب کے ہم نے اس موضوع پر ایک لیکچر دیا کہ جو شخص ہاسٹل کی زندگی سے محروم ہو اس کی شخصیت نامکمل رہ جاتی ہے ہاسٹل سے شخصیت پنپنے نہیں پاتی۔ چند دن تو ہم اس پر فلسفیانہ گفتگو کرتے رہے اور نفسیات کے نقطۂ نظر سے اس پر بہت کچھ روشنی ڈالی لیکن ہمیں محسوس ہوا کہ لمبی تانوں سے کام نہ چلے گا اور جب تاثیر ہو یہ کی نوبت آئی تو ذرا دقت محسوس ہوئی۔ کالج کے جن طلبا کے متعلق میرا ایمان تھا کہ وہ زبردست شخصیتوں کے مالک ہیں۔ ان کی زندگی کچھ ایسی نہ تھی کہ والدین کے سامنے بطور نمونے پیش کی جا سکے، ہر وہ شخص جسے کالج میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا ہے جانتا ہے کہ والدین اغراض کے لیے واقعات کو ایک نئے اور انوکھے پیرائے میں بیان کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے لیکن اس پیرائے کا سوجھ جانا الہام اور اتفاق پر منحصر ہے بعض روشن خیال بیٹے والدین کو اپنے جیرت انگیز اوصاف کا قائل نہیں کر سکتے اور بعض نالائق سے نالائق طالب علم والدین کو کچھ اس طرح مطمئن کر دیتے ہیں کہ ہر چلتے ان کے نام منی آرڈر پر منی آرڈر چلا آتا ہے۔

نادان آں چناں روزی رساند [illegible] کہ داناں اندراں حیران ماند

جب ہم ڈیڑھ مہینے تک شخصیت اور ہاسٹل کی زندگی پر اس کا انحصار، ان دو مضمونوں پر وقتاً فوقتاً اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے، تو ایک دن والد نے پوچھا:

"تمہارا شخصیت سے آخر کیا مطلب ہے؟"

میں تو خدا سے یہی چاہتا تھا کہ وہ مجھے عرض و معروض کا موقع دیں میں نے کہا، دیکھئے نا مثلاً ایک طالب علم ہے وہ کالج میں پڑھتا ہے۔ اب ایک تو اس کا دماغ ایک اس کا جسم ہے جسم کی صحت بھی ضروری ہے اور دماغ کی صحت تو ضروری ہے ہی، لیکن اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہوتی ہے جس سے آدمی گویا پہچانا جاتا ہے میں اس کو شخصیت کہتا ہوں اس کا تعلق نہ جسم سے ہے نہ دماغ سے ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی کی جسمانی صحت بالکل خراب ہو اور اس کا دماغ بھی بالکل بے کار ہو، لیکن پھر بھی اس کی شخصیت ۔۔۔۔۔۔۔۔ نہ خیر دماغ تو بے کار نہیں ہونا چاہیے ورنہ انسان خبطی ہوا ۔۔۔۔۔۔ لیکن پھر بھی اگر ہو بھی تو بھی ۔۔۔۔۔۔۔۔ گویا شخصیت ایک ایسی چیز ہے ۔۔۔۔۔۔ ٹھہریے میں ابھی ایک منٹ میں آپ کو بتاتا ہوں۔"

ایک منٹ کی بجائے والد نے مجھے آدھ گھنٹے کی مہلت دی جس کے دوران میں وہ خاموشی کے ساتھ میرے جواب کا انتظار کرتے رہے۔ اس کے بعد وہ

شاید باقی دو مضمون ہم نے نہیں دیکھے، لیکن ہم نے یہ تو ثابت کر دیا کہ جس مضمون میں چاہیں پاس ہو سکتے ہیں

اب تک تو ہم دو دو مضمونوں میں فیل ہوتے رہے تھے، لیکن اس کے بعد ہم نے ٹھان لیا کہ جہاں تک ہو سکا اپنے مطالعہ کو وسیع کریں گے۔ یونیورسٹی کے بیہودہ اور بے معنی قاعدہ کو ہم ہی مرضی کے مطابق نہیں بنا سکتے، تو اپنی طبیعت پر ہی کچھ زور ڈالیں، لیکن جتنا غور کیا اسی نتیجے پر پہنچے کہ تین مضمونوں میں ایک وقت پاس ہونا فی الحال مشکل ہے، پہلے دو دو میں پاس ہونے کی کوشش کرنی چاہیے

چنانچہ پہلے سال انگریزی اور فارسی میں پاس ہو گئے اور دوسرے سال فارسی اور تاریخ میں۔

جن جن مضامین میں ہم جیسے جیسے فیل ہوئے وہ اس نقشے سے ظاہر ہیں:

۱۔ انگریزی۔ تاریخ۔ فارسی۔

۲۔ انگریزی۔ تاریخ

۳۔ انگریزی۔ فارسی۔

۴۔ تاریخ۔ فارسی۔

گویا جن جن طریقوں سے ہم دو دو مضامین میں فیل ہو سکتے تھے، وہ ہم نے سب پورے کر دیے۔ اس کے بعد ہمارے لیے دو مضامین میں فیل ہونا ناممکن ہو گیا اور ایک ایک مضمون میں فیل ہونے کی باری آئی۔ چنانچہ اب ہم نے مندرجہ ذیل نقشے کے مطابق فیل ہونا شروع کر دیا

۵۔ تاریخ میں فیل۔

۶۔ انگریزی میں فیل

ساتویں دفعہ امتحان دے چکنے کے بعد جب ہم نے اپنے نتیجوں کو یوں اپنے سامنے رکھ کر غور کیا، تو ثابت ہوا کہ غم کی رات ختم ہونے والی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ اب ہمارے فیل ہونے کا صرف ایک ہی طریقہ باقی رہ گیا ہے، وہ یہ کہ فارسی میں فیل ہو جائیں، لیکن اس کے بعد تو پاس ہونا لازم ہے۔ ہر چند کہ یہ سانحہ ازحد جانکاہ ہو گا، لیکن اس میں یہ مصلحت پوشیدہ ہے کہ اس سے ہمیں ایک قسم کا ٹیکا لگ جائے گا۔ بس یہی ایک کسر باقی رہ گئی ہے۔ اس سال فارسی میں فیل ہوں گے اور پھر اگلے سال قطعی پاس ہو جائیں گے۔ چنانچہ ساتویں دفعہ امتحان دینے کے بعد ہم بے تابی سے فیل ہونے کا انتظار کرنے لگے بلکہ اس بات کا انتظار تھا کہ اس فیل ہونے کے بعد ہم اگلے سال ہمیشہ کے لیے بی اے ہو جائیں گے۔

ہر سال امتحان کے بعد جب گھر آتا، تو والدین کو نتیجے کے لیے پہلے ہی تیار کر دیتا، رفتہ رفتہ نہیں، بلکہ یک لخت اور فوراً۔ رفتہ رفتہ تیار کرنے سے خواہ مخواہ وقت ضائع ہوتا ہے اور پریشانی بے حد طول کھینچتی ہے۔ ہمارا قاعدہ یہ تھا کہ جاتے ہی کہہ دیا کرتے تھے کہ اس سال کم از کم پاس نہیں ہو سکتے۔ والدین کو اکثر یقین نہ آتا۔ ایسے موقعوں پر طبیعت کو بڑی الجھن ہوتی ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ میں پرچوں میں کیا لکھ کر آیا ہوں، اچھی طرح جانتا ہوں کہ ممتحن لوگ اکثر نشے کی حالت میں پرچے نہ دیکھیں، تو میرا پاس ہونا قطعاً ناممکن ہے۔ چاہتا ہوں کہ میرے تمام بہی خواہوں کو بھی اس بات کا یقین ہو جائے تاکہ وقت پر انہیں صدمہ نہ ہو، لیکن یہی چاہتا ہوں کہ میری تمام باتیں محض کسر نفسی سمجھی جائیں۔ آخری سالوں میں والد کو فوراً یقین آ جایا کرتا تھا، کیونکہ تجربے سے ان پر ثابت ہو چکا تھا کہ میرا اندازہ غلط نہیں ہوتا، لیکن ادھر ادھر کے لوگ "ابھی نہیں صاحب" ابھی کیا کہہ رہے ہیں؟ "ابھی نہیں کوئی بات ہے" ایسے فقروں سے ناک میں دم کر دیتے۔ بہر حال اب کے پھر گھر پہنچتے ہی ہم نے حسب دستور اپنے فیل ہونے کی پیشین گوئی کر دی۔ دل کو یہ تسلی تھی کہ بس یہ آخری ہے، اگلے سال ایسی پیشین گوئی کرنے کی ضرورت نہ ہو گی۔

ساتھ ہی خیال آیا کہ وہ ہاسٹل کا قصہ پھر شروع کرنا چاہیے۔ اب تو کالج میں صرف ایک ہی سال باقی رہ گیا ہے۔ اب بھی ہاسٹل میں رہنا نصیب نہ ہوا، تو عمر بھر گویا آزادی سے محروم رہے۔ گھر سے نکلے تو ماموں کے ڈربے میں، اور جب ماموں کے ڈربے سے نکلے، تو شاید اپنا ایک ڈربہ بنانا پڑے گا۔ آزادی کا ایک سال صرف ایک سال اور یہ آخری موقع ہے۔

آخری درخواست کرنے سے پہلے میں نے تمام ضروری مصالحہ بڑی احتیاط سے جمع کیا۔ جن پروفیسروں سے مجھے اب ہم عمری کا فخر حاصل تھا، ان کے سامنے نہایت بے تکلفی سے اپنی آمد و رفت کا اظہار کیا اور ان سے والد کو خطوط لکھوائے کہ اگلے سال لڑکے کو ضرور آپ ہاسٹل میں بھیج دیں۔ بعض کامیاب طلبہ کے والدین سے بھی اسی مضمون کی عرضداشتیں بھجوائیں۔ خود اعداد و شمار سے ثابت کیا کہ یونیورسٹی سے جتنے لڑکے پاس ہوتے ہیں، ان میں سے اکثر ہاسٹل میں رہتے ہیں اور یونیورسٹی کا کوئی وظیفہ یا تمغہ یا انعام تو کبھی ہاسٹل سے باہر گیا ہی نہیں۔ میں حیران ہوں کہ یہ دلیل مجھے اس سے پیشتر کبھی کیوں نہ سوجھی تھی، کیونکہ یہ بہت ہی کارگر ثابت ہوئی۔ والد کا انکار نرم ہوتے ہوتے غور و خوض میں تبدیل ہو گیا، لیکن پھر بھی ان کے دل سے شک نہ مٹا۔ کہنے لگے "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جس لڑکے کو پڑھنے کا شوق ہو، وہ ہاسٹل کی بجائے گھر پر کیوں نہیں پڑھ سکتا"

میں نے جواب دیا کہ ہاسٹل میں ایک علمی فضا ہوتی ہے جو ارسطو اور افلاطون کے گھر کے سوا اور کسی گھر میں دستیاب نہیں ہو سکتی۔ ہاسٹل میں جسے دیکھو علوم میں منہمک نظر آتا ہے۔ باوجود اس کے کہ ہر ہاسٹل میں دو دو تین تین سو لڑکے رہتے ہیں، پھر بھی وہ خاموشی طاری ہوتی ہے کہ قبرستان معلوم ہوتا ہے۔ وجہ یہ کہ ہر ایک اپنے اپنے کام میں لگا رہتا ہے۔ شام کے وقت ہاسٹل کے صحن میں جا بجا طلبا علمی مباحثوں میں مشغول نظر آتے ہیں۔ علی الصبح ہر ایک طالب علم کتاب ہاتھ میں لیے ہاسٹل کے چمن میں ٹہلتا نظر آتا ہے۔ کھانے کے کمرے میں، کامن روم میں، غسل خانوں میں، برآمدوں میں، ہر جگہ لوگ فلسفے اور ریاضی اور تاریخ کی باتیں کرتے ہیں۔ جن کو ادب انگریزی کا شوق ہے، وہ دن رات آپس میں شیکسپیئر کی طرح گفتگو کرنے کی مشق کرتے ہیں۔ ریاضی کے طلبا اپنے ہر ایک خیال کو الجبرے میں ادا کرنے کی عادت ڈال لیتے ہیں۔ فارسی کے طلبا رباعیوں میں [illegible] کرتے ہیں۔ تاریخ کے دلدادہ [illegible]

والد نے اجازت دے دی۔

(۱) کیا موجودہ نظام تعلیم میں طالبات پوری طرح اپنا حق حاصل کر رہی ہیں؟

(۲) کیا جامعہ خواتین قائم ہونے کی صورت میں طالبات بہتر انداز میں اپنا تعلیمی سفر جاری رکھ سکیں گی؟

(۳) جامعہ خواتین میں کون سے پہلو مدّنظر رکھنا ضروری ہیں؟

پروفیسر بنت الاسلام (لاہور)

(۱) لفظ "حق" وضاحت طلب ہے کس بات کو حق کہا گیا ہے؟ اگر حق سے مراد صرف امتحانات پاس کرنا اور سندیں حاصل کرنا ہے تو پھر ٹھیک ہے کہ لڑکیاں اپنا حق حاصل کر رہی ہیں۔ لیکن اگر حق سے مراد یہ ہے کہ طالبات کو وہ تعلیم دی جائے جو زندگی میں ان کے کام آئے اور وہ بہتر زندگی گزار سکیں اور اپنے متعلقین، وطن اور دین کے لیے زیادہ مفید ثابت ہو سکیں تو پھر نہیں اُن کا حق نہیں مل رہا کیونکہ موجودہ نظام تعلیم عورت اور مرد دونوں کو ایک ہی طریقے کی تعلیم دیتا ہے اور اس کے ڈھانچے میں مردوں کی ضروریات کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے بہ نسبت عورت کی ضروریات کے۔

(۲) بے شک اگر خواتین کی علٰحدہ یونیورسٹی ہو اور اس میں طالبات کی مخصوص ضروریات کا دھیان رکھا گیا ہو تو لڑکیاں بہتر انداز میں تعلیم حاصل کر سکیں گی کئی لڑکیاں صرف اس لیے تعلیم حاصل کرنے سے محروم رہ جاتی ہیں کہ والدین انہیں مخلوط یونیورسٹی میں بھیجنے کے روادار نہیں ہوتے اور ان طالبات کی بھی کمی نہیں جو خود بھی مخلوط کلاسوں میں جاتے ہوئے گھبراتی ہیں اور ان میں وہ طالبات بھی شامل ہیں جو ویسے پردہ نہیں کرتیں۔ بعض مضامین کے ایم۔اے طالبات کے کالجوں میں بھی ہیں طالبات یونیورسٹی میں پڑھنے کے بجائے ان کالجوں میں آنا بہتر سمجھتی ہیں۔

(۳) نصاب مرتب کرتے وقت طالبات کی مخصوص ضروریات کا دھیان رکھا جائے وہ مضامین خاص طور پر پڑھائے جائیں جن کی طالبات کو مابعد کی زندگی میں ضرورت پیش آئے گی مثلاً ہوم اکنامکس اور ہوم نرسنگ وغیرہ۔ بہت اعلیٰ تعلیم کے لیے صرف ان طالبات کو چنا جائے جو غیر معمولی ذہن کی مالک ہوں ویسے تو جامعہ میں اعلیٰ تعلیم ہی دی جاتی ہے مگر اعلیٰ سے اوپر "بہت اعلیٰ" بھی ہوتی ہے وہ ہر لڑکی کے لیے عام نہ ہو۔ عورتوں کی یونیورسٹی میں میڈیکل کالج پر خصوصی زور دیا جائے کہ خاتون ٹیچر اور خاتون ڈاکٹر کی اشد ضرورت ہے طالبات کو صحیح اسلامی تعلیم دینے کا لازماً بندوبست ہو۔

اُمّ زبیر (کراچی)

(۱) میرا جواب ہے ــــــ "نہیں"
مگر کیوں؟ اس کیوں کے دلائل کے لیے تو کئی صفحات درکار ہوں گے۔ لیکن مختصراً عرض کرتی ہوں۔
مملکت خداداد پاکستان میں ہمارا سب سے پہلا کام یہی ہونا چاہیئے تھا کہ نظام تعلیم کو نظریۂ پاکستان کے مطابق اسلامی نظام تعلیم میں بدل دیا جاتے مگر وائے حسرتا ہنوز دلّی دُور است۔ مروجہ نظام تعلیم کی بنیادی خرابی یہ ہے کہ وہ انگریز کا بنایا ہوا ہے جس میں خدا پرستی کا کوئی تصور ہی نہیں اور وہ کائنات کی ہر شئے کو مادّی نقطۂ نظر سے دیکھتا اور حل کرتا ہے۔ جس میں ایک "فرد" اپنی زندگی میں زیادہ سے زیادہ آسائشیں حاصل کر سکے۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ انگریز کو اپنی حکومت چلانے کے لیے غلامانہ ذہنیت کی ضرورت تھی اس کو ایسے افراد چاہئیں تھے جو اس کے ایک اشارے پر ہزاروں کام اس کی منشا کے مطابق انجام دے سکیں لہذا اس نے جی حضوریوں، خوشامد پسندوں اور خوشامد پرستوں کے گروہ تیار کرنے کے لیے نظام تعلیم بنایا تھا اور یہ پڑھے لکھے لوگ حکومت کے دفتر میں "کلرک" بن کر زندگی کی معراج حاصل کر لیتے تھے انگریزی حکومت خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں سے آزادی کی جوت، لو چھین لینا چاہتی تھی، کیونکہ اس کو اور تہذیب و تمدن کو سب سے زیادہ خطرہ مسلمانوں سے ہی تھا علامہ اقبال نے اس کی اس حکمتِ عملی کی کیا خوب تشخیص کی ہے "ارمغان حجاز" کی ایک نظم "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" میں ابلیس کہہ رہا ہے۔

"خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام — چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات
ہر نفس ڈرتا ہوں اس اُمت کی بیداری سے میں — ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات"

پاکستان بننے کے بعد اس خرابی کا احساس اور اظہار بار بار ہر دور حکومت پاکستان نے کیا، لیکن عملاً اس کو تبدیل نہیں کیا گیا۔ تیر مارا، تو یہ کہ سکولوں، کالجوں میں دینیات و قرآن مجید ناظرہ پڑھنا ضروری قرار دیا "جامعات" میں ایک پرچہ بھی دینیات کا رکھ دیا گیا، لیکن اس سے وہ مقصد تو ہرگز پورا نہیں ہو سکتا تھا، جو ایک آزاد مسلمان قوم کے لائق ہو۔ میرے ... یہ کہ خواتین کے لیے تعلیم کے میدان مردوں سے الگ ہوں، جو تعلیمی نصاب بھی بالکل الگ ہونا چاہیئے میری نگاہ میں مروجہ تعلیم کا اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ حاصل کر لینے کے باوجود بھی تعلیم نامکمل ہے خصوصاً عورت کے لیے حقیقی اور اعلیٰ تعلیم یہی ہے کہ پاکستان کی طالبہ کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ سب سے پہلے ایک مومنہ اور مسلم لڑکی ہے اُسے لازماً "علم" ہونا چاہیئے کہ وہ ایک آزاد مملکت کی شہری ہونے کے ساتھ ہی ایک عقیدہ اور ایک نظریہ، خدا اور رسول پر ایمان و یقین رکھنے والی ہے اُسے یہ یقین ہونا چاہیئے کہ ایک روز خدا کے رو برو اپنی شعوری زندگی کے ہر عمل کی جوابدہی بھی کرنی ہے۔ ڈھلتی عمر کی سرائے میں اس کی جو حیثیت (بیٹی، بہن، بیوی، ماں) بنتی چلی جائے گی خدا اور اس کے رسول کی طرف سے ان سب حیثیتوں کے مطابق اس کے ذمہ کچھ حقوق و فرائض بھی عاید ہوتے چلے جاتے ہیں جو اُسے لازماً ادا کرنے ہیں جن کو اگر ادا نہ کیا گیا تو زندگی نامکمل رہ جائے گی، بلکہ بے شمار مشکلات اور الجھنوں میں اُلجھ جائے گی میری ان باتوں سے یہ مطلب نہ سمجھا جائے کہ آج کی پیشہ ورانہ تعلیم کے خلاف ہوں

آخر میں ایک بات اعادہ کہنا چاہتی ہوں کہ نظریۂ پاکستان کے مطابق نظام تعلیم کو بنانا پھر مردوں اور عورتوں کے لیے الگ الگ کرنا بڑی دیدہ ریزی اور جگر ماری اور ماہروں کا کام ہے اس سلسلے میں میری تجویز یہ ہے کہ موجودہ ماہرین تعلیم کے ساتھ دین و شریعت کے ماہرین کی ایک ٹیم ساتھ کر دی جائے، جو باہم مل کر اسلامی نظام تعلیم کا ایسا ڈھانچہ تیار کریں جو آئندہ نسلوں کو صحیح معنوں میں مسلمان بنائے اُن کے سینوں میں جوش ایمانی، احساس فرض اور انتھک جدوجہد کا جذبہ بیدار ہو جائے وہ دنیا کے ملحدانہ افکار و خیالات پر اسلام کے عقائد و نظریات کو غالب کر دیں اور پاکستان کو صرف عالم اسلام کا ہی نہیں، بلکہ دنیائے انسانیت کا رہنما بنا دیں۔

اور یہ کام اُسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب کہ ایوانِ حکومت میں قرآن دوست کو اُس کا مقام مل جائے۔

**

بقیہ : سابق صدروں کے افکار

...ے چاروں کی عزت و عصمت محفوظ ہو راہ چلتے ان پر آوازے نہ کسے جائیں اور ان سے چھیڑ خانی کر کے ان پر کیس کرائے لگائے جا سکیں، اور ان بے چاروں کا دھیان بھی پڑھائی کی طرف لگ سکے۔ کیوں ٹھیک ہے نا،

مسعود احمد کھوکھر - ۶-۷-۱۹۷۵ء

(۱)

ہمارے ... ایک جواب ہے جس کی کوئی تعبیر نہیں۔ اس وقت کی سیاست قیادت اور چاہت اور آج ...
[illegible]
[illegible]

(۲)

نئی انتخابات سے تعلیمی ماحول متاثر نہیں ہوتا بلکہ انتخابات سے فرد .....

(۳)

تعلیمی تجاویز

الطاف حسن قریشی

اسلامی تہذیب اور نظریۂ پاکستان کے الفاظ بار بار ضبط میں آئے، مگر اس کی جس قدر گردان ہوئی، نظریۂ پاکستان کی روح میں کمی آتی چلی گئی۔ قومی تعلیمی کمیشن نے نظریۂ پاکستان کو عظیم الشان خراج تحسین پیش کیا تھا:

"ہمارے نظامِ تعلیم کو ان مقاصد کے تحفظ میں جو تشکیلِ پاکستان کا محرک تھے، بنیادی کردار ادا کرنا ہوگا اور اس تصور کے ذریعے اتحاد کی بنیادوں کو استحکام بخشنا ہوگا۔ برصغیر کے مسلمانوں میں علیحدہ وطن کی آرزو اس لیے ابھری تھی کہ وہ اپنی مخصوص اقدار کے مطابق اپنے آپ پر حکومت کریں۔ دوسرے الفاظ میں یہاں ملک اسلامی زندگی کے تحفظ کے لیے وجود میں آیا۔" (صفحہ ۱۱)

یہ ۱۹۵۹ء کا اعلان تھا اور دس برس بعد ہم سب نے دیکھ لیا کہ اس نظامِ تعلیم نے جو افراد تیار کیے، وہ نظریاتی قدروں سے تشویشناک حد تک بے بہرہ تھے بلکہ ان میں وہ نظریات راہ پاگئے جو نظریۂ پاکستان کی نفی کرتے ہیں۔ ۱۹۶۹ء کی نئی تعلیمی پالیسی میں بھی نظریۂ پاکستان کے تحفظ کا اظہار موجود ہے۔ سوال اٹھتا ہے ہمارے انتظامات کیا ہوں گے اور ہم کس طرح ماضی کے تجربات سے فائدہ اٹھائیں گے۔

طالب علموں میں نظریۂ پاکستان سے محبت کیوں پیدا نہ کرسکے؟ اس کے بڑے بڑے [illegible] ہیں:

۱۔ اساتذہ جو بچوں کو اس عمر میں پڑھاتے ہیں جس میں ذہن پر نقوش ثبت ہوتے ہیں، [illegible] نظریۂ پاکستان کا شعور نہیں رکھتے۔ ہم نے تربیت کے کسی مرحلے پر بھی اساتذہ پر اللہ کا رنگ [illegible] کی کوشش نہیں کی ہے۔ پی ٹی سی، ایس وی، سی ٹی، بی ایڈ، ایم ایڈ کے تربیتی کورس اٹھا کر دیکھ [illegible] نظریہ اور تشکیلِ کردار کی بات نظر نہ آئے گی۔ اساتذہ میں کثرت ان افراد کی ہے جو قرآن ناظرہ [illegible] نہ آیات کا مطلب سمجھتے ہیں۔ ان میں ایک ایسا عنصر بھی موجود ہے جو طلبہ کے ذہنوں [illegible] اسلام کے اثرات کھرچنے کے لیے خاص طور پر مستعدی کا اعتبار کرتا ہے اور ہم نے ایسے عنصر کو چھانٹنے کا کوئی اہتمام نہیں کیا۔

۲۔ ہمارے نصابِ تعلیم میں تشکیلِ پاکستان ایک تحریک اور ایک عہد ساز تہذیبی انقلاب کی حیثیت سے پیش ہی نہیں ہوا۔ دسویں جماعت تک جو معاشرتی علوم پڑھائے جاتے ہیں، ان میں پاکستان کا بھی ذکر آتا ہے، مگر یہ ذکر اتنا بے جان اور بے روح ہے اور جن ہونٹوں پر یہ ذکر آتا ہے، وہ اس قدر خشک اور بے رنگ ہیں کہ طلبہ اپنے ذہنوں پر کوئی نقش مرتب کر ہی نہیں سکتے۔ ایف اے اور بی اے کے اکثر مضامین اس ذکر سے خالی ہیں۔ پاکستان کی کسی بھی یونیورسٹی میں پاکستانیات کا پرچہ کسی بھی شعبے میں لازمی نہیں۔ شعبۂ تاریخ میں ایسے ایسے علاقوں کی تاریخ پڑھائی جاتی ہے مثال کے طور پر حیدرآباد یونیورسٹی میں تاریخ سندھ، پشاور یونیورسٹی میں سرحد کی تاریخ، ڈھاکہ یونیورسٹی میں بنگال کی تاریخ اور پنجاب یونیورسٹی میں پنجاب کی تاریخ۔ الغرض برصغیر کے پس منظر میں پاکستان کی تاریخ کہیں بھی لازمی پرچے کی حیثیت نہیں رکھتی۔ یہی حال شعبۂ علم السیاست کا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی میں پاکستانیات کا پرچہ کسی زمانے میں لازمی ہوتا تھا، اب اہلِ نظر اس کے بھی درپے ہیں۔

۳۔ تحریکِ پاکستان پر عام فہم زبان میں اور خوبصورت طباعت کے ساتھ لٹریچر نہیں ملتا۔ حکومت نے کبھی اس طرف سنجیدگی سے توجہ نہیں دی اور عام ناشرین وہ کتابیں چھاپنا پسند کرتے ہیں جن کی کھپت زیادہ ہے۔ پورے ملک میں ایک بھی ایسا ادارہ قائم نہیں ہوا جس نے تحریکِ پاکستان پر مستقل کام کرنے کا منصوبہ بنایا ہو۔ تحریکِ پاکستان اور تاریخِ پاکستان پر اچھے معیار کی چند کتابیں منظرِ عام پر آئی ہیں اور وہ بھی زیادہ تر انگریزی میں اور بیشتر غیر ملکی مصنفوں کی ہیں۔ اردو زبان میں ایک بھی قابلِ قدر کوشش نہیں ہوئی۔ بنگلہ کا دامن بھی تقریباً خالی ہے اور ایسی کتابیں تو وجود ہی میں نہیں آئیں جو بچوں کے ذہن میں کہانیوں، افسانوں یا دلچسپ تاریخی واقعات کے ذریعے پاکستان کے نقش و نگار منقش کرسکیں۔

۴۔ حکومت کو اپنی تعلیمی پالیسیوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ماہرینِ تعلیم کے سلسلے میں بھی

ہمارا ملک بڑا بدقسمت رہا ہے ہوا یہ کہ چند نوکرشاہی افسروں چند تعلیمی ماہرین اور چند صحافت کی مل بھگت سے ایک خاص طبقے کو ماہرین تعلیم کی حیثیت سے روشناس کرایا گیا۔ یہ ماہرین تعلیم وہ تھے جو علمی آزادی کا نعرہ لے کر آئے تھے اور ان کے افکار کو پریس میں نمایاں جگہ دی گئی پھر انہیں مختلف تقاریب میں، خواہ کہ ان کے افکار کو ملی سُرخیوں کے ساتھ پھیلایا گیا، پھر ان عظیم شخصیتوں پر مقالے لکھے گئے، ریڈیو سے ان کی تقریریں نشر ہوئیں اور ٹیلی وژن پر بھی وہی نظر آتے اس طرح یہ پاکستان کے مسلّمہ ماہرین تعلیم بن بیٹھے اور نوکر شاہی سے مل بھگت کے نتیجے میں ان کے نام سرکاری فائلوں تک پہنچ گئے اب جب بھی کوئی مسئلہ حکومت کے پیش نظر ہوتا ہے، وہ زیادہ تر انہی ماہرین تعلیم سے مشورہ کرتی ہے اور انہی کو ذمہ داریاں سونپتی ہے یہ ماہرین تعلیم نوکر شاہی کی مدد سے اسکیم کو اپنے مزاج اور اپنے فلسفے کے مطابق عملی جامہ پہناتے ہیں اور اصل منصوبے کی شکل بگاڑ کر رکھ دیتے ہیں

۵ ۔ اس ملک میں برسر اقتدار اور دوسرے مؤثر حلقے اسلامی اقدار کا مذاق اڑاتے رہے ہیں پاکستان سے حقیقی محبت اس کے دل میں پیدا ہوگی جو دل سے خدا اور رسولؐ کے لیے محبت و شیفتگی کے جذبات رکھتا ہے یہ جذبہ جس قدر سرد پڑتا جائے گا بنگالی، سندھی، پنجابی، بلوچستانی اور سرحدی اُبھرتا جائے گا ہم سے اسلامی طاقتوں کو شکست دینے کے جوش میں اس بات کا ہوش نہ رہا کہ ملک کی بنیادیں بھی ہل سکتی ہیں۔ ہر علاقے میں زبان، تہذیب، نسل اور عصبیتوں کے بُت تراش لیے گئے ہیں اور ان کی پوجا ہو رہی ہے اور ان کے پجاری اس قدر شدید ہو گئے ہیں کہ قومی اور ملی وحدت کے پرستار دبک کر بیٹھے پر مجبور ہیں

۶ ۔ طلبہ میں ایک مربوط تصور اور ایک مربوط فلسفہ اس لیے بھی نہیں اُبھر سکا کہ مختلف مضامین کے درمیان تضاد اور تصادم پایا جاتا ہے طالب علم سے اسلامیات کے ذریعے اسلام کا ہلکا سا تصور قائم کیا، لیکن اسے مختلف مضامین پڑھ کر یہ احساس ہوا کہ اسلام نے انسانی تہذیب اور علوم و فنون کی ترویج اور تعمیر میں کچھ بھی حصہ نہیں لیا گویا اسلام کو زندگی سے کسی قسم کا تعلق نہیں رہا، چنانچہ اس کے ذہن میں ایک ایسے مذہب کا تصور راسخ ہو گیا جس کا زندگی سے تعلق نہیں اس کے علاوہ اُس نے اسلامی علوم میں خدا اور کائنات کے تصورات کچھ اور پڑھے اور فلسفے اور سائنس میں کچھ اور۔ یہ تمام امور اسلام کے ہمہ گیر نظریے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

۷ ۔ قیام پاکستان کے بعد نظام تعلیم ایسا مرتب ہوا کہ اس میں عربی اور فارسی زبانوں کے لیے کچھ زیادہ گنجائش نہ رہی عربی اور فارسی زبانوں سے ایک ایسی تہذیب اور ایک ایسا ماحول منتقل ہوتا آرہا تھا جس میں اسلامی شعائر اور اسلامی روایات زندہ و پائندہ تھیں ان زبانوں کو پڑھ کر طالب علم غیر شعوری طور پر اسلامی زندگی کے مظاہر سے متاثر ہوتا چلا جاتا تھا اب وہ ماحول اور وہ فضا تقریباً ختم ہو گئی اور اس طرح جو خلا پیدا ہوا اُس میں وہ افکار اور وہ شخصیتیں جذب ہوتے لگیں جن کا چرچا طالب علم کے چاروں طرف ہوتا رہا ہم نے اپنے قومی ہیرو اور تاریخ کی عظیم شخصیتوں پر ایسی تنقیدی نگاہ ڈالی کہ انہیں جلا کر راکھ کر دیا اور اسی راکھ کے ڈھیر پر غیر ملکی شخصیتوں اور غیر ملکی افکار تعمیر ہوتے رہے ایک نوجوان ذہن کو کوئی نہ کوئی آئیڈیل چاہیے تھا اسے اپنا نہ ملا تو باہر سے لے آیا اور اس کی پوجا کرنے لگا۔

اس پس منظر کی روشنی میں اسلامیات کو دسویں جماعت تک لازمی قرار دینے سے کام نہ چلے گا اس عظیم مقاصد کے لیے عظیم منصوبے کی ضرورت ہے اس منصوبے کے چند بنیادی اصول یہ ہو سکتے ہیں

۱ ۔ اساتذہ کے لیے جے وی اور ایس وی کے جو تربیتی نظام ہیں اُن میں قرآن حکیم کی تدریس کا مخصوص انتظام ہو اور اس وقت تک کسی کو جے وی یا ایس وی کا سرٹیفکیٹ نہ دیا جائے جب تک قرآن کا پوری صحت کے ساتھ پڑھنا نہ آجائے قرآن کو ناظرہ پڑھانے کے سائنٹفک بنیادوں پر تجربے کیے جا چکے ہیں اور ایسے قواعد مرتب کر لیے گئے ہیں جن سے قرآن پڑھنے کا مرحلہ چند مہینوں میں بڑی کامیابی سے طے کیا جا سکتا ہے اسی میں بچوں کے لیے قرآن کی ناظرہ تعلیم لازمی قرار دی گئی مگر اسکولوں کو قاری میسر نہ آئے چنانچہ یہ اسکیم مؤثر طور پر نافذ نہ ہو سکی اگر ہر جے وی اور ایس وی استاد قرآن کو صحت کے ساتھ پڑھانے کی صلاحیت رکھتا ہو، تو قرآن کی ناظرہ تعلیم واقعی مؤثر ثابت ہوگی

۲ ۔ اُردو کی پہلی، دوسری اور تیسری کتاب میں اسلامی نظام زندگی کو خوبصورت کہانیوں کے ذریعے پیش کیا جائے سچائی، وعدہ ایفائی اور دیانت و امانت کے واقعات عام فہم زبان میں اس طرح پیش کیے جائیں کہ بچے کے ذہن پر مستقل نقوش مرتب ہوں تیسری جماعت تک دینیات کی علیحدہ کتاب پڑھانے کی ضرورت نہیں اُستاد اسے طور پر بچوں کو اخلاقی کہانیاں سنائے اور قرآن کی آیات یاد کرائے

۳ ۔ پانچویں جماعت سے لے کر ایم اے تک پاکستانیات کا پرچہ لازمی ہو اس میں تحریک پاکستان کے مختلف مراحل، اس دور کی عظیم شخصیتوں کے کارنامے، پاکستان کے وجود میں آنے کی عظیم انسانی قربانیوں کے مناظر، پاکستان کا تاریخی، سیاسی اور تہذیبی پس منظر، مملکت پاکستان کی عظمت و شوکت، یہ تمام باتیں طالب علموں کے ذہن میں سلیقے سے راسخ ہو جانی چاہییں تقسیم پاکستان سے پہلے دسویں جماعت کے انگریزی سلیبس میں ایک کتاب OUR INDIA (ہمارا ہندوستان) شامل تھی اسے پڑھ کر دل کی محبت کا بھرپور جذبہ اُبھرتا تھا اور ہندوستانی ہونے پر فخر اور اعتماد کا شعور ملتا تھا ہمیں اس کتاب کے خطوط پر اچھی کتابیں پاکستان پر تیار کرنی ہوں گی مجھے ابھی تک اُس کتاب کی زبان اور انداز بیان یاد آتا ہے

۴ ۔ یونیورسٹی کی سطح پر پاکستانیات کا ایک شعبہ قائم کیا جائے اگر نظریۂ پاکستان کا تحفظ پاکستان کا تحفظ ہے، تو ہمیں اعلیٰ سطح پر نظریۂ پاکستان کا تحفظ پاکستان کا تحفظ ہے، تو ہمیں اعلیٰ سطح پر نظریۂ پاکستان پر علمی اور تحقیقی کام کرنا ہوگا تاکہ اعلیٰ ذہنوں میں شکوک و شبہات پیدا نہ ہوں اور وہ اپنا تاریخی رول ادا کرنے کے لیے تیار ہوتے چلے جائیں۔ اس تحقیقی کام سے اُن میں وسعت نظر اُبھرے گی اور وہ قومی مسائل کو قومی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے خوگر ہو جائیں گے۔

۴ ۔ تعلیمی اداروں میں ایسے اساتذہ کو داخل ہونے کی اجازت نہ دی جائے جو اسلام کے خلاف منفی اور معاندانہ زاویۂ نظر رکھتے ہوں نظریاتی ریاست میں تعلیم و تربیت کا کام انہی افراد کے ہاتھ میں دیا جا سکتا ہے جو اُس نظریے پر یقین اور اس کے لیے دھڑکتا ہوا دل رکھتے ہوں جس نظریے پر ریاست قائم ہے ہر اُستاد کے معاہدۂ ملازمت میں نظریۂ پاکستان پر یقین کو لازمی شرط قرار دیا جائے۔

۵ ۔ خود ساختہ ماہرین تعلیم کے بجائے اُن ماہرین تعلیم کا تعاون حاصل کیا جائے جو واقعی پاکستان اور نظریہ پاکستان کے لیے درد رکھتے ہیں اور گمنامی کی زندگی گزار رہے ہیں تعلیمی وزارت اور اہم تعلیمی دفاتر میں ان اصحاب کے تربیت یافتہ اور نوازش ہائے بیجا سے اُوپر اٹھائے ہوئے افراد موجود ہیں جو اپنے مخصوص نظریات کے مطابق تعلیمی نظام کو چلاتے رہے ہیں، وہ تمام افراد موجود ہیں جو نظریۂ پاکستان کو بے اثر بنانے کی سر توڑ کوششیں کر رہے ہیں مغربی پاکستان میں ایسا بااثر عنصر موجود ہے جو ہر تعلیمی پالیسی کو ختم کرنے کی سازشیں کر رہا ہے اور وہ عنصر بظاہر اپنے آپ کو نئی حکومت کا دوست ظاہر کرتا ہے۔

زیادہ سے زیادہ پانچویں جماعت تک مادری (علاقائی) زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ تیسری جماعت سے اُردو لازمی زبان کی حیثیت سے پڑھائی جائے۔ بچوں کے لیے کتابیں اس طرح تیار کی جائیں کہ دونوں زبانوں کو سیکھتے وقت بچوں کے ذہن پر بوجھ نہ پڑے۔

علاقائی زبانوں کے فروغ میں یہ پالیسی بھی مفید ہو سکتی ہے کہ پی سی ایس افسروں کے لیے اُردو زبان کے علاوہ دو علاقائی زبانوں کی تحصیل بھی ضروری قرار پائے سی ایس پی افسروں کو قومی زبانوں کے علاوہ ایک علاقائی زبان بھی آتی ہو اس طرح انتظامی مسائل کو حل کرنے میں آسانی ہوگی اور علاقائی زبانیں اپنا موزوں مقام بھی حاصل کر لیں گی۔

ابتدائی تعلیم کی اساسی اہمیت کے پیشِ نظر اس سلسلے میں چند حقائق پیشِ خدمت ہیں:

اعداد و شمار کے مطابق ہر ضلع میں ایک ہزار پرائمری (یا پانچ جماعت) سکول میں ایک تعلیم کے سروے کے مطابق ان اسکولوں میں سے صرف ۲۷ فی صد ایسے ہیں جن کی عمارتیں دو تین کمروں پر مشتمل ہیں اور ان کی حالت نسبتاً اچھی ہے۔ ۴۴ فی صد سکول خستہ عمارتوں میں ہیں اور سوت کی کشتی حالت میں مبتلا ہیں۔ ایک بڑی تعداد درختوں کے سائے میں ہے۔ جس سے ہم نے چلچلاتی دھوپ میں بچے جس حالت میں ہوتے ہیں اس کا اندازہ وہ نہیں لگا سکتے جو شہری زندگی کی آسائشوں سے بہرہ ور ہیں۔ بارش ہو جائے، تو چھٹی، گرمی میں شدت پیدا ہو جائے، تو بچوں اور اُستاد کے لیے ٹنڈ منڈ درختوں کے نیچے بیٹھے رہنا محال۔ چنانچہ گرمیوں کے دنوں میں یہ سکول دو تین گھنٹوں سے زیادہ کام نہیں کرتے۔

اب ذرا نصاب کی طرف آئیے معلوم نہیں بچوں کا نصاب کن تقاضوں سے تیار کیا گیا۔ دوسری جماعت کے بچے کو آٹھ کتابیں ایک ڈرائینگ کی کاپی جو کتاب کی طرح بھاری ہوتی ہے، اٹھانی پڑتی ہیں کاپیوں کا بوجھ علاوہ۔ دوسری جماعت کے لیے جو حساب کی کتاب تیار ہوئی ہے اُسے دیکھ کر وحشت ہوتی ہے۔ اتنی لمبی چوڑی اور اس قدر مشکل کہ انسان حیران ہو جائے۔ یہ سب کچھ کس مقصد کے لیے کیا گیا تھا؟ یہ بوجھ ہر جماعت کے ساتھ ساتھ بڑھتا جاتا ہے کوئی معقول آدمی اس بات کا تصور کر سکتا ہے کہ چھ سات برس کا بچہ آٹھ مضامین کی تعلیم حاصل کرے؟ بہت سادہ کام جو اُستاد زبانی بچوں کو کرا سکتا ہے، اسے کتابوں میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ بعض کتابیں امریکہ اور انگلستان کے ماحول اور طریقوں کو سامنے رکھ کر لکھی گئیں۔ اسی حساب کی کتاب میں جو تصویریں دی گئی ہیں انھیں بچے نہیں سمجھتے اور اساتذہ کے الفاظ کی طرف کم توجہ دیتے ہیں۔ ایک اور ستم یہ کہ اکثر کتابیں ایسے افراد نے لکھیں جنھیں بچوں کو پڑھانے کا سرے سے کوئی تجربہ ہی نہ تھا۔ ان کتابوں کو خوبصورت ہونا چاہیے وہ بالکل بے رنگ ہیں۔

اب ذرا اساتذہ پر ایک نظر ڈالیے آپ کو ایک ضلع میں ۱۵ فی صد کے قریب ایسے پرائمری سکول ملیں گے جن میں صرف ایک استاد کام کرتا ہے۔ یعنی پانچ جماعتوں کو جن میں سے ہر جماعت میں آٹھ آٹھ، نو نو مضامین ہیں، ایک استاد اور بعض اوقات وہ بھی ان ٹرینڈ بچوں کو تعلیم دیتا ہے۔ رول ماڈل کا اصول ہے کہ چالیس بچوں پر ایک اُستاد دیا جاتا ہے۔ ایسے اسکول ۵ فی صد سے بھی کم ہیں جن میں ایک جماعت کے لیے ایک اُستاد ہو۔ ابتدائی تعلیم کو جس طرح نظر انداز کیا گیا، اس میں تو ایک جماعت کے لیے کم از کم دو اُستاد ہونے چاہییں۔

اگر پرائمری اسکولوں میں بمشکل ۲ فی صد ایسے اسکول ہوں گے جو پرائمری تعلیم کے تقاضے پورے کرتے ہوں۔ آپ اس ڈھانچے پر کوئی مستحکم عمارت کیونکر تعمیر کر سکتے ہیں؟

پرائمری تعلیم کے سلسلے میں چند تجاویز پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ ابتدائی تعلیم کو تعلیمی بجٹ کا ۵۰ فی صد حصہ ملنا چاہیے۔ یونیورسٹی کیمپس پر کروڑوں روپیہ خرچ کرنے اور اس میں لاکھوں روپے کا غبن ہونے کے بجائے یہ زیادہ مناسب ہے کہ ابتدائی تعلیم کو صحت مند خطوط پر استوار کیا جائے۔ پرائمری اسکولوں کے لیے ایسی عمارتیں تعمیر کی جائیں کہ وہ آنے والے پچیس برسوں کی ضرورتیں پوری کر سکیں۔ ایک عزیب بچے کو اپنی زندگی میں کوئی انقلاب محسوس کرنا چاہیے۔ اگر ہم ابتدائی تعلیم میں کشش، حفظانِ صحت کی سہولتیں اور معیارِ تعلیم کے نمونے پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے، تو فی الواقع ہماری دیہی اور معاشرتی زندگی میں ایک عظیم انقلاب رونما ہو جائے گا۔

۲۔ یہ اصول وضع کیا جائے کہ پرائمری اسکول میں کم از کم تین اساتذہ ہوں گے۔

۳۔ پرائمری جماعتوں کا نصاب تبدیل کیا جائے پہلی تین جماعتوں میں زیادہ اہمیت اُردو، دینیات اور حساب کو دی جائے۔ اُردو کی کتاب میں اسلامی تاریخ کے واقعات، سیرت، ماحول اور حفظانِ صحت کے اصول اور معلومات عامہ دی جا سکتی ہیں۔ بچے کی لسانی بنیادیں مضبوط ہو جائیں، تو باقی مضامین وہ از خود پڑھ لے گا۔ تقسیم سے پہلے دوسری جماعت تک صرف اُردو کی کتاب اور حساب پڑھائے جاتے تھے۔ اُستاد املا اور تاریخ سے پہلے کتاب پڑھاتا تھا اور تاریخ کے بعد حساب۔ دو سال کی محنت سے بچے میں زبان اور حساب کی صلاحیت مضبوط ہو جاتی اور وہ اس کی مدد سے دوسری کتابیں پڑھ لیتا تھا۔ تیسری جماعت میں ضلع کا جغرافیہ شامل کر دیا جاتا۔ آج کے نصاب نے بچے میں معلوماتِ عامہ حاصل کرنے کا شوق تو پیدا کر دیا، مگر زبان اور ریاضی کے معاملے میں وہ بہت پیچھے رہ گیا۔ نصاب کا بوجھ کم ہونے سے اُستاد کے لیے تدریس کا کام آسان اور مفید ہو جائے گا۔

۴۔ پرائمری اسکولوں کے اساتذہ کا وقار اور تنخواہیں خاص اہتمام سے بلند کی جائیں، یعنی ایسا مرتبہ عطا ہو کہ تعلیم یافتہ حضرات پرائمری اُستاد بننے میں فخر محسوس کریں۔ ہمارے خیال میں بی اے بی ایڈ اساتذہ کو پرائمری اسکولوں میں مقرر کیا جائے۔ نفسیاتی اصولوں کا سب سے مفید استعمال تو پرائمری اسکولوں ہی میں ہو سکتا ہے۔ پرائمری اُستاد کو بچوں کی نفسیات اور مضامین کے تدریسی اصولوں کا جس قدر گہرا شعور ہوگا، اُسی قدر وہ بچے کے اندر علم کی وسعتیں اُتار سکے گا۔ اگر اساتذہ ابتدائی آٹھ برسوں میں بچوں کے اندر علم کی چنگاری روشن کرنے میں کامیاب ہو گئے، تو سمجھ لیجیے معاشرے کی فکری اور معاشرتی بنیادیں مستحکم ہو جائیں گی۔

۵۔ ہر بڑے ابتدائی اسکول (ELEMENTARY SCHOOL) میں جو آٹھ جماعتوں پر مشتمل ہوگا، ایک تربیت یافتہ ڈاکٹر مقرر کیا جائے، جو بچوں کی صحت کا خاص خیال رکھے اور جسمانی نشوونما میں ان کی رہنمائی کرے۔

فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم

تعلیم یافتہ افراد کی بے روزگاری بڑا سنگین مسئلہ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق دو لاکھ تعلیم یافتہ نوجوان بے روزگار ہیں اور ہمیں تحقیق و دیگر کے مصنفوں نے اس مسئلے کو ایک نئے انداز سے حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ ہمارے خیال میں طلبہ کے اندر اتنی صلاحیت اور اعتماد و تربیت پیدا کر دی جانی چاہیے کہ وہ اپنے لیے از خود معاش کے راستے بنا سکیں۔ اس مقصد کے لیے ہم تجویز کرتے ہیں کہ:

۱۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ۴۰ فی صد طلبہ اور طالبات کے لیے فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم کی سہولتیں فراہم کی جائیں۔

۲۔ ہائی اسکول زیادہ تر جامع (COMPREHENSIVE) اسکول ہوں۔

۳۔ ٹیکنیکل کالج کا کورس چار برس کا ہو یعنی دو سال بعد ٹیکنیکل ڈپلوما اور چار سال کے بعد بی ایس سی انجینئرنگ کی ڈگری مل جائے۔

۴۔ ہر صوبے میں ٹیکنیکل تعلیم کا ڈائریکٹوریٹ قائم کیا جائے جس کا سربراہ ڈائریکٹر جنرل ٹیکنیکل ہو۔ یہ ڈائریکٹوریٹ ٹیکنیکل تعلیم کے فروغ اور نشو و نما کے لیے مسلسل کام کرتا رہے۔ یہ فنی تعلیم، زراعت، صنعت و حرفت اور کامرس کے شعبوں میں استعداد پیدا کریں۔ ٹیلرنگ اور کشیدہ کاری کی بھی ڈگری ملے۔

۵۔ فنی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے صوبائی اور مرکزی وظائف کا ۵۰ فی صد حصہ ان طلبہ کے لیے مخصوص ہو جو ٹیکنیکل تعلیم حاصل کر رہے ہوں۔

۶۔ ٹیکنیکل کالج میں تربیت کے دوران میں ہر طالب علم دو سال کے لیے منظور شدہ انڈسٹری میں اپرنٹس کے طور پر کام کرے اس عرصے میں اُسے اپرنٹس شپ الاؤنس دیا جائے۔

۷۔ ملک کی اقتصادی منصوبہ بندی اس طرح کی جائے کہ وہ تربیت یافتہ فنی افراد مختلف شعبوں میں زیادہ سے زیادہ فراہم کر سکے۔ یعنی پہلے منصوبہ بندی صرف ضروریات کے نقطۂ نظر سے کی جاتی تھی، اب اس کا زاویہ بدل دیا جائے اور فنی افراد کی فراہمی اس کا مطمحِ نظر قرار پائے۔

اگر یہ منصوبہ عمل جامہ پہن سکے، تو ملک کے بڑے بڑے پیچیدہ مسائل حل ہو جائیں گے مگر ایک پہلو اور بھی قابلِ غور ہے کہ ہائی اسکول اور ماسٹر کالج کو ہماری رائے میں اکٹھا ہونا چاہیے۔ ہمارے دلائل یہ ہیں:

۱۔ ماہرین نفسیات کے مطابق ۱۳ اور ۱۷ سال کی عمر کے بچوں کو یکساں ماحول میں یکجا تعلیم دینی چاہیے

۲۔ ہائی اسکولوں اور ماسٹر کالجوں کو یکجا کرنے سے فنی تعلیم میں سہولتیں پیدا ہوں گی نئی اسکیم کے مطابق زیادہ نمبر لانے والوں کو انٹر پر تعلیم ختم کر دی جانی چاہیے۔ اس طرح ان کے ماحول میں ایک تسلسل موجود رہے گا اور اسکول اور کالج کی زندگی میں جو ایک وسیع فاصلہ ہوتا ہے اور جس کے خطرناک معاشرتی اور اخلاقی نتائج نکلتے ہیں اس سے طلبہ محفوظ رہیں گے

۳۔ بھارت میں انہی مسائل پر حال ہی میں تحقیق ہوئی ہے ۷۶ء میں کوٹھاری رپورٹ منظر عام پر آئی اس میں اعداد و شمار سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ہائی اسکول اور انٹر کالج کی علیحدگی سے دونوں ادارے غیر اقتصادی (UN ECONOM CAL) ہوتے ہیں۔

ہم بڑے اختصار کے ساتھ چند اہم تجویزیں پیش کرتے ہیں؛

۱۔ خواتین کے لیے علیحدہ یونیورسٹی قائم کی جائے خواتین کے لیے نصاب بھی علیحدہ ہو تاکہ انہیں اپنی شخصیت کو نسوانی تقاضوں کے ساتھ نشوونما دینے کا موقع ملے

۲۔ ہمارے تعلیمی زوال کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم نے اپنے بہترین اور تجربہ کار ہزاروں اساتذہ کو پرنسپل، صدر ہائے شعبہ بنا کر ضائع کر دیا ہے کالج میں نئے طلبہ داخل ہوتے ہیں، تو ان کے حصے میں وہ اساتذہ آتے ہیں جو مشکل سے چار یا پانچ برس کے ہوتے ہیں۔ یہ اساتذہ اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے طلبہ میں کچھ ذہن پیدا نہیں کر سکتے ہماری رائے میں وائس پرنسپل، پرنسپل اور صدر شعبہ کو تدریسی کام زیادہ کرنا چاہیے یونیورسٹی میں بھی اسی دستور العمل پر کام کیا جائے۔

۳۔ یونیورسٹی میں تازہ تازہ ایم اے پاس کرنے والوں کو استاد مقرر نہیں کرنا چاہیے اس کے لیے لازم ہو کہ وہ کسی کالج میں کم از کم سات برس پڑھا چکا ہو۔

۴۔ صوبائی محکمہ تعلیم کو تنظیم نو کی ضرورت ہے صوبائی سطح پر تین ڈائرکٹریٹ ہوں؛

(الف) ڈائرکٹر جنرل (اسکول)

(ب) ڈائرکٹر جنرل (کالج)

(ج) ڈائرکٹر جنرل (ٹیکنیکل)

یہ تینوں ڈائرکٹر جنرل براہ راست وزیر تعلیم کے ماتحت ہوں اور صوبائی سیکرٹری تعلیم کی حیثیت کارنیلس رپورٹ کے مطابق ڈائرکٹر جنرل سے کم تر ہونی چاہیے۔

چند اہم تجاویز

صوبے کی تعلیمی سرگرمیوں میں ربط اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے وزیر تعلیم کی صدارت میں تعلیمی کونسل قائم کی جائے۔ جو تمام صوبے کے تعلیمی مسائل پر تحقیق اور غور و خوض کرتی رہے

ماضی میں ہمارے ٹیکسٹ بورڈ کے ذریعے نصابی کتابوں کی اشاعت کا نہایت ہی ناکام اور صورتحال تجربہ کیا۔ یہ بورڈ برسوں سے قوم کو بے وقوف بنا رہا ہے حکومت اسے سوڈش پیپر مفت مہیا کرتی ہے اس نے تو حق سے تیار کی جاتی ہیں کہ ایک بچے کو سال میں چار پانچ بار ایک کتاب کو خریدنا پڑتا ہے۔

ایسے ادارے کو ختم ہونا چاہیے اس کی جگہ وزارت تعلیم میں ایک مخصوص شعبہ قائم ہو جو مختلف جماعتوں کے لیے نصاب کے خاکے تیار کرے اور اس خاکے کے مطابق نمونے کی کتابیں تیار کی جائیں اور غیر عام ناشروں کو اسی معیار کی کتابیں چھاپنے کی اجازت ہو۔ یہ شعبہ جائزہ لیتا رہے گا کہ کوئی کتاب معیار سے گھٹیا تو نہیں چھپتی۔ اساتذہ کو آزادی ہوگی کہ وہ ان کتابوں میں سے کوئی معیاری کتاب اپنے اسکول کے لیے منتخب کریں۔

تعلیمی تبدیلی بڑی احتیاط کا تقاضا کرتی ہے۔ قوم چاروں طرف سے مسائل میں گھری ہے اور نجات دہندوں کی طرف بار بار دیکھ رہی ہے۔

موجودہ نظام تعلیم عام طالب علم کو اچھا مسلمان، سچا پاکستانی بنانے میں کیوں ناکام ہے؟

❀*❀*❀*❀*❀*❀

کیونکہ یہ اسلامی نہیں۔ (ماجد علی زوالوجی)

اس میں آدھا قصور بیمار معاشرے کا ہے۔ (پروین عالم۔ سوشل ورک)

اس لیے کہ یہ اسلامیت اور وطنیت سے خالی ہے (شاہد سلیم سوشیالوجی)

چونکہ یہ نظریاتی نہیں — فرنگیت سے بھرپور ہے (رفیق شاہد۔ سوشیالوجی)

اس لیے کہ یہ نظام ہی غیر فطری ہے (ظہیر گیلانی۔ کیمیکل ٹیکنالوجی)

نظریۂ پاکستان، تحریک پاکستان اور احساس ذمہ داری کی کمی (صالحہ سلیمان صحافت)

شروع ہی سے اسلامیات کو انگریزی سے کمتر حیثیت (خالد حسن فلسفہ) سے متعارف کرایا جاتا ہے۔

چونکہ اساتذہ کی تربیت ہی غلط بنیادوں پر ہے (حسن کاکا خیل۔ ریاضی)

اس لیے کہ یہ نظام تعلیم ہے ہی فرنگی۔ (وقار احمد طبیعات)

یہ نظام تعلیم بنیادی طور پر کلرک فیکٹری ہے (ملک اختر جاوید اقتصادیات)

ہمیں تحریک پاکستان کی قربانیوں کا صحیح شعور نہ ملنے کے سبب (نجم النسا فارمیسی)

چھوٹے میناروں کے بجائے مکمل مسجد بنانے کی ضرورت ہے (اکرم رازی فارمیسی)

آپ کا خیال غلط ہے (روبینہ واسطی سیاسیات)

خدائی خدمت گاروں کا اثر ہو رہا ٹھیک (اشفاق مہر فارمیسی)

یہ نظام تعلیم ان اعلیٰ مقاصد کے لیے بنایا ہی کب گیا تھا (مصطفیٰ میرانی سوشیالوجی)

کتب کی اکثریت "کا ڈھیر" ہے (الیاس احمد زوالوجی)

اس عمر میں ایسی سنجیدہ باتیں مت سوچو۔ (کلیم باتراں۔ فلکیات)

دینی علم اور تحریک پاکستان ہر لحہ لازم ہونا چاہیئے (نصرت پروین فلسفہ)

دھریک نون ہیرٹیس لگیا کر دے۔ (ذوالفقار چودھری صحافت)

چونکہ یہ دینی اور قومی معاملات میں مداخلت نہیں کرتا (مریم خاتون، زوالوجی)

نظام تعلیم بھی تو معاشرتی نظام کا ایک حصہ ہے۔ (حسن نواز تارڑ۔ صحافت)

گر نوجوانوں کو بدمست گھوڑے کی طرح کھلا ہی چھوڑنا۔ (یاسمین حمید فلسفہ) حماقت ہوگا۔

آزادیٔ کشمیر کا واحد حل آپ کی نظر میں ؟

❁❁*❁*❁*

جہاد بالنفس، جہاد بالقلم، جہاد بالسیف (لیاقت بیگ صحافت)

کیسے حسین فقیر سائیں واحد حل دے گئے (راقم الحروف پنجابی)

پاکستان میں مکمل اسلامی نظام کا نفاذ اور جذبۂ جہاد کی بیداری (فرح نوین فارمیسی)

آزادی کا ایک ہی ڈھنگ گوریلا جنگ گوریلا جنگ (بشارت احمد، علوم)

جذبۂ جہاد کے ذریعے (فرمان علی۔ زوالوجی)

دفاعی قوت میں معقول اضافہ اور گوریلا جنگ (سلیم چغتائی زوالوجی)

استصواب رائے (لبنیٰ ملک فارمیسی)

الجزائر اور ویت نام کی طرح تختہ یا تختہ منتخب کیا جائے (رفیق شاہد سوشیالوجی)

"ڈنڈے سے ڈنڈا" (الیاس شیخ زوالوجی)

جس کی لاٹھی اُس کی بھینس (حسن نواز صحافت)

پھر کوئی محمود آئے پھر سے قاسم کوئی (عابدہ سحر۔ صحافت)

تیس سال سے حل ہی تو تلاش ہو رہا ہے (شوکت رانا فارمیسی)

رائے شماری (عتیق النساء۔ باٹنی)

طاقت سے چھینے علاقے طاقت سے واپس (خالد حسن۔ فلسفہ)

واحد حل طاقت کا عقل مندی سے استعمال (سلمیٰ سعید زوالوجی)

جنگ مگر میرے خیال میں اب یہ مسئلہ کم اور سٹنٹ زیادہ ہے (سعید۔ اردو)

آزادانہ استصواب رائے (سمیرہ وحید۔ تاریخ)

عائدہ حکومت۔ مسلح جدوجہد (خالد فاروق نباتیات)

ایک ہی لفظ۔ جنگ (ضیاء السلام سیاسیات)

دو قومی نظریہ سے نئی نسل کو واقف بنایا جائے (طاہر شہناز۔ اقتصادیات)

جہاد ہی ہے زندگی (ارشد چغتائی کیمیکل ٹیک)

جہاد فی سبیل اللہ (حافظ سلمان بٹ سیل کالج)

الجہاد والجہاد والجہاد والجہاد (مقصود احمد سیل کالج)

● ●

کلاس روم میں جنس مخالف کی موجودگی

ذہنی، تعلیمی، اخلاقی رجحان کو ڈسٹرب کرنے کا سبب بنتی ہے ؟

کرتی ہے مگر امر تسری ڈی سے کم (ماجد علی۔ زوالوجی)

اس سے میں زیادہ حقیقت پسند ہو گئی (پروین عالم۔ سوشل ورک)

میں ان بیماریوں سے ابھی تک بچا ہوا ہوں (رفیق شاہد۔ سوشیالوجی)

کچھ گڑبڑ ہوتی رہتی ہے (خالد فاروق باٹنی)

وہی پہ یہ بوجھ نہ ہو، دل کی بے تابی نہ ہو (عابدہ سحر۔ صحافت)

اخلاقی تصورات کسی حد تک منتشر ہوا کرتے ہیں (حسن نواز صحافت)

قدرے توازن کی فضا قائم رہتی ہے (صالحہ سلیمان صحافت)

ذہنی اور تعلیمی رجحان کو یقیناً منتشر کرتی ہے (مہ پارہ ارشد۔ اردو)

اعتباری نظام میں رہیں تو صحرا میں میٹر (فرخ۔ فارمیسی)

جنسِ مخالف کی موجودگی میں صنفِ نازک ٹیلنٹ کا خوبی سے استعمال کرنے کی صلاحیت بہر حال نہیں رکھتی جو کہ قدرتی امر ہے (میمونہ شہزادی تعلیم و تحقیق)

مخلوط تعلیم میں علم کا حصول جوئے شیر لانے کے مترادف (ضیاء السلام ملک سیاسیات)

سو فی صد درست ہے فرمایا ہوا آپ کا (الیاس شیخ۔ زوالوجی)

سارا وقت شخصیت جاذب نظر بنانے میں گزر جاتا ہے (محمد اسلم۔ پنجابی)

کبھی کبھار ذہنی، اخلاقی، تعلیمی تصور کو منتشر کرتی رہتی ہے (مریم خاتون زوالوجی)

عموماً لوگ بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کی فکر میں رہتے ہیں (مہر عبدالغفار عربی)

یقیناً درست کہا آپ نے (سعید طفر اردو)

ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی (بشریٰ ناہید اردو)

اگر صحت مند بنیادوں پر ہو تو آدمی انسان بن جاتا ہے (خالد حسن قریشی علم)

مخلوط تعلیم نہیں ہونی چاہیئے۔ (مس کاکاخیل۔ ریاضی)

"ٹاپ سیکرٹ" (یاسمین حمید۔ فلسفہ)

اگر خیالات منتشر ہونے لگیں تو مطالعہ حصار بنتا ہے (قمر السلام۔ اقتصادیات)

خاموشی سے جوائس یونیورسٹی منوا لیجئے (ماجد عرفان سیل)

● ●

زندگی کا سوال درپیش ہوتا پھر حل حروف میں لکھا ہوا آتا پھر کیا ہوا ______ اگلی بار آ کر دیکھیے۔ جب اندھیرا چھا جاتا تو چوروں کی طرح بورڈنگ میں داخل ہو کر اپنے کمرے میں پڑ رہتا۔

مجھے آوارہ گردی کا شوق نہ تھا یہ بورڈنگ کے ماحول سے فرار کا واحد راستہ تھا رہا سینما دیکھنا احساس کمتری کا مارا ہوا ہر شخص بہادروں کے کارنامے دیکھنے کا شوق رکھتا ہے خود کو بہادر سے (IDENTIFY) کر کے چند گھنٹوں کی عیاشی کر لیتا ہے اس کے لیے احساس کمتری سے ذہنی مخلصی یا لباس سے بڑی عیاشی ہوتی ہے۔

اسلامیہ کالج کے بعد سکھ سندو سبھا کالج امرتسر میں داخل کروایا گیا۔ سندو سبھا کالج میں مسلمان طلبا کو داخل کرنے کی اجازت نہ تھی خصوصی داخلہ کے لیے بورڈ کی منظوری لینا پڑتی تھی مجھے اجازت اس لیے ملی کہ پرنسپل میرے والد کے دوست تھے سارے کالج میں صرف چار مسلمان طالب علم تھے جو ہوسٹل میں مقیم تھے۔

ہوسٹل کالج سے آدھ میل دور شہر کے کنارے پر لق و دق ویرانے میں واقع تھا۔ ہوسٹل میں چالیس لڑکے رہتے تھے جن میں صرف چار مسلمان تھے پینتیس برہمنوں میں چار شودر تھا دو جانے میں داخل ہونے کی ہمیں اجازت نہ تھی۔ ڈائننگ ہال پر بیٹھ کر کھانا کھانا ممنوع تھا ہمیں کے برتنوں کو ہاتھ لگاتے تو بھرشٹ ہو جاتے لہذا ہمیں اپنے برتنوں کا خود انتظام کرنا پڑتا نوکر ہمارے برتنوں کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے خود ہی انہیں دھونا پڑتا بورڈنگ میں گوشت لانا پکانا کھانا منع تھا

ہوسٹل ایک پرانی بوسیدہ کوٹھی میں تھا اسے آموں والی کوٹھی کہا جاتا تھا چونکہ وہاں آموں کے پیڑ تھے اور سانپ بکثرت تھے ہم چاروں کا شغل سانپ مارنا اور چرا کر آم کھانا تھا۔

روز ہم سولہ سترہ میل پیدل چلتے تھے چونکہ کالج پہنچنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ ان دنوں بسیں اور ٹیکسیاں نہ تھیں۔ سڑک پر صرف دو ہی سواریاں تھیں تانگہ اور ریل گاڑی۔

پڑھنے پڑھانے کا وقت کہاں ملتا تھا میں چار کھنٹے تو پیدل چلنے میں صرف ہو جاتے ہوسٹل میں پہنچتے تو تھک کر چور ہوتے پھر کھانے میں دال اور پھلیاں دال اور پھلیاں کھانے کے بعد مطالعہ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

تفریح کی صرف ایک صورت تھی پرنسپل اپنی لینڈو میں بیٹھ کر ہوسٹل کا وزٹ کرنے آتے ان کا انتظار کھینچتے جب وہ واپس جاتے تو ہم ان کی لینڈو کی بیک سیٹ پر بیٹھ جاتے باری باری دو بیٹھتے دو لینڈو کے پیچھے بھاگتے یوں شہر پہنچتے اور کسی تھیٹر یا سینما میں جا گھستے آخری دنوں میں جب امتحان قریب آ گئے تو پرنسپل صاحب سیر و تفریح کے لیے نہ ہوسٹل آنے لگے اور ہم تفریح کے لیے مجبور ہو گئے علاقہ کیوں سمت کیسے کرتے۔

سندو سبھا کالج میں ایک سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہاں احساس کمتری کی شدت میں تھوڑی سی تخفیف ہو گئی یہ تخفیف وقتی تھی دائمی نہیں یہ عقدہ آج تک نہیں کھلا کہ میں ایف اے میں پاس کیسے ہو گیا۔

احساس کمتری کی شدت کے علاوہ میری ایک اور مشکل بھی تھی مجھے عشق کرنے کا جنون تھا ہر چلتی پھرتی لڑکی کو دیکھ کر مجھے اس سے عشق ہو جایا کرتا تھا شکر ہے ان دنوں چلتی پھرتی لڑکیاں سر عام نظر نہیں آتی تھیں یا شاید اسی وجہ سے ہو جایا کرتا تھا

۱۹۲۱ء میں لاہور میں انارکلی بازار میں کسی کوئی برقعے میں ملبوس لڑکی ہی نظر نہیں آتی تھی ان دنوں انارکلی لاہور کا جدید ترین علاقہ تھا جہاں رونق ہوتی تھی

مال روڈ اور میکلوڈ روڈ ویران تھے مال اور میکلوڈ کے درمیانی آبادیاں وجود نہیں رکھتی تھیں ادھر مزنگ کا اور اچھرے کا گاؤں تھا ادھر قلعہ گوجر سنگھ کا سرکلر روڈ پر تانگے چلتے تھے ہیرا منڈی آباد تھی گانا سننے کے لیے ہیرا منڈی جانا پڑتا تھا۔ ریڈیو ابھی نہیں چلا تھا اردو فلم کا وجود نہ تھا لڑکی دیکھنے کے لیے ڈبی بازار جانا لازم تھا والڈ سٹی کے محلوں میں لڑکیاں تو تھیں لیکن انہیں کھڑکیوں میں آنے کی اجازت نہ تھی۔ محلے کے بڑے بوڑھے ہر راہ گیر کو کڑی نگاہوں سے دیکھتے تھے کون ہے ادھر کیوں آیا ہے نگاہوں میں سر تو نہیں کھلے سے گزر جانا دل گردے کا کام تھا۔

پتہ نہیں یہ عشق کی بیماری مجھے کیوں لگی تھی شاید اس لیے کہ میں بچپن سے جنس زدہ تھا گھر کے ماحول کو دیکھ کر مجھے جنس سے نفرت ہو گئی تھی یہ نفرت اتنی شدید تھی اتنی شدید تھی کہ جنس میرے لیے (OBSESSION) ہو کر رہ گئی۔ اس جنس زدگی کے کوائف بھی عجیب سے تھے

پتہ نہیں ہوا کیا جسم کو جنس سے نفرت رہی، ذہن کشش سے بھر گیا

یا شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں عشق کے ذریعے انتقام لے رہا تھا اپنے والد کو سمجھا رہا تھا کہ اے اللہ کے بندے عورت خوش وقتی کے لیے نہیں ہی عشق کرنے کے لیے ہی ہے اس سے عشق کر ذاس کے لیے آہیں بھر اس کے ہجر میں جلو سب کچھ تیاگ کر اس کی جو کھٹ پر جا بیٹھو اسے فرشتوں کی سی پاکیزگی بخش کر خود پر حرام لو۔

میری تعلیم ادھوری رہنے کی ایک وجہ عشق بھی تھا اس زمانے میں عشق کرنے کے لیے لڑکی ملتی نہ تھی خوش قسمتی سے مل جاتی یعنی ایک جھلک پر گزارا کرنا پڑتا یہ جھلک بھی نیم جھلک ہوتی چونکہ درمیان میں یا تو برقعے کا پردہ حائل ہوتا اور یا کھڑکی کی چق۔

اس زمانے میں لڑکیاں بندشوں کی وجہ سے مظلوم تھیں آج آزادی کی وجہ سے مظلوم ہیں اس مخلوق کی قسمت ہی میں مظلومیت لکھ دی گئی ہے۔

امرتسر میں میں ایک سفید دھبہ اور سنہری لٹ پر عاشق ہو گیا نیم جھلک میں یہی کچھ نظر آیا تھا چہرے کا ایک سفید دھبہ اور سنہرے بالوں کی ایک لٹ مجھے علم نہ تھا کہ وہ کیسی ہے کون ہے کہاں رہتی ہے عشق کے لیے یہی بہت کچھ ہوتا ہے۔ لہذا دو سال اسی پر گزارا کیا آگے اللہ مالک تھا

بی اے میں میں پھر سے اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہو گیا اسلامیہ کالج کی وہی سرتال تھی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی اس لیے پھر سے شدت احساس کمتری بیدار ہوا۔

اول تو جماعت میں جانا مشکل تھا اگر دل کڑا کر کے پہنچ جاتا تو بلیک بورڈ کے پیچھے چھپا رہتا اور وہاں بیٹھ کر کسی سفید دھبے اور سنہری لٹ کے خیالوں میں کھو جاتا۔

انہی دنوں میری زندگی کا ایک عظیم حادثہ عمل میں آیا کمبائنڈ آرٹس کالج کا ایک طالب علم ہوسٹل میں میرے ساتھ والے کمرے میں آ گیا اس کا نام فیاض محمود تھا وہ میرے گاؤں بٹالے کا رہنے والا تھا۔ ایک اونچے اور معروف خاندان سے تھا جسے ہم اچھی طرح سے جانتے تھے

فیاض محمود کا زندگی میں صرف ایک کام تھا کتابیں پڑھنا وہ دن رات صبح شام ہر وقت پڑھنے میں مصروف رہتا تھا اس کا کمرہ کتابوں جدید ترین رسائل اور ورلڈ کلاسیکس تصاویر سے بھرا رہتا تھا۔ اس کے مطالعے کا مرکز درسی نہ تھا وہ انگریزی ادب کی ہر کتاب پڑھنے کا دلدادہ تھا چاہے وہ کورس سے متعلق ہو یا غیر متعلق اس کے مالی حالات اچھے تھے اس کے ہاتھ جو رقم اسے ہاتھ لگتی اس کی کتابیں اور رسائل خرید لیتا۔ کتاب اس کے لیے سب سے بڑی عیاشی تھی۔

محمد حسن
مستقل ادارہ تعلیم و تحقیق پنجاب یونیورسٹی

صاحبِ تفہیم القرآن کے تعلیمی نظریات

معاملہ فلسفۂ حیات کا ہو یا فلسفۂ تعلیم کا حقیقت کی تلاش اہم حیثیت رکھتی ہے کیونکہ جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ حقیقت کیا ہے اس وقت تک زندگی کا صحیح لائحہ عمل مرتب نہیں ہو سکتا۔ یہ نظام کائنات الل ٹپ چل رہا ہے یا کسی بندھے ٹکے اصول کے مطابق چل رہا ہے؟ اگر کوئی اصول ہے تو اس کی نگہداشت کون کر رہا ہے؟ انسانی عقل اس عقدے کو حل کرنے کے لیے زمانۂ قدیم سے سعی کر رہی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ عالم خود بخود وجود میں آیا ہے اور کسی روز خود ہی ختم ہو جائے گا۔ ایک گروہ کی رائے میں یہ عالم کائنات مصنوع تو ہے، لیکن صانع کو اس سے کوئی سروکار نہیں۔ اس کے برخلاف ایک عقیدہ یہ ہے کہ کائنات کا ایک خالق ہے جس نے حکمت کے ساتھ اس کی تخلیق کی ہے۔ اسی حکمت و تدبر کے ساتھ اس کا نظام چلا رہا ہے، اور جب چاہے گا اس نظام کو ختم کر دے گا۔

سید مودودی تصورِ حقیقت کے متعلق مؤخر الذکر مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے محققانہ انداز میں اس تصور کی وضاحت کی ہے کہ یہ نظام کائنات خود بخود نہیں چل رہا ہے اور اس کو چلانے والی مدبر قوت خدا کی ذات ہے۔ اس کے سامنے باقی تمام طاقتیں ہیچ ہیں۔ وہ پورے اختیارات کا مالک ہے۔ اسی کے حکم کے تحت یہ دنیا کا کارخانہ چل رہا ہے۔ وہی اس پورے نظام کو پیدا کرنے والا ہے۔ کوئی دوسرا خلق و تدبیر میں اس کا شریک نہیں، نہ ہی اس کی ربوبیت میں کوئی حصہ دار ہے۔ اس پورے نظام کائنات میں اسی کا حکم چلتا ہے۔ اس نے انسان کو اپنی قدرت و حکمت سے وجود بخشا لہٰذا انسان کا معبود بھی وہی ہے۔ انسان کے لیے لازم ہے کہ اسی کو اپنا آقا و مالک سمجھے۔ انسان کا تعلق اپنے مولا سے عبدیت کا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس کی معرفت اور رضا حاصل کرنے میں ہمہ حال مشغول رہے۔ بندہ ہونے کی حیثیت سے اس کو اپنے ارادہ و اختیارات سے دستبردار ہو جانا چاہیے۔ پس انسان کو چاہیے کہ وہ ایسا علم حاصل کرے جس سے عبدیت کے تمام تقاضے پورے ہو سکیں۔[1]

سید مودودی کا یہی تصورِ حقیقت دراصل ان کے تمام تصورات و نظریات کا سرچشمہ ہے۔

تصورِ کائنات

یہ نظام کائنات بھی ایک عجب کارخانہ ہے۔ جس کی حقیقت کو معلوم کرنے کے لیے انسانی عقل ابھی تک سرگرداں ہے۔ انسانی طبقے نے ہر دور میں اس کے بارے میں مختلف نظریات قائم کیے ہیں۔ بعض نے اس کو ایک اتفاقی حادثہ مانا ہے۔ ان کے نزدیک اس کا نظم و ترتیب بھی کسی حادثے کی پیداوار ہے۔ اس کائنات میں انسان کا وجود بھی کسی حادثے کا پیدا کردہ ہے۔ انسان اور اس کائنات کے درمیان تعلق صرف خواہشات طبعی کی تکمیل کا ساماں بہم پہنچاتا ہے۔

بعض نے کائنات کو ایک وجود کا مظہر قرار دیا ہے۔ دریا، درخت، پہاڑ، چاند اور خود انسان بھی اسی ایک واحد وجود کے جلوہ نما ہیں جن کی اپنی کوئی حیثیت اور وجود نہیں ہے اور نہ ہی وہ کسی ارادے کے مالک ہیں۔ ایسے میں کسی کی کوئی ذمہ داری ان پر نہیں۔ ان کا عمل خدا کا عمل، ان کی حرکت خدا کی حرکت اور ان کا ارادہ خدا کا ارادہ ہے۔ اس طرح انسان اور کائنات میں کوئی تعلق ممکن ہی نہیں۔

بعض کے نزدیک کائنات کی ہر وہ شے ایک الٰہ ہے جس میں کچھ طاقت یا نفع کا پہلو موجود ہے، چنانچہ دریا اگر ستانے جائے تو معبود ہے۔ آگ اگر جلا سکتی ہے پرستش کے قابل، سانپ اگر کاٹ لیتا ہے، تو لائق تعظیم و عبادت ہے۔ غرض کائنات کی ہر شے مخدوم اور انسان اس کا خادم ہے۔

ایک اور مکتب فکر کے علمبرداروں مثلاً ہیگل اور مارکس نے بھی کائنات کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے اپنے فلسفے کو اس بنیاد پر چلایا کہ دنیا ہمیشہ سے قائم ہے۔ دنیا کا نظام کبھی ختم نہیں ہوگا بلکہ ہمیشہ قائم رہے گا۔ اس کے ختم ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں سید مودودی کی رائے ہے کہ یہ نظام کائنات کسی حادثے کی پیداوار نہیں، بلکہ اس کو بنانے والے نے ارادتاً بنایا ہے۔ ذرّے سے لے کر آفتاب عالم تک ساری کائنات ایک بندھے ٹکے اصول اور قانون کے تحت چل رہی ہے۔ یہ قانون سب پر حاوی ہے جو چیز بھی اس قانون سے روگردانی کرے گی چاہے پتھر ہی کیوں نہ ہو، اس کو تباہ و برباد ہونا ہے۔[2]

بعض مفکرین نے کائنات کو الگ الگ اجزاء میں تقسیم کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ ایک جزو کا دوسرے جزو سے کوئی تعلق نہیں۔ ہر ایک اپنے الگ اصول اور ضابطے کے تحت چل رہا ہے۔ اس سلسلے میں سید مودودی فرماتے ہیں:

کائنات علیحدہ علیحدہ مستقل الوجود اجزاء پر مشتمل نہیں، بلکہ وہ ایک کل ہے جس کے تمام اجزاء ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں۔ زمین کا ایک ذرّہ مریخ اور عطارد کے ذرات سے ویسا ہی تعلق رکھتا ہے جیسا سر کا ایک بال میرے ہاتھ کے ایک رونگٹے سے رکھتا ہے گویا پوری کائنات ایک جسد واحد ہے اور اس کے اجزاء میں باہم

١۔ قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں، ص ۲۷، ۳۰، ۱۰۴۔
٢۔ سید مودودی، تفہیمات، جلد اوّل، ص ۴۰۔

ٹھیک اسی طرح سے جیسا کہ ایک جسم کے اجزا میں ہوتا ہے پھر جس طرح کائنات کے اجزا میں رابطہ اور تسلسل ہے اسی طرح ان واقعات میں بھی رابطہ اور تسلسل ہے جو اس دنیا میں پیش آتے رہتے ہیں دنیا کا کوئی چھوٹا یا بڑا واقعہ بجائے خود ایک مستقل واقعہ نہیں ہے، بلکہ وہ تمام کائنات کے سلسلہ واقعات کی ایک کڑی ہے اور اس کی مصلحت کے تحت صادر ہوتا ہے جس کو پیش نظر رکھ کر خداوند عالم نے اپنی اس غیر محدود سلطنت کو چلانے رکھا ہے ۱

سید مودودی کی رائے میں یہ کائنات ایک عارضی سلسلہ ہے اسے ایک نہ ایک دن ختم ہونا ہے سائنس نے بھی ثابت کر دیا ہے کہ کائنات کی ایک خاص حد ہے جہاں پہنچ کر وہ فنا ہو جائے گی اس کائنات کی خلاف عالی ہستی ہی ایک ہے۔ باقی سب فانی ہیں محدود ہیں انسان کا تعلق اس کائنات کے ساتھ صرف طبعی خواہشات کی تکمیل نہیں ہے بلکہ یہ کائنات انسان کے لیے مسخر کر دی گئی ہے ۲

تصورِ انسان تخلیق انسان کا معاملہ ان سوالات میں سے ایک ہے جو مدتوں سے کوتاہ عقل کے پیمانے میں محدود رہتا ہے انسان کی تخلیق کے بارے میں ہر دور میں الگ الگ نظریے قائم کیے گئے کسی نے انسان کو مادی نظام کائنات کی طرح ایک حادثہ قرار دیا ہے گویا انسان خود بخود پیدا ہو گیا ہے۔ اس کے بعد کرنے میں کسی بلند و بالا ہستی کا نام نہیں۔ ڈارون نے انسان کو خدا کی روح عالم قرار دیا اور کہا کہ خدا انسان کو خود اپنی تکمیل کا آلۂ کار بنا رہا ہے تاریخ کے میدان میں انسان محض ایک بے شعور، بے اختیار، بے ارادہ ہتھیار ہے اور وہ خدا ہی ہے جو انسانوں کے واسطے سے مقصد و فکر پیش کرتا ہے، ان کو لڑاتا ہے اور پھر ان کے درمیان مصالحت فکر و خیال کی نئی صورتیں پیدا کرتا رہتا ہے

مارکس کے نزدیک انسان ایک حیوان طبعی ہے جو خواہشات کو پورا کرتا ہے، گویا وہ صرف انسان کے مادی ڈھانچے کو دیکھتا ہے۔ اس کی روح تک اس کی رسائی نہیں۔ اس کی رائے میں انسان کو عقل و استدلال، فکر و شعور، مشاہدہ، وجدان، تحقیق اور تخلیق کی جو قوتیں دی گئی ہیں، وہ سب دراصل اس حیوانِ طبعی کی خواہشات، اغراض اور ضروریات کو پورا کرنے میں لگی ہوئی ہیں۔ انسان کے لیے ضروری ہے کہ اس کے مطابق اخلاق اور اصول کو وضع کر کے زندگی کے راستے کا تعین کرے۔

تصورِ انسان کے سلسلہ میں سید مودودی ایک جامع نقطۂ نظر رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ انسان کسی مادے سے خود بخود پیدا نہیں ہو سکتا:

حیات کی پیدائش کے لیے جتنے عوامل درکار ہیں، ان سب کا ٹھیک ٹھیک تناسب کے ساتھ بالکل اتفاقاً جمع ہو کر زندگی کا آپ سے آپ وجود میں آ جانا، دہریوں کا ایک غیر علمی مفروضہ تو ضرور ہے، لیکن اگر ریاضی کے قانونِ بخت و اتفاق (LAW OF CHANCE) کو اس پر منطبق کیا جائے، تو اس کے وقوع کا امکان صفر سے زیادہ نہیں۔ اب تک تجربی طریقے پر سائنس کے معملوں (LABORATORIES) میں بے جان مادے سے جاندار مادہ پیدا کرنے کی جتنی کوششیں بھی کی گئی ہیں، تمام ممکن تدابیر استعمال کرنے کے باوجود وہ سب قطعی ناکام ہو چکی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ جو چیز پیدا کی جا سکی ہے وہ صرف وہ مادہ ہے جسے اصطلاح میں D N A کہا جاتا ہے۔ یہ وہ مادہ ہے جو زندہ خلیوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ جوہرِ حیات تو ضرور ہے، مگر خود جاندار نہیں۔ زندگی اب بھی بجائے خود ایک معجزہ ہے جس کی کوئی توجیہ اس کے سوا نہیں کی جا سکتی ہے کہ یہ ایک خالق کے امر، ارادہ اور منصوبے کا نتیجہ ہے ۲

سید مودودی کے نزدیک انسان کو پیدا کرنے والی ہستی صرف خدا ہے جس نے اس کو ایک منصوبے اور ارادے کے طور پر پیدا کیا۔ یہ صرف حیوانی وجود نہیں ہے بلکہ یہ ایک روحانی وجود بھی رکھتا ہے جو اس کے حیوانی قالب کے اندر رہتا ہے اس کا مقصد صرف جسمی ضروریات کی تکمیل نہیں ہے عقل، تمیز، اکتساب علم اور فیصلے کی قوت دے کر ایک حد تک خود اختیاری عطا کی گئی ہے اللہ تعالیٰ دوسرے حیوانات کی طرح اسے لگے بندھے راستے پر نہیں چلاتا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسے کوشش کی قوت دے کر دنیا میں چھوڑ دیا ہے تاکہ وہ اپنی کوشش ہی سے زندگی کا راستہ اختیار کرے" اسی خود اختیاری کی حامل اور اسی کوشش کی قوت رکھنے والی اور اپنی کوشش کے لیے خود ہی سمت اور راستہ منتخب کرنے والی روح کا نام انسان ہے ۳ چونکہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنا نائب مقرر کیا ہے اس لیے یہ اس کا فرض ہے کہ وہ اس منصب کے متعلق اپنی ذمہ داری پوری کرے جو کام اس کے سپرد کیا گیا ہے اس کو فرض شناسی اور وفاداری کے ساتھ سر انجام دے۔ انسان کو ایسا علم دیا گیا ہے جو فرشتوں کو بھی نہیں ملا۔ گویا انسان کی ہستی ایک طرح سے کائنات میں بلند و بالا ہستی ہے پس انسان کا مقصد اس دنیا میں صرف اور صرف یہ ہونا چاہیے کہ وہ رضائے الٰہی حاصل کرے اپنے علم کو بروئے کار لاتے ہوئے دنیا اور آخرت میں کامیاب اور کامران ہونے کی کوشش کرے ۲

علم کیا ہے؟

فلسفۂ تعلیم میں علم کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں ہر ایک ماہرِ تعلیم نے علم کی تعریف اپنے حالات کے مطابق کرنے کی کوشش کی ہے اکثر مغربی ماہرینِ تعلیم کے نزدیک چونکہ انسان کا تعلق خدا سے نہیں، بلکہ اس کائنات ہی کے ساتھ ہے لہٰذا ان کی بیان کردہ تعریفوں میں روحانی پہلو غائب ہے اسلامی نقطۂ نظر سے علم ایک عطیہ الٰہی ہے لہٰذا علم اس چیز کا نام ہو گا جس سے تعلق بالله پیدا ہو سید مودودی کے نزدیک اس وقت کے علماء دینی اور علوم دینیہ کے ماہرین ایک تاریک دنیا میں رہتے ہیں ان کے نزدیک نئی نئی ایجادات کر لینا اور معاشیات، مالیات، قانون اور فلسفہ میں مہارت حاصل کر لینا ہی علم ہے علم کے اعتبار سے وہ جاہل ہیں اور انسان کو علم کی ہوا تک نہیں لگی ہے علم سے مراد دینی کتب

۱۔ تفہیمات، جلد اول ص ۱۴۔
۲۔ حوالۂ مذکورہ بالا۔ ۱۔ سید مودودی تفہیم القرآن جلد سوم، ص ۵۹۳۔
۱۔ فاران، کراچی اگست ۱۹۷۳ء ص ۵۴۔
۲۔ تفہیم القرآن جلد سوم ص ۵۹۳۔ ۳۔ ایضاً ص ۵۱۱۔

پوشیدہ صلاحیتوں کی نشوونما

سید مودودی کے نزدیک تعلیم کا اولین مقصد معرفتِ الٰہی کا حاصل کرنا ہے جو ایک ہمہ گیر مقصد ہے۔ مزید برآں ان کے نزدیک تعلیم کا مقصد یہ بھی ہونا چاہیے کہ انسان کی جملہ صلاحیتوں کی اس طرح نشوونما کی جائے کہ وہ سوسائٹی کے لیے مفید اور کارآمد اور انسانی زندگی میں پاکیزگی، اور اصلاح و ترقی کا ذریعہ بن سکیں ۳

کلچر کی منتقلی

تعلیم کسی تہذیب اور کلچر کی آئینہ دار ہوتی ہے تعلیم کا مقصد، صرف کلچر کو زندہ رکھنا بلکہ اس کو آئندہ نسلوں میں منتقل کرنا بھی ہے ہمارے نظامِ تعلیم کا یہ مقصد ہونا چاہیے کہ زندگی جس نظریے اور نصب العین کے تحت چل رہی ہے، انہی بنیادوں پر اسے ترقی دے۔ زندہ قومیں انہی اغراض و مقاصد کے تحت اپنا الگ مستقل نظامِ تعلیم قائم کیا کرتی ہیں ۱

تعمیرِ اخلاق

تعلیم کا مقصد ایسے افراد تیار کرنا ہے جو اپنی قومی تہذیب اور دین پر سچے دل سے ایمان لا کر اس کے اصولوں کو ٹھیک ٹھیک جان سکیں۔ اسی کے مطابق مضبوط اور سیرت اور قابلِ اعتماد اخلاق رکھتے ہوں اور ایسی اہلیت کے مالک ہوں کہ اجتماعی زندگی کو اسی تہذیب اور اصولوں کے مطابق چلا سکیں۔

لیڈرشپ کی تربیت

تعلیم کا مقصد ایسے افراد کو تیار کرنا ہے جو دورِ جدید میں دینِ حق کے اصولوں کے مطابق ٹھیک ٹھیک دنیا کی رہنمائی کرنے کے قابل ہوں ۲

گویا تعلیم کا اہم مقصد بہترین شہری پیدا کرنا ہے تاکہ وہ دنیا کی امامت کرنے کے قابل بن سکیں جس قوم کا مقصد دنیا میں لیڈرشپ حاصل کرنا ہے، وہ اپنی تعلیم کو اس طرح استوار کرتی ہے جس سے یہ مقصد پورا ہو جاتا ہے تعلیم کا سب سے بڑا مقصد ایسے افراد کی تربیت ہے جو دنیا کی رہنمائی کر سکیں مقصدِ تعلیم میں اس کو مدِنظر رکھنا لازمی ہے۔

اوپر وہ عام مقاصدِ تعلیم بیان کیے گئے ہیں جنہیں سید مودودی نظامِ تعلیم کی اساس قرار دیتے ہیں علاوہ ازیں سید صاحب نے الگ الگ شعبوں کے لیے تعلیم کے مقاصد بھی بیان کیے ہیں ان کے نزدیک اعلیٰ تعلیم کا مقصد ایسے مسلمان پیدا کرنا ہے جو اعلیٰ دماغی تربیت حاصل کر کے ایک صالح نظام اور اخلاقی تعمیر کے لیے علمی دنیا میں اپنی قابلیت کا سکہ بٹھا سکیں ان کے اخلاقی اوصاف قرآن اور حدیث کے مطابق ہونے چاہئیں ان میں صلاحیت ہونی چاہیے کہ وہ مشکلات کا مقابلہ کر سکیں ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے رزق کے لیے تگ و دو کرنے والے ہوں ۱

سید مودودی نے ابتدائی جماعتوں میں تعلیم کے حسبِ ذیل مقاصد بیان کیے ہیں ۲

۱۔ شائستگی پاکیزگی، صفائی، تمیز جس وضع اور ذوقِ سلیم

۲۔ اخلاقِ حسنہ، انفرادی، عائلی اور اجتماعی۔

۳۔ انضباط (DISCIPLINE) باقاعدہ، اور مہذب طریقے سے سوسائٹی میں رہنے اور کام کرنے کے ڈھنگ۔ محاسبہ نفس کی عادت، احساسِ فرض، احساسِ ذمہ داری

۴۔ وسعتِ قلب، وسعتِ نظر، وسعتِ تصور، بلند حوصلگی، خودداری۔

۵۔ عزم و ارادہ کی پختگی، متانت و سنجیدگی (SERIOUSNESS) خلوصِ نیت اور یہ ضروری صفت کہ جس معاملہ سے بھی دلچسپی لیں، اس میں ان کی دلچسپی سطحی نہ ہو۔

۶۔ جرأت و دلیری جفاکشی، چستی، ہر نوع کا کام کر لینے کی صلاحیت، زندگی کے ہر پہلو سے کچھ نہ کچھ واقفیت (نہ صرف معلومات کی حد تک بلکہ عملاً بھی)۔

۷۔ اسلامی نصب العین کا عشق اور گہرا اسلامی جذبہ جو خون و روح اور قلب میں اترا ہوا ہو جس کا اظہار بچوں کی تمام حرکات و سکنات سے ہو۔

۸۔ جماعتی زندگی کے لیے وہ مناسب اوصاف جو قرآن و حدیث میں بیان کیے گئے ہیں۔

۹۔ اسلامی اوزان اور پیمانوں (ISLAMIC STANDARD OF WEIGHT & MEASURE) سے ہر چیز کو ناپنے اور تولنے کی عادت۔

۱۰۔ ضروری انتظامی صلاحیت۔

۱۱۔ تجسس و تحقیق اور تفکر و مشاہدہ کی عادت۔ کھلے کانوں اور کھلی آنکھوں کے ساتھ دنیا میں رہنا، باقاعدگی کے ساتھ سوچنا، استدلال کرنا اور پرکھنا۔

نصابِ تعلیم

تعلیم کے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے نصاب کا موزوں انتخاب ضروری ہے۔ بے نصاب نظام مقاصدِ تعلیم کو پورا نہیں کر سکتا سید مودودی نے جس دور میں پرورش پائی وہ غلامی کا دور تھا۔ اس وقت ہندوستان میں دو قسم کے نظام ہائے تعلیم رائج تھے ایک تو وہ نظام جو سمندر پار سے آنے والی قوم نے اپنے خاص مقاصد کو پیشِ نظر رکھ کر رائج

۳۔ ایضاً ص ۵۷۔

۱، ۲۔ تعلیمات ص ۱۴۲۔

۳۔ ایضاً ص ۱۶۸۔

۱۔ تعلیمات ص ۱۰۸۔

۲۔ ایضاً، ص ۱۱۱، ۱۱۲۔

گیا تھا۔ دوسرا وہ نظامِ تعلیم جو قدیم طرز پر چل رہا تھا اور مسلمان اس کو ۔ نا نہیں چاہتے تھے۔

یہ دونوں نظام ہائے تعلیم ایک زندہ قوم کے مقاصد کو پورا نہیں کرتے تھے۔ اس پر سید مودودی نے تنقیدی نظر ڈالی اور جائزہ لیا کہ اس میں کیا رد و بدل کیا جائے۔ سید مودودی جانتے ہیں کہ جدید نظامِ تعلیم کو ہم نے مغرب سے اس حالت میں لیا ہے کہ اس کو خدا پرستی سے کوئی تعلق نہیں۔ صرف ہم نے دینیات کا ایک کورس اس میں شامل کر لیا ہے۔ سید صاحب اس پیوند کاری کو درست نہیں سمجھتے۔ ان کے خیال میں تعلیم میں متضاد عناصر کی آمیزش اصولی حیثیت سے غلط ہے۔ سید صاحب کے نزدیک ہر نظامِ تعلیم کسی تصور کا حامل ہوتا ہے۔ دنیا کی کسی درس گاہ میں ایسی تعلیم نہیں دی جاتی جس میں کوئی ضد تصور ... در حاصل صورت۔ سو جس کا انتخاب تصور کی مناسبت سے کیا جاتا ہے ہم نے دینیات کا الگ کورس رکھ کر طلبہ کو ذہنی کشمکش میں مبتلا کر دیا۔ تصور کو زندہ رکھنے کے لیے نظامِ تعلیم میں تبدیلی ناگزیر ہے[1]۔ سید صاحب کی رائے ہے کہ دینیات کو ضمن تعلیمی نصاب کی گردن کا قلادہ بنا کر لٹکا دینے کا کوئی فائدہ نہیں فرماتے ہیں: اس کو پورے نظامِ تعلیم میں اس طرح اتار دیجئے کہ وہ اس کے دورانِ خون، اس کی رگ رگ کی بینائی و سماعت، اس کا احساس و ادراک، اس کا شعور و فکر بن جائے اور مغربی علوم و فنون کے تمام صالح اجزا کو اپنے اندر جذب کر کے اپنی تہذیب کا عضو بناتا چلا جائے۔ اس طرح آپ فلسفی مسلمان، سائنس دان مسلمان، ماہرین معاشیات، مسلمان مقنن، مسلمان مدبرین، غرض تمام علوم و فنون کے مسلمان ماہر پیدا کر سکیں گے جو زندگی کے مسائل کو اسلامی نقطۂ نظر سے حل کریں گے، تہذیبِ حاضر کے ترقی یافتہ اسباب و وسائل سے تہذیبِ اسلامی کی خدمت لیں گے اور اسلام کے افکار و نظریات اور قوانینِ حیات کو دورِ عصری کے لحاظ سے از سرِ نو مرتب کر یہاں تک کہ اسلام از سرِ نو علم و عمل کے میدان میں اس امامت و رہنمائی کے مقام پر آ جائے گا جس کے لیے وہ درحقیقت دنیا میں پیدا کیا گیا ہے[2]۔

سید مودودی جدید دور کے علوم پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ جدید تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ جماعتوں کے لیے الگ الگ نصاب تجویز کرتے ہیں

ابتدائی تعلیم کا نصاب سید مودودی ابتدائی تعلیم کی مدت آٹھ سال مقرر کرتے ہیں۔ ان کی رائے میں پرائمری سکولوں میں جو مضامین پڑھائے جاتے ہیں اور جن پر بہت سے تجربات کیے گئے ہیں، ان کو شامل نصاب رکھا جائے[3]۔ اس کے ساتھ ساتھ طلبہ کو لکھنے پڑھنے کی اتنی استعداد بہم پہنچائی جائے کہ وہ ادب کو سمجھ کر پڑھ سکیں اور اپنے خیالات کو تحریر و تقریر میں ادا کر سکیں۔ ابتدائی طور پر انہیں عربی قرآن کو سمجھنے کے لیے پڑھائی جائے۔ انگریزی اس حد تک پڑھائی جائے کہ انگریزی کتابیں سمجھ سکیں اور ان کا ترجمہ کرنے کے قابل ہو سکیں۔ سید صاحب ابتدائی سطح پر فارسی زبان کی کتابیں گلستان اور بوستان کو بھی شامل نصاب کرتے ہیں۔ ان کی رائے میں ذہنی تربیت اور اخذ کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ریاضی کو بھی شامل کر لینا چاہیے۔ جغرافیہ خصوصی، عالمی، عرب اور پاک و ہند کے متعلق مواد اور تاریخ اسلام، انبیاء اور صحابہ کی سیرت اور پاک کی تاریخ ضروری حد تک نصاب میں شامل ہونی چاہیے۔ اسلامی عقائد، اسلامی اخلاق اور اسلامی تہذیب و تمدن کے متعلق واضح معلومات کا ابتدائی تعلیم کے نصاب میں شامل ہونا لازمی ہے[4]۔

نصاب میں ٹیکنیک کے جدید تصور اور نصابی اصولوں کے بالکل مطابق سید مودودی سفارش کرتے ہیں کہ عمر کے ساتھ ساتھ جن مسائل کا جاننا بچوں کے لیے ضروری ہو وہ ضرور نصاب میں شامل کرنے چاہئیں مثلاً:

ایک دس برس کے لڑکے اور لڑکی کو طہارت وغیرہ کے متعلق چند ضروری باتیں معلوم ہونا چاہییں۔ طہارت و پاکیزگی کے احکام، وضو کے مسائل، نماز اور روزے کے طریقے، حرام اور حلال کی ابتدائی حدود، والدین اور رشتہ داروں اور ہمسایوں کے حقوق، کھانے پینے کے آداب، لباس کے حدود، معاشرتی زندگی کے پسندیدہ اصول یہ وہ چیزیں ہیں جو ایک مسلمان بچے کو معلوم ہونی چاہئیں[5]۔

اس کے ساتھ ساتھ سید صاحب عملی کام کی ضرورت کو بھی محسوس کرتے ہیں اور اس بات کا لحاظ کرتے ہیں کہ عملی میدان میں بھی طلبہ کی تربیت کرنی چاہیے، چنانچہ ان کی ... میں ابتدائی سطح پر کشتی، تیراکی، گھوڑے کی سواری، اسلحہ کا استعمال، ہاتھ سے کام کرنے کی مشق، ابتدائی طبی امداد، بازار سے سودا سلف خریدنے کی مشق، خط و کتابت کی مشق، د... کام سے واقفیت اور لڑکیوں کے لیے کھانا پکانے، کپڑے سینے اور سینے پرونے کی تربیت وغیرہ نصاب میں شامل ہونی چاہیے[6]۔

ثانوی تعلیم کا نصاب

زبانوں کی تعلیم: اپنی مادری زبان کے ساتھ ساتھ عربی زبان میں طلبہ کو اتنی استعداد ہونی چاہیے کہ انہیں مزید مطالعہ کے لیے آسانی رہے کوئی شخص اسلام کی روح کو اس وقت تک نہیں سمجھ سکتا جب تک قرآن کو براہِ راست اس کی اپنی زبان میں سمجھنے کے قابل نہ ہو جائے[7]۔ عربی کے علاوہ انگریزی یا کوئی اور یورپین زبان اس حد تک کہ اس میں آسانی سے ریسرچ کرنے کے قابل ہو، شامل نصاب ہونی چاہیے[8]۔

قرآن و حدیث: اسلامی زندگی کو استوار کرنے کے لیے قرآن کی تعلیمات کو اس قدر ثانوی نصاب میں شامل ہونا چاہیے کہ وہ ابتدائی تحقیقی مطالعہ کی تیاری کے لیے مفید ثابت ہو سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ اصولِ حدیث اور حدیث کی ایسی منتخب کتاب جس سے تحقیقی مطالعہ کے لیے راہ ہموار ہو کو نصاب میں داخل کرنا چاہیے۔

سید مودودی ثانوی سطح کے لیے نصاب کے پانچ ایسے شعبے قائم کرتے ہیں جو اعلیٰ تعلیم کے لیے مددگار ثابت ہوں۔

---

[1] تعلیمات ص ۴۹۔ [2] ایضاً ص ۳۰۔ [3] تعلیمات ص ۳۲۶۔ [4] تعلیمات ص ۱۴۷۔ [5] ایضاً ص ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۸
[6] تعلیمات ص ۱۴۹۔ [7] ایضاً، ص ۱۱۳۔ [8] ایضاً ص ۱۵۰۔ [9] ایضاً، ص ۱۰۹۔

۱۔ شعبہ فلسفہ میں وہ سائنسی مضامین کو بھی شامل کرتے ہیں۔ اس میں منطق، فلسفۂ قدیم و جدید اور علم کلام پر ایک ایک کتاب جو ان علوم کی اصطلاحات، طرز بیان اور ان کے مسائل سے واقف کرنے کے لیے کافی ہو، نیز نفسیات، طبیعیات اور علم کیمیا پر بھی ایک ایک کتاب شامل نصاب ہونی چاہیے۔ نفسیات کا مضمون مغربی ممالک میں تو ثانوی جماعتوں میں پڑھایا جاتا ہے، مگر ہمارے ہاں کالج میں اس مضمون کو شامل نصاب کیا گیا ہے۔ سید صاحب نے بھی اسے ثانوی سطح پر شامل نصاب کرنے کی سفارش کی ہے۔ اس سے ان کے تصور نصاب کی ہمہ گیری کا اندازہ ہوتا ہے۔

۲۔ دوسرا شعبہ تاریخ کا ہے۔ اس میں سید صاحب تاریخ عمرانیات اور تاریخ سیاسیات کو بھی شامل کرتے ہیں۔ وہ سفارش کرتے ہیں کہ شعبۂ تاریخ کے نصاب میں اس بات کا لحاظ رکھا جائے کہ طلبہ تاریخی تحقیق اور مدنیت و متعلقات تمدن کی گتھیوں کا مطالعہ کر سکیں۔

۳۔ شعبہ معاشیات کا نصاب ایسا ہونا چاہیے جس سے طالب علم انسانی سوسائٹی کی ترکیب اور اس کے بنیادی مسائل کو بحیثیت مجموعی سمجھے اور پھر معاشیات، مالیات، بینکنگ اور کاروبار معیشت کے اصول سے واقف ہونے کے علاوہ موجودہ زمانے کے معاشی نظاموں اور سکولوں سے بھی فی الجملہ روشناس ہو جائے۔

۴۔ شعبۂ قانون کے لیے اصول قانون، اصول فقہ، تاریخ فقہ، تاریخ قانون اور تاریخ فقہ اسلامی پر ایک ایک ابتدائی کتاب اور فقہ مذاہب کے مسائل کا ایک مختصر مجموعہ شامل نصاب ہونا چاہیے۔ ہمارے ہاں اعلیٰ جماعتوں کے بعد مغربی ممالک کا قانون پڑھایا جاتا ہے، حالانکہ انسان کے لیے اس کی بنیادی طور پر سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ سید صاحب کے نزدیک مغربی قانون کے بجائے اسلامی قانون کو شامل نصاب کیا جانا چاہیے اور اس کی تدریس ثانوی جماعت ہی سے شروع ہو جانی چاہیے۔

۵۔ پانچواں شعبہ علوم اسلامی کا ہے۔ اس وقت ثانوی جماعتوں میں اسلامیات کا مضمون پڑھایا جاتا ہے، مگر اس سے ہمارے مقاصد پورے نہیں ہوتے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے باوجود ہمارے طلبہ میں اسلام سے لگاؤ کا مادہ پیدا نہیں ہوا ہے۔ سید صاحب اس ضمن میں عربی زبان کی تدریس کے لیے ایک الگ کورس کو نصاب میں شامل کرتے ہیں جو کہ اس عام تدریس سے الگ ہو۔ اس کے علاوہ ہر شعبے میں فقہ پر ایک ایک کتاب، نیز عقائد اور تاریخ ادیان بھی شامل ہو کر شامل نصاب ہونا چاہیے۔ سید صاحب ثانوی تعلیم کے لیے دو سال کی مدت تجویز کرتے ہیں۔

اعلیٰ تعلیم کا نصاب

اعلیٰ تعلیم کے لیے بھی سید مودودی وہی پانچ شعبے تجویز کرتے ہیں جن کی بنیاد ثانوی تعلیم میں رکھی گئی ہے۔ ثانوی تعلیم میں تو لوازمۂ نصاب (CONTENT) کا انتخاب محدود طور پر کیا گیا ہے، مگر اعلیٰ تعلیم کے لیے اس میں وسعت کر دی گئی ہے۔

۱۔ فلسفہ: تاریخ فلسفہ، مسلمان فلاسفہ کے مختلف مکاتب فکر، غیر مسلم فلاسفہ کے مختلف مکاتب فکر، علم کلام، فلاسفہ متصوفین، منطق، نفسیات، فلسفہ اخلاق، نظری (THEORETICAL) سائنس، حکمت قرآن اور اس کی مدد کے لیے حدیث۔

۲۔ تاریخ: تاریخ اسلام، تاریخ مسلمین، تاریخ عالم قدیم و جدید، تاریخ انقلاب، فلسفۂ تاریخ، عمرانیات (SOCIOLOGY)، مختلف عمرانی فلسفے، مدنیات (CIVICS)، سیاسیات و دساتیر عالم (CONSTITUTIONS OF THE WORLD)، اسلامی فلسفۂ تاریخ، فلسفۂ مدنیت اور نظام اجتماعی، اساس کا مطالعہ قرآن و حدیث کی روشنی میں۔

۳۔ معاشیات: علم المعیشت، مختلف معاشی نظریے اور معاشی و تمدنی مسالک، دنیا کے مختلف معاشی نظام، مالیات (FINANCE)، بینکنگ (BANKING)، قرآن و حدیث اور فقہ کا مطالعہ معاشی نقطۂ نظر سے۔

۴۔ قانون: تاریخ قانون، اصول قانون، قدیم و جدید قوموں کے قوانین، اصول قضا و نظام عدالت، قرآن و حدیث اور اسلامی فقہ کا مطالعہ قانونی نقطۂ نظر سے۔

۵۔ علوم اسلامی: ادب و لغت عربی، تفسیر، حدیث، فقہ، علوم اسلامی کی تاریخ، تاریخ افکار مسلمین، مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ، تاریخ ادیان عالم، فلسفہ ثانیات، دور جدید کی مذہبی و اخلاقی تحریکیں، مغربی الحاد کی تاریخ۔ اس قسم کے نصاب سے طلبہ میں علمی و اخلاقی دونوں حیثیتوں سے ایسی ضروری قابلیتیں اور اوصاف پیدا ہو جائیں گے جو جدید انسانی معاشرہ کے لیے ناگزیر ہیں۔ اس تعلیم و تربیت سے وہ اس علم سے آراستہ ہو جائیں گے اور جوہر انسانیت اور جوہر اسلامیت کے اعتبار سے مکمل ہو جائیں گے کہ ایک متمدن اور مہذب زندگی کے لیے جس قسم کی فعال کارکن ضروری ہیں وہ پیدا ہو جائیں گے۔

معیاری نظامِ تعلیم

ہمارے ہاں اس وقت دو نظام تعلیم پائے جاتے ہیں۔ ایک قدیم نظام تعلیم اور دوسرا جدید نظام تعلیم۔ قدیم نظام تعلیم جسے درس نظامیہ کے نام سے پکارا جاتا ہے، ہمارے مذہبی مدرسوں میں ابھی تک رائج ہے۔ اس میں جدید تعلیم کا کوئی دخل نہیں۔ اس کا مقصد دینی ضرورت کو پورا کرنا ہے۔ دنیا کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے یہ کافی ہے کیونکہ اس کے نصاب میں کسی قسم کی لچک پیدا نہیں کی گئی ہے۔ جو نصاب قدیم زمانے میں رائج تھا اس کو جوں کا توں ابھی تک برقرار رکھا گیا ہے۔ دوسرا نظام تعلیم جسے جدید کہا جاتا ہے ہمارے ہاں حکومت کی سرپرستی میں رائج ہے۔ یہ نظام تعلیم ایک خاص مقصد کو پورا کرنے کے لیے انگریزوں نے یہاں پر رائج کیا تھا، جو ابھی تک سارے سرکاری مدارس میں رائج ہے۔ قومی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے یہ نظام تعلیم بھی مفید نہیں ہے۔

سید مودودی ان دونوں نظام ہائے تعلیم پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں۔ قدیم نظام تعلیم کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ تعلیم مذہبی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے نہیں، بلکہ مسلمان

تعلیمات، ص ۱۱۰۔ ، ، ، تعلیمات، ص ۱۱۔ تعلیمات، ص ۱۱۰۔ ایضاً، ص ۱۰۹، ۱۰۷۔
تعلیمات، ص ۱۱۹۔

کے عہد حکومت میں سول سروس کی تعلیم تھی اس کی افادیت اسی دن سے ختم ہو گئی تھی جس دن سے یہاں انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی تھی [1] انگریزوں نے یہاں ایسا نظام رائج کیا جس کے ذریعے باہر سے آنے والے حکمرانوں کے لیے بہترین آلۂ کار پیدا کر سکیں جو اپنے آقا کی زبان کو سمجھ کر حکمران اور عوام کے درمیان رابطہ اور تعلق پیدا کرنے کے لیے معاون ثابت ہوں اور یہاں پر انگریزوں کی منشا کو پورا کر سکیں [2]

مسلمانوں کو اس زوال سے بچانے کے لیے چند لوگوں نے قدم بڑھایا تاکہ یہ قدم ڈوبنے سے بچ سکیں۔ سید مودودی ایک مثال بیان کرتے ہیں کہ ایک زوال پذیر قوم کو بچانے کے لیے کون سی دوسری تدابیر ہو سکتی ہیں ایک گروہ نے پرانے جہاز کے تختوں کو جوڑ کر لوگوں کو اس میں سوار شروع کر دیا۔ دوسرے گروہ نے نیا دخانی جہاز کرائے پر لیا اور قوم کو اچانک ہلاکت سے بچانے میں کامیاب ہو گیا، مگر منزل تک پہنچانے کے لیے یہ دونوں ناکافی تھے۔ نہ تو پرانے بادبانی جہاز (یعنی قدیم نظام تعلیم) میں اتنی قوت ہے کہ وہ تیز رفتار جہاز سے سبقت لے جائے اور نہ ہی نیا دخانی جہاز (جدید نظام تعلیم) اس لائق ہے کہ مسلمان اس کی مدد سے اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکیں، کیونکہ یہ جہاز دوسروں کا بنایا ہوا ہے اور جنہوں نے اس کو اپنے مقصد کے لیے اور ضرورتوں کے تحت بنایا ہے اور اس کے رہنما اور چلانے والے بھی انہی میں سے ہیں۔ سید مودودی کی رائے ہے کہ ہمیں ان سے یہ امید نہیں کرنی چاہیے کہ وہ ہمیں اپنی منزل کی طرف لے جائیں گے، بلکہ خطرہ ہے کہ وہ مخالف سمت کی طرف لے جائیں گے جو ہماری منزل سے دور ہو گی [3]

سید مودودی کے نزدیک ان دونوں گروہوں میں اجتہادی صلاحیت نہیں جو مناسب موقع پر تدبیر کرے اور لوگوں کی مناسب رہنمائی کرے۔ کہتے ہیں :

"انتہائی خراب کر کے پرانے جہاز والوں میں سے اگر کوئی اجتہاد کرتا ہے، تو بس اتنا کہ اپنے اس پرانے جہاز میں چند کلیں کے ملے لگا لیتا ہے، نئے طرز کا پرچم چپکا کر لیتا ہے اور ایک چھوٹی سی دخانی مشین خرید لیتا ہے جس کا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ دور سے سیٹی بجا بجا کر لوگوں کو یہ دھوکہ دیتی رہے کہ پرانا جہاز نیا ہو گیا ہے۔ اس مقابلے میں نئے جہاز والے اگرچہ دوسروں کے جہاز پر بیٹھے ہیں اور تیزی کے ساتھ سمتِ مخالف پر بہے چلے جا رہے ہیں، مگر وہ جہاز پرانے بادبان جس نے کہ عیسوی صدی کے اپ ٹو ڈیٹ جہاز پر لگائے ہوئے ہیں، تاکہ خود اپنے نفس کو اور مسلمانوں کو یہ دھوکہ دے سکیں کہ یہ جہاز بھی "اسلامی" جہاز ہے اور لندن کے راستے سے حج کعبہ کو چلا جا رہا ہے [4]

قدیم نظام تعلیم کے نصاب کے بارے میں سید مودودی فرماتے ہیں کہ اس میں فلسفہ، منطق، ادب اور صرف و نحو تو شامل ہے مگر دین کی بنیادی تعلیم کے لیے قرآن و حدیث پر زیادہ زور نہیں دیا جاتا۔ قرآن کی تعلیم کے لیے صرف چند ایک سورتیں پڑھائی جاتی ہیں۔ قرآن کے تحقیقی مطالعہ کی طرف توجہ نہیں دی جاتی۔ حدیث کی تعلیم کا حال بھی یہی ہے کہ اس میں محدثانہ کی طرف توجہ کم اور فقہی اور اعتقادی مسائل کے متعلق اختلافی بحثیں زیادہ ہوتی ہیں۔ ان مدارس میں قرآن و حدیث کی تعلیم اس نہج پر نہیں دی جاتی کہ اسلام کے معاشی، سیاسی، تمدنی، اور اخلاقی نظام کے متعلق پوری واقفیت حاصل ہو۔ نہ ہی دستورِ مملکت یا نظام عدالت یا بین الاقوامی قانون کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظام تعلیم سے فارغ ہونے والوں میں اجتہادی صلاحیتیں مفقود ہیں۔ وہ پرانی ڈگر پر چل رہے ہیں۔ یہ نظام تعلیم نہ صرف ہماری مذہبی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے بالکل ناکافی ہے، بلکہ دنیوی ضرورتیں بھی اس نظام تعلیم سے پوری نہیں ہو سکتیں [5]

جدید نصاب تعلیم لادینیت، مادہ پرستی اور اسلامی اخلاق سے بالکل خالی ہے۔ اس تعلیم کی بدولت ہماری نسل دینی اخلاق اور دینی طرزِ فکر سے دن بدن دور ہوتی چلی جا رہی ہے۔ ہمارے ہاں ایسے علوم پڑھائے جاتے ہیں جن کو مرتب کرنے والے ایسے لوگ ہیں جو دنیوی زندگی میں خدائی رہنمائی محسوس نہیں کرتے۔ سائنس، فلسفہ، تاریخ اور عمرانیات جیسے مضامین انگریزوں نے اپنے نظامِ تعلیم کے طرز پر یہاں رائج کیے ہیں۔ جن لوگوں نے اس طرز پر تعلیم حاصل کی ہے، دراصل وہی لوگ اس وقت تک اس نظامِ تعلیم کی گردن پر سوار ہیں۔ ان کا نقشہ سید مودودی نے ان الفاظ میں کھینچا ہے،

"ان میں نہ فرض شناسی ہے، نہ مستعدی، نہ جفاکشی، نہ ضبط اوقات، نہ جرأت و ثبات، نہ عزم و استقلال، نہ باقاعدگی، نہ ضبطِ نفس، نہ اپنی ذات سے بالاتر کسی چیز سے وفاداری۔ وہ بالکل خودرو درختوں کی طرح ہیں جنہیں دیکھ کر یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ ان کا کوئی قومی کیریکٹر بھی ہے۔ ان میں معزز سے معزز پوزیشن میں ہو کر بھی کسی ذلیل سے ذلیل بددیانتی اور بدکرداری کے ارتکاب میں دریغ نہیں ہوتا۔ ان میں بدترین قسم کے رشوت خور، بولیشن پرور، سفارشیں کرنے والے اور سننے والے، بلیک مارکیٹنگ کرنے اور کرانے والے، ناجائز درآمد برآمد کرنے اور کرانے والے، انصاف اور ضابطوں اور ضابطے کا خون کرنے والے، فرض سے جی چرانے اور لوگوں کے حقوق پر ڈاکے مارنے والے اور اپنے ذرا سے مفاد پر اپنی پوری قوم کے مفاد اور فلاح کو قربان کر دینے والے ایک دو نہیں، ہزاروں کی تعداد میں، ہر شعبۂ زندگی میں ہر جگہ آپ کو کام کرتے نظر آتے ہیں۔ انگریز کے ہٹ جانے کے بعد ملک کو چلانے کی ذمہ داری کا بار اسی تعلیم کے تیار کیے ہوئے لوگوں نے سنبھالا ہے اور چند سال کے اندر سیرت کا انہوں کے ہاتھوں ملک کا جو حال ہوا ہے وہ ساری دنیا دیکھ رہی ہے اور جو نسل اب اس نظامِ تعلیم کی درس گاہوں میں زیرِ تربیت ہے اس کے اخلاق و کردار کا حال آپ چاہیں تو درس گاہوں میں، ہوسٹلوں میں، تفریح گاہوں میں اور قومی تقریبات کے مواقع پر بازاروں میں دیکھ سکتے ہیں [6]

جدید نظامِ تعلیم بنیادی انسانی اخلاقیات سے بھی خالی ہے، لہٰذا اس تعلیم سے ایک آزاد ملک کے لیے قابلِ اعتماد کارکن پیدا کیے کی کوئی اگر توقع رکھتا ہے، تو وہ عقل مند نہیں کہلایا جا سکتا [7]

نظامِ تعلیم کیسا ہو

[سید م]ودودی لکھتے ہیں کہ قدیم اور جدید دونوں نظاموں کی انفرادیت کو ختم کر دینا چاہیے۔ اسلام کے نزدیک دین اور دنیا الگ الگ کوئی شے نہیں۔ دنیا اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہے

---

[1]، [2] ... ۱۸۲، [3] تعلیمات، ص ۱۴، ۱۵۔ [4] تعلیمات، ص ۱۶۔ [5] تعلیمات، ص ۱۸۰، ۱۸۱۔ [6] تعلیمات، ص ۱۸۵، ...

وہی اس پورا سا حکم چلا رہا ہے انسان اس سلطنت میں ایک رعیت کی حیثیت رکھتا ہے انسان کا مقصد حیات یہ ہے کہ اس دنیا میں رہ کر زندگی کو دینی تقاضوں کے مطابق گزارے، گویا دنیوی زندگی اللہ کی رضا اور ہدایت کے مطابق ہو۔ اس چیز کا نام دین ہے۔ دین کا تعلیمی تقاضا یہ ہے کہ تمام دنیوی علوم کو دینی علوم کے قالب میں ڈھالا جائے۔ اگر دینی اور دنیوی علوم کو الگ الگ حیثیت سے پڑھایا جائے گا، تو طلبہ میں یہ تصور پرورش پائے گا کہ دنیا کسی اور چیز کا نام ہے اور دین کسی اور چیز کا۔ دونوں کے درمیان توافق پیدا کرنا مشکل ہو جائے گا[1]

مروجہ نظام تعلیم کی تمام خرابیوں کی جڑ یہ مصنوعی تقسیم ہے جو اسلام کے اصول نظر سے قطعاً جائز نہیں، اس لیے یہ ضروری ہے کہ اسلامیات کے مضمون کو باقی مضامین سے الگ نہ پڑھایا جائے، بلکہ تمام مضامین کو اسلامیات کے رنگ میں تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ سمجھ سکیں کہ وہ اس خدائی سلطنت میں خدا کی حکمت و قدرت کے آثار کو اچھی طرح جان سکیں اور اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ کائنات کی ہر چیز کا تعلق خدا تعالیٰ سے ہے جو انسان کے لیے ہی مسخر کی گئی ہے[2]

اختصاصی تعلیم

سید مودودی کی رائے ہے کہ نظام تعلیم میں اختصاصی تعلیم کا طریقہ رائج کرنا چاہیے۔ ہر طالب علم کو مجموعہ علوم پڑھانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ انسان کا علم اتنا وسیع ہو گیا ہے کہ تمام علوم کی معقول استعداد کسی انسان میں پیدا ہونا قدرے محال ہے۔ اس لیے ایک مخصوص علم میں قابلیت پیدا کرنے کا طریقہ اپنانا چاہیے[3]۔

تعلیم نسواں

انسانی تہذیب و تمدن میں عورتوں کی تعلیم کے بارے میں بہت اختلاف رہا ہے۔ مغربی اقوام نے عورت کو عزت اور حقوق اس وقت تک نہیں دیے جب تک وہ عورت رہی۔ جب عورتوں نے اپنے کندھوں پر مردوں کے فرائض کا بار اٹھانے کی ذمہ داری قبول کر لی اس وقت عورت کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا[4] اسلام نے عورت کو جو مقام دیا ہے انسانی تمدن کو ٹھیک چلانے کے لیے جو تعلیم اسلام نے عورت کو دی ہے وہ آج کل کسی تہذیب سے جدید غیر اسلامی معاشروں میں نہیں ملتی سید مودودی کے نزدیک گاڑی کو چلانے کے لیے جس طرح دو پہیوں کی ضرورت ہے اسی طرح انسانی گاڑی کو چلانے کے لیے مردوں کے ساتھ عورتوں کا ہونا ضروری ہے اگر ان میں سے کسی ایک کو الگ کر دیا جائے تو گاڑی نہیں چل سکے گی جس طرح گاڑی کے دو پہیوں کا درست ہونا ضروری ہے، اسی طرح انسانی زندگی کے لیے مرد اور عورتوں کا درست ہونا لازمی ہے اسلام نے جتنے حقوق مرد کو دیے ہیں، اتنے ہی حقوق عورت کو تفویض کرتا ہے[5] اپنی مشہور تصنیف "پردہ" میں سید مودودی فرماتے ہیں:

"عورتوں کو دینی اور دنیوی علوم سیکھنے کی نہ صرف اجازت دی گئی ہے، بلکہ ان کی تعلیم و تربیت کو اسی قدر ضروری قرار دیا گیا ہے جس قدر مردوں کی تعلیم و تربیت ضروری ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دین و اخلاق کی تعلیم جس طرح مرد حاصل کرتے تھے اسی طرح عورتیں بھی حاصل کرتی تھیں آپ ان کے لیے اوقات معین فرما دیتے تھے"[6]

عورتوں کو کن علوم کی تعلیم دی جائے؟ سید مودودی کے نزدیک جو تعلیم مردوں کے لیے مقرر کی گئی ہے، عورتوں کے لیے بھی اس کا انتظام کیا جائے، مگر اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ عورتیں اپنی فطری ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکیں، نہ کہ وہ اس تعلیم کی بدولت مردوں کے ساتھ کارخانوں، دفتروں اور زرعی فارموں میں کام کریں۔ عورت کا صحیح مقام گھر اور اس کا اصل کام انسان سازی ہے۔ اس لیے عورت پر مصنوعی ذمہ داریوں کا بوجھ نہیں ڈالنا چاہیے[7]

جہاں تک نفس تعلیم و تربیت کا تعلق ہے اسلام نے عورت اور مرد کے درمیان امتیاز نہیں رکھا ہے البتہ نوعیت میں فرق ضروری ہے اسلامی نقطہ نظر سے عورت کی صحیح تعلیم و تربیت وہ ہے جو اس کو بہترین بیوی، بہترین ماں اور بہترین گھر والی بنائے اس کا دائرہ عمل گھر ہے اس لیے خصوصیت کے ساتھ اس کو ان علوم کی تعلیم دی جانی چاہیے جو اس دائرے میں اسے زیادہ مفید بنا سکتے ہوں مزید برآں وہ علوم بھی اس کے لیے ضروری ہیں جو انسان کو انسان بنانے والے اور اس کے اخلاق کو سنوارنے والے اور اس کی نظر کو وسیع کرنے والے ہیں ایسے علوم اور ایسی تربیت سے آراستہ ہونا مسلمان عورت کے لیے لازم ہے اور ان علوم کے علاوہ دوسرے علوم و فنون کی اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کرنی چاہے، تو اسلام اس کی راہ میں مزاحم نہیں بشرطیکہ وہ ان حدود سے تجاوز نہ کرے جو شریعت نے عورتوں کے لیے مقرر کی ہیں[8]

تربیت اساتذہ

نظام تعلیم میں تربیت اساتذہ کا مسئلہ ریڑھ کی ہڈی کے مانند ہے۔ نصاب میں کتنی ہی خامیاں موجود ہوں، اگر اس کو پڑھانے والے اساتذہ میں خوبیاں موجود ہوں گی جو ایک استاد میں ہونی چاہئیں، تو نظام تعلیم غلط سمت کی بجائے صحیح سمت چل سکتا ہے سید مودودی اساتذہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ نظام تعلیم میں نصاب اور کتابیں اتنی اہمیت کی مالک نہیں ہیں، اصل چیز اساتذہ اور ان کا کردار ہے، جو قوموں کا رخ بدل دیتے ہیں اگر نظام تعلیم بگڑے ہوئے اخلاق اور عقیدے کے لوگوں کے ہاتھ میں ہو تو ان کے ہاتھوں میں جو نسل پروان چڑھے گی، ان سے کسی اصلاح اور فلاح کی امید نہیں کرنی چاہیے[9]

---

[1] ایضاً، ص ۸۴۔ [2] تعلیمات، ص ۸۶ [3] ایضاً، ص ۸۸۔ [4] ایضاً، ص ۲۱۲۔ [5] روداد جماعت اسلامی حصہ پنجم ص ۸۱۔
[6] پردہ ص ۲۴۲[illegible] [7] تعلیمات، ۲۱۳۔ [8] پردہ ص ۲۴۷۔ [9] تعلیمات، ص ۱۹۳۔

نظامِ تعلیم میں عام نوکری کے بجائے انتخابِ اساتذہ کا خاص معیار ہونا چاہیے۔ صرف کسی کو اس کی علمی قابلیت کی بنا پر منتخب نہیں کر لینا چاہیے بلکہ اس کے عقائد و نظریات کا جائزہ بھی لینا ہوگا اور یہ بھی جانچنا ہوگا کہ اس کی عملی زندگی کا اس کے علم سے کتنا تعلق ہے۔ اساتذہ کے لیے ضروری ہے کہ اپنے عقائد و افکار کے لحاظ سے پورے کے پورے مسلمان ہوں، مغربی تہذیب و ثقافت سے شکست خوردہ نہ ہوں۔

جن اساتذہ کو منتخب کیا جائے ان کے متعلق یہ اطمینان بھی کر لیا جائے کہ ان کے گھر والے بھی حدود شرعیہ کی پابندی سے آزاد نہ ہوں، اس لیے کہ جامعہ کے حدود میں اگر طلبہ کے ساتھ ایسے اساتذہ رہیں جن کے گھر کی خواتین نیم عاملسب میں مبتلا ہوں اور جن کے گھر سے نغموں کی آوازیں بلند ہوتی رہیں تو طلبہ کو ان سے کوئی اچھا سبق نہ مل سکے گا۔[1]

گویا سید مودودی کے نزدیک ضروری ہے کہ اساتذہ خود بھی اچھے اوصاف اور کردار کے مالک ہوں اور ان کے گھر میں بھی ان کی زندگی کا عکس نظر آتا ہو تاکہ طلبہ پر کسی طرف سے بھی غلط اثر نہ پڑے۔

ایسے اساتذہ کا اس دور میں ملنا ناممکن نظر آتا ہے، تو پھر اس کا حل کیا کیا جائے گا۔ سید صاحب کے نزدیک ایک عمارت کے لیے مکان بنانے کے لیے اینٹیں نہ ہوں، تو پہلے بھٹہ تیار کرنا پڑے گا تاکہ اینٹیں تیار کی جائیں۔ اس طرح ایک خاص طرز کا نظام چلانے کے لیے اساتذہ تیار کرنے پڑیں گے۔ ان کے لیے خاص تربیت گاہیں مہیا کرنی پڑیں گی۔ ان کے لیے ایسی تعلیم کا بندوبست کرنا ہوگا جس میں ان کی اخلاقی تربیت کے ساتھ ان میں اجتہادی صلاحیتیں بھی پیدا ہوں۔[2]

انتخابِ اساتذہ کے سلسلہ میں یہ بات مدِنظر رہے کہ اساتذہ علوم جدیدہ کے بھی ماہر ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ قرآن و سنت میں بھی بصیرت رکھتے ہوں اور ان میں اتنی قابلیت ہو کہ وہ مغربی علوم اور نظریات کا صحیح صحیح تجزیہ کر سکیں۔ اسلام کے حقائق طلبہ کے سامنے پیش کرتے وقت مغربی علوم سے مرعوب زدہ نہ ہوں، بلکہ ان کے دل میں اسلام کی سچی محبت ہو، ہر بات کو بیان کرنے وقت اسلامی نقطۂ نظر واضح کرتے چلے جائیں۔[3]

نظامِ امتحانات

نظامِ امتحانات کے بارے میں سید مودودی کی رائے یہ ہے کہ جامعہ سے داخلی امتحانات کا نظام ہو جامعہ سے خارجی، بہرحال اصلاحات مستقبل کی دیانت داری سے۔ جولائی ۱۹۷۳ء میں تنظیم اساتذہ پاکستان کے ایک وفد سے گفتگو کرتے ہوئے سید مودودی نے خیال ظاہر کیا تھا کہ موجودہ ناقص نظامِ تعلیم کے پیش نظر اگر داخلی امتحانات کا نظام نافذ کیا جائے تو بہتر ہے لیکن اس میں بھی اساتذہ کی تربیت انتہائی ضروری ہے۔ اساتذہ جب تک صحیح کردار کے مالک نہیں ہوں گے اور ایسی رائے میں (O B J E C T I V E) نہیں ہوں گے اس وقت تک داخلی نظامِ امتحانات کسی صورت کامیاب نہیں ہو سکتا۔[4]

ذریعۂ تعلیم کا مسئلہ

ہمارے ہاں ابھی تک انگریزی زبان ذریعۂ تعلیم کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ اس بات کی کوشش کی جا رہی ہے کہ انگریزی کے بجائے اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے۔ سید مودودی کے نزدیک کسی غیر زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانا ایک آزاد قوم کی شان کے خلاف ہے جب کہ ہماری اپنی زبان اس قابل ہے کہ اس کو ذریعۂ تعلیم بنایا جا سکتا ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ ہمیں چاہیے کہ ابتدائی تعلیم سے آخری مدارج تک تعلیم اردو زبان میں ہو۔ انگریزی کی حیثیت ثانوی ہو، جو صرف سائنس اور دوسرے جدید علوم کی تعلیم ہو جائیں اس زبان میں حاصل کریں، مگر اس زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانا سخت غلطی ہے۔[5]

رسم الخط کا مسئلہ

پاکستان میں ایک زمانے میں رسم الخط کے بارے میں بڑی شدت سے بحث چل رہی تھی۔ اس وقت پاکستان کی دو قومی زبانیں تھیں۔ مغربی پاکستان میں اردو اور مشرقی پاکستان میں بنگلہ۔ مغربی پاکستان میں بھی چار زبانیں بولی جاتی تھیں، سرحد میں پشتو، سندھ میں سندھی، پنجاب میں پنجابی اور بلوچستان میں بلوچی، لیکن رسم الخط کا جھگڑا صرف دو زبانوں میں تھا اردو اور بنگالی۔ مسئلہ یہ تھا کہ ان دونوں قومی زبانوں کے لیے کیسا رسم الخط ہو جو دونوں کو آپس میں قریب کر دے۔

بعض مغرب زدہ لوگ اس بات پر زور دینے لگے کہ دونوں زبانوں کا رسم الخط رومن ہونا چاہیے۔ اس سے دونوں زبانوں میں قریبی تعلق پیدا ہو جائے گا۔ سید مودودی رسم الخط پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بنگال میں ہر جگہ عربی رسم الخط رائج رہا اور انگریزوں اور ہندوؤں کی سازش سے عربی رسم الخط کی جگہ ناگری رسم الخط رائج کیا گیا تھا۔ اس کا مقصد صرف مسلمانوں کو اپنے دین سے بیگانہ کرنا تھا، بلکہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے زیر اثر لانا بھی تھا۔ چنانچہ انگریزوں نے اپنے دورِ اقتدار میں ان تمام مدارس کی امداد بند کر دی جو عربی رسم الخط میں تعلیم و تربیت دیتے تھے اور ناگری رسم الخط زبردستی ٹھونسا گیا تھا۔[6]

اسی طرح ہر ایک طرح سے مسلمانوں پر یہ رسم الخط [illegible] کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اردو رسم الخط میں ہمارا تمام لٹریچر موجود ہے جس سے موجودہ نسل بھی آشنا ہے۔ اگر اس کو بدل دیا

[illegible] ۔ [1] ایضاً، ص ۴۷ ۔ [2] تعلیمات، ص ۲۱۹ ۔ [3] تعلیمات، ص ۲۱۴ ۔ ۲۱۵

گیا تو ساری نئی نسل اردو لٹریچر سے بالکل ناواقف ہو کر تمام مذہبی، ادبی میراث جو اردو، عربی اور فارسی زبان میں موجود ہے اس سے بیگانہ ہو کر اپنی تہذیب کھو بیٹھے گی۔ اس طرح ہم صدیوں کے سرمایہ علم و تہذیب سے محروم ہو جائیں گے۔ سید صاحب اس سلسلے میں ترکی قوم کی مثال بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے رسم الخط کو تبدیل کر کے کشمکش کا شکار ہو گئے کیونکہ نئے رسم خط لکھنے اور رائج ہونے میں کافی وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے اہل قلم کوئی علمی کام نہ کر سکیں گے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے بھی کافی عرصہ درکار ہوگا۔ رومن رسم الخط کے اختیار کرنے سے سب سے بڑا نقصان جو ہوگا وہ یہ کہ مسلمان دنیا سے بالکل کٹ جائیں گے جہاں عربی رسم الخط رائج ہے جو اردو کے لیے بھی آسانی سے اپنایا جا سکتا ہے۔ ہماری حیثیت مسلمان اور پڑوسی ملکوں میں ایک اجنبی کی سی ہو جائے گی۔ [1]

سید مودودی کے نزدیک ہمارے لیے مناسب رسم الخط نسخ ہے کیونکہ مسلمان عربی رسم الخط سے پہلے ہی مانوس ہیں۔ اگر اردو زبان کا رسم الخط نسخ میں تبدیل کر دیا جائے، تو اردو پڑھنے والوں کے لیے بھی آسانی رہے گی اور مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کے لیے بھی یہ خط آسان ہوگا کیونکہ وہ قرآن پڑھنے کی خاطر اس رسم الخط کو اب بھی سیکھتے ہیں، اس لیے ان کے لیے بھی زیادہ مشکل نہیں ہوگی۔ خط نسخ اب کافی ترقی کر چکا ہے۔ طباعت کی سہولت بھی اس میں موجود ہے۔ اس طرح بنگالی زبان اور اردو زبان کا رسم الخط ایک ہو جائے گا جو بحیثیت مسلمان ہونے کے ہمارے لیے فائدہ مند ہوگا۔ [2]

نظریۂ ادب

ادب کے بارے میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے کہ آیا ادب برائے ادب ہو یا ادب برائے زندگی۔ اس بحث نے بہت سے لوگوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ادب زندگی کی ضرورتوں کے مطابق ہو یا صرف ادب کے لیے ہو۔ مارکسی نظریات نے ادب برائے زندگی کا تصور دیا۔ سید مودودی ادب کے بارے میں بیان فرماتے ہیں:

"معاش کے لیے کوئی ادب پیدا کرنا میرے نزدیک غلط چیز ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ آدمی معاش کے لیے اینٹیں ڈھوئے۔ ادب دماغوں کو ڈھالنے والی چیز ہے۔ یہ کام معاش کے لیے نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کو تو بالکل نظریہ و مسلک پر استوار کرنا ہوگا۔" [3]

ادب کا کام دماغ کی تربیت ہے۔ ادب ایک خاص نظریۂ زندگی کی ترجمانی کرنے والا ہونا چاہیے، کیونکہ یہی وہ چیز ہے جو قوموں کو تقاضا کرتی ہے۔ ادب برائے معاش تو زندگی ختم ہونے کے ساتھ ہی اپنے تصورات کو ختم کر دیتا ہے، کیونکہ انسان جب تک زندہ ہے وہ پیٹ کی خاطر ادب پیدا کرے گا۔ یہ چیز انسان کو کسی ایک مسلک کے تابع نہیں رکھ سکتی جہاں بھی انسان کو معاش میں کشائش نظر آئی، اپنے ادب کو اس طرف جھکا دیا۔

خلاصہ، نتائج، سفارشات

خلاصہ

سید مودودی اس وقت عالمی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی شخصیت گوناگوں خوبیوں کی جامع ہے۔ وہ مفسر قرآن، عالم دین، سیاست دان، متکلم اسلام ہونے کے علاوہ مفکر تعلیم بھی ہیں۔ سید مودودی نے موجودہ حالات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ نظام تعلیم کی خامیوں کی نشان دہی کی ہے اور اس نظام تعلیم کو مرتب کرنے کی کوشش کی ہے جو ہمارے قومی مقاصد کی تکمیل کر سکے، چنانچہ اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ سید مودودی کے تعلیمی نظریات کا جائزہ لیا جائے اور اس کی روشنی میں اپنے نظام تعلیم میں اصلاح کے لیے سفارشات پیش کی جائیں۔

نتائج

اس تحقیق کے دوران میں سید مودودی کی کتب کے علاوہ چند دوسری کتب کا بھی مطالعہ کیا گیا۔ اس مطالعہ کا ماحصل درج ذیل ہے:

1۔ حقیقت اصلیہ ذات الٰہی ہے۔ وہی نظام کائنات اپنے تدبر و حکمت کے ساتھ چلا رہی ہے۔

2۔ یہ کائنات خود بخود وجود میں نہیں آئی، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے ارادے سے پیدا کیا اور اس کی تخلیق میں ایک مقصد موجود ہے۔

3۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اور دنیا میں اپنا نائب مقرر کیا۔

4۔ "علم" کا مفہوم معرفت الٰہی اور صفاتِ الٰہی کا جاننا ہے۔ اس کے بغیر کوئی شخص صاحب علم کہلانے کا مستحق نہیں۔

5۔ علم ایک عطیۂ الٰہی ہے۔ وحی الٰہی اصل ذریعۂ علم ہے۔

6۔ وحی الٰہی کے علاوہ انسان کو حواس و عقل کی قوتیں دی گئی ہیں جن کی مدد سے وہ علم حاصل کر سکتا ہے۔ نیز دوسروں کے علم سے بھی استفادہ کر سکتا ہے، لیکن یہ تمام ذرائع وحی کے تابع ہیں۔

7۔ تعلیم میں اخلاق کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ علم، احسان اور صلہ رحمی پسندیدہ اقدار ہیں۔ تعمیر کردار میں اسلامی شعائر کی پابندی سے پختگی پیدا ہوتی ہے۔

8۔ تعلیم کا مقصد جہاں معرفت الٰہی ہے وہاں انسان کی پوشیدہ صلاحیتوں کی نشوونما، ثقافت کی منتقلی، مضبوط سیرت و اخلاق کی تعمیر اور صحیح لیڈر شپ پیدا کرنا

---

[1] تعلیمات، ص ۲۱۶، ۲۱۷۔ [2] ایضاً ص ۲۱۸۔ [3] مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں، ص ۴۷۔

گئی ہے۔

۹۔ نصابِ تعلیم کے مرتب کرنے میں اسلامی روح کو مرکزی حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔ پرائمری، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے لازمی نصاب کے انتخاب میں مدرج اسلام کو معیار بنایا جانا چاہیے

۱۰۔ نظامِ تعلیم میں قدیم و جدید کی تفریق نہیں ہونی چاہیے۔ اس کا جواز اسلام میں قطعاً نہیں ہے۔ نظامِ تعلیم کو اس طرح مرتب کیا جائے کہ دینی اور دنیوی تفریق پیدا نہ ہو۔

۱۱۔ پاکستان میں تعلیم اردو زبان میں ہونی چاہیے

۱۲۔ رسم الخط کے اعتبار سے خطِ نسخ کو اپنانا زیادہ مناسب ہے کیونکہ یہ قرآنی خط سے مشابہ ہے جس سے مسلمان مانوس ہیں لہٰذا انہیں خطِ نسخ اپنانے میں رکاوٹ نہیں ہوگی،

۱۳۔ ادب کا مقصد معاشی ضرورتوں کو پورا کرنا نہیں بلکہ ذہنی تربیت ہے۔ ادب نظریۂ زندگی کی ترجمانی کرتا ہے۔

۱۴۔ نظامِ تعلیم میں تربیت اساتذہ ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اساتذہ کی تعیناتی کے وقت ان کی علمیت اور اخلاق و کردار دونوں کا خیال رکھنا چاہیے۔

۱۵۔ تعلیم کا حاصل کرنا مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے ضروری ہے۔ عورتیں بھی وہ علوم حاصل کرسکتی ہیں جو مرد حاصل کرتے ہیں مگر اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ عورت کا اصل مقام گھر اور تربیتِ اطفال ہے۔

۱۶۔ امتحان میں داخلی نظام کا اپنانا مناسب ہے مگر اس میں اساتذہ کی دیانت داری بنیادی حیثیت رکھتی ہے

سفارشات

سید مودودی کے تعلیمی نظریات کی روشنی میں درج ذیل سفارشات پیش کی جاتی ہیں

۱۔ نظامِ تعلیم کو اس طرح مربوط کیا جائے کہ قدیم اور جدید نظامِ تعلیم کی تفریق ختم ہو جائے۔ اس باہمی ربط کی بنیاد بہرحال اسلام کے بنیادی اصول ہونے چاہئیں۔

۲۔ مقاصدِ تعلیم اور نصابِ تعلیم کی تدوین و ترتیب اس طرح کی جائے کہ تمام افراد چاہے وہ ڈاکٹر ہوں یا انجینئر، استاد ہوں یا وکیل، تاجر ہوں یا کسی اور پیشے سے متعلق ہوں، اپنے پیشے میں مہارت کے علاوہ اوّل و آخر صحیح مسلمان ثابت ہوں۔

۳۔ اساتذہ کو نہ صرف علمی قابلیت کا مظاہرہ کرنا چاہیے بلکہ اپنے کردار و سیرت سے بھی طلبہ پر اثر انداز ہونا چاہیے

۴۔ اساتذہ کے انتخاب میں ان کی علمی اور پیشہ ورانہ لیاقت کے علاوہ عقائد و نظریات کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

۵۔ بچوں کو ابتدا ہی سے ایمان کی پختگی اور عملِ صالح کی تعلیم دینی چاہیے توحید و رسالت کا تصور بچے کے ذہن میں شروع عمر ہی سے راسخ کیا جانا چاہیے طلبہ سے نماز کی پابندی کروانی چاہیے اس سے سیرت میں تبدیلی ہوتی ہے۔ خاص طور پر مدارس میں نماز باجماعت کا اہتمام کیا جائے اس سے مساوات اور جمہوریت کا تصور بھی واضح ہوگا

۶۔ طلبہ پر نظریۂ پاکستان جو درحقیقت اسلامی نظریۂ حیات کا دوسرا نام ہے واضح کرنے کی کوشش کرنی چاہیے

۷۔ طلبہ میں اخلاقِ حسنہ، شائستگی، پاکیزگی، روحِ سلیم، وسعتِ نظر، خودداری، جرأت و دلیری، جفاکشی اور خود کام کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے

۸۔ طلبہ کو فکر کے ساتھ ساتھ ضروری معاشرتی مسائل سے واقفیت بہم پہنچانی چاہیے۔

۹۔ نظامِ تعلیم کو اس طرح مرتب کیا جائے جس سے اسلامی کلچر اور تہذیب کا احیا ہو سکے

۱۰۔ مختلف مضامین کو از سرِ نو اس طرح مرتب کیا جائے کہ اسلامی نظریات کو مرکزی حیثیت حاصل ہو۔
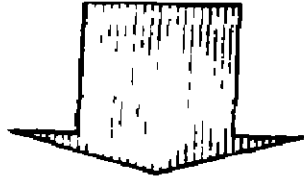
**:

لہو رنگی تصویریں

> [illegible] برس پہلے تقسیم ہند کی رات [illegible] بزرگوں نے خود [illegible] دیکھ کر
> انسانیت کے آنسو بہے [illegible] دیکھا [illegible] کے ملیٹھ گے۔ واقعات
> کی حسب حال تصویریں انہی کے قلم سے [illegible] شاید ہمارا [illegible] کرے۔
> [illegible] (مدیر)

ڈاکو اور لٹیرے

پنڈت جواہر لال نہرو

آج جب میں مہاتما گاندھی کے سامنے گیا تو میں ان سے آنکھیں چار نہیں کر سکتا تھا شرم سے میری گردن جھکی ہوئی تھی ـــــ وہ عظیم انسان ـــــ ہمارا گرو آج کیا سوچتا ہوگا۔ کیا پھر وہ ہمیں اسی لیے اہنسا دیتا رہا کہ ہم یہ کارنامے کریں جو آج کل کر رہے ہیں

جب میں ان کارناموں کا خیال بھی کرتا ہوں تو خوف و دہشت کے مارے جیسے [illegible] گناہوں اور آج کل خون ہی تو رنگا ہے۔ ہمارے پیسے کے لیے ان ہزاروں لاکھوں اموات مترودہ دولت اور شرمندگی جواب کی نسلوں تک ہمارے ساتھ چپکی رہے گی۔

اتنے کئی سالوں سے جو خواب ہم دیکھتے آرہے تھے کیا اس کی تعبیر یہی تھی؟ ایک نسل نے جو کام اپنی ساری زندگی میں کیا تھا کیا وہ یوں تباہ ہو جائے گا؟ یہ بڑی نازک گھڑی ہے۔ سوچنے کا مقام ہے آخر ہندوستان کو کیا بنانا چاہتے ہیں؟ ہم کیسا ہندوستان اپنی اولاد کے لیے چھوڑ جانا چاہتے ہیں؟

دوسری طرف جو کچھ ہوا ڈیڑھ سو سن کر ہمیں بھی جوش آ جاتا ہے مجھے بھی غصہ آتا ہے لیکن پھر میں سوچتا ہوں کہ جو غلطی کرنے لگا ہوں اس کا انجام کیا ہوگا کیا ہم لٹیروں کا ملک بنانا چاہتے ہیں؟ جو لوگ ان کے خون سے لتھڑے ہوئے ہاتھوں میں لوٹ مار کا سامان لیے ہوئے فسادیوں کے ہجوم جب مجھے دیکھ کر "جواہر لال کی جے اور مہاتما گاندھی کی جے" کے نعرے لگاتے ہیں، تو میں سوچنے لگتا ہوں کیا میں لٹیروں اور ڈاکوؤں کا سردار ہوں؟

میرے بھائیو یاد رکھو کہ ملک پاگل پن سے نہیں بچتے۔ پاگل آدمی ملکوں کو مٹاتے ہیں ہم اس وقت محض لاکھوں کروڑوں انسانوں کی زندگیوں سے نہیں کھیل رہے بلکہ ایک قوم اور ایک ملک کی زندگی سے کھیل رہے ہیں۔ اپنے مستقبل سے کھیل رہے ہیں۔ سمجھو اور سنبھلو!!

(پنڈت نہرو کے تقریری بیان سے ۲۹ ستمبر، ۱۹۴۷ء کو ریڈیو سے نشر ہوا)

میں تیری بہن آں

کرشن چندر

تقسیم ہند کا اعلان ہو چکا تھا اور میں پل کے ایک ٹی اور ریسٹورنٹ کے پیچھے ایک لمبا سا کیو (قطار) لگا تھا۔ میں نے قریب جا کر ایک آدمی سے پوچھا جو ایک میلی سی قمیص اور ایک میلی سی پتلون پہنے تھا۔

"یہاں کیا راشن ملتا ہے؟"

وہ نوجوان مسکرا کر بولا "یہاں سیکس (SEX) کا راشن ملتا ہے"

"کیا مطلب؟"

وہ بولا "ایک مسلمان لڑکی ہتھے چڑھی ہے، ہم لوگ اس کی بے عزتی کر رہے ہیں"

"میں نے سامنے کیو میں کھڑے ہوئے لوگوں کو گنا، مجھ سے آگے پچیس آدمی تھے دیکھتے ہی دیکھتے میرے پیچھے پندرہ آدمی اور آ کے کھڑے ہو گئے۔

"یہ کیو کب تک رہے گا؟" میں نے اسی نوجوان سے پوچھا۔

"جب تک لڑکی مر نہیں جاتی" نوجوان نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر تک تو میں کیو میں کھڑا رہا لوگ باری باری آگے بڑھ رہے تھے، پھر بھی کیو بہت لمبا تھا اور اس لڑکی کی چیخیں بڑی دلخراش تھیں۔

کھڑے کھڑے میرے دل کو کچھ ہونے لگا، جیسے کوئی میرے دل کو مٹھی میں لے کر دھیرے دھیرے مسل رہا ہو۔ واقعی اس لڑکی کی چیخیں بڑی دردناک تھیں۔

"وے بھراوا، میں تیری بہن آں۔ وے ویرا، میں تیری بہن آں"

میں نے اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں دے لیں اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ میلی قمیص والا نوجوان اپنی میلی پتلون سنبھالتا ہوا زور سے قہقہہ مار کر بولا،

"بزدل"۔

(ناولٹ غدار سے)

انسان کے شکاری

رامانند ساگر

کئی مسلم گاڑیوں کے ساتھ مشرقی پنجاب میں جو کچھ کیا گیا وہ بھی کم ہولناک نہ تھا۔ ان میں سے ایک گاڑی کے تیرہ ہزار انسانوں میں سے صرف پندرہ بچے تھے اور وہ بھی لاشوں کے نیچے دب جانے کے باعث

ان پندرہ نے بے حد بھوک اور پیاس کے سبب مرتے ہوئے اپنے بھائیوں، بیویوں اور بچوں کے خون کو چاٹا انتہا یہ کہ کئی روز ریل میں رہنے کے بعد آخر انہوں نے ایک دوسرے کے منہ میں پیشاب کیا تاکہ حلق تو تر ہو سکیں۔

جالندھر میں ایک ڈاکٹر کی لڑکی نے اپنی چھوٹی بہن اور بھائی کے ساتھ بیس گھنٹے تک مسلح اور سکھوں کے ایک بپھرے ہوئے ہجوم کا مقابلہ کیا بیس گھنٹے وہ تینوں ایک ریوالور اور دو رائفلوں سے لڑتے رہے، لیکن آخر کار انہیں ہتھیار ڈال دینے پڑے۔

ڈاکٹر کو باہر لایا گیا تو ایک جوان گھمنڈ سے آگے بڑھا اس نے کہا،

"اسے چھوڑ دو، یہ میرا شکار ہے" اور پھر ایک ہاتھ میں پکڑے ہوئے ایک وزنی کھانڈے کا ایک بھرپور ہاتھ ایسا مارا کہ کھانڈا ڈاکٹر کی کھوپڑی کو چیر کر چھاتی کے ایک طرف سے ہوتا ہوا ایک کولہے کے قریب سے نکل گیا اور پھر قریبی دیوار میں جا کر ایسا لگا کہ کند ہو گیا۔

ڈاکٹر کے دونوں ٹکڑے زمین پر اس کے قدموں میں پڑے تھے اور وہ اپنے کند کھانڈے کو دیکھتا ہوا کہہ رہا تھا

"اگر تم اتنے ہی نرم تھے، تو پہلے کہتے، میں اپنا کھانڈا ہی خراب نہ کرتا"

اس کے بعد ان دونوں لڑکیوں کو باہر لا کر ان کے متعلق کئی طرح کی اسکیمیں مرتب کی گئیں لیکن دونوں لڑکیاں بڑے بہادرانہ انداز میں خاموشی سے کھڑی رہیں آخر میں انہیں کہا گیا کہ جے کا نعرہ لگائیں، لیکن انہوں نے نہایت اطمینان سے جواب دیا

"ہم لڑائی ہار رہے ہیں آپ کا جو جی چاہے ہمارے ساتھ کر سکتے ہیں، لیکن ہمیں کچھ کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔"

ان لڑکیوں کے ساتھ ایک دس سال کا ان کا چھوٹا سا بھائی بھی تھا جو حیران ہو کر دیکھ رہا تھا کہ میری بہنیں جو کبھی پردے کے بغیر غیر مردوں کے سامنے نہیں گئی تھیں آج کس ڈھٹائی سے بڑھ بڑھ باتیں کر رہی ہیں آخر انہیں ننگی عورتوں کے ایک فاتحانہ جلوس کے آگے چلنے کو کہا گیا، لیکن انہوں نے انکار کر دیا

مصطفےٰ خان سیمائی، ڈرلسنگ گاؤں پہلے اس کے سامنے مصر کے گرجا کی طرح منڈلا رہا تھا میر پرسکاچ وسکی کی بوتل ختم کر رہی تھی۔ وہ اپنی بانہیں پھیلا پھیلا کر کہتا تھا میری جان اگر میرے بیٹے سے لگ جاؤ تم بڑی مظلوم ہو، مگر بڑی غریب ہو، لیکن میں ایک امیر انسان ہوں، میں کچھ روز کے لیے تمہیں ملکہ بنا کے رکھوں گا، ہمارا رحیم خان معلوم نہیں کہاں کھو گیا شاید وہ کسی ویرانے میں مرا پڑا ہو، لیکن تم اس فرضی ہستی کی یاد میں اپنی جوانی برباد کرو، آؤ میری جان آؤ میرے سینے سے لگ جاؤ اب تم لیے آزاد وطن میں آگئی ہو اب تمہیں کسی بات کا ڈر نہیں ہمارا وطن ہے پاکستان زندہ باد، پاکستان پائندہ باد۔

دلشاد کے گلے میں مولا علی بخش کی تسبیح لٹک رہی تھی جب مصطفےٰ خان سیمائی کی رال ٹپک ٹپک کر تسبیح کے دانوں کو چومتی، تو دلشاد کو یہ محسوس ہوتا کہ ایک مسلمان بھائی سنگِ اسود کو بوسہ دے رہا ہے۔

دو چار دن میں جب مصطفےٰ خان سیمائی نے اپنے حج کے ارکان پورے کر لیے، تو دلشاد پھر مہاجر خانے میں واپس آگئی۔ اس کا محمود ایک شیشے کا لٹو چلا رہا تھا اس نے تتلا تتلا کر نانیاں بنا کر دلشاد کو سمجھایا کہ رشیدہ باجی بھی موٹر میں بیٹھ کر دادا میاں کے پاس گئی تھی، دادا میاں نے سیٹی کا یہ لٹو بھیجا ہے، یہ لڑکی کہتی ہے، یہ رنگدار مٹھائی ہے۔ آج وہ پھر موٹر میں بیٹھ کر دادا میاں کے پاس گئی ہے۔ موٹر پوں پوں کرتی جا رہی ہے۔ اب وہ پھر دادا میاں سے پیسے لائے گی، ستے ستے لوٹ لائے گی، گلے وار ٹوپی لائے گی۔

لاہور، لاہور بہت بڑا، بہت بڑا شہر تھا۔ لاہور والے لاہور والے بڑے بڑے انصار تھے اور انصار مدینے سے بھی کچھ زیادہ افضل تر تھے۔ سال دلشاد کے پیٹ سے ایک چاند رحیم خان پیدا ہوتا تھا۔ رشیدہ کے پیٹ سے ہر روز ایک چاند ادھم لیتا تھا، بیٹیوں کے پیٹ سے نئے باپ تھے۔ سبھوں کے لیے ستے سے ستے بھائی چارے کا رشتہ مل جاتا تھا، خون کا رشتہ خون سے۔

بیس لاکھ مسلمانوں کی لاشیں

مرتضےٰ خاں میکش

مشرقی پنجاب کے تمام اضلاع امرتسر، گورداسپور (ماسوائے تحصیل شکرگڑھ) فیروزپور، جالندھر، ہوشیارپور، کانگڑہ، انبالہ، رہتک، حصار، گوڑگاؤں، میرپور، فضلع پٹیالہ، حصہ، نابھہ، کلسیہ، الور، بھرت پور اور کوہستان شملہ کی تمام ریاستوں سے مسلمان یک بینی دو گوش نکال باہر پھینک دیے گئے لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کہنے والا اور اس حقیقت کریٰ کا اعلان و اقرار کرنے والا ایک متنفس بھی اس وسیع ملک میں جس کا رقبہ ستر ہزار مربع میل ہے، باقی نہ رہا۔ بلکہ دہلی کے سارے صوبے سے مسلمانوں کے اخراج کا کام بہت پہلے پایۂ تکمیل کو پہنچایا جا چکا تھا اس قتل عام اور اخراج کے باعث مسجدیں ویران ہو گئیں بزرگوں کے مزار تباہ کر دیے گئے ہزاروں مسلمان عورتیں جبراً قید اور لونڈیاں بنا کر رکھ لی گئیں ہزار بچے چھین لیے گئے اور ہزاروں خاندان ہندو یا سکھ بنا لیے گئے۔

ان اضلاع کی بیس لاکھ مسلم آبادی میں سے لاکھوں کلمہ گو قتل کر دیے گئے اکثر گولیوں کا شکار ہوئے بہت سے تیز دھار رکھنے والے آلات سے مارے گئے ایک بڑی تعداد نذرِ آتش کر دی گئی۔ یہ ساری زمین مسلمانوں کے خون سے لالہ زار بن گئی کلمہ گویانِ توحید کی لاشوں سے پٹ گئی، چیلوں، کوؤں، گدھوں، کتوں اور گیدڑوں نے ان کا گوشت نوچ نوچ کر اس حد تک کھایا کہ سیر ہو کر منہ موڑ گئے۔

لاکھوں مسلمان جنہوں نے شمالی کیمپوں کے رستے گذار مصائب در سفر کی ناقابلِ برداشت صعوبتوں کا شکار ہو کر مر گئے اور جہاں جہاں سے گزرتے اپنے قبرستانوں سے زمین کو آباد کرتے گئے ہزاروں مسلمان بارشوں کے باعث آنے والے سیلابوں اور دریاؤں کی طغیانیوں میں غرق ہو کر بہہ گئے دریائے بیاس کے دونوں طرف کئی کئی میل تک زمین ان کی گلی سڑی لاشوں سے پٹ گئی گرانڈ ٹرنک روڈ پر سے ناک بند کیے بغیر گزرنا مشکل ہو گیا

پاکستان میں پہنچنے کے بعد پناہ گزینوں میں اموات کی رفتار تیز تر ہو گئی، کیونکہ سفر کے مصائب جھیلنے کے باعث امراض کے مقابلے میں ان کی قوت مدافعت بہت کم ہو گئی تھی اور پاکستان میں ان کا پہلا سال جاری کوئی نہ تھا ۲۵ دسمبر اور ۲۶ دسمبر کی درمیانی شب کو جب کہ پاکستان کے ارباب اقتدار، قائد اعظم کے یوم ولادت پر رقص و سرود اور مے نوشی کی محفلیں گرم کر کے جشن منا رہے تھے، لاہور، ملکپورہ اور دیگر مقامات کے کیمپوں میں کئی ہزار مسلمان ایک ہی شب میں سردی سے ٹھٹھر کر مر گئے۔

دہلی کے ہزاروں مسلمان ان سب کیفیات کا تختۂ مشق بن کر تلف ہوئے اور ہندوستان کے دیگر اقطاع سے لاکھوں مسلمان ہجرت کر کے پاکستان میں پناہ لینے کے لیے وارد ہوئے یہ مسلمان کروڑوں روپے کی جائدادیں، املاک، اموال، اراضی، باغات، مویشی، سامان، گھر، عمارتیں اور کاروبار چھوڑ کر آئے اور پاکستان میں ہیچ کر تباہ حالی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئے جان و مال کے اس اتلاف پر یہ مصیبت جھیلنی پڑی کہ بھائی سے بھائی بچھڑ گیا۔ اعزا و اقربا ایک دوسرے سے سینکڑوں میل دور جا پڑے گاؤں کے لوگ خویشوں سے رنج و راحت کے شریک چلے آ رہے تھے تتر بتر ہو گئے

ان تمام اتلافات اور نقصانات کا صحیح صحیح اندازہ لگانا بہت مشکل بلکہ امرِ محال ہے۔ تاہم زیادہ سے زیادہ حزم و احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ

قتل ہونے والوں کی تعداد

کیمپوں میں اور سفر کے مصائب سے مرنے والوں کی تعداد — پانچ لاکھ

پاکستان میں پہنچنے کے بعد دو ماہ کے اندر اندر مرنے والوں کی تعداد — پانچ لاکھ

ان عورتوں، بچوں اور مردوں کی تعداد جو ہندو بنا لیے گئے — ایک لاکھ

قصہ مختصر سولہ لاکھ سے لے کر بیس لاکھ تک مسلمان چھ ماہ کے قلیل عرصے میں ہلاک ہو گئے باقی ماندہ کی خانہ بربادی اس پر مستزاد ہے کل ایک کروڑ سے زائد مسلمان سارے ہندوستان سے اس قیامت صغریٰ کی لپیٹ میں آگئے (واقعاتی تصنیف "اخراج اسلام از ہند" سے)

***

پاکستانی شہری اور نظامِ تعلیم

پروفیسر عبدالحمید صدیقی
ماہرِ معاشیات، ماہرِ تعلیم

جنابِ صدر اور معزز حضرات!

عام طور پر کوئی ایسا ملک جو نیا نیا دنیا کے نقشے پر ابھرا ہو اسے سامنے ملاحظہ یہ عجیب مسئلہ رکھا ہے کہ وہ اپنے شہریوں کے لئے فکر و عمل کی کس راہ کو اور عمل کی کس سمت کو متعین کرے۔ اور اسی طرح ایک نئی قوم کے سامنے بھی یہ سوال کافی پریشان کن ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے افراد کو کس مقصد کے حصول کے لیے سرگرمِ عمل کرے۔ کسی دوسرے ملک اور دوسری قوم کے لیے یہ دونوں سوالات شدید اضطراب کا باعث بن سکتے ہیں لیکن ہمارے لیے یہ دونوں سوالات زیادہ کسی پیچیدگی کے حامل نہیں۔ ہم انہیں پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے سے بہت پہلے طے کر چکے ہیں بلکہ پاکستان انہی نظریوں اور اصولوں کو زندہ کرنے کے لیے تو معرضِ وجود میں آیا تھا۔

مسلمانوں کے اندر صدیوں سے یہ احساس شعوری طور پر موجود چلا آ رہا ہے کہ اُن کی حیاتِ اجتماعی اُس ڈھانچے اور نقشے کے مطابق نہیں جیسا جو ہمیں اسلام نے دیا ہے اور جس کے عملی مظاہر ہمیں سنتِ رسول اور آثارِ صحابہ میں ملتے ہیں۔ آپ مسلمانوں کی کسی انقلاب انگیز تحریک کا جائزہ لیں آپ کو اس کے پیچھے یہی احساس کارفرما نظر آئے گا۔ مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات، شاہ ولی اللہ اور ان کے فرزندانِ ارجمند کے افکار و نظریات، شاہ اسمٰعیل شہید اور سید احمد بریلویؒ کی تحریکِ جہاد، دیوبند اور ندوہ کی تعلیمی سرگرمیاں، تحریکِ خلافت، مولانا شبلی و حالیؒ اور علامہ اقبالؒ کے افکار و تصورات غرض ان سب فکری اور عملی کوششوں میں یہی احساس جاری و ساری نظر آتا ہے بلکہ خود تحریکِ پاکستان بھی اسی احساس کی مظہر ہے۔

برِّ عظیم ہند ہی کے نہیں دنیا کے لوگ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے لیے ایک الگ خطۂ ارضی کا مطالبہ صرف اس وجہ سے کیا تھا کہ وہ اپنی الگ اور مستقل تہذیب کا شعور رکھتے تھے اور ان اجتماعی تصورات اور معاشرتی افکار کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے جن سے ہندوستانی وطنی قومیت کا مزاج تیار ہوا تھا۔ اگر بات محض یہی تو مسلمانوں کے لیے اس میں کیا قباحت تھی کہ وہ بھی عیسائیوں، پارسیوں اور سکھوں کی طرح ایک محدود معنی میں اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے ہندوستانی قومیت کا جزو بننے پر راضی ہو جاتے۔ آخر اس میں کیا چیز مانع تھی کہ مسلمان اپنے مذہبی عقائد پر قائم رہتے ہوئے اور اپنی رسوم و عبادات اور بعض معاشرتی خصوصیات کو قائم رکھتے ہوئے امورِ مملکت کے انصرام اور نظمِ اجتماعی کی تشکیل میں ہندوؤں سے پورا پورا اشتراکِ عمل کر لیتے اور اس ملک کا شیرازہ نہ بکھرتا۔ کانگریس کا استدلال یہی تو تھا کہ جب تم اپنی مذہبی آزادی برقرار رکھ کر بھی ہندوستانی وطنیت میں شامل ہو سکتے ہو تو پھر مذہبی اساس پر ایک علیحدہ قومیت کا ادعا کیوں کرتے ہو۔ اس کا جواب مسلمانوں کی طرف سے یہ دیا جاتا تھا کہ ہم اپنی مذہبی زندگی اور اجتماعی زندگی کے درمیان کوئی حدِ فاصل قائم نہیں کر سکتے کیونکہ مذہب ہی ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کا مدار اور اس کی اساس ہے۔ ہماری تہذیب میں مذہب صرف ایک عنصر کی حیثیت سے داخل نہیں بلکہ وہی اس تہذیب کا مدارِ اعلیٰ اور جوہرِ حیات ہے۔ اس لیے ہم مذہب کو اجتماعی اور سیاسی زندگی سے خارج کر کے اپنی تہذیب کو باقی نہیں رکھ سکتے۔ ہمارے لیے یہ ناممکن ہے کہ سیاسی، ملکی اور تمدنی امور میں مذہبی اندازِ فکر اور مذہبی طرزِ خیال سے ہٹ کر کسی دوسرے طرزِ فکر کے مطابق کام کریں یا اجتماعی زندگی کی کوئی ایسی شکل گوارا کر لیں جو ہمارے مذہبی احساسات و تخیلات سے متعارض ہو۔ یہ جواب بالکل معقول تھا اور اسلام کے مزاج اور تقاضوں کے عین مطابق تھا۔

حضرات! آپ خود ہی غور فرمائیں کہ جو ملک اسلام کی خاطر حاصل کیا گیا ہو اور جس کے قیام کا منشائے مقصود ہی اسلامی تعلیمات کی عملی تعبیر ہو، اس ملک کے باشندوں کے بارے میں اب یہ سوچنا کہ انہیں کس مذہب و تمدن کا خادم بنایا جائے، کس نوعیت کی اخلاقی صفات سے انہیں متصف کیا جائے، کس نصب العین کو اُن کی سرگرمیوں کا ہدف ٹھہرایا جائے اور کس مقصد کے لیے انہیں سرگرمِ عمل اور متحرک کیا جائے محض ایک لا حاصل بات ہے۔ ان سارے امور کا فیصلہ تو ہم پہلے ہی کر چکے ہیں اور اسی فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے ہم نے جان و مال اور عزت و آبرو کے ناقابلِ بیان نقصانات برداشت کر کے ایک الگ خطۂ ارضی حاصل کیا تھا۔

حضرات! پاکستان مسلمانوں کے دینی احساسات کی صحیح مادی تصویر ہے۔ یہ اُن کی آرزوؤں کا مرکز، اُن کے عزائم اور ارادوں کا محور اور اُن کی امنگوں اور تمناؤں کا مظہر ہے۔ اسے صرف احیائے اسلام کے لیے قائم کیا گیا ہے اور اسی غرض کے لئے یہاں کے باشندے اس کے تحفظ و بقا کے لیے ہر قسم کی قربانیاں دینے پر آمادہ رہتے ہیں۔ پاکستان ایک خطۂ ارضی ہی نہیں بلکہ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی ایک انقلاب انگیز تحریک کا ردِ عمل ہے۔ اس کا مقصد یہ نہیں کہ یہاں صرف ایک محکمہ اوقاف یا ایک شیخ الاسلام یا ایک وزارتِ امورِ دینیہ کے قیام تک محدود رہے بلکہ پوری اجتماعی زندگی، سیاست، معیشت، معاشرت، عدالت، قانون، تعلیم، غرض حیاتِ اجتماعی کے سارے گوشوں پر پوری طرح حاوی ہو۔

پاکستان کے اس پس منظر اور اس کے ساتھ وابستہ ان جذبات و احساسات کو اگر سامنے رکھا جائے تو پاکستان کے مطلوب شہری کے اوصاف کا تعین کچھ مشکل نہیں رہتا۔ پاکستان کا مطلوب شہری وہی ہو سکتا ہے جو اسلامی تعلیمات کا امین اور علمبردار ہو۔ اس ملک کو جس گرد و پیش سے وقت ضرورت فائدہ اٹھانے کے کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے، مگر عملی دنیا میں اس کی ہدایات اور پابندیوں سے ہر طرح گریز کیا جا رہا ہے۔ دو رنگی اور تضاد کی اس فضا میں آخر کس طرح توقع رکھیں کہ اسلام کا علمبردار پایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس ماحول میں ہماری جو اولاد جوان نسل پروان چڑھ رہی ہے وہ بھی دین کو بس ایک کھلونے سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں دیتی۔ جب کسی شخص کو گرمانے یا کوئی مؤثر بیان دے کر عوام کے جذبات سے کھیلنے کی ضرورت پیش آئی تو فوراً اس کو استعمال کر لیا لیکن جہاں انہوں نے کسی معمولی سے معمولی ایثار کا مطالبہ کیا وہاں اس سے اس طرح آنکھیں چرا کر نکل گئے جیسے کہ اُن کا اللہ کے اس دین سے کوئی دُور کا بھی تعلق نہ تھا۔

اس ماحول میں جو سوسائٹی تشکیل پا رہی ہے وہ دینی اور اخلاقی اعتبار سے بڑی کمزور اور بودی ہے۔ آپ خود حالات کا جائزہ لے کر دیکھیے کہ موجودہ معاشرے میں کتنے

دست شناسی کی سائنسی تعبیر، علم حیات و عمرانیات کے منظم ہونے کی حیثیت سے کی ہے۔

محور: عمرانی علوم اور نفسیات کے ایک استاد کی حیثیت سے آپ نوجوانوں کے ان مختلف ہوئے مسائل کا کیا تجزیہ کرتے ہیں؟

ملک صاحب: میرا تجزیہ یہ ہے کہ معاشرے میں دن بدن استاد، والدین اور نئی نسل کے درمیان شدید بعد پیدا ہوتا جا رہا ہے، فاصلے بڑھتے جا رہے ہیں، تعلقات میں اجنبیت اور بیگانگی کی دیواریں حائل ہوتی جا رہی ہیں۔ فریقین کے درمیان ذہنی اور روحانی رابطہ دن بدن کم ہوتا جا رہا ہے۔ اُدھر معاشرے میں تمام ذرائع ابلاغ سے ایک ہیجان خیز اور ہنگامہ پرور فضا پیدا کی جا رہی ہے، اور مشکل یہ ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے کہ رہنمائی اور مشاورت مہیا کرنے والے اداروں کا زبردست فقدان پورے ملک میں کوئی ادارہ موجود نہیں جہاں نوجوان دلی کیفیات کا اظہار اور راستے رستے ناسوروں کا مداوا تلاش کر سکیں۔ گھٹن کی اس ماحول میں ان کی رسائی ایسی ہی قسم کے ہم عمر نوجوانوں تک ہوتی ہے جو ان کو مزید ذہنی الجھنوں میں مبتلا کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ ہمارے سکولوں اور کالجوں میں رہنمائی و مشاورت کے کلینکوں (CLINICS) کا جال بچھا ہونا چاہئے، بصورت دیگر غیر سائنسی نظر کے حامل دست شناسوں کی طرف نوجوانوں کا رجوع فطری امر ہے۔

محور: مشاورت و رہنمائی کے اس پروگرام میں علم دست شناسی بھی کوئی رول ادا کر سکتی ہے؟

ملک صاحب: یہ علم مسائل کی تشخیص کا کام دے سکتا ہے، ان کا حل تجویز نہیں کرتا۔ اس کی حیثیت سٹیتھسکوپ کی طرح ایک آلہ تشخیص کی سی ہے، جس سے کسی مرض کی نشاندہی تو ممکن ہے لیکن علاج نہیں۔ البتہ دست شناس جو عمرانی و نفسیاتی علوم سے بہرہ ور ہو، سائنسی مزاج رکھتا ہو، انسانی مسائل پر بھی اس کی نظر ہو تو وہ رہنمائی و مشاورت کا مؤثر ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے۔ اس ضمن میں ایک نوجوان لڑکی کا واقعہ میرے ذہن میں آتا ہے جسے اس کی والدہ اس کی کسی مخصوص ذہنی کیفیت کی بنا پر میرے پاس لائیں۔ اس کے ہاتھ کی لکیروں کی مخصوص ساخت اور ظاہری حرکات و سکنات اس کی کسی گہری ذہنی پریشانی کی آئینہ دار تھیں جس کا اظہار اس کے لئے ماں کی موجودگی میں انتہائی مشکل تھا۔ میں نے الجھن کو بھانپتے ہوئے اس کی والدہ سے درخواست کی کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے کمرے میں تشریف لے جائیں۔ مختصراً اور واضح سی بات یہ تھی لڑکی اپنی محبوب کی شادی کسی پوشیدہ مسئلے سے دوچار ہو چکی تھی جس کے نتائج کے تصور سے وہ سخت خوفزدہ تھی اور اظہار بھی اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔ واقعہ کی سنگینی کے پیش نظر میں نے لڑکی کی والدہ کو اعتماد میں لیا اور اسے حقیقی صورتِ حال سے آگاہ کیا، جس سے وہ مسئلہ جو کہ ایک شدید حادثے اور المیے کا سبب بن سکتا تھا، بڑی خوش اسلوبی سے طے پا گیا اور شادی وہاں ہوئی جہاں لڑکی چاہتی تھی۔

بالعموم دست شناس کسی فرد کی زندگی کی درج ذیل خدمات سر انجام دے سکتا ہے:

(۱) اس کے فطری رجحانات اور پیدائشی صلاحیتوں کی جانچ پرکھ۔

(۲) ذہنی اور جسمانی امراض و مسائل کی تشخیص۔

(۳) ماضی و حال کے واقعات کی تعبیر اور آنے والے دور کی ایک دھندلی سی تصویر۔

محور: مذکورہ بالا خاتون کے واقعہ کے بعد میرے ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ کیا آپ نے نئی نسل کی لڑکیوں کے مسائل کو لڑکوں کے مسائل سے مختلف پایا ہے؟

ملک صاحب: بعض مسائل دونوں اصناف کے مشترک ہیں، اور بعض مختلف، کیونکہ دونوں کو پاکستانی معاشرے کا جزو ہونے کی حیثیت سے یکساں قسم کے معاشرتی و معاشی مسائل کا سامنا ہے۔ بہرحال صنفی اختلاف مسائل کے اختلاف کی عکاسی بھی کرتا ہے، مثلاً لڑکیوں کے لئے ان کا ازدواجی حیثیت ان کے کیریئر سے زیادہ معاشرے میں ان کا مقام متعین کرتی ہے، شادی اور کیریئر کے درمیان کشمکش دونوں میں کسی ایک کا انتخاب، گھر سے باہر دفتروں میں ملازمت، معیاری ازدواجی زندگی کا حصول، شائستہ لیسندی، حقائق سے فرار، آزادی کے نئے رجحانات کا غیر مناسب استعمال، قدروں کا تصادم ——— یہ چند ایک ان کے مخصوص مسائل ہیں۔ آج سے تیس برس قبل کی لڑکیاں شرم و حجاب کا مجسمہ تھیں لیکن آج اپنی ازدواجی زندگی اور دیگر تعلقات کے بارے میں بے باکی سے گفتگو کرتی ہیں، اس سے بدلتے ہوئے معاشرتی ڈھانچہ کا احساس ہوتا ہے۔

محور: "ہاتھ کی زبان" میں ایک مضمون "میلن کی اوٹ میں" آپ نے تحریر کیا ہے۔ "مارک سے ہاتھوں کا ذکر آتے ہی میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ جاتے ہیں" کیا آپ اب بھی اسی COMPLEX میں مبتلا ہیں؟

ملک صاحب: یہ COMPLEX کی بات نہیں معاشرتی مجبوری کا اظہار ہے، اور دست شناس کے لئے "گریم مشکل" کا معاملہ ہے۔

محور: آپ نے اس علم کی سائنسی حیثیت کا ذکر بار بار کیا ہے، اس کے لئے آپ کے پاس عقلی استدلال کیا ہے؟

ملک صاحب: عقلی استدلال یہ ہے کہ علم دست شناسی پر سائنسی طریق کار کا اطلاق ممکن ہے، اس کے مطابق کسی مظہر فطرت (PHENOMENON) پر تحقیق کا آغاز ہمیشہ چند ابتدائی غیر مربوط اور نامکمل مشاہدات (OBSERVATIONS) سے ہوتا ہے۔ ان کی بنا پر ہمارے ذہن میں کوئی مفروضہ (HYPOTHESIS) جنم لیتا ہے، اس مفروضے کی تصدیق یا تردید کے لئے کسی مرکزِ تحقیق (UNIVERSE) کا انتخاب کیا جاتا ہے، جہاں سے منظم و مربوط حقائق و شواہد (FACTUAL DATA) اکٹھے کئے جاتے ہیں، بعد ازاں ان کا تجزیہ و تعبیر (ANALYSIS AND INTERPRETATION) کی جاتی ہے، اگر حقائق و شواہد کی اکثریت سے مفروضہ کی تردید ہوتی ہے تو علم باطل ٹھہرتا ہے، اور اگر ان کی واضح اکثریت مفروضے کی تصدیق کرتی ہے تو وہ علم سچا ہے، اور مفروضہ سائنسی نظریے کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے جسے جوں جوں تجربات کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے تو اصول و قوانین معرضِ وجود میں آتے ہیں۔

اسی سائنسی طریق کار کو ذہنی مریضوں کے ہاتھوں پر آزمایا گیا، ہمارا مفروضہ یہ تھا کہ ہاتھ کی وہ لکیر جسے عرفِ عام میں دماغی لکیر کے نام سے پکارا جاتا ہے، اس پر چند مخصوص علامات ذہنی مریضوں کی خاص قسم (SCHIZOPHRENICS) کی مظہر ہے، ہم نے اس مفروضے کی تردید و تصدیق کے لئے گورنمنٹ مینٹل ہسپتال لاہور کو بطور مرکز تحقیق (UNIVERSE) منتخب کیا۔ لگ بھگ ایک سو ایسے ذہنی مریضوں کے ہاتھوں کے نقوش دست کے نمونے اکٹھے کئے، حقائق و شواہد کی اکثریت سے ہمارے مفروضہ کی تصدیق کی

اب اسی طرح کاروبار کا اطلاق عاملوں کے ہاتھوں پر کیا جا رہا ہے۔ تا حال جو حقائق ہیں دستیاب ہو سکا اس سے ہمارے اس مفروضے کی تصدیق ہوتی ہے کہ عاملوں کے ہاتھوں پر کچھ غیر معمولی علامات پائی جاتی ہیں جو عام لوگوں کے ہاتھوں پر نہیں ہوتیں

محور | ایک بات جو میرے ذہن میں مسلسل کھٹکتی رہی، اور جو عام اور نوجوانوں کے ذہن میں بھی اس کی کچھ خلش محسوس ہوتی ہو گی کہ سائنسی مرتبے کے ساتھ ساتھ اس علم کی مذہبی حیثیت کیا ہے؟

ملک صاحب | اس سوال سے مجھے اس لئے پریشان نہیں کیا کہ میں اس علم کے سائنسی مرتبے کا قائل ہوں، اور اگر آپ مذہب کی بات کرتے ہیں، تو میرا پختہ یقین ہے کہ کم از کم اسلام ان مذاہب میں سے نہیں جو سائنس سے کسی طرح بھی متصادم ہوا ہو۔ ایک بار ایک عالم دین سے جو اس علم کی مذہبی حیثیت پر معترض تھے سے دریافت کیا کہ تسلیم انسانی ہاتھ پر یہ علامات اور لکیریں کس نے بنائی ہوئی ہیں یا آپ نے، انہوں نے فرمایا کہ یہ سب اللہ کی بنائی ہوئی نشانیاں ہیں میں نے دوبارہ استفسار کیا کہ پھر بتائیے اللہ تعالیٰ نے آج تک کوئی چیز بے معنی بھی پیدا کی ہے، اگر یہ بامعنی ہیں، تو ان کے معانی کو کھنگالنا مشیت ایزدی کے خلاف کیونکر ہوا!

مجھ سے پوچھئے تو طبِ دست شناسی سے خدا پر میرے اعتقاد کو بدرجہ تقویت حاصل ہوئی ہے میں دست شناسی سے خدا شناسی تک پہنچا ہوں یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ آفرینش سے ابتدائے آفرینش تک جتنے انسان بھی پیدا ہوئے ہیں یا ہوں گے، ان کے ہاتھوں کے انگوٹھوں پر نشانات کبھی ایک دوسرے سے مشابہ نہیں پائے گئے ہیں اور نہ کبھی ایسا ہونا ممکن ہو گا انگوٹھا ہر انسان کا شناختی نشان ہے (IDENTIFICATION MARK) اور اس کی انفرادیت کا مظہر۔ یوں معلوم ہوتا ہے، ہر انسان جو اس دنیا میں قدم رکھتا ہے اسے ایک شناختی نشان الاٹ کیا جاتا ہے، اور یہ نشان کسی مخصوص منصوبہ بندی کے تحت باقاعدہ ریکارڈ میں محفوظ ہے کہ جب وہ کہیں نیا کا شکار ہو جائے تو بھی پولیس ریکارڈ سے اس کی شناخت ممکن رہے، کبھی کبھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے کارسازِ مطلق نے کچھ حافظوں کمپیوٹر پر عمل جاری رکھے ہوئے ہیں، یا ہر کی لکیریں بھی شاید کمپیوٹر نظام کا حصہ ہیں بلکہ اس بات کا احساس بھی ہوتا ہے کہ انسانی ذہن میں کچھ آلات ایسے بھی نصب ہیں، جو راڈار کی مانند آنے والے دور کی ایک دھندلی سی تصویر بھی اس کے سامنے پیش کر لیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ لکیریں بسا اوقات انسانی مستقبل کی نقشے بھی ٹھہرتی ہیں،

محور | اس علم کو جدید عصری تقاضوں میں ڈھالنے کے لئے آپ کے ذہن میں کیا تجاویز ہیں؟

ملک صاحب | اس علم کی تمام تر اصطلاحات علم نجوم اور قدیم ہندی اور یونانی دیومالاؤں کے حصوں سے مستعار لی گئی ہیں مثلاً زحل، عطارد، زہرہ، مشتری، حلقۂ سلیمانی وغیرہ یہ اصطلاحات ان ہی علوم سے اس کی نسبت قائم کرتی ہیں، اور اسے پُراسرار علوم کی صف میں لا کھڑا کرتی ہیں

ان اصطلاحات کو جدید سائنسی علوم، میڈیکل سائنس، نفسیات، بیالوجی اور عمرانیات کی روشنی میں از سر نو وضع کرنے کی ضرورت ہے۔ مزید برآں اس علم کی علامات کے مفہوم، وجہ تعبیر کو جدید علمی تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی بھی ضرورت ہے، کچھ علامات کے مفہوم کو محض صرف از سر نو متعین کرنے بلکہ انہیں بالکل بدلنے کی ضرورت ہے، مثلاً شادی کی ایک روایتی لکیر بتا کر دیکھئے اسے میرے نزدیک شادی کی لکیر سے منسوب کرنا درست نہیں یہ انسان کے جنسی رجحانات کی مظہر ہے بہت سی علامات جن کی تقدیر پرستانہ تشریح و تعبیر کی جاتی رہی ہے بہت کم دست شناس شاید یہ جانتے ہوں گے کہ یہ در اصل کسی انسان کی سیرت و کردار اور شخصی رجحانات کی عکاس ہیں اور انسانی مقدر سے ان کا رشتہ اگر کچھ ہے تو وہ صرف علت و معلول (CAUSE AND EFFECT) کا ہے

بقیہ دینیات کا پیریڈ

اس وقت جو طریق تعلیم رائج ہے وہ جدید اور اسلامی تعلیم کی ایک ایسی آمیزش پر مشتمل ہے جس میں کوئی امتزاج اور کوئی ہم آہنگی نہیں دو بالکل متضاد اور بے جوڑ تعلیمی عنصروں کو جوں کا توں لے کر ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے، ان میں یہ صلاحیت پیدا نہیں کی گئی کہ ایک مرکب علمی قوت بن کر کسی ایک کلچر کی خدمت کر سکیں یکجا ہونے کے باوجود یہ دونوں عنصر نہ صرف ایک دوسرے سے الگ رہتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کی مزاحمت کر کے طلبہ کے ذہن کو دو مخالف سمتوں کی طرف کھینچتے ہیں اسلامی نقطۂ نگاہ سے قطع نظر خالص تعلیمی نقطۂ نگاہ سے بھی اگر دیکھا جائے، تو یہ کہنا پڑے گا کہ تعلیم میں اس قسم کے متناقض عناصر کی آمیزش اصلاً غلط ہے، اور اس سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔

اسلامی نقطۂ نظر سے یہ آمیزش اور بھی زیادہ خاصی کا سبب بن گئی ہے کیونکہ اول تو خود آمیزش ہی درست نہیں، پھر اس پر مزید خرابی یہ ہے کہ یہ آمیزش بھی مساویانہ نہیں ہے اس میں مغربی عنصر بہت طاقتور ہے اور اسلامی کلچر اس کے مقابلے میں نہایت کمزور ہے مغربی عنصر کو پہلا فائدہ تو یہ حاصل ہے کہ وہ ایک عصری عنصر ہے جس کی پشت پر زمانہ رفتار کی قوت اور ایک غالب حکمران تمدن کی طاقت ہے اس کے علاوہ یونیورسٹیوں کی تعلیم میں ٹھیک اسی شان اور اسی طاقت کے ساتھ شریک کیا گیا ہے جس کے ساتھ وہ ان یونیورسٹیوں میں جذب ہو رہا ہے جو مغربی کلچر کی خدمت کے لیے قائم کی گئی ہیں یہاں مغربی علوم و فنون کی تعلیم اس طور پر دی جاتی ہے کہ ان کے تمام اصول اور نظریات مسلمان لڑکوں کی صاف اور سادہ لوحِ دل پر ایمان بن کر ثبت ہو جاتے ہیں اور ان کی وجہ سے کلیتہً مغربی سانچے میں ڈھل جاتا ہے حتیٰ کہ وہ مغربی نظر سے دیکھنے اور مغربی دماغ سے سوچنے لگتے ہیں، اور یہ اعتقاد ان پر مسلط ہو جاتا ہے کہ دنیا میں اگر کوئی چیز معقول اور با صحت ہے تو وہی ہے جو مغربی فلسفہ کے اصول و مبادی سے مطابقت رکھتی ہو پھر ان تاثرات کو مزید تقویت اس ماحول سے پہنچتی ہے جو ہماری یونیورسٹی میں پھیلا دی جا رہی ہے لباس و معاشرت، آداب و اطوار، رفتار و گفتار، غرض کوئی چیز ایسی نہیں جس پر مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی رجحانات کا غلبہ نہ ہو۔ یونیورسٹیوں کا ماحول اگر پورا نہیں تو ۹۵ فیصدی یقیناً مغربی ہے اور ایسے ماحول کے جو اثرات ہو سکتے ہیں اور ہوا کرتے ہیں ان کو ہر صاحب نظر خود سمجھ سکتا ہے اس کے مقابلے میں غیر اسلامی عنصر نہایت کمزور ہے، اول تو وہ اپنی تمدنی و سیاسی طاقت کو کھو کر دیسے ہی کمزور ہو چکا ہے، پھر ہماری یونیورسٹیوں میں اس کی تعلیم جن کتابوں کے ذریعے سے دی جاتی ہے وہ موجودہ زمانے سے صدیوں پہلے لکھی گئی تھیں، ان کی زبان اور ترتیب و تدوین ایسی نہیں جو اس زمانے کو اپیل کر سکے ان میں سے اسلام کے ابدی اصولوں کو جن حالات اور جن عملی مسائل پر منطبق کیا گیا ہے ان میں سے اکثر اب درپیش نہیں ہیں، ان پر ان اصولوں کو منطبق کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے مزید برآں اس تعلیم کی پشت پر کوئی زندہ تحریک، کوئی زندہ ماحول، کوئی عملی برتاؤ اور چلن بھی نہیں اس طرح مغربی علم کے ساتھ اسلامی تعلیم کی آمیزش اور بھی زیادہ بے اثر ہو جاتی ہے ایسی نامساوی آمیزش کا طبعی نتیجہ یہ ہے کہ طلبہ کے دل و دماغ پر مغربی عنصر پوری طرح غالب آ جائے اور اسلامی عنصر محض ایک سامانِ تضحیک ہے کے لیے رہ جائے یا زیادہ سے زیادہ اس لئے کہ زمانۂ ماضی کے آثار باقیہ کی طرح اس کا احترام کیا جائے

چند مشورے

رانا محمد اختر

آزاد کشمیر میں تعلیمی تبدیلیاں

آزاد کشمیر میں تعلیم کے شعبے کو ایک مدت سے نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ نظام تعلیم بعض والدین کے تمام اور طلبہ کی مشکلات کو کبھی اس حال میں سمجھا گیا کہ اس سلسلے میں حل مشورہ کر کے دیکھا ہو اور کوئی لائحہ عمل تیار کیا جائے۔ اس پس منظر میں آزاد کشمیر تعلیمی کانفرنس کے انعقاد پر جمعیت طلبہ اس توقع کا اظہار کرتی ہے کہ تعلیمی کانفرنس آزاد کشمیر میں تعلیم کے مسائل کا جائزہ لینے اور انہیں حل کرنے کے سلسلے میں ایک مثبت کوشش ثابت ہوگی۔

تعلیم

گذشتہ کئی برس سے اس بات کو تقریباً سب ہی تسلیم کرتے چلے آ رہے ہیں کہ تعلیم کی بے مقصدیت اور تعلیمی سہولتوں کی عدم افادیت کا اصل سبب وہ نظام تعلیم ہے جس سے ہمیں برصغیر کے انگریز آقاؤں سے ورثے کے طور پر مسلسل اپنے یہاں جاری رکھا ہے۔ واضح سی بات ہے کہ آزاد کشمیر میں ایک ایسے نظام تعلیم کی ترویج کی ضرورت ہے جو قومی ضروریات اور عوام کی امنگوں اور آرزوؤں کا حقیقی ترجمان ہو۔ ایک غیر ملکی سامراجی طاقت کے تشکیل کردہ تعلیمی نظام کا جاری رہنا جو اس نے محض اپنے نوآبادیاتی مقاصد کی تکمیل کے لیے نافذ کیا، ہمارے تمام مسائل اور مصائب کی حقیقی وجہ ہے۔ اس صورت حال کو وقتی یا جزوی اصلاح درست نہیں کر سکتی بلکہ ایک ایسی کلی تبدیلی ضروری ہے جو طلبہ کو کشمیر کی آزادی اور اسلام کی نظریاتی اساس پر مبنی فلاحی معاشرہ کے قیام کے مقاصد کی تکمیل کے لیے تیار کر سکے۔ تعلیمی کانفرنس کے شرکاء پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ نظریاتی لحاظ سے دیوالیہ اور تخلیقی نقطہ نظر سے بانجھ روایات سے ہٹے ہوئے طریقہ امتحان و طریقہ تعلیم میں وہ انقلاب لانے کے لیے سوچیں جو اسلامی نظام تعلیم کے نفاذ کا ذریعہ ثابت ہو۔ ہماری رائے میں آزاد کشمیر میں تعلیم کا بنیادی مقصد نوجوانوں کو کشمیر کی جدوجہد آزادی کا سپاہی بنانا اور اسلام کے اصولوں کی اساس پر معاشرتی و ریاستی ڈھانچہ چلانے کی تربیت دینا ہونا چاہیے۔ ان مقاصد کے لیے محض اعلانات و سفارشات کا طریقہ اختیار کیا گیا تو یقیناً یہ ایک بے مقصد بات ہوگی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایک طرف تو ماہرین تعلیم، دانشور، اساتذہ اور طلبہ اس تعلیمی ڈھانچہ کی تشکیل کے فکری و عملی کام میں حصہ لیں جو ہمارے قومی نصب العین کے مطابق ہو اور دوسری طرف اس تشکیل شدہ ڈھانچہ کے عملی نفاذ کے لیے فوری طور پر قدم اٹھایا جائے۔ نئی پالیسی کے نفاذ کو تحریک کی شکل دی جائے اور اس غرض سے اہل علم، اساتذہ، طلبہ اور صحافیوں پر مشتمل تعلیمی کونسل بنائی جائے جو اسے نوکر شاہی کے سرخ فیتے کی نذر ہونے سے محفوظ رکھ سکے۔ ساتھ ہی ساتھ ابلاغ عامہ کے ذرائع مسلسل ان سفارشات کو عوام کے سامنے لاتے رہیں تاکہ کوتاہیوں پر احتساب کا عمل ہو سکے۔

تعلیمی نصب العین

ہمارے نظام تعلیم کا مقصد ایسے نوجوانوں کی تیاری ہونا چاہیے جو وطن عزیز کی جدوجہد آزادی کے مجاہد، بہترین مسلمان اور بہترین صاحب علم ہوں۔"

اس مقصد کے لیے ہمارے نظام تعلیم میں فوری طور پر مندرجہ ذیل تبدیلیاں لائی جانی چاہئیں

تعلیمی اداروں کے موجودہ ماحول کو تبدیل کیا جائے اور اس سلسلے میں ضروری اقدامات کیے جائیں۔ گو کہ مکمل تبدیلی کے لیے کچھ وقت درکار ہوگا لیکن ابتدا میں چند مفید اور مؤثر اقدامات کیے جا سکتے ہیں۔ اس وقت رقص اور موسیقی کو فنون ثقافت کا ایک جزو سمجھا جاتا ہے اور مغرب زدگی

تعلیمی ماحول

کے رجحانات بڑھتے جا رہے ہیں۔ اخلاقی قدروں کو پس پشت ڈالا جا رہا ہے اور روزہ نماز کے مواقع بہم پہنچانے کی ضرورت تک محسوس نہیں کی جاتی۔ تعمیرہ پذیرائی اور سجاوٹ میں مسلم ثقافت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ مذہب کو ایک نجی اور انفرادی معاملہ قرار دیا جا رہا ہے۔ یہ رجحان ختم ہونا ضروری ہے۔ ہمارے تعلیمی اداروں کو اس بات کا واضح اور بیّن ثبوت دینا چاہیے کہ ہم اوّل و آخر مسلمان ہیں۔ اگر اس بات کی اہمیت کو قبول کر لیا جائے، تو ایسے کئی اقدامات کی سفارش کی جا سکتی ہے جو آسانی سے قابل عمل ہیں۔ اگر ان اقدامات پر سختی سے عمل کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے تعلیمی اداروں کا ماحول ہمارے نظریات کے مطابق نہ ہو

- ہر ہائی اسکول اور کالج میں مسجد کی تعمیر لازمی قرار دی جائے۔
- نماز کے اوقات میں کوئی پیریڈ نہ ہو۔

اہتمام دعائیہ اجتماع

تمام اسکولز اور کالجز میں تدریس کا آغاز دعائیہ اجتماع ——— سے ہو جس میں تلاوتِ کلامِ پاک مع ترجمہ کوئی سی دو احادیث ہوئی، قومی ترانے اور آزاد کشمیر و پاکستان کا پرچم بلند کرنے کے ساتھ ہی آزادی کشمیر کا جذبہ بیدار کرنے والی نظموں اور نعروں کا بھی اہتمام کیا جائے۔

نصاب اور درسی کتب

ہمارا نصاب اور درسی کتب نہ صرف مقصدیت کے اعتبار سے غیر واضح ہے، بلکہ جدید معلومات سے بھی عاری ہے۔ ان دونوں مقاصد کے لیے مختلف سطحوں پر مختلف کمیٹیوں کی تشکیل کے ساتھ ساتھ مندرجہ ذیل تجاویز خاصی مؤثر ثابت ہوں گی۔

مسئلہ کشمیر کی نصاب میں شمولیت

مسئلہ کشمیر کی تاریخ اور جدوجہد آزادی کے حقائق و واقعات کو ہر سطح پر نصاب میں شامل کیا جائے۔ معاشرتی علوم اور رسالوں کے پرچوں کے نصاب میں اس موضوع پر مضامین شامل کیے جا سکتے ہیں۔ پرائمری اسکول کی سطح پر قومی نظمیں پڑھائی جانی چاہئیں۔ جغرافیہ کے مضامین میں ریاست جموں و کشمیر کا جغرافیہ اور تاریخ کے مضامین میں ریاست کی تاریخ اور مسلمانوں کے جذبہ آزادی کو نصاب میں شامل ہونا چاہیے۔

کانفرنسیں

رسالوں، ہیڈ ماسٹروں اور ایک ایک مضمون کے معلموں کی کانفرنسیں سال میں کم از کم دو بار ہونی چاہئیں، جہاں تعلیمی انقلاب کا موضوع مرکزی حیثیت سے زیر بحث لایا جائے

اساتذہ کا نظریاتی رجحان

اگر استاد کا رویہ اسلامی خطوط پر تعلیمی انقلاب کے کام میں مضرات سے مؤثر ترقی روکنے اور تنزل کرنے سے بے کر بر طرفی تک کارروائی کی جانی چاہیے خصوصاً اگر استاد کی طرف سے مخالف اسلام نظریات کی حمایت کرنا یا کمیونزم زیر بحث لانا، یا اسلامی تصورات و احکامات کی تضحیک کرنا ثابت ہو جائے۔ تو اسے نظریہ پاکستان کے ہر قسم کے مفاد سے محروم کر کے برطرف کر دیا جانا چاہیے جس طرح ریاست کے لیے تخریبی کام دائمی ناقابل برداشت ہے، اسی طرح نظام تعلیم بھی تخریبی عمل کا روادار نہیں ہو سکتا

معاشرے میں استاد کی حیثیت اس کے کردار اور صرف کردار پر منحصر ہے۔ اس کا کوئی دوسرا حل ممکن نہیں۔ اونچی تنخواہیں اور سہولتیں سر آنکھوں پر، لیکن صرف یہی چیزیں اس عظیم محنت اور عزت کی بنیاد نہیں ہیں جو ہمارے معاشرے میں ہمیشہ استاد کو حاصل رہی ہیں۔ اگر استاد اپنے اندر ایک صالح اسلامی کردار پیدا کریں، تو لازماً طلبہ کے دل میں ان کی محبت بڑھے گی، اس طرح مسلمان معاشرے میں استاد اور شاگرد کے پرمقدس رشتے جو ایک تاریخی روایت ہیں، ایک نئے دور میں داخل ہوں گے۔

متفرق تجاویز

مل مدارس کو ابھارنے کے لیے چند متفرق تجاویز۔

لازمی فوجی تربیت

ہمارا مشورہ اداروں سے یہ مطالبہ ہے کہ ہر طالب علم کو کم از کم ایک سال کے لیے لازمی فوجی تربیت دی جائے تاکہ طلبہ جیسی قوت کو جہاں ہنگامی قومی ضروریات کے لیے تیار رکھا جا سکے، وہیں ان میں ڈسپلن، حصول صحت، اور قومی تحفظ کے احساس کو ابھارا جائے، اس لیے دیگر کئی ممالک کی طرح ثانوی تعلیم کی تکمیل پر ایک سالہ فوجی تربیت لازمی قرار دی جائے۔ اس سلسلے میں نیشنل کیڈٹ کور NCC اسکیم ناکافی ہے، ایک تو اس میں وہی طلبہ زیادہ تر دلچسپی لیتے ہیں جو فنی تعلیمی اداروں میں داخلوں کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ ٹریننگ بھی معمولی دماغی نوعیت کی ہے جنگ چالوں اور ہتھیاروں کے جدید ترین دور میں محض ایل ایم جی اور تھری ناٹ تھری کی ٹریننگ تحریک آزادی کے لیے ناکافی ہے۔

فوجی قوت کے مظاہرے

قومی اہمیت کے ایام مثلاً یوم شہدائے کشمیر ۱۳ جولائی، ستمبر اور یوم آزادی کشمیر ۲۴ اکتوبر وغیرہ کو رسمی جلسے کی بجائے لازمی فوجی قوت کے مظاہرے کیے جائیں۔

مڈل ہائی اسکول اور کالج کے طلبہ کو ان ایام میں رخصت دینے کے بجائے اساتذہ کی زیر نگرانی ان مظاہروں کو دیکھنا لازمی قرار دیا جائے۔ اس سے ہماری نئی نسل پر نہایت مثبت اثرات مرتب ہوں گے

ریڈیو اور ٹی وی

یہی عصری آلات تعلیم اور تربیت کا مؤثر ذریعہ ہیں۔ آزاد کشمیر میں میڈیا کو تعلیمی مقاصد کے لیے استعمال کیا جانا چاہیے۔ راولپنڈی، اسلام آباد ٹیلی ویژن سے آزاد کشمیر کے لیے خصوصی پروگرام نشر ہونے چاہئیں جو کشمیر کی آزادی کو اہمیت دیں صبح کے وقت ریڈیو، ٹی وی کی تعلیمی نشریات شروع کی جا سکتی ہیں جن میں تعلیمی فلموں اور ڈراموں کے ذریعہ نظریاتی تشخص اور قومی تہذیب و تمدن کو رواج دیا جائے اور عظمت اسلام، شجاعت اور قومی غیرت و حمیت کو ابھارا جائے

تعلیمی اداروں کا مسئلہ

آزاد کشمیر میں میڈیکل کالج، انجینئرنگ کالج اور یونیورسٹی کے نہ ہونے کی وجہ سے تعلیم کا دائرہ خاصا محدود ہے تعلیمی سہولتوں میں اضافہ کے لیے درج ذیل اقدامات کیے جانے چاہئیں:

۱۔ آزاد کشمیر میں یونیورسٹی قائم کی جائے جامعہ کے قیام تک تمام بڑے شہروں اور ضلعی صدر مقامات پر ڈگری کالجوں میں ایم اے، ایم ایس سی کی کلاسیں شروع کی جائیں۔

۲۔ میڈیکل کالج، انجینئرنگ کالج اور فنی تعلیمی ادارے (پولی ٹیکنیک) قائم کیا جائے۔

۳۔ لاء اور کامرس کی تعلیم کا انتظام ہونا چاہیے اور کامرس و لاء کی ڈگری تعلیم کے لیے ادارے قائم ہوں۔

۴۔ موجودہ تعلیمی اداروں میں معیاری سرمایات کی غرض سے مطلوبہ گرانٹس کی فراہمی کا اہتمام کیا جائے۔

تعلیم نسواں

نظام تعلیم کو اسلامی اصولوں میں ڈھالنے کے لیے مخلوط تعلیم، مخلوط سوسائٹی مخلوط مجالس کا خاتمہ بہت ضروری ہے ہماری تہذیبی اقدار سے یہ قطعاً لگا نہیں کھاتی مخلوط تعلیم کے خاتمے کے ساتھ ہی یہ لازم ہے کہ تعلیم نسواں کا بھرپور اہتمام کیا جائے آزاد کشمیر میں طالبات کے لیے تعلیمی سہولتوں کا فقدان ہے گرلز اسکولز، گرلز کالجز اور خواتین تربیتی مراکز کے قیام پر فوری توجہ دی جانی چاہیے۔

تعلیمی فنڈ

آزاد کشمیر میں تعلیم کے معیار اور سہولتوں کی فراہمی کے لیے خطیر رقم صرف کرنے کی ضرورت ہے اس سلسلے میں "تعلیمی فنڈ" قائم کیا جا سکتا ہے جس میں عوام و خواص سے تعاون کے لیے کہا جائے۔ بالخصوص بیرون ملک کشمیریوں سے اپیل کی جائے کہ وہ اپنی آمدن کا ایک حصہ (مثلاً ۵ فی صد) ریاست میں تعلیم کے مقاصد کے لیے مختص کر دیں۔ اگر بیرون ملک کشمیریوں کی جانب سے ملک روانہ کی جانے والی رقوم کی لازمی کٹوتی کر لی جائے، تو تعلیمی فنڈ کو اور وسیع کیا جا سکتا ہے۔

وظائف اور روزگار کی سہولتیں

کشمیری طلبہ کو اعلیٰ تعلیمی کارکردگی پر مناسب وظائف و انعامات دینے کا انتظام، طلبہ کے تعلیمی ذوق میں اضافہ کا سبب ثابت ہوگا ساتھ ہی اگر تعلیم کے بعد روزگار کی ضمانت فراہم کی جائے تو حصول علم میں نہ صرف دلچسپی بڑھے گی، بلکہ حکومت اپنی ایک اہم ذمہ داری کی ادائیگی بھی کرے گی پسماندہ علاقہ ہونے کے ناطے آزاد کشمیر میں تعلیم اور عدہ کی حوصلہ افزائی کے لیے حکومت پاکستان کو بھی مدد کرنی چاہیے بیرون ملک وظائف کے سلسلے میں اکثر یہ شکایت سننے میں آتی ہے کہ استحقاق کی بجائے یہ وظائف اثر و رسوخ اور سیاسی دباؤ کے تحت دیے جا رہے ہیں۔ اب

یہ سلسلہ میرٹ کے استحقاق پر سختی سے عملدرآمد ہونا چاہیے۔

مطالعۂ کشمیر

کشمیری تاریخ، سیاسی جغرافیہ (GEO POLITICS)، جدوجہد آزادی اور معیشت و معاشرت کو کشمیر اسٹڈیز کے عنوان سے بطور ایک مضمون پوسٹ گریجویٹ سطح پر پڑھانے کا اہتمام ہو سکتا ہے۔ آزاد کشمیر میں ایم اے کلاسز کے اجراء کے بعد تو یہاں یہ مضمون شروع ہو گا ہی، پاکستان کی جامعات میں بھی کشمیر اسٹڈیز میں ریسرچ شروع ہونی چاہیے۔

انتظامی امور میں طلبہ کا حصہ

انتظامی امور میں طلبہ کو تعلیم سے متعلق پالیسی بنانے اور چلانے والی مجالس میں نمائندگی دی جائے، تو اس سے احساسِ شرکت و ذمہ داری پیدا ہو گا جو تعلیم کے اداروں کے انتظام کو بہتر چلانے کا ذریعہ بنے گا۔

چند اہم امور

- قرآن فہمی کے لیے عربی زبان سے واقفیت کی اہمیت کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ ثانوی سطح پر عربی زبان کی تعلیم لازمی قرار دی جانی چاہیے۔
- نئی پود کو اپنی تاریخ اور پس منظر سے بخوبی آگاہ ہونا چاہیے۔ اسلامی تاریخ اور کشمیری مسلمانوں کے پس منظر کی تعلیم پر خصوصی توجہ کی جانی چاہیے۔
- اسکول اور کالج کے ہال اور گیلریوں کو اہم شخصیات کے اقوال اور ہماری تاریخ کے اہم واقعات کی تصاویر سے سجایا جائے، تو یہ تاریخی تربیت کا ذریعہ ہو گا۔
- گلگت و بلتستان کا آزاد کشمیر تعلیمی بورڈ سے الحاق کیا جائے۔
- اساتذہ و طلبہ کو فراہمی و تحصیلِ علم پر مکمل توجہ کے لیے فارغ کرنے کی غرض سے ان مسائل سے نجات دلائی جائے جو اس راہ میں رکاوٹ ہے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے اہم ٹرانسپورٹ کا مسئلہ ہے جس کے حل ہونے سے اساتذہ و طلبہ اپنی صلاحیتیں اور توجہ علم پر مرتکز کر سکیں گے۔
- درسی کتب کافی سستے داموں فراہم کی جانی چاہئیں۔ دوسری ایسی کتب بھی جو ہم چاہتے ہیں کہ ہماری نئی نسل کے زیر مطالعہ رہیں، کم قیمتوں پر دستیاب ہونی چاہئیں۔ اس کے لیے طلبہ کی خاطر مخصوص پیپر بیک ایڈیشن شائع کیے جا سکتے ہیں۔ صحت مند لٹریچر فراہم کیے بغیر ہم سستے جاسوسی اور گھٹیا عشقی ادب کی لعنت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔
- طلبہ کی ایک اور بنیادی ضرورت کپڑے بھی رعایتی نرخوں پر فراہم کیے جانے چاہئیں۔ اس سے ہم طلبہ میں میانہ روی اور سادگی پسندی کے رجحان کو بھی پرورش دے سکتے ہیں۔
- تعلیم مفت ہونی چاہیے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ آج سے دو سال پہلے طلبہ پر فیسیں عائد کر دی گئی ہیں، جب کہ پہلے فیسیں نہیں لی جاتی تھیں۔
- لائبریریاں زیادہ سے زیادہ کھولی جائیں، تاکہ طلبہ میں مطالعہ کرنے کی عادت پڑے اور اچھے ادب کا ذوق پیدا ہو۔ یہ اس وقت ممکن نہیں ہو گا جب تک کہ ایسی لائبریریاں جو طلبہ کو خصوصی سہولتیں دیتی ہیں، اچھی کتب فراہم نہ کی جائیں۔ ایسے اقدامات کی سفارش بھی کی جانی چاہیے جس سے ان غیر ملکی اور ملکی جاسوسی اور گھٹیا عشقی کتب کی بڑھتی ہوئی رو کو روکا جا سکے جو ہماری نسل کو بے اندازہ نقصان پہنچا رہی ہیں۔
- طلبہ اور اساتذہ کا رہائشی مسئلہ سال بہ سال شدید ہوتا جا رہا ہے۔ ملک کے اہم تعلیمی مراکز میں طلبہ کے لیے مزید ہوسٹل تعمیر کیے جائیں، یہاں تک کہ ہر اس طالب علم کے لیے جگہ فراہم کی جائے جس کو ضرورت ہے۔
- جن تعلیمی اداروں کی عمارات نہیں ہیں، وہ فوری طور پر فراہم کی جانی چاہئیں۔
- طلبہ کے لیے علاج کی خصوصی سہولت نہیں ہے۔ ان کے لیے مفت دواخانوں کا بندوبست کیا جائے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو برائے نام میڈیکل فیس لے کر بھی یہ مسئلہ حل کیا جائے۔
- بڑے شہروں اور قصبوں میں طلبہ کو حصولِ روزگار میں مدد دینے کے لیے دفاتر روزگار قائم کیے جائیں۔ یہ دفاتر منظم اور مربوط طریقے پر کام کریں۔
- ریڈیو مظفر آباد، تراڑ کھل اور اسلام آباد ٹیلی ویژن پر قابلیت اور صلاحیت کی بنیاد پر کشمیری طلبہ کو مواقع دیئے جائیں، اقربا پروری اور جماعتی مفاد کی وجہ سے نہیں۔

آخر میں ہم یہ کہیں گے کہ آزاد کشمیر میں تعلیم کو بہتر بنانے اور نظامِ تعلیم کو قومی امنگوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے حکام و اہلِ علم جو اقدامات بھی کریں گے، طلبہ کے نمائندے کی حیثیت سے ہم اس میں مکمل تعاون کا یقین دلاتے ہیں۔ ہمیں اندازہ ہے کہ وسائل کی کمی ایسے کسی بھی پروگرام پر عمل درآمد کے لیے دشواریاں پیدا کرنے کا ذریعہ بن سکتی ہے، لیکن اگر عزم و ارادہ محکم ہو تو اس دشواری پر تعلیمی فنڈ جیسے منصوبوں کے ذریعے قابو پایا جا سکتا ہے۔ کشمیر میں یونیورسٹی اور امتحانی بورڈ کے سلسلے میں موجودہ کا تجربہ واضح کیا جا سکتا ہے کہ ایک یونیورسٹی ہی نہم جماعت سے لے کر ایم اے تک کے امتحانات اور یوں نوکر شاہانہ ادارے قائم کرنے پر وسائل صرف نہ ہوں، بلکہ تعلیم ہی کو اہمیت دی جا سکے اور اس یونیورسٹی کا دائرہ کار گلگت و بلتستان تک بڑھا دیا جائے۔

" علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دار و مدار حواس پر ہے۔ اس علم سے ایک طبعی قوت ہاتھ آتی ہے، جس کو دین کے تحت رہنا چاہیے۔ اگر یہ دین کے ماتحت نہ رہے، تو محض شیطنت ہے۔ ... مسلمان کے لیے لازم ہے کہ علم کو مسلمان کرے ——— بولہب را حیدر کرار کن ——— اور اگر یہ بولہب حیدر کرار بن جائے، یا یوں کہیے کہ اگر اس کی قوت دین کے تابع ہو جائے، تو نوعِ انسانی کے لیے سراسر رحمت ہے۔"
(اقبال)

ط۔ مرد و عورت کے تعلقات کی فطری حدود

ی۔ غربت و دولت کا مقام

ک۔ اسلامی سوسائٹی اور جمہوری و اشتراکی سوسائٹی میں وجہ اختلاف۔

علاوہ ازیں کس سہریت (Civics) کے مضمون میں اسلامی نظام حکومت و سیاست کے مختلف پہلوؤں کو طلبہ پر واضح کر دینا چاہیئے کہ حکومت کا مقصد کیا ہے۔ اس میں پولیس اور عدالت کا مقام کس طرح کی ذمہ داریاں کیا ہیں، اس کا نظام تعلیم و اشاعت کن طریقوں پر چلتا ہے، اس کے مالیات کن اصولوں پر کام کرتے ہیں وغیرہ۔

ہر طالب کو سہریت کے ذریعے یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ ان کے روزمرہ کے معاملات کا تعلق حکومت کے کن کن شعبوں سے کس کس ادارے کے ذریعے کن کن طریقوں سے قائم ہے اور ان کو متعلقہ امور اپنی ضروریات کے لیے کدھر رجوع کرنا چاہیے

اس سارے کورس میں خوب اچھی طرح نمایاں کیا جائے کہ اسلامی عقائد اور اسلامی عبادات اور اسلامی قواعد اخلاق مسلم سوسائٹی کے روابط پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے اور مختلف مباحث قرآن و حدیث اور دور خلافت راشدہ کی نظیریں کو رہنمائی کے لیے علمی ترتیب سے سامنے لایا جائے

ان اشارات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری دینیاتی تعلیم کے لیے سب سے زیادہ اہم مضمون یہی ہوگا

۲۔ مطالعہ نظام فطرت

اس ایک جامع عنوان کے تحت علم کیمیا، طبعی جغرافیہ، حفظان صحت، علم حیوانات کے مبادیات اور علم نباتات میں سے کچھ عام معلومات کی چیزیں زبان دانی کے نصاب میں جا ملیں گی، لیکن علم کیمیا، طبیعی کیمیا اور حفظان صحت مستقل اختیاری مضامین کی حیثیت سے جیسے آج رائج ہیں آئندہ بھی رہیں گے۔ ان مختلف مضامین کے نصاب اور طریق تعلیم میں جن اصولوں کو مد نظر رکھنا ہے وہ یہ ہیں

ا۔ یہ دکھانا ہے کہ کائنات ایک صاحب شعور اور صاحب ارادہ ہستی کی مخلوق ہے ڈرائنگ، ملائنگ، مکرنگ اور بلڈنگ کے جو حیرت انگیز آثار اس میں کام کر رہے ہیں وہ ایک آرٹسٹ کا کرشمہ ہیں۔

ب۔ یہ دکھانا ہے کہ پوری کائنات بحیثیت مجموعی بھی اور جزءً جزءً بھی اپنے خالق کے سامنے "مسلم" (مطیع فرمان) کی حیثیت رکھتی ہے، حتیٰ کہ جسم انسانی بھی بلحاظ جسم کے مسلم ہے، لہٰذا انسان کے لیے اس کائنات میں اپنے خالق کے سامنے مسلم بننے سے کاروبار بہتر بن رہتا ہے

ج۔ یہ واضح کرنا ہے کہ کائنات کے ہر شعبے میں سنت الٰہی (خدا کا قانون) کار فرما ہے اور ہر چیز اس کی حکومت میں جکڑی ہوئی ہے، پس یہاں انسان کے لیے بھی خدا کا قانون معلوم کر کے اس کی پیروی کرنا واحد ذریعہ ارتقاء ہے۔

د۔ اس حقیقت کو نمایاں کرنا ہے کہ نظام فطرت میں مکمل مقصدیت کار فرما ہے۔

ہ۔ قرآن کے سارے استدلال کو ان مضامین کے مباحث میں سمو دیا جائے کہ اسلام کے عقلی اثبات کے لیے نظام فطرت کے مطالعہ کو بنیاد بنایا گیا ہے سہریت کے بعد اس مضمون کی اہمیت بھی اول درجہ کی ہوگی

تاریخ

تاریخ کا مضمون بھی موجودہ صورت سے زیادہ وسیع کرنا ہے، اس کے شعبے حسب ذیل ہوں گے

ا۔ تاریخ اسلام از آدم تا نبی صلعم (مجمل)

ب۔ تاریخ اسلام (۱) دور نبوت (۲) دور خلافت راشدہ (۳) دور شاہی (۴) مسلمان ہندوستان میں۔

ج۔ ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ ۔ (۱) ہندوستان مسلمانوں سے پہلے (۲) مسلمانوں کی آمد راہ بحیرہ عرب (۳) مسلمانوں کی آمد راہ درہ خیبر (۴) مسلمان انگریزی استبداد کے پنجے میں۔ (۵) آزادی کی جدوجہد (۶) ظہور پاکستان

د۔ تاریخ عالم (مجمل) (۱) قرون مظلمہ (۲) قرون وسطیٰ (۳) قرون جدیدہ (۴) پاپائیت کا رد عمل الحاد کی شکل میں (۵) جمہوریت کا ظہور اور ارتقاء (۶) سرمایہ داری اور امپیریلزم (۷) اشتراکیت کا ظہور (۸) دنیا کا ہمہ گیر اضطراب (۹) جمعیت اقوام متحدہ کی ناکامی (۱۰) دنیا میں اسلامی نظام کی ضرورت

تاریخ کی نصاب کے سامنے حسب ذیل امور قابل لحاظ ہوں گے

ا۔ یہ واضح کرنا کہ تاریخ اسلام و جاہلیت کی دو قوتوں کی کشمکش کی جولان گاہ ہے

ب۔ یہ واضح کرنا کہ اقوام کے فنا و بقاء کا انحصار ہر ملک اور ہر زمانہ میں اخلاقی ارتقاء و انحطاط میں مضمر ہے۔

ج۔ یہ واضح کرنا کہ طبعی پہلو (وسائل تمدن) کے لحاظ سے ارتقاء مسلسل ہے، لیکن اخلاقی پہلو سے کبھی ارتقاء ہوا ہے، کبھی انحطاط۔

د۔ یہ واضح کرنا کہ خدا کا قانون رحمت و عذاب کس طرح کام کرتا ہے۔

ہ۔ یہ واضح کرنا کہ مصلحین اور انقلاب اخلاقی دور سے رونما ہوتے ہیں

و۔ یہ واضح کرنا کہ انسان کی اچھی اقدار ہمیشہ سے اچھی ہیں اور بری اقدار ہمیشہ سے چلی آ رہی ہے

ز۔ یہ واضح کرنا کہ تاریخ اسلام اور تاریخ مسلمانان میں کیا فرق ہے۔

(باقی صفحہ ۱۹۰ پر)

مجیب الرحمٰن شامی
ایڈیٹر "بادبان"

عبدالمالک کی طرح جیو!

ڈھاکہ یونیورسٹی کے ہال میں ایک نوجوان کی آواز گونجی تھی:
"ہم یہاں ہر قیمت پر اسلامی نظام نافذ کریں گے"——— سیکولر
نظامِ تعلیم کا پرچار کرنے والوں کے دل اس ایک آواز نے دہلا دیئے
وہ بھاگنے پر مجبور ہو گئے——— سٹیج خالی ہو گیا، ہال ویران ہو گیا،
لیکن عبدالمالک کا نعرۂ حق وہاں گونجتا رہا، اس کی گونج آج تک
مدھم نہیں پڑ سکی——— باطل کا شعار ہے کہ وہ کھلے میدان میں
شکست کھانے کے بعد شب خون مارتا ہے، عقب سے وار کرتا
ہے یہی بات ۱۲ اگست کو دہرائی گئی ——— عبدالمالک کی
للکار کی تاب نہ لانے والے اس پر ٹوٹ پڑے ———
اس وقت جب کہ عبدالمالک اپنے گھر جانے کے لیے
ریس کورس میدان کو عبور کر رہا تھا——— حملہ آور کئی تھے اور
عبدالمالک اکیلا——— لیکن وہ اکیلا بھی کہاں تھا، حق کی نصرتیں
اور رحمتیں اس کے ساتھ تھیں وہ بھاگنے کے بجائے ڈٹ
گیا——— خدا کا نام لینے والے ڈٹ ہی جایا کرتے ہیں———
عدو کے سامنے عبدالمالک کا خون بہہ نکلا، وہ نڈھال ہو کر گر
پڑا لیکن اس کی زبان سے یہی الفاظ ادا ہوتے رہے۔ "ہم یہاں
ہر قیمت پر اسلام لائیں گے"——— عبدالمالک جانبر نہ ہو سکا۔
اس نے ہسپتال میں جان دے دی، لیکن اس کا گرم خون ۱۲ کروڑ
عوام کے خون کو گرما گیا——— پورب سے لے کر پچھم تک ہر
شخص کی زبان پر اس کے الفاظ تھے: "ہم ہر قیمت پر اسلام
لائیں گے"——— عبدالمالک نے یہ قیمت چکا دی ہے———
اس کا لہو بالکل اسی خون کی طرح مقدس ہے، جو ستمبر ۱۹۶۵ء
میں واہگے کی سرحد پر بہا تھا——— اس کے خون سے
وہی خوشبو اٹھ رہی ہے، جو عزیز بھٹی اور شامی شہید کے خون
سے اٹھی تھی——— عزیز بھٹی اور بریگیڈیئر شامی جغرافیائی سرحدوں کی
حفاظت کا حق ادا کر گئے——— اور عبدالمالک نے نظریاتی سرحدوں
کی حفاظت کا حق ادا کیا——— عزیز بھٹی اور شامی کے خون کی
آبرو پر اعلانِ تاشقند نے وار کیا——— یہ اعلان مصلحتوں کی پیداوار
تھا——— عبدالمالک کے لہو پر بھی مصلحتیں حملہ آور ہیں———
یہ لہو آج تک ریس کورس میدان میں بکھرا ہوا ہے———
یہ لہو ابھی تک اپنے قاتلوں کی تلاش میں ہے، انصاف دینے
والے ہاتھ سو گئے ہیں——— لیکن عبدالمالک جاگ رہا ہے۔
عبدالمالک عشق کی علامت ہے، جذب و سرمستی کا نشان ہے
اور عشق مصلحت کی پیداوار نہیں ہوتا——— عشق تو مصلحتوں کو
نظر انداز کرنے اور خاطر میں نہ لانے کا نام ہے———
عبدالمالک شہیدِ عشق تھا——— ہمیں اس کے خون کا انتقام
لینا ہے، جس طرح عزیز بھٹی اور شامی کے خون کا بدلہ ہمارے
ذمے ہے، اسی طرح عبدالمالک کے خون کا حساب لینا بھی ہمارا
فرض ہے——— ہم ان سب کا انتقام لیں گے———
قاتل ایک ہے——— واہگے پر اس نے کھل کر حملہ کیا تھا،
ڈھاکے میں چھپ کر——— وہ کسی رنگ میں آئے، ہم اسے
پہچانتے ہیں——— ہم اس سے انتقام لیں گے یا عبدالمالک
کی طرح جان دے دیں گے اور سب سے بڑا "انتقام" یہی ہے
کہ ہم یہاں اسلام قائم کر دیں——— یہاں خدا کی حاکمیت
کا پرچم لہرائے، قرآن کی آواز گونجے——— یہ آواز گونجی تو
باطل قوتیں دب جائیں گی، مٹ جائیں گی، ان کی تمنائیں خاک
میں مل جائیں گی——— ہمیں اسی آواز کو بلند کرنا ہے———
ہمیں یہ عہد کرنا ہے کہ اس "انتقام" کے لیے ہر قیمت ادا کریں
گے——— عبدالمالک یہ قیمت ادا کر چکا ہے——— اس کی روح ہماری
طرف دیکھ رہی ہے——— ہم اسی کو گواہ بنا کر اعلان کرتے ہیں
کہ زندہ رہیں گے تو اس کی طرح، ورنہ جینے سے انکار کر دیں گے۔

انٹرویو

محور: محترم شیخ الجامعہ! جب پنجاب یونیورسٹی میں آپ کی تقرری بحیثیت وائس چانسلر کی گئی، اس وقت آپ نے کیا محسوس کیا؟ اور پھر محسوسات کی اساس پر جب آپ نے یونیورسٹی میں قدم رکھا، اس لمحے آپ نے یونیورسٹی کی غیر یقینی صورت حال کو کیسے سنبھالا دیا ___؟

وائس چانسلر: مجھے ایک روز بذریعہ ٹیلی فون اطلاع دی گئی کہ میرا تقرر پنجاب یونیورسٹی میں بحیثیت وائس چانسلر کیا گیا ہے اور یہ حکم دیا گیا کہ فوری احکامات کا انتظار کروں۔ دو روز بعد چانسلر صاحب کی طرف سے نئی تقرری کے احکامات موصول ہوئے جن کے مطابق اسی روز لاہور کا چارج سنبھالنے کی ہدایت کی گئی تھی چنانچہ چند گھنٹوں میں مختصر تیاری کر کے لاہور آ گیا۔ میرے لیے یہ خبر بالکل غیر متوقع اور اچانک تھی اور [illegible] ردِ عمل یہ تھا کہ میرے سپرد ایک نہایت ہی مشکل کام کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ اہالیانِ ملتان نے اپنے روایتی انداز میں ہمارے ساتھ جس محبت اور خلوص کا اظہار کیا تھا، اس کی وجہ سے سرزمین ملتان سے بہت گہرا لگاؤ ہو گیا تھا، اس لیے وہاں سے یکایک روانگی کوئی خوش آئند تجربہ نہ تھی۔

جب میں پنجاب یونیورسٹی میں پہنچا تو یہاں کی سیاسی صورت حال انتہائی مخدوش تھی۔ طلبہ سیاست کا میدان بہت گرم اور شدید کشیدگی کا شکار تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی بھی لمحے یونیورسٹی میدانِ جنگ کی سی شکل اختیار کر سکتی ہے۔ طلبہ کے ___ دونوں گروہ شدید عداوت کے عالم میں تھے۔ ایک گروپ کو براہ راست حکومت سے رابطہ حاصل تھا، پھر غیر طالب علم عناصر کی مداخلت نے اس دشمنی کی حالت دگرگوں کر رکھی تھی۔ روز روز کے لڑائی جھگڑوں سے پوری انتظامیہ، اساتذہ اور طلبہ تنگ آ چکے تھے۔ انہی دنوں پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کا سالانہ الیکشن بھی ہونے والا تھا جو اس سلگتی ہوئی آگ کو مزید ہوا دے کر بھڑکا رہا تھا۔

شروع روز ہی مجھے احساس ہو گیا کہ ایک کٹھن ذمہ داری کا بوجھ ڈالا گیا ہے جس میں بظاہر نہ جائے رفتن نہ جائے ماندن کی سی کیفیت ہے۔ اس مشکل امتحان کے پہلے ہی سال میں سیاست اور انتخابات یونین کو دیکھتے ہوئے میں نے یہ طے کیا کہ ہر معاملے میں غیر جانبداری، رواداری اور نیک نیتی سے مسائل حل کیے جائیں تو مشکل مرحلہ آسان ہو سکتا ہے، کیونکہ طالب علم [illegible] معیار اور غیر جانبدارانہ رویے ہی سے اعتماد کی فضا قائم ہو سکتی ہے۔

اس بنیاد پر طلبہ کے دونوں فریقوں کے درمیان خدا کا نام لے کر گفت و شنید کا آغاز کیا لیکن شروع میں مفاہمت کی کوئی امید دکھائی نہ دی، کیونکہ بیرونی عناصر طلبہ کو اس جانب بڑھنے نہ دیتے تھے۔ اس پر حکومت سے درخواست کی گئی کہ غیر طالب علم عناصر کو یونیورسٹی کے احاطوں سے باہر رکھا جائے اور یہ کہ یونیورسٹی میں امن و امان کی صورت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب ہر معاملہ غیر جانبداری سے طے کیا جائے۔ میری اس درخواست کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ غیر طالب علم عناصر کو جو یونیورسٹی کے معاملات میں دخل دے رہے تھے، گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے بعد جب بارہ مشترکہ مذاکرات ہوئے، تو طلبہ کے درمیان ہم آہنگی کی فضا پیدا ہونے لگی۔

محور: پھر کیا ہوا؟

وائس چانسلر: اس ابتدائی ایجی ٹیشن کے بعد طلبہ کے دونوں گروہوں اور اساتذہ نے مل کر ایک ضابطہ اخلاق [illegible] بنایا۔ مجھے یہ بتاتے ہوئے مسرت محسوس ہوتی ہے کہ اس ضابطہ اخلاق کو اکثر معاملات میں طلبہ نے تسلیم کر لیا اور اس کے مطابق کسی بھی فیصلے کو ماننے سے پس و پیش سے کام نہ لیا جس سے امن کی فضا بہتر ہونا شروع ہوئی۔

محور: آپ کی آمد کے تھوڑے دنوں بعد یونین الیکشن مکمل ہو گئے۔ اس کے بعد حالات کو تدریجاً کیسے کنٹرول کیا؟

وائس چانسلر: سٹوڈنٹس یونین کے غیر جانبدارانہ الیکشن میں طلبہ کی جو یونین کامیاب ہوئی، اس کے افراد کے ذہنوں میں میرے بارے میں لامحالہ طور پر شکوک و شبہات تھے، کیونکہ حالات ہی بظاہر ایسے تھے کہ جن میں میری تقرری ہوئی۔ لیکن میں نے جو عہد کیا تھا اس کے مطابق مکمل غیر جانبداری کے ساتھ الیکشن پروگرام مکمل کیا۔ نتیجتاً طلبہ کی یونین [illegible] عام طلبہ کے درمیان وائس چانسلر کے بارے میں یہ اطمینان و اعتماد پیدا ہوا کہ جس بات کا وائس چانسلر کی جانب سے اقرار و اعلان کیا جائے گا اسے بغیر کسی پس و پیش کے مکمل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ یہی اعتماد طلبہ کے دوسرے گروہ میں بھی پیدا ہوا اور اب تک خدا کے فضل و کرم سے یہ اعتماد جامعہ کی فضا کو پرسکون رکھنے کا سبب ہے ___ اور ہمیں کسی تشویشناک صورتحال کا سامنا نہیں۔

چونکہ البدر کے مجاہد انتخاب قیادت میں اولین قیادت جماعت کی تیار کردہ تھی جس کا مطلب یہ ہو کہ یہ بات مان لی گئی کہ اس تنظیم کی قیادت فکری اور عسکری دونوں محاذوں کی قیادت سنبھالنے کی اہل ہے

حلف نامۂ البدر

البدر کا ہر مجاہد تربیت کی تکمیل کے بعد تمام ساتھیوں کے روبرو حسب ذیل حلف نامہ پڑھتا جس کے الفاظ یوں تھے ـــــ ،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشہد ان لا الٰہ الا اللہ و اشہد ان محمداً عبدہ و رسولہ

میں .... خدائے بزرگ و برتر کو حاضر و ناظر جان کر اعلان کرتا ہوں کہ

○ پاکستان کی سالمیت پر آنچ نہ آنے دوں گا ،
○ پرامن شہریوں کے جان و مال کی حفاظت کروں گا ۔
○ اسلام اور پاکستان کے لیے ہر سطح پر جنگ کروں گا ،
○ اور اپنی جان و مال کو اس مقصد کے لیے وقف کر دوں گا

۔ اللہ میرا حامی و مددگار ہو۔ آمین

البدر پروگرام

البدر کا پانچ نکاتی پروگرام حسب ذیل تھا

۱۔ پاکستانی عوام میں اعتماد بحال کرنا اس کے لیے البدر کیڈٹ عوام سے وسیع رابطہ رکھیں گے، دیہاتوں اور دور دراز علاقوں میں بھی پہنچیں گے، ضرورتاً جلسوں اور اجتماعات کا انعقاد بھی کریں گے

۲۔ بنگالی اور غیر بنگالی کے درمیان پیدا ہونے والی خلیج کو پاٹنا اور مشرقی و مغربی پاکستان کے درمیان گہرے اخوت و محبت کے جذبات پروان چڑھانے کے لیے عملی و فکری اقدامات کرنا

۳۔ پاکستان دشمن عناصر اور ہندوستانی مداخلت کاروں کی سرگرمیوں پر کڑی نگاہ رکھنا

۴۔ مداخلت کاروں اور شرپسندوں کے خلاف پاک فوج اور سول انتظامیہ کے ساتھ عملی تعاون کرنا اس مقصد کی خاطر تمام محب وطن طلبہ کو عسکری تربیت دینا

۵۔ ملک دشمن عناصر خواہ وہ کہیں بھی ہوں ان کے بارے میں مکمل چھان بین کرنے کے بعد فوجی حکام کو مطلع کرنا، ہر شعبے میں محب وطن پاکستانی فراہم کرنا ـــــ (۱۱) [illegible]

تربیت

البدر کیڈٹ دو طرح کی تربیت حاصل کرتے۔ ایک عسکری، دوسری فکری

● عسکری تربیت میں چار سے بارہ روز کی ٹریننگ شامل تھی جس میں جوڈو کراٹے، آتشیں اسلحہ استعمال کرنے، کھولنے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے ساتھ ساتھ وائرلیس نظام سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرنا تھا

میدان عمل میں حسب ذیل ہتھیار البدر کو دیے جاتے :

• تھری ناٹ تھری • لائٹ مارٹر • اینٹی ایئر کرافٹ
• ہینڈ گرنیڈ • جدید ساخت کی بندوقیں • ڈائنامائٹ
• [illegible] • ریوالور • اور مقامی سطح سے چھپایا ہوا روسی، ہندوستانی اسلحہ

● فکری تربیت میں جماعت کا دعوتی پروگرام کسی حد تک متاثر ہوا، لیکن رسمی پروگرام پہلے سے کہیں زیادہ تعداد میں رکھے گئے جن میں

• شب بیداریاں • مجالس ذکر • روزانہ درس قرآن • درس حدیث
• ایک روزہ تربیتی کیمپ • فلسفۂ جہاد • احتساب • دعا وغیرہ

اس تربیت کے پروگرام اس قدر ولولہ انگیز ہوتے کہ البدر کی اگر رات جہاد السیف میں گزرتی، تو ان کے دن کا بیشتر حصہ فکری جہاد کی تیاری میں صرف ہوتا ـــــ اور

یہ بھی ہزاروں سرمیداں جنگ میں جھکنے کے باوجود گذشتہ رات بہت خدا کے حضور گریہ وزاری میں گزارے جس کی تصدیق سب سے موجی آ میسر ذکر سے ہیں یہی وہ کردار تھا جس نے پاک فوج کے سب سے آ مسرپر اور جوانوں کو اسلام کے عملی مجاہدوں کی جانب سوچ کا، اور وہ لوگ آج تک البدر کا نام سنتے ہی اپنا سر اظہار عقیدت میں جھکا لیتے ہیں۔

مشاہرہ

مشاہرہ، تنخواہ، الاؤنس اور معاوضے کی کی ناموں سے معاوضے کو جانا پہچانا جاتا ہے ——— پاک آرمی کی طرف سے اپنے کومی وامس کے تحت البدر کمانڈوں کے لئے بھی انفرادی معاوضے کا اعلان کیا گیا ——— فرد، فرد اتر غیب بھی دی گئی ——— لیکن اسلامی چھاترو سنگھو کی اگزیکٹو کونسل کے فیصلے کے مطابق کسی ایک کمانڈنٹ یا مجاہد نے بھی مالیہ، الاونس یا مشاہرہ نہ لیا۔ اس میں جہاد کی لے لوث جذبہ کا عنصر شامل تھا جمعیت کا موقف تھا کہ یہ مشاہرہ اور تنخواہیں ہمارے بجائے دوسرے رفاہی پروگراموں پر خرچ کی جائیں ——— البدر کی باقاعدہ وردی بھی تھی، لیکن اشرات سے استعمال نہیں کیا جاتا تھا، کیونکہ یہ حکمت کا تقاضا تھا!

معرکے ہی معرکے

ہم یہاں البدر کے چند معرکوں کی کارروائی مدرقارئین کرتے ہیں وہ چند واقعات جو ہمیں بھارت کی قید سے لوٹ کر آنے والے فوجی جوانوں کی زبانی یا سقوط کے بعد پاکستان پہنچنے والے البدر کی زبانی میسر آئے!

ڈسٹرکٹ مومن شاہی

سب سے پہلے ——— کامران، کمانڈر البدر نے بتلایا کہ ـ

سرحد کے نزدیک ٹریننگ حاصل کر رہے تھے کہ جون کے پہلے ہفتے میں شام کے وقت ایک آدمی دوڑا دوڑا آیا اور کہنے لگا کہ مکتی باہنی کے لوگ گاؤں کے مولیشی چوری کر کے لے جا رہے ہیں صوبیدار صاحب نے کہا کہ فوری طور پر "البدر" کے پندرہ نوجوانوں کو ساتھ لے کر آپریشن پر جاؤ۔ یہ "البدر" کا سب سے پہلا آپریشن گروپ تھا جس کا کمانڈر ہمیں مقرر کیا گیا ہم بہت خوش تھے ان مسرت انگیز لمحات کا اظہار اس وقت مشکل ہے۔ ہمیں خوشی تھی کہ اپنے وطن کی حفاظت کے لئے اور وطن دشمنوں کو پکڑنے جا رہے ہیں۔ جب ہم وہاں پہنچے تو وہ مویشی چھوڑ کر بھاگ نکلے درختوں سے زیادہ گھنا ہونے کی وجہ سے ہم فائرنگ نہ کر سکے ——— سرحد کے قریب مکتی باہنی نے پاک فوج کے کیپٹن جاوید کو جنگلی طریقہ AMINC کے ذریعے شہید کر دیا ان کی شہادت پر میجر صاحب نے مجھے کہا کہ انڈیا جا کر اس کے خون کا انتقام لوں، مقامی ذمہ داریوں کی بنا پر میں تو نہ جا سکا البتہ میں نے تین "البدر" کے مجاہد جو رضاکار تھے اسلم، مطیع ——— اور تیسرے ساتھی کا نام یاد نہیں انہیں آرڈر کیا کہ انڈیا جا کر AMINC کے ذریعے اپنے مجاہد کے خون کا بدلہ لے کر آؤ انہوں نے حکمت عملی سے ایک بھارتی فوجی ٹرک تباہ کر دیا اس میں دو ہندو فوجی افسر اور پانچ مکتی باہنی بھی سوار تھے ہمارے ساتھیوں نے یہ کام رات کے اندھیرے میں دشمن کے مورچوں میں سے گزرتے ہوئے جان ہتھیلی پر رکھتے ہوئے کیا اس گروپ میں صرف اور صرف تین مجاہد تھے۔!

شیر پور سے سولہ میل دور ایک مقام "حیدر نگر" کے متعلق خبر آئی کہ وہاں ہندوستان کے ایجنٹوں نے بہت گڑبڑ کر رکھی ہے۔ سن کر ہم لوگ تیار ہو گئے، ۳۰ آدمی تھے اور ۳۰ "البدر" کے مجاہد، جن کی کمان میجر ریاض ملک خود کر رہے تھے ہم نے رات کے اندھیرے میں نکلے وہاں پہنچے تو ایک گھر سے روشنی اور کچھ آدمیوں کی باتوں کی آواز آ رہی تھی ——— ہم تین ساتھی ان کے پاس گئے۔ اور کہا کہ ہم مکتی باہنی ہیں، جمال پور پر حملہ کرنا چاہتے ہیں اس طرح ہم اس لئے کر رہے تھے تاکہ ہمیں ان کے بارے میں پتہ چل جائے اگر وہ تائید کر دیا تو صاف دشمن ثابت ہو جاتا اور اسے پھر "دوسری طرح" درست کر دیتے انہوں نے بتایا کہ دو ساتھی جا رہے ہیں اس لئے وہ ابھی رکے رہیں ہم نے فوری طور پر ہنڈز اپ کرنے کو کہا باہر آواز دی، دوسرے ساتھی بھی آ گئے۔ ان لوگوں کو گرفتار کر لیا ان سے بہت سا اسلحہ اور ہندوستانی کرنسی ملی ——— پیدل ہی حیدر نگر کی طرف کوچ کیا رات دو بجے وہاں پہنچے میجر صاحب نے اس مشکوک گھر کے گھیراؤ کے لئے مجھے کہا کہ "البدر" کی ڈیوٹی لگاؤں جب ان کی ڈیوٹی لگا رہا تھا تو فائرنگ کی آواز آئی میں نے ساتھیوں کو چوکنا رہنے کی ہدایت کی اور خود حوصلہ لینے گیا مکتی باہنی بالکل ہمارے سامنے تھی میں نے دیکھا کہ فوج اور مکتی باہنی میں ٹکراؤ ہو گیا ہے۔ سات مکتی باہنی کے مارے گئے اور باقی فرار ہو گئے رات کے اندھیرے میں اندازہ لگانا مشکل تھا اس لئے دو گھنٹے ساتھیوں نے آرام کیا صبح ان لوگوں کے زخمی تو ملے مگر سات مردہ آدمی، دو شین گنیں ۲۵ ہینڈ گرینیڈ، بہت سا ایمونیشن اور بھارتی کی پاکستان کے خلاف تحریک کے سب سے سائیکلو سٹائل کا عدد ملے!

ہماری سب سے بڑی کامیابی شیرپور سے سترہ میل دور "بالیا ماڑی" کے مقام پر اسلحہ کے بہت بڑے ذخیرے کا ہاتھ لگنا تھا۔ ——— مومن شاہی سے ۲۵ میل دور پھول پور کے مقام پر "تل کلا" نامی پانچ میل چوڑی جھیل تھی جس میں جزیرے تھے اگست کا آخری ہفتہ تھا اس مقام کے متعلق ہمیں یہ اطلاعات ملی تھیں کہ یہاں مکتی فوج کا سب سے بڑا ہیڈ کوارٹر ہے جب ہم جھیل کے نزدیک پہنچے، تو اس سکیم کے تحت فوج پیچھے سے بڑھے گی اور ہم سامنے بھاگنے والے ایجنٹوں کا صفایا کریں گے مگر اس سکیم کو عملی جامہ پہنانے سے قبل ہی ہمارا ان سے سامنا ہوا ہم نے کہا ہم "مکتی" ہیں مقصد یہ تھا کہ اس عرصہ میں قدم جما لیں ہم صرف ۵ فوجی اور ۴۲ "البدر" کے نوجوان تھے اور مکتی باہنی کے ۳ سو سے زائد مسلح افراد تھے انہوں نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا سارا دن فائرنگ ہوتی رہی۔ چیک پوسٹ ۹ میل دور تھی رابطہ قائم نہیں ہو رہا تھا یکایک ہمیں خیال آیا کہ اسلحہ ختم ہو گیا تو پھر کیا کریں گے۔ اب جائے مخاط انداز سے فائرنگ شروع کی تو دشمن کے قدم بعض مقامات سے اکھڑنے شروع ہو گئے جب وہ فرار ہوئے وہاں سے ۲۱ مشین گنیں، ۹ بندوقیں ۳۵ گرینیڈ مال غنیمت میں ملے، اور مصلحت اسی میں جانی کہ پانچ پانچ افراد کا گروپ بن کر چیک پوسٹ کی طرف روانہ ہوا جائے ایمونیشن ساتھ لیا اور گھیراؤ سے نکلے لگے "مکتی" نے چھپ کر گوریلا جنگ کو ترجیح دی وہ راستوں کے ارد گرد چھپ گئے۔ اسی دوران شام کے اندھیرے میں ہم نے راکٹ لانچر استعمال کرنے شروع کئے۔ اس ہتھیار کی آواز بہت ہی خوفناک ہوتی ہے۔ وہ سمجھے کہ تباہ اسلحے کی بڑی کھیپ سے ہم پر یہ لوگ حملہ آور ہوئے ہیں اس سے خوفزدہ ہو کر انہوں نے راہ فرار اختیار کی اور رات ۹ بجے ہم چیک پوسٹ پر پہنچ گئے۔

رن کچھ اور ۶۵ء کی جنگ میں شرکت کرنے والے فوجی بھی ہمارے ساتھ تھے انہوں نے کہا کہ "ایسا سخت معرکہ ان دونوں جنگوں میں ہم نے نہیں دیکھا" اسی طرح

جانی کوئی نقصان نہ ہوا

نومبر کے پہلے ہفتے کی بات ہے کہ کمال پور سرحدی پوسٹ پر البدر کے تیس
اور پاک فوج کے ساٹھ جوان قیام پذیر تھے رات کے وقت ایسٹ پاکستان رائفلز
مکتی باہنی اور ہندوؤں نے ہماری چوکی کو چاروں طرف سے گھیر لیا کیمپ میں "البدر"
کے صرف سات افراد ہی مائن ماہر تھے ہم نے آہستہ آہستہ فائرنگ ختم کر دی دشمن
سمجھا شاید سب ختم ہو گئے ہیں انہوں نے پیش قدمی شروع کی ہمارے چھپے ہوئے
ساتھیوں نے یک دم فائرنگ شروع کر دی وہ بوکھلا گئے ان کے ۹۳ آدمی مارے
گئے اور بہت سا اسلحہ چھوڑ کر فرار ہو گئے اس قسم کے واقعات تقریباً ہر دوسرے
تیسرے روز ہوتے رہتے تھے ہمارے دو ساتھی شہید ہوئے

البدر کے نائب میجر ریاض نے بتلایا: "یہ مئی ۱۹۷۱ء کی غالباً ۲۸ تاریخ کا واقعہ ہے کہ
جب میرے ضلع میں البدر کی پہلی کمپنی نے بارہ روز کی ابتدائی سرسری سی تربیت مکمل کر
لی تو اسی دوران میں ہندوستان کی سرحد پار کر کے بھارتی سپاہ کے ایک دستے
نے ہمارے فوجیوں پر گوریلا حملہ کر دیا۔ اس حملہ کے دوران ہمارے ایک کیپٹن جاوید
شہید ہو گئے۔ میں پریشانی کے عالم میں سوچ رہا تھا کہ اس صورتِ حال سے کیسے
نمٹا جائے اور اس کا بدلہ کیسے لیا جائے اسی ادھیڑ بُن میں البدر کے پہلے کمانڈر
———— اچانک اسے کامران طالب علم سال دوم میرے پاس آئے اور کہا "سر!
شہید کیپٹن جاوید صاحب کا بدلہ ہم لیں گے" میں نے حیرانگی سے کہا "بھئی! ہندوستانی بارڈر
پار کر کے وہاں جانا اور پھر ہندو فوج پر شب خون مارنا آپ سے کیسے ممکن ہو گا؟" دبلے پتلے
سانولے سلونے کامران نے معصوم مسکراہٹ کے ساتھ کہا "ان شاء اللہ بدلہ لے کر دکھا دیں
گے" میں نے کہا "اچھا آپ ہی کی کمان میں آج رات ایک گروپ بھیجوں گا اپنے ساتھ
پانچ "البدر" ساتھیوں کو لے جانا"

نماز مغرب سے کچھ پہلے کامران آیا اور کہا "میجر صاحب! ہم چلتے ہیں آپ ہمیں
ٹارگٹ (TARGET) بتلائیں اور کچھ اسلحہ بھی دے دیں" ———— میں نے ٹارگٹ بتلا
دیا اور اسلحہ دینے کے بارے میں کچھ گومگو کی کیفیت کا شکار ہو گیا، کیونکہ اس سے قبل
رضاکار فورس میں کچھ لوگ انڈین جاسوسی بھی کرتے رہے اور پھر اسلحہ لے کر فرار بھی ہوئے تھے
اس لئے میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے ہاتھوں کوئی ایسا "کیس" ہو، لیکن "اسلامی چھاترو
سنگھو" کے ان معصوم نوجوانوں کے جوش و جذبے کو دیکھ کر جی بھی چاہتا کہ اسلحہ دیا
جائے۔ پھر یہ بھی پریشانی تھی کہ "البدر" کی تاسیس چونکہ میرے علاقے میں ہوئی ہے،
اس لئے کہیں کوئی غلط قدم نہ اٹھ جائے یا کسی اعتبار سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے
میں کشمکش میں رہا ———— اور اسی ذہنی کشمکش میں میں نے کہا "نماز مغرب کے بعد بات
کروں گا"

نماز کے بعد پھر مسکراتے سانولے سلونے چہرے میرے سامنے تھے میں نے
انہیں ایک پستول اور ہلکا ڈائنامیٹ دیا اور یہ اسلحہ ان میں سے کسی ایک کے بھی تحفظ
کے لئے کافی نہ تھا ———— کامران نے کہا "اور کچھ نہیں تو ہر ایک ساتھی کے ذاتی تحفظ کے
لئے ہی ایک ایک ہلکا ہتھیار دے دیجئے" لیکن میں اس سے آگے اور زیادہ "اعتماد"
نہ کرنا چاہتا تھا پھر نامعلوم میرے ذہن میں یہ خیال کیسے آیا کہ میں فوراً اندر گیا اور
"سورۃ یٰسین" کا ایک نسخہ لے آیا جو ایک پرانے عید کارڈ میں لگا ہوا تھا
وہ خاموشی سے کامران کے ہاتھ میں دیا تو اس کے ساتھیوں نے مزید کوئی تقاضا [illegible]
رات کے اندھیرے میں اپنی راہ لی چونکہ بارڈر دور نہ تھا،
اس لئے وہ سورج نکلنے کے بعد جب میرے پاس واپس آئے تو کہا "میجر صاحب!
کمال ہو گیا"

تفصیلات سے معلوم ہوا ان البدری شاہینوں نے ہندو فوج کے ایک میجر
اور چار سپاہیوں کو انہی کے اسلحے کے ذریعے موت کے گھاٹ اتار دیا جبکہ ایک ٹینک
تباہ کر دیا ———— یہ تھا ———— "البدر" کا پہلا ایکشن جو سرزمینِ ہند پہ ہوا۔

چٹاگانگ

چٹاگانگ موہستی کھالی (کاکس بازار کے قریب ایک جزیرہ)
جمعیت کے رفیق اور پلاٹون کمانڈر محمد (طالب علم عربی مدرسہ المدرسہ) نے بتلایا:
"رمضان المبارک کے اواخر کی بات ہے کہ میں کاکس بازار کے ناظم بھائی عبدالاول سے
ملنے کورلیشن کھالی گیا لوٹتے وقت شاہ جلال چوہدری (رکن چاٹگام جمعیت) اور حنیف
سے سرِ راہ ملاقات ہو گئی انہوں نے یونہی سرسری طور پر کہا کہ آپ "البدر" میں شامل
ہو جائیں اور بات آئی گئی ہو گئی ———— عید کے ایک ہفتہ بعد میں نے موہستی
کھالی میں ان دونوں اور کاکس بازار کے ناظم کو پریشانی میں منتظر بیٹھے دیکھا۔
دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ البدر کے نئے طلبہ کو لینے کے لئے یہاں آئے ہوئے
ہیں چونکہ جزیرہ میں اجنبی ہیں اس لئے تھانیدار اور رضاکار کمانڈر انہیں مکتی باہنی
سمجھ کر گرفتار کرنا چاہتے ہیں ———— میں چونکہ انہیں جانتا تھا اس لئے بمشکل
ان سے پیچھا چھڑوایا ان کی خاطر تواضع کی حنیف بھائی نے مجھ سے کہا کہ آپ جمعیت
کے جتنے بھی اچھے طالب علم ہو سکیں سب کو لے کر فوراً چاٹگام آ جائیں
———— اور چلے گئے

میرے پاس وقت نہ تھا مدرسہ کی چھٹیاں تھیں، ورنہ میں کم از کم سو ساتھیوں کو لے
جا سکتا تھا بہرحال ۱۲ بہترین کارکنان کو ادھر ادھر سے اکٹھا کیا اور انہیں لے کر
چاٹگام پہنچا اس دوران کاکس بازار کے ناظم عبدالاول بھی ہمارے ساتھ آ ملے
ہم بارہ ساتھیوں میں سب سے چھوٹا طالب علم پانچویں جماعت کا سراج الاسلام
تھا ———— ہم ساتھیوں میں سے لڑائی کے دوران اور سقوط ڈھاکہ سے پہلے کوئی
شہید نہ ہوا۔ لیکن بعد میں مجھے اطلاع ملی کہ مختار احمد فرار (ایک ہیڈ ماسٹر کا لڑکا،
متعلم ہشتم)، بشیر احمد متعلم ہشتم اور سراج الاسلام متعلم پنجم کو مکتی باہنی نے شہید کر ڈالا)

تربیت کے لئے ہمیں چاٹگام چھاؤنی بھیج دیا گیا جہاں ایل ایم جی، رائفل، مائن
گرینیڈ ۲ م م وغیرہ سب کی ٹریننگ ہمیں ایک ہی دن میں دے دی۔ دس
فائر بطور امتحان کرنے ہوتے ہیں میں نے تین فائر کئے تینوں سیدھے اندرا کے
پیٹ میں لگے۔ (چھاؤنی میں نشانہ بازی کے لئے اندرا کی ایک تصویر بنی ہوتی تھی۔)
ایوب نے میری پشت ٹھونکی اور تعارفی خط دے کر کیپٹن کے پاس بھیج دیا
جس نے مجھے البدر میں باقاعدہ شامل ہونے کی اجازت دے دی اور اس طرح
میں دس دن کی تربیت کے بجائے ایک ہی دن میں تمام تربیتی مراحل سے
گزر گیا

ہمیں البدر کے ایک شہری کیمپ میں رکھا گیا ہم ———— تخریب پسندوں
اور مکتی باہنی کا پتہ چلا چلا کر فوج کو بتاتے یہی کام ہمارے سپرد کیا گیا تھا

چند روز بعد ہم اپنے ہیڈ ماسٹر سے ملنے عیدگاہ گئے ہمیں اور ان کے بیٹے
کو وردی میں کیل کانٹوں سے لیس دیکھ کر وہ بہت حیران ہوئے۔ ہماری وردی پہلے
صرف کرتا پاجامہ تھی پھر حکومت کے [illegible] ہم لوگ وردیاں پہننے لگے تھے وہاں
دیہات کے افراد نے بتایا کہ یہاں سے اٹھارہ میل دور ہیگڈانا کے قریب جنگل

ہیں کہیں پہاڑوں پر کسی باسی کا نام ہے جہاں سے اگر وہ یہاں حملے کرتے ہیں، اور کل ہی ایک مخبر ر... کو پکڑ کر لے گئے ہیں۔ اس گھنے جنگل میں ابھی تیرہ سمتی کچھ تھے ــــــ ہمارے جوانوں نے گولی ماری اور ہم تین ساتھیوں نے فوج کے بارہ افراد اور رضاکار... ہیں اپنے ساتھ لئے اور رات کے ایک بجے کے قریب کسی باسی کو ان کے اڈے کے قریب چالیس دو اعلیٰ رہے کہ فوج کے عام سپاہیوں کو البدر کی کمان میں دینی طور پر دے دیا جاتا تھا۔ عام طور پر معاملات کار روائی ہو چکے۔ ہم نے پولیس سمیت اور عام حملہ شروع کر دیا۔ رات بھر لڑائی ہوئی۔ صبح ہم نے ایڈوانس کر کے اڈے کو گھیر لیا۔ البدر ایک رضاکار ہونے کے لئے مالی تھا وہ اس سے بھاگتے رہے اور ہم مارتے رہے ــــــ دوپہر کے بعد وہاں پر ہمارا مکمل قبضہ ہو گیا۔ پہاڑ کی سطح پر ان کا ہیڈ کوارٹر تھا اور باقاعدہ ڈائننگ روم بھی موجود تھا۔ ان سب میں ہمیں ۱۳ رائفلیں، چودہ G.3 ۸ ایم ایم، اسٹین گن اور کچھ بیٹری ایمونیشن ملا۔ آنا یجاس تخریب پسند وہاں مارے گئے۔ ہمارا کوئی نقصان نہ ہوا۔ البتہ ایک رضاکار اپنی غلطی کی وجہ سے ہمارے ہی ہاتھوں مارا گیا۔ تیرہ جانے سے ہم نے قیدی نکالا اور طبری نمازکے بعد اٹھارہ میل پیدل چل کر شام ۹ بجے کے قریب نعرۂ تکبیر، البدر زندہ باد ــــــ البدر کے نعروں سے پاکستان قائم رہے گا۔ بنگال نہیں پاکستان ــــــ کے نعرے لگاتے ہوئے کاکس بازار میں داخل ہوئے اور سکون سے کھانا کھایا۔ کاکس بازار میں لوگوں نے ہمیں ٹھہرانا چاہا۔ ہم بھی رکنا چاہتے تھے، مگر حکم نہیں تھا اس لئے چاٹگام چلے گئے۔

اب ــــ ہمارے دن شہر میں آپریشن پر گزرنے لگے۔ کام ہوگیا اور ہم تخریب کاروں کو ڈھونڈنے لگتے۔ صرف عالب میں بھی ہم ان سر پسندوں کی تلاش میں نکل جاتے۔ جنگ کے دوران دس دسمبر ۷۱ء کو رات ۱۱ بجے چاٹگام شہر بھی کر رنگا متی سیکٹر پر بھارت تہہ میل اندر گھس آیا ہے۔ فوراً صوبیدار منور خان کے ساتھ ہم دس البدر دس مجاہد اور دس فوجی کمک لے کر سیکٹر پہنچے۔ بھارتیوں کا حملہ جاری تھا۔ وہ مسلسل ہم پر آگ برسا رہے تھے۔ اگر ہم نے فائر نگ سے روکے رکھا۔ جب چار گھنٹے اسی عالم میں گزر گئے تو بھارتی سمجھے کہ پاکستانی فرار ہو گئے۔ چنانچہ انہوں نے مورچوں سے نکل کر ایڈوانس شروع کر دیا۔ اس عالم میں ہم نے عام حملہ کر دیا اور مورچوں سے باہر نکل آئے۔ تکبیر کی صدائیں گونجتی رہیں اور ہم کار سے دور ہوتے رہے۔ وہ کچھ پیچھے ہٹتے تو ہم تعاقب میں دوڑنے لگتے۔ وہ گھبرا کر اور پیچھے دوڑتے تو ہم دم مارتے ہوئے اور آگے بڑھ جاتے۔ اس طرح جنگی حکمت عملی کے بغیر سیدھے سادھے ــــ انداز میں ہم نے تین گھنٹے کے اندر اندر دشمن کو چھ میل پیچھے دھکیل دیا اور اپنے پرانے مورچوں پر پھر ڈٹ گئے ــــ جہاں آخر تک ہم لڑتے رہے۔ ہم مزید آگے بڑھ سکتے تھے، اور بڑھنا چاہتے تھے۔ ہمارا ساتھی صوبیدار صاحب بھاگ کر ہمیں ایڈوانس سے روک دیا گیا۔ ایک قدم بھی آگے بڑھنے نہیں دیا گیا۔ کہا یہ تھا کہ آرڈر نہیں ہے۔

چاٹگام کے حسان (متعلم الف ایس سی) نے بتایا کہ "۱۲ دسمبر ۷۱ء کی رات ہے۔ ہم ایک جگہ پولیس سپاہی کے دشمن پر گوریلا شائل کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے کہ اسی میں بھارتی فضائیہ کے لڑاکا طیارے فضا میں نمودار ہوا اور چند گز کے فاصلے پر دو دو ہزار پونڈ وزنی بم پھینکے۔ بم پھینکے تو ہمیں گرمی یوں محسوس ہوا جیسے ــــ سائکلون (Cyclone) آیا ہو یا آندھی کا ایک ریلا ــــــ! ــ حالانکہ اتنے قریب فاصلے پر اگر ہینڈ گرنیڈ پھٹے تو جسم انسانی کے پرخچے اڑ جائیں لیکن ان بموں کے پھٹنے کے باوجود ہمیں کوئی زخمی ہوا، اور نہ ہی ہمارا نقصان ہوا۔ حالانکہ قریب ہی زمین میں بڑے بڑے گڑھے بن گئے۔ اس معاملے کو دیکھ کر ہمارا اسر خدا کے حضور جھک گیا اور آج جب بھی وہ وقت یاد آتا ہے تو دل ودماغ لرز اٹھتے ہیں ــــــ!

البدر نے دو جہاز مار گرائے

ایک فوجی جوان نے بتایا کہ جنگ کے دوران چاٹگام میں پاک فوج ایک بھی بھارتی حملہ آور جہاز کو نہ گرا سکی تھی کہ البدر کے دو مجاہدین حسان مثال نے اینٹی ائیر کرافٹ کے ذریعہ دو ہوائی جہاز گرائے جس کے بعد شہر میں البدر نے جلوس نکالا اور حسان مثال زندہ باد ــــــ کے نعرے لگائے۔ یہ دونوں کارکن اینٹی ائیر کرافٹ کے گر تھے۔ جنہیں کی دوگن پوسٹ البدر کے مجاہدین کو تحریم سے ان کی شاندار کارکردگی کی سپردگی دے رکھی تھیں۔

فوج

البدر کے کیڈٹوں نے فوجیوں کی اصلاح کے لئے بھی اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ چنانچہ الوسرور رکن جمعیت نے چاٹگام کے ایک کیپٹن نام مصلحتاً چھوڑنا چاہتا ہے کو بتایا کہ ہمارا کیپٹن صاحب پہلے شراب پیتا تھا جس کے نتیجہ میں انہوں نے شراب چھوڑ دی اور نماز باجماعت میں باقاعدہ ہو گئے۔ اور البدر سے بہت متاثر ہوئے۔ ایک روز ایک سپاہی نے ایک البدر کو تھپڑ مارا تو الوسرور نے شکایت کی۔ اس پر کیپٹن نے البدر کیڈٹ کو بلا کر اس سپاہی کو تھپڑ مارنے کے لئے کہا۔ کیڈٹ نے کہا میں اسے معاف کرتا ہوں۔ اس پر کیپٹن نے کہا تم تو معاف کر سکتے ہو مگر میں اسے معاف نہیں کروں گا، کیونکہ اس نے البدر کو تھپڑ مار کر مسلک ر ... قرآن کے پیغام جہاد کی عملی تصویر کو تھپڑ مارا اس لئے اسے گولی ماری جانی چاہئے، مگر چونکہ البدر نے معاف کر دیا ہے اس لئے میں صرف سات کوڑے اور دس سال قید معہ تین ماہ قید تنہائی کی سزا کی سفارش کرتا ہوں، بالآخر الوسرور کے شدید اصرار کے بعد سپاہی کی سزا معاف کرائی گئی!

شاہ جلال کی شہادت

شاہ جلال چودھری چاٹگام جمعیت کے رکن، اور البدر کے پلاٹون کمانڈر تھے۔ ان کی شہادت سے متعلق ــــــ یوسف ــــ البدر کیڈٹ نے بتایا:

"جنگ ۱۹۷۱ء کے باقاعدہ آغاز کے بعد چاٹگام میں تیل کے ذخیرے پر بھارتی فضائیہ کے طیاروں نے راکٹ اور بم گرائے جس کے نتیجہ میں ذخیرے کی جنوبی سمت میں آگ لگ گئی۔ جنگ میں پیٹرول کی سمت ضرورت اور اہمیت تھی جبکہ اس سے قبل ہی شدید قلت تھی۔ شمالی سمت میں رکھے ہوئے بہت سے ڈرم کوشش کر کے بچائے جا سکتے تھے اگر اس ذخیرے کو آگ سے منتقل کیا جاتا۔ یہ اہم ترین کام پاک آرمی کے جوان نہیں کر رہے تھے اور آگ رفتہ رفتہ پھیل رہی تھی۔ اس صورت حال میں شاہ جلال ۲۹ البدر کیڈٹوں کی قیادت میں آگے بڑھے اور آگے سے بچے ہوئے ڈرموں کو لڑھکاتے ہوئے دور دور لے جانے لگے، اس مشن میں میں بھی ان کے ہمراہ تھا۔ اتنے میں ہوائی حملہ ہوگیا کچھ ساتھی راستہ کے ایک طرف دکانوں کے پیچھے چھپ گئے اور دیگر پندرہ ساتھی جن میں شاہ جلال چودھری بھی شامل تھے، راستہ کی دوسری طرف حفظ ماتقدم کے طور پر عمارت میں داخل ہو گئے۔ اتفاق دیکھئے کہ جس عمارت میں وہ داخل ہوئے بدقسمتی سے"، اس پر بھی بمباری شروع ہو گئی۔ حملہ کے بعد جب عمارت کا ملبہ ہٹایا گیا تو ہمارے دس

دوست جو انجینئرنگ کالج کے سٹوڈنٹ تھے شہید ہو چکے تھے۔ الشمس شاہ جلال اور دیگر چار کیڈٹ بُری طرح شدید زخمی ہو گئے۔ ان زخمیوں کو ہسپتال لے جانے کے لئے ایک گاڑی سے اٹھایا اور ایک دوسرے ساتھی نے شاہ جلال کو پیٹھ پر لاد لیا اور بیری کی سمت شہر کی جانب بھاگے، اسی دوران میں پھر ہوائی حملہ ہو گیا جہاز سے۔ نیچی پرواز میں تھے۔ میں قریبی دکان کے پیچھے رینگ کر لیٹ گیا۔ البدر کے ساتھی محمد حسین اس پناہ گاہ سے دور رہ گیا کیونکہ اس نے حملہ کے دوران چلاتے ہوئے مجھے کہا "مجھے چھوڑ دو ایسی حالت میں بچاؤ" ---! اس لئے یہ بات مان کر میں رینگ گیا لیکن شاہ جلال بے انتہا زخمی حالت میں چلا رہا تھا --- "محمد حسین کو بچاؤ، محمد حسین کو بچاؤ" یہ آواز سن کر میں نے گردن اٹھا کر دیکھا اور زخمی شاہ جلال گر پڑا تھا محمد حسین کو بچانے کے لئے آگے لپک رہا تھا۔ قبل اس کے کہ میں کوئی بات کرتا، جہاز کی نیچی پرواز دیکھ کر چلایا ہی جا رہا تھا کہ جنگی طیارے کی گولیوں کی بوچھاڑ نے، محمد حسین کو بچانے کی کوشش میں زخمی شاہ جلال کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہوا میں بکھیر دیا --- شہید کر دیا۔

راج شاہی

راج شاہی سے جمعیت کے رکن ضلع جمعیت کے ناظم انجینئرنگ یونیورسٹی کے طالب علم، مشرقی پاکستان ٹیکنو انجینئرنگ کے ممبر --- برادرم انعم اسلام بتلاتے ہیں۔

اپریل کے آخر میں رضاکار تنظیم نے کام شروع کیا تقریباً دو ماہ بعد جون میں البدر کا قیام عمل میں آیا۔ راج شاہی میں چار سب ڈویژن تھے اور ہر ایک میں الگ الگ پوسٹ قائم تھے۔ ہر پوسٹ ۳۱۳ ورکر پر مشتمل ہوتا تھا جو طلبہ رضاکار تھے وہ اس میں آگے باقی ساتھیوں سے بھی پندرہ دن کی تربیت حاصل کر لی۔ شروع میں البدر کے متعلقات عام میں تھا۔ بعد ازاں اجتماع ارکان کے فیصلے کے مطابق اکتوبر میں البدر کے ٹاؤننگ کمانڈر کی حیثیت سے کام کرنے لگا تقریباً سات آٹھ آپریشنز پر میں خود بھی گیا۔ ہمیشہ کوشش یہی ہوتی ہماری آمد کی اطلاع پر بھاگ جاتی اگر مقابلہ ہو بھی تو جلدی فرار کی راہ اختیار کر لیتے۔ میں چونکہ کمانڈر تھا اس لئے بھاری اسلحہ استعمال کرنے کا موقع نہ ملا۔ بس ایک ریوالور اور ایک میگافون میرے پاس تھا جو کہ لڑائی کے دوران ہدایات دینے کے کام آتا تھا۔ دو ملیشیا جیپیں ہمیں مستقل طور پر ملی ہوئی تھیں۔ آرمی آفیسرز ہمارے ساتھیوں و البدر کے کردار سے بے حد متاثر تھے، اور بار بار اس کا اظہار ہمارے سامنے کرتے تھے۔ ان کی کیمپ ہمارے شہر میں تھے ... ہم کے قریب البدر کے مجاہد رہتے تھے کل تعداد میں ... پوسٹ کے مجاہدین کی اجرت ۵ تک مہیا کی گئی تھی ایک سو دس روپے ماہوار آرمی البدر کے ہر مجاہد کو دیا جاتا تھا مگر ہمارے ساتھیوں میں سے کوئی اس کو نہ لیتا تھا۔

البدر کے آپریشن کے دوران اللہ کی رحمت ہم نے محسوس کی، ہم ناتجربہ کار تھے مگر ایمان کے بل بوتے پر کام کر رہے تھے۔ ایک مرتبہ دو بسیں اور ایک ٹرک بھر کر البدر کے مجاہدین آپریشن پر گئے۔ ایک دیہات پر پہنچ کر مکتی باہنی سے لڑائی ہوئی، کچھ دیر مقابلے کے بعد وہ بھاگ گئے مگر ہمارے واپسی کے راستے میں بارودی سرنگیں بچھا گئے۔ ہمیں خبر نہ تھی کہ ہمارا پہلا ٹرک اس پر پہنچا ہی تھا کہ دھماکے سے سرنگ پھٹ گئی۔ ٹرک کے پرخچے اڑ گئے۔ حادثہ اتنا شدید تھا کہ ہمارے کئی ساتھی ہلاک ہو سکتے تھے، مگر اللہ کی رحمت سے ٹرک تو ختم ہو کر رہ گیا لیکن ہمارے صرف سات آٹھ ساتھی زخمی ہوئے۔ البتہ ڈرائیور جو ہم میں سے نہیں تھا، شدید زخمی ہوا اور یہ تھی ہم پر اللہ کی رحمت خاص

راج شاہی میں مکتی باہنی کے سات آٹھ اڈوں پر ہم نے قبضہ کیا۔ ایک اڈے سے سائیکلو اسٹائل مشین بھی ملی تھی، وہ شرانگیز پروپیگنڈے کے لئے استعمال کرتے تھے، جبکہ ہر جگہ سے ہتھیار اسلحہ اور بے پناہ ایمونیشن ہمارے قبضہ میں آیا۔ ایک اڈے سے تو ایک ٹرک بھر کر گولیاں ہم نے حاصل کیں

فیلڈ میں ہی ہمارے مسلسل تحریکی پروگرام بھی ہوتے تھے، ہمارے شعبہ معاملات کا شعبہ روزانہ دیہاتوں میں جا کر رائے عامہ کو صحیح راہ پر لانے اور عوام کی ملک کی حفاظت کے لئے راہ ہموار کرتا۔ راج شاہی ریڈیو کے تمام پروگرام بھی یہی شعبہ طے کرتا اور کرواتا تھا، جبکہ انٹیلی جنس کا شعبہ آرمی اور البدر کے کمانڈروں کو مخالفین کی صف بندی، ان کے اڈوں اور پروگرام سے بروقت آگاہ کرتا جس کی بنا پر ہماری کارروائیاں عمل میں آتیں

ان ایام میں مختلف مواقع پر مسیرہ پوسٹ کے سات آٹھ ساتھی شہید ہوئے۔ نواب گنج سب ڈویژن بھارتی سرحد سے گھرا ہوا تھا وہاں پر البدر کا ایک مکمل پوسٹ تھا۔ علام ... جمعیت کے رکن کمانڈر تھے، (یہ اب مشرقی پاکستان جیل میں ہیں) انہوں نے ہی راج شاہی ضلع میں جمعیت کے کام کا آغاز کیا تھا ان کی باقاعدہ انڈین فوج کے ساتھ سرحد پر لڑائی ہوتی رہتی، ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ کے زوال کے بعد بھی بھارتی فوج کے حملوں کو یہ لوگ روک رہے تھے۔ اس سے قبل بھی جب آرمی کو ضرورت ہوتی وہ البدر کو سرحد پر بلا لیتی تھی۔ ۱۵ دسمبر تک وہاں چھ سات سے زیادہ ساتھی شہید نہیں ہوئے تھے البتہ خدشہ یہ ہے کہ بعد کے دنوں میں کافی ساتھی شہید ہوئے ہوں گے

کھلنا سے ایم رحمٰن (معلم سال سوم، رکن مشرقی پاکستان جمعیت صوبائی مجلس شوریٰ) بتلاتے ہیں: ۴ دسمبر کو جب پاک فوج جیسور سے ہٹی اور کھلنا کی حفاظت کے لئے شہر کے تین اطراف کو پاک فوج نے دفاعی اعتبار سے خاصا مضبوط بنا لیا تھا، جبکہ چوتھی جانب دریا تھا جس کے سبب یہ سمت غیر محفوظ تھی، لیکن یہ بھی یاد رہے کہ پاک بحریہ یکم دسمبر کو کھلنا کی بندرگاہ چھوڑ چکی تھی۔ بہرحال دریائی کمزور پوزیشن کی حفاظت کے لیے "البدر" کو مقرر کر دیا گیا جن کے پاس ہلکے ہتھیار تھے۔ ۹ دسمبر کو دس بجے کے قریب شہر کی اس جانب دریا کے ذریعہ ہندوستانی "گن بوٹس" (INDIAN GUN BOATS) گھس آئیں اور چالنا بندرگاہ پر شدید گولہ باری شروع کر دی، چونکہ "چالنا پورٹ" کو پہلے ہی پاک بحریہ نے خالی کر کے پسپائی اختیار کر لی ہوئی تھی، اس لئے دشمن کی گن بوٹس کو روکنا ناممکن تھا مگر ہماری جانب سے ہوائی فائرنگ جاری رہی لوہے اور آگ کی بھرپور جنگ میں --- محض بندوقوں سے مسلح ساتھیوں میں اضطراب تو ضرور پیدا ہوا لیکن کوئی اس جگہ سے ہٹا نہیں۔ اسی اثنا میں ہندوستانی فضائیہ کے دو بمبار نمودار ہوئے، چونکہ پاک فضائیہ بھی بالکل بے بس ہو کر ختم ہو چکی تھی اس لئے اس صورت حال میں مزید پریشان کن کیفیت پیدا ہوئی اس سب کچھ کے باوجود قدرت کا ارادہ کچھ اور ہی تھی۔ بالکل غیر متوقع طور پر ہندو فضائیہ نے اپنی ہی گن بوٹس پر بمباری شروع کر دی، اور گن بوٹس نے تحفظ ذات کی خاطر اپنا رخ ہماری طرف سے موڑ کر اپنی ہی فضائیہ کے خلاف کر لیا، اس طرح دو گن بوٹس غرق ہو گئیں اور بقیہ دو گن بوٹس زبردست نقصان اٹھا کر واپس بھاگ گئیں

ضلع ڈھاکہ سے جمعیت کے رکن برادرم لطف حسین (رائف اسے) کا آنکھوں دیکھا معاملہ کچھ یوں ہے۔

"ضلع ڈھاکہ میں مدھیا باڑی" جو کپڑے کی صنعت کے اعتبار سے "مانچسٹر آف

پڑھی ناشتہ کیا افطار سے ایک لنگی اور کرتہ لیا اور سعودی اتار پھینکی امین الاسلام نے کہا کہ
آپ کو لوگ جانتے ہیں اس لئے آپ یہاں سے چلے جانے میں ہی جان اس سے آلو ق کر کے مجھے
رخصت ہوا اور کہا کہ میرے رہنے سے تم بھی ہلاکت میں پڑ جاؤ گے مجھے تو یہ لوگ شاید
کل ہی شہید کر دیں تم لوگ کچھ اور رہ مدد رسو تا کہ کچھ اور اللہ کی عبادت کر سکو میرے پاس
۱۴۰ روپے تھے۔ ہر ایک کو دس روپے دیئے دس خود رکھے اور روتے ہوئے ایک دوسرے
سے جدا ہوئے۔ مجھے یقین تھا کہ میں تو آج یقیناً شہید ہو جاؤں گا

۹ بجے صبح میں دوبارہ کشتی والے کے پاس پہنچا اس نے کہا داڑھی کا ذکر چھوڑ دیں
بے داڑھی آدمیں کاٹوں گا اس نے یہ کہہ کر کوئی کپڑے اور یہ کچھ نہیں کہوں گا مجھے کشتی
پر بیٹھنے کی اجازت دی۔ ایک سکے دن کشتی گھاٹ سے الگ ہوئی ایک ہوائی لنگی بھی ساتھ
تھا موہش کھالی کی سمت کشتی ایک میل ہی بڑھی ہوگی کہ کئی ماہی گیر کشتی کی طرف دوڑے
گئے اور آواز دی کہ ادھر آؤ کشتی پھر ساحل سے لگ گئی انہوں نے پوچھا کوئی البدر یا رضاکار
یا مجاہد ہے کشتی والوں نے کہا نہیں کوئی نہیں پھر انہوں نے سب کے چہرے گھورنے
سب نے نگاہ سے گرمی نہ لگائے اور سب کی وہ اس پر میری طرف متوجہ ہوئے وہاں سے
تین میل بڑھے تھے کہ مارل گھاٹ کے قریب ایک اور ٹولے نے بلا لیا اور وہی سوال دہرایا۔
کوئی البدر مجاہد، رضاکار ہے اس پر کشتی میں موجود ہوائی لنگی نے کہا کہ یہ ایک البدر ہے
کشتی والے نے کہا اسے کیا کرو گے میں نے کہا گالی مت دو اور جو چاہے کرو ہاتھ پکڑ
کر کشتی سے باہر کھینچیں گے میں نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا میں مسلمان ہوں جس طرف
چاہو لے جاؤ مجھے وہ اتار کر لے گئے ساحل سے قریب ہی میں نے دیکھا کہ ایک سو سے
زائد مجاہد مرے ہوئے تھے انہیں اذیت پہنچائی جا رہی تھی مجھے بھی اس طرف لے گئے

اس وقت اچانک مجھے اپنے محلے کا ایک مکتی باہنی نظر آیا اس نے تو جانم ادھر
کہاں میں نے کہا کہ ہمارے امتحان کا نتیجہ لینے ہیڈ ماسٹر نے مجھے جانگاؤں بھیجا تھا مگر
راستے سے ہی واپس جانا تھا کہ یہ مجھے البدر کہہ کر مارنے کے لئے کشتی سے اتار لائے ہیں اس پر
میرے محلے والا دوسروں سے جھگڑ پڑا وہ کہنے لگا کہ میں نے ایک سال آزادی کے لئے جنگ کی
ہے اگر تم اسے مارنا چاہتے ہو تو پہلے مجھے مار دو جھگڑے کے بعد انہوں نے مجھے چھوڑ دیا اور
رات ۲ بجے کے قریب میں گھر پہنچا ابا نے بتایا کہ مکتی باہنی تمہاری تلاش میں کئی مرتبہ یہاں کے
چکر لگا چکی ہے۔ تمہارا یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں تم ڈاکٹر نور الامین کے پاس جاؤ جو جماعت
کی عوامی لیگ کا سیکرٹری تھا اسے میں نے پاکستانی فوج سے بچا کر ایک محفوظ مکان
میں رکھا تھا میں نے جا کر اس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ رات ہو چکی تھی وہ پستول لے کر نکلا
میں نے تعارف کرایا اور پناہ چاہی اس احسان فراموش نے جواب دیا کہ فوراً میرے
سامنے سے چلے جاؤ ایک منٹ اور دیکھا تو مار ڈالوں گا اس مرد ناشرم میں چھوڑ رہا ہوں
میں نے کہا یہ ہے ہماری مدد ... اور پہاڑیوں کی طرف چلا گیا ایک ہفتہ درختوں کے پتے
کھا کر گزارہ کیا ایک ہفتہ بعد حسن اتفاق سے اپنے ایک خدمت گار ملازم سے ملاقات ہو گئی
ایک ہفتہ اور گزر گیا اور وہ کچھ کھانا، کرتہ اور سگریٹ کے پیکٹ دے کر چلا گیا سگریٹ
پینے کی عادت ان لوگوں سے البدر کے ساتھیوں کو ملی تھی کیونکہ لڑائی کے دوران یہی وہ واحد
چیز ہوتی ہے جو سردی سے محفوظ رکھتی ہے۔ میں نے اسے کہا کہ اسے کہو کہ وہ مجھے کسی اور
ملک بھیج دیں اکیس دن پھر یہ کھا کر گزارے اکیس دن بعد وہی ملازم اور میرا چھوٹا بھائی
اپنے ساتھ کمبل اور لنگی لے کر آئے تھے کمبل سے تو گزر گیا تھا اس پر مجھے
صدمہ ہوا کہ کہیں سارا گھر بھی تو نہیں لوٹ لیا گیا کہ یہ انتہائی گھٹیا کمبل ہمارا کیوں لایا ہے بھائی
سے پوچھا تو اس نے کچھ نہ کہا مگر کچھ چھپانے کی کوشش کی والد مرحوم کے ... محمد کے والد کا
کاکس بازار اور موہیش کھالی کے درمیان آمد و رفت کے لئے کشتیاں چلانے کا کاروبار تھا

نور محمد کا بھی الگ کاروبار تھا اور دو تین کشتیاں ان کی بھی چلتی تھیں آتے ہوئے کاکس
بازار کے بنک میں ذاتی اکاؤنٹ میں ان کے بارہ ہزار روپے تھے چیک بک وغیرہ بھی
کسی ایک کارکن کو دے آئے تھے۔ بھائی نے ایک سو روپے مجھے دیئے اور کہا کہ آئندہ رات
ایک لانچ لامار گھوٹی (ایک گھاٹ کا نام) پر آئے گی اس میں سوار ہو جانا

اس اثناء میں میری جوتی بھی ضائع ہو گئی ہوا یوں کہ ایک دن صبح درخت سے
ٹیک لگائے کچھ سوچ رہا تھا اس وقت ایک لومڑی نے آ کر میری جوتی چبانی شروع
کر دی۔ میں نے دیکھ کر بھگایا مگر اب وہ پہننے کے قابل نہ رہی تھی یوں اب میں ننگے پیر تھا

ہم مقررہ وقت پر لانچ میں سوار ہو کر برما کی طرف روانہ ہوتے انگلروں کی یہ
لانچ میرے والد صاحب نے کرایہ پر حاصل کر کے بھجوائی تھی موہیش کھالی ہی کے
دو اور محب وطن اس میں سوار تھے۔ سفر شروع ہوا درمیان میں ایک جزیرہ "جن
جیرہ" ملا اس کی ساری آبادی تحریک کی حامی تھی۔ بہرحال ہم نے خود کو مکتی باہنی کہہ کر
ان سے ناریل حاصل کئے (یہاں کے ناریل بہت مشہور ہوتے ہیں)

آٹھ سو روپے دن کے ہم لوگ وہاں سے روانہ ہوئے جن جیرہ کے ساحل سے ابھی
جدا ہوئے تھے کہ مکتی باہنی کی ایک لانچ نے دیکھ لیا اور تعاقب شروع کر دیا سورج
ڈوبتے وقت تک تعاقب ہوا بالآخر رات کے اندھیرے میں ہم بچ نکلے۔ رات بھر لانچ
چلتی رہی مگر مکتی باہنی سے بچنے کی کوشش میں ہم بھٹک کر گہرے سمندر کی طرف نکل آئے
تھے کسی کو سمت کا کچھ اندازہ نہ تھا اندازاً شمال کی طرف لانچ موڑ دی دس گھنٹے بعد یہاں پہاڑیاں
نظر آنے لگیں مزید تین گھنٹے کے بعد ہم برما میں مچھیروں کی ایک بستی پہنچے پھر وہاں سے
روانہ ہو کر رات ایک گاؤں میں اترے ساری آبادی مسلمان تھی چند ایک جاننے والے بھی
مل گئے۔ جا کر کھانا کھایا۔ رات ٹھہرے صبح نہائے کپڑے بدلے۔ پتہ چلا کہ ہمارے یہاں
آنے کی خبر مشہور ہو گئی ہے (برما میں دو متوازی حکومتیں عملاً موجود ہیں۔ ایک برما گورنمنٹ کی،
ایک کمیونسٹوں کی) اب جو بھی ملے گا وہ ہمیں پکڑ لے گا بہرحال دن وہاں گزارا اور رات
ہمیں ایک پہاڑ میں مختلف مقامات پر وہاں کے مسلمانوں نے چھپا دیا صبح پہاڑ کے قریب
واقع ایک مسجد کے امام نے مشورہ دیا کہ اپنے سفارت خانے کو خط لکھو چنانچہ میں نے
البدر کے مدیر کی حیثیت سے انہیں خط لکھا ہوا سفارت خانے والوں نے کہا کہ فوراً دفتر آ
جاؤ ورنہ پکڑے جاؤ گے تیسرے دن ہم کشتی لے کر اکیاب چلے گئے

دن کے دو بجے وہاں پہنچے کشتی سے کرائے کی گاڑی منگوائی اسی اثناء میں
اکیاب جامع مسجد کے امام کو بھی ہماری اطلاع پہنچ چکی تھی وہ بھی تشریف لے آئے سب
مل کر پاکستان آفس پہنچے مگر دس منٹ بعد برما کے امیگریشن والوں نے ہمیں سفارت خانے
کی حدود میں داخل ہو کر گرفتار کر لیا اور ریکارڈ کر لئے گئے سفارت خانے کی حدود سے پکڑنے پر
پاکستان ایلچی نے سخت احتجاج کیا اور بالآخر رہا ہو کر پاکستانیوں کے کیمپ میں بھیج دیا وہاں اس
وقت ۴۳ افراد مقیم تھے سب ٹوٹ کر گلے ملے اور حال احوال معلوم کیا تین دن بعد ڈھاکہ
سے فرار ہو کر ایک کرنل وہاں پہنچا۔ اس نے ہم تینوں کو بلا کر خوب گفتگو کی اور کہا کہ اگر مشرقی
پاکستان سے ایک کروڑ مسلمان بھی آئیں گے تو بھی ہم انہیں مغربی پاکستان بھیجنے کا انتظام
کریں گے۔ پھر وہ دلاسا دے کر چلا گیا

اس بات پر ہم نے مشرقی پاکستان اور ساتھیوں کو لانے کے لئے خطوط روانہ کئے،
لیکن مزید لوگوں کی سرپرستی میں ایک طرف فوجی کیمپ سے چلے گئے تو ہمیں بھی ایک ہفتہ
بعد برما گورنمنٹ کے حوالے کر دیا گیا جس نے ہمیں جیل میں ڈال دیا برما کے افسروں نے کہا
کہ تم لوگ اتنی کچھ قربانیاں دے کر آئے ہو مگر ہم کیا کریں پاکستان سفارت خانہ آپ کو قبول
نہیں کرتا اس لئے ہمارے ملکی قانون کے مطابق ہم آپ کو قید کر رہے ہیں یہ سترہ ہزار سلک

ناخواندگی کا تناسب

اشفاق مہر (مارمسی)

ملک کا نام	کل آبادی کا ان پڑھ فی صد کے حساب سے
جاپان	۲۰۳
امریکہ	۲۰۵
فرانس	۳۰۶
روس	۹۰
مصر	۸۰۰۱
ہندوستان	۸۰۰۶
پاکستان	۸۰۰۸

بقیہ . قانون کی تعلیم میں انقلابی تبدیلیاں

فقہ سے کی جاتی ہے، پھر ہر مذہب (اسکول) کے لوگ اپنے مخصوص فقہی نقطۂ نظر سے حدیث پڑھاتے ہیں اور قرآن کی صرف ایک یا دو بڑی سورتیں محض تبرکاً داخل درس کر دی جاتی ہیں، بلکہ ان میں بھی کلام الٰہی کی ادبی خوبیوں کے سوا کسی اور چیز کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔ اس کا نقصان یہ ہوا ہے کہ جو فضلاء ان درسگاہوں سے نکلتے ہیں وہ قانون کے جزئیات و فروع سے تو خوب واقف ہوتے ہیں مگر جس دین کو قائم کرنے کے لیے یہ قانون بنایا گیا ہے اس کے مجموعی نظام، اس کے مقاصد، اس کے مزاج اور اس کی روح سے بڑی حد تک نابلد رہتے ہیں۔ ان کو یہ تک معلوم نہیں ہوتا کہ دین سے شریعت اور شریعت سے فقہی مذاہب کا تعلق کیا ہے۔ وہ قانونی جزئیات اور اپنے مذہب خاص کے فروعی مسائل ہی کو اصل دین کہہ بیٹھتے ہیں۔ اسی چیز نے ہمارے ہاں فرقہ بندی کے جھگڑے اور تعصبات پیدا کیے ہیں۔ اسی چیز کا یہ نتیجہ ہے کہ مسائل زندگی پر فقہی احکام کا انطباق کرنے میں بارہا شریعت کے اہم ترین مقاصد تک نظر انداز کر دیے جاتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اب اس غلطی کی اصلاح ہو اور کسی طالب علم کو اس وقت تک قانون نہ پڑھایا جائے جب تک وہ پہلے قرآن اور پھر حدیث سے دین کو اچھی طرح نہ سمجھ لے۔

اس معاملہ میں بھی ہمیں ابتداءً چند سال تک کچھ مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا، کیونکہ قرآن و حدیث سے واقف گریجویٹ نہ مل سکیں گے اور اس کے لیے شاید ہمیں لا کالجوں ہی میں اس تعلیم کا بھی انتظام کرنا پڑے گا، لیکن آگے چل کر جب ہماری عام تعلیمی اصلاحات نافذ ہو جائیں گی، تو آسانی کے ساتھ یہ ضابطہ بنایا جا سکے گا کہ لا کالجوں میں صرف وہی طلبہ داخل ہو سکتے ہیں جو تفسیر اور حدیث کو مخصوص مضامین کی حیثیت سے لے کر بی۔اے کر چکے ہوں، ورنہ دوسرے مضامین کے طلبہ کو ایک سال مزید ان مضامین پر صرف کرنا ہوگا۔

۳ تعلیم قانون کے نصاب میں تین مضامین ضرور شامل ہونے چاہئیں۔ ایک جدید زمانے کے اصول قانون (JURISPRUDANCE) کے ساتھ ساتھ اصول فقہ کا مطالعہ، دوسرے اسلامی فقہ کی تاریخ کا مطالعہ، تیسرے فقہ کے تمام بڑے بڑے مذاہب (اسکولوں) کا غیر متعصبانہ مطالعہ۔ ان تینوں چیزوں کے بغیر طلبہ میں نہ تو فقہ کا پورا فہم پیدا ہو سکتا ہے، نہ ان کے اندر وہ اجتہادی صلاحیتیں ابھر سکتی ہیں جو اعلیٰ درجے کے قاضی اور مفتی بننے کے لیے ناگزیر ہیں، اور نہ ان کے اندر سے ایسے ماہرین نکل سکتے ہیں جو ہماری ترقی پذیر ریاست کی روز افزوں ضرورت کے لیے تعبیر و قیاس اور استحسان و اجتہاد کے صحیح طریقے استعمال کر کے قوانین بنا سکیں۔ اپنے قانون کے اصولوں کو پوری طرح سمجھے بغیر آخر وہ روز مرہ پیش آنے والے مسائل پر ان کا انطباق کیسے کر سکیں گے۔ اپنی فقہ کی تاریخ کو جانے بغیر انہیں کیونکر معلوم ہوگا کہ اسلامی قانون کا ارتقا کس طریقے پر ہوا ہے اور آئندہ کس طریقے پر ہو سکتا ہے۔ علمائے اسلام کے جمع کیے ہوئے پورے ذخیرے پر وسیع نظر رکھے بغیر وہ کیونکر اس قابل ہو سکیں گے کہ جب کسی مسئلے میں ایک فقہی مذہب سے رہنمائی نہ ملتی ہو تو سارا اجتہاد کرنے سے پہلے دوسرے مذاہب فقہ سے استفادہ کر لیں۔ اسی وجہ سے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ہماری تعلیم قانون کے نصاب میں یہ تینوں مضامین داخل ہوں۔

۴ تعلیم کی اس اصلاح کے ساتھ ہمیں اپنے کالجوں میں طلبہ کی اخلاقی تربیت کا بھی خاص انتظام کرنا ہوگا۔ اسلامی نقطۂ نظر سے لا کالج چالاک وکیل، بے ضمیر قانون پیشہ، زر پرست مجسٹریٹ اور بدکردار جج تیار کرنے کی فیکٹری نہیں ہے، بلکہ اس کا کام تو ایسے قاضی اور مفتی پیدا کرنا ہے جو اپنی قوم میں اپنی سیرت و کردار کے لحاظ سے بہترین لوگ ہوں، جن کی راست بازی اور عدل و انصاف پر کامل اعتماد کیا جا سکے، جن کی اخلاقی ساکھ ہر شبہ سے بالاتر ہو۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں سب سے بڑھ کر خدا ترسی، پرہیزگاری اور احساس ذمہ داری کا دور دورہ ہونا چاہیے۔ یہاں سے نکلنے والے طلبہ کو اس مسند کے لیے تیار ہونا ہے جس پر کبھی قاضی شریح، امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور قاضی ابو یوسفؒ جیسے لوگ بیٹھ چکے ہیں۔ یہاں ایسے مضبوط کیرکٹر کے آدمی تیار ہونے چاہئیں جو کسی مسئلہ شرعی میں فتوے دیتے وقت یا کسی معاملے کا فیصلہ کرتے وقت خدا کے سوا کسی کی طرف نظر نہ رکھیں، کوئی لالچ، کوئی خوف، کوئی ذاتی دلچسپی، کوئی محبت اور کوئی نفرت ان کو اس بات سے نہ ہٹا سکے جسے وہ اپنے علم اور اپنے ضمیر کے لحاظ سے حق اور انصاف کی بات سمجھتے ہوں۔ (اقتباس "تحریک آزادی ہند اور مسلمان" حصہ دوم)

سال بہ سال

محور کا سفر

سال	مدیر اعلیٰ	مجلسِ ادارت
۱۹۵۹-۶۰	احمد یوسفی	ظفر ہمدانی، صدر سلیم
۱۹۶ ۶۱ء	ایس ناگی	نسرین کوثر
۱۹۶۱ ۶۲ء	ریاض حسن کاظمی	ساجدہ پروین
۱۹۶۲ ۶۳ء	امین اعظمی	ہوا انجم، ممتاز منگلوری، وحدت
۱۹۶۳-۶۴ء	فیصل حسین علوی	خالدہ منصور، اسما حامد
۱۹۶۴-۶۵ء	سیدہ ناز کاظمی	ضیا شاہد، عطاء الحق قاسمی، ریحان عمر
۱۹۶۵-۶۶ء	سیدہ ناز کاظمی	خالد سلیم، ریحانہ نور، جاوید عظمت
۱۹۶۶ ۶۷ء	رفیع الدین ہاشمی	عبدالغنی فاروق، عطاء الحق قاسمی، محمد ارشد چوہدری
۱۹۶۷-۶۸ء	امجد اسلام امجد	نرگس پروین، نزہت شاکر
۱۹۶۸ ۶۹ء	اقبال کوثر	جلیل عالی، احمد تبسم
۱۹۶۹-۷۰ء	محمد اجمل نیازی	ممتاز اقبال ملک، مظفر عباس
۱۹۷۰-۷۱ء	ممتاز اقبال ملک	خیر محمد بدھ، محمد سعید
۱۹۷۲-۷۳ء	واحد علی	خالد ہمایوں، ثروت صدیقی
۱۹۷۵-۷۶ء	راشد متین	خالد منصور، یاسمین نیر، انوار قدیر
۱۹۷۶-۷۷ء		

قیادت کا انتخاب

سن	صدر	جنرل سیکرٹری
۱۹۵۸-۵۹ء	محمد حسین	سید اطہر
۱۹۵۹-۶۰ء	جاوید قیوم	مجاہد ترمذی
۱۹۶ - ۶۱	ریاض احمد	زاہد سرفراز
۱۹۶۱-۶۲ء	علی افضل	خالد سرفراز
۱۹۶۲-۶۳ء	محمد عثمان غنی	آغا افضل حسین
۱۹۶۳-۶۴ء	محمد نصر اللہ شیخ	فدا احمد صدیقی
۱۹۶۴-۶۵	حامد احمد	مسعود علی
۱۹۶۵-۶۶	عطاء اللہ	حمید خان
۱۹۶۶-۶۷ء	سید محمد عارف	محی الدین
۱۹۷۰-۷۱ء	حافظ محمد ادریس	عبدالحفیظ خان
۱۹۷۱-۷۲ء	عبدالحفیظ خان	جاوید اختر ہاشمی
۱۹۷۲-۷۳ء	جاوید اختر ہاشمی	پرویز الطاف
۱۹۷۳-۷۴ء	فرید احمد پراچہ	عبدالشکور
۱۹۷۴-۷۵ء	عبدالشکور	سید احسان اللہ وقاص
۱۹۷۵-۷۶ء	مسعود احمد کھوکھر	لیاقت بلوچ
۱۹۷۶-۷۷	لیاقت بلوچ	سید محمد نعیم

KINGDOM OF SAUDI ARABIA

FIRST WORLD CONFERENCE ON MUSLIM EDUCATION

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ

قرآن حکیم

RECOMMENDATIONS

Objectives of the Conference

1 To define the Principles, Aims and Methodology of the Islamic concept of Education

2 To suggest Ways and Means of realizing the above principles in practice

3 To formulate methods of securing mutual understanding and co-operation among Muslim scholars all over the world

I

PREAMBLE

The First World Conference on Muslim Education which met at Hotel Intercontinental Mecca al Mukarramah from 12 to 20 Rabiuthani 1397 A H corresponding to 31 March to 8 April 1977 A D on the invitation of King Abdul Aziz University and under the patronage of His Majesty King Khalid bin Abdul Aziz and the Crown Prince Fahd bin Abdul Aziz

Discussed in the course of a number of sessions the foundations upon which there should be built a sound educational system deriving basically from Islam and committed fully to Islamic concepts and attitudes

And after considering 150 papers presented on the subject by 313 scholars from 40 different countries

Formulated the concepts and attiudes which should inform Islamic education and

Considering the great importance attaching to educaion in the life of a nation

Conscious of the heavy responsibility in the matter of consolidating Islamic solidarity which rests on the shoulders of Muslim scholars the leaders of thought and all those who work in the field of education serve the cause of the Muslim world and advocate full commitment to Islam and believe in the application of the Islamic Shari ah to all domains of life

Recognising that existing conditions in present-day educational institutions in most Muslim countries do not truly reflect the Islamic ideal

And that these institutions do not play their rightful role in the education of the younger generation in Islamic faith thought and conduct

And that there exists at present a regrettable dichotomy in education in the Muslim World one system namely religious education be[ing] completely divorced from the secular sciences and secular educat[ion] being equally divorced from religion although such compartmental[iza]tion was contrary to the true Islamic concept of education and made [it] impossible for the products of either system to represent Islam as a co[m]prehensive and integrated vision of life and

Finally considering the anti religious and often irreligious ideolog[ies] and concepts which have made inroads into secular education — a proc[ess] which is continuing

Made the following recommendations on the concepts and attitud[es] enunciated below

CONCEPTS AND ATTITUDES

The aim of Muslim education is the creation of the good and righ[te]ous man who worships Allah in the true sense of the term builds up t[he] structure of his earthly life according to the Shari ah (law) and employs i[t to] subserve his faith

The meaning of worship in Islam is both extensive and comprehe[n]sive it is not restricted to the physical performance of religious rituals o[nly] but embraces all aspects of activity faith thought feeling and work [in] conformity with what Allah (Praise be to Him) says in the Holy Qur an [I] have created the Jinn and man only to worship Me and Say O my Lo[rd] my prayers my sacrifice my life and my death are for Allah the Lord of t[he] Worlds Who hath no peer

Therefore the foundation of civilization on this earth the exploitat[ion] of the wealth resources and energies that Allah has hidden in its bow[els] the search for sustenance the measures by which man can rise to [the] recognition of the ways of Allah in the Universe knowledge of the prop[er]ties of matter and the ways in which they can be utilised in the service

faith and in the dissemination of the essence of Islam and in helping man to attain to a righteous and prosperous life — all these are considered forms of worship by which scholars and God seekers come into closer contact with Allah. If such is the Islamic concept of worship and if from the Islamic point of view the object of education in the most comprehensive sense of worship is the upbringing of the true believer, it follows that education must achieve two things. First, it must enable man to understand his Lord so that he worships Him in full conviction of His Oneness, observes the rituals and abides by the Shari ah and the Divine injunctions. Secondly, it must enable him to understand the ways of Allah in the universe, explore the earth and use all that Allah has created to protect faith and reinforce His religion in the light of what Allah has said in the Quran

It is He who hath brought you from the earth and made you inhabit and inherit it

Thus the sciences of the Shari ah (Islamic law) meet other sciences such as medicine, engineering, mathematics, psychology, sociology etc. in that they are all Islamic sciences so long as they move within the framework of Islam and are in harmony with Islamic concepts and attitudes. All these sciences are necessary in reasonable degree for the ordinary Muslim while they are in a much more specialized form required and sought by scholars, Mujtahideen and Jurists of the Ummah (the nation).

The Islamic concept of science does not impose any restriction or limitation on theoretical, empirical or applied sciences except for one limitation which pertains to the ultimate ends on the one hand and their actual effects on the other. In the Islamic sense science is a form of worship by which man is brought into closer contact with Allah, hence it should not be abused to corrupt faith and morals and to bring forth harm, corruption, *injustice and aggression*

Consequently any science which is in conflict with faith and which does not serve its ends and requirements is in itself corrupt and stands condemned and rejected and has no place in God s injunctions

Every system of education embodies a particular philosophy which emanates from a particular concept from which it cannot be isolated. We cannot have a philosophy or an educational policy which is based on a concept not identical with the Islamic. This is what is now happening when we apply British, French, American or Russian policies of education because they in the long run conflict with and contradict the Islamic concept

Islam embodies a general and comprehensive concept which sustains a self contained, unique and distinctive educational policy. All we have to do is to base our education on this particular, unique and distinctive concept. When it comes to the means by which this end can be achieved there is no objection whatsoever to the full exploitation of every successful human experiment so long as it is not in conflict with the Islamic concept

The sources of knowledge according to the Islamic concept fall into two categories

(1) Divine revelation where Allah teaches that man cannot by himself be rightly guided to the Divine truth and that life cannot be regulated *in the proper manner in the absence of stable and unchangeable injunc*tions inspired by Allah the Wise and the All knowing whose knowledge encompasses all

(2) The human intellect and its tools which are in constant interaction with the physical universe on the levels of observation, contemplation, experimentation and application. Man is free to do as he pleases subject to the condition that he remains fully committed to the Quran and the Sunnah

On the basis of these concepts and attitudes the conference recommends the following

III

RECOMMENDATIONS

1 Aims of Education

1 1 Education should aim at the balanced growth of the total personality *of Man through the training of Man s spirit, intellect, the rational self*, feelings and bodily senses. Education should therefore cater for the growth of man in all its aspects: spiritual, intellectual, imaginative, physical, scientific, linguistic, both individually and collectively and motivate all these aspects towards *goodness and the attainment of perfection*. The ultimate aim of Muslim education lies in the realization of complete submission to Allah on the level of the individual, the community and humanity at large

1 2 The Conference recommends that all Muslim countries must necessarily implement Allah s Shari ah and mould the lives of people upon Islamic principles and values because only then they shall succeed in systematising their education according to the aims given above

2 Classification of knowledge and the system

2 1 In order to achieve the ultimate aims and objectives of education knowledge be classified into the following two categories

(a) Given perennial knowledge based on the Divine revelation represented in the Quran and Sunnah and all that can be derived from them with emphasis on the Arabic language as the key to the understanding of both

(b) *Acquired knowledge including social, natural and applied sci*ences susceptible to quantitative growth and multiplication, limited variations and cross cultural borrowings as long as consistency with the Shari ah as the source of values is maintained

2 2 *There must be a core knowledge drawn from both with major* emphasis on the first, specially on the Shari ah, which must be made obligatory to all Muslims at all levels of the educational system from the highest to the lowest, graduated to conform to the standards of each level. This along with the compulsory teaching of Arabic should form the major section of the core curriculum. These two alone can sustain Islamic civilization and preserve the identity of the Muslims

3 Curricula and Syllabi: Given perennial knowledge

3 1 Study of the Holy Quran is the basic step in the formation of a Muslim s faith, his ethics, ideas and concepts. Students nowadays memorize small portions of the Holy Quran at different stages of education and therefore when they graduate from the universities, particularly the professional colleges, they find themselves completely unable to recite properly one single Sura *of the Quran or memorize or read it*. The recitation and memorizing of the Quran therefore be made obligatory from the elementary stage of education onwards with gradually increasing emphasis on interpretation and understanding at later stages in order to guarantee that when the student completes his secondary school he will have memorized at least some parts of the Quran and understood their general meaning. More and more Quranic schools be established for boys and girls alike throughout the Muslim world. At the same time at all stages the study and understanding of the Hadith be emphasised

3 2 Religious curricula and religious books should be based on the Quran and the Sunnah and be so formed that Allah s signs in the creation and the miracles of His Apostle Muhammad (peace be on him) are highlighted, the allegations of the enemies of Islam repudiated and the hearts of the young opened to the love and fear of Allah and His Prophet (peace be upon him)

3 3 The study of Fiqh (Islamic jurisprudence) should be linked with and bear on our contemporary life as it is actually lived and experienced and its problems and issues with particular emphasis on Islamic solutions as they must be applied in an integrated form in Muslim society

3 4 The study of the Shari ah with all its related branches should form the core of courses in faculties of law together with comparative studies between Shari ah and secular laws when the need arises. Such courses should be given by a panel of specialists who in virtue of their deep faith and scholarly competence are entitled to elucidate the integral, comprehensive and sublime character of the Shari ah as an effective instrument in serving the interest of the people and meeting the needs of the community and in avoiding the pitfalls arising from the application of secular laws as have been recognised by contemporary capitalist and communist societies alike

3 5 Islamic culture be taught at all stages of education, particularly at the university level and also in military academies and every college and institute in such a way as would meet the needs of students, solve their scientific, ideological and religious problems and provide sufficient and convincing answers to their queries. The study of Islamic culture should demonstrate the greatness of Islam, its comprehensiveness, its sublime values, principles and systems and its salutary influence on the condition of mankind at all times and in all places. Courses on Islamic culture should review the glories of Islamic history in all fields and enumerate the human *material, political, military and cultural accomplishments of the Muslim* peoples which entitle them to be called the best nation ever known to mankind. This would also demonstrate the influence of Islam on oppressive human institutions, past and present, whether political, economic or social, and emphasize aberrations in contemporary civilisation with its capitalist and communist aspects, in contrast to the institutions of Islam

3 6 The Conference urges the necessity of further research into rare manuscripts in order to turn them into useful material for study in legal departments at Islamic universities and to raise the standard of the learner of the Islamic Shari ah. Curricula and plans for higher legal studies should be drawn up to produce men competent enough to assess the sources of the Shari ah and formulate Islamic solutions for all problems with which the world is faced

3 7 *Place of Arabic and its method of Teaching*

The Conference, having noted that the standard of the student in Arabic is extremely poor in Arab and Islamic countries alike, recommends

that extra attention be paid to the Arabic language with all its branches and that it should become a compulsory subject in all countries of the Muslim world. The Conference further recommends that necessary measures be taken to emphasise the place of Arabic in education at all stages particularly in Arab countries and experiments and studies actually undertaken in this field be utilised.

4. Curricula and Syllabi: Acquired knowledge

4.1 **Literature**: The Conference urges men of letters in the Muslim world to establish an Islamic school of literary criticism on the basis of Islamic principles with its own standards of judgement in order to be able to *scrutinize and evaluate literature alien to Islamic thought.*

4.2 **Arts and Crafts**: The Conference draws attention to the necessity of the study of Islamic arts and crafts and the development of Islamic aesthetics.

4.3 **Social Sciences**: Western social sciences be replaced by a newly devised set of social sciences whose concepts are not only not contradictory to Islam but are drawn from the principles to be found in the Quran and the Sunnah. The Conference also recommends that facilities and financial aid be provided to committed Muslim scholars and that the outstanding among them be selected for higher studies. Research by individual scholars as well as by teams should be arranged by institutes and societies for specialised studies established for this purpose, and the preparation and publication begun at once of text books dealing with the Islamic heritage in all fields of social sciences. The Conference would also like the following tasks to be undertaken:

a) Bibliographical indexing of the social sciences,
b) Comparative studies, and
c) Preparation of easy to handle encyclopaedias.

4.4 **Natural Sciences**: Educational curricula in the Muslim world and at all stages should include the study of the history of sciences and knowledge of the role of Muslims in their development with particular emphasis on the scientific achievements of each Muslim country, the significance of Muslim contribution in the scientific field particularly in medicine, astronomy, physics, chemistry and mathematics that led to pioneering work whose research methodology and discovered content and principles were the main basis for further research by European scholars. The cause of the development of the sciences during Islam's heyday and their subsequent decline should be fully investigated. Students should be urged to revive the scientific spirit of their ancestors under whom Islamic sciences flourished.

4.5 **Applied Sciences**: *The Conference recommends that courses in* Natural and Applied Sciences be reformulated in the spirit of Islam in such a manner so as to link them with faith, intensify the religious outlook of the learners and make them appreciative of the greatness of the Creator and His miraculous creativity as Allah says in the Holy Quran: "Only those who know fear Allah." The artificial gap between Shariah sciences on the one hand and the physical and non physical sciences on the other must be removed. Such a gap has resulted from our failure to adopt Islamic methodology in teaching those subjects separately from religion. The Conference urges that the curricula of those sciences and the prescribed text books must be purged of ideas and attitudes which directly conflict with Islamic faith or contradict it. A distinction must be drawn between scientific facts — which are not contrary to Islamic faith and scientific hypotheses and theories which have not been established definitely and which may be contrary to Islam.

On the other hand, the Conference calls for separating the cosmic references in the Quran from modern scientific hypotheses and theories excepting those established definitively as scientific facts. To connect them is no service to the Quran; it leads rather to confusion of thought and faith when some of these hypotheses and theories turn out to be false.

Universities and scientific research centres should be responsible for recording the facts about these sciences, from the Islamic view point, in encyclopaedias so that writers of school books of every kind and level can draw upon and refer to them. The Conference recommends that students of pure and applied sciences should be required to have some knowledge of Shariah sciences and humanities.

5. Education and Society: Non formal Education

5.1 **Mass Media programmes**: The ideal method for consolidating the educational institutions and helping them in the upbringing of the younger generation on sound Islamic lines is the application of Islam in all domains of life. Mass communication media are the most potent instruments which can help schools *perform their functions if they adhere to* Islamic principles, but if they adhere to anti Islamic principles they can equally effectively wipe out any traces of Islamic education.

The Conference requests that all those responsible for the information media in Islamic countries should offer simplified scientific programmes guided by the Islamic spirit which links religion with science and which uses science to strengthen religious consciousness. Serious efforts be made to produce cultural programmes based on Islamic values as substitute for those immoral plays and films, obscene pictures and entertainment subversive of morality that occupy a major place in the present day programmes and films.

5.2 **Architecture, City-Planning and Islamic Atmosphere**

A good and healthy environment outside the limited scope of the school be created and the social atmosphere be purged of alien impurities relating to ideology and values so that there is no conflict between the goals of education and the practice in society. In order to achieve this aim proper care be taken to maintain the Islamic atmosphere in architecture, city planning and the like to ensure that they are guided by Islamic concepts particularly in the holy cities of Mecca al Mukarramah, Al Madina al Munawarah and Jerusalem. The Conference urges King Abdul Aziz University to undertake necessary research in this particular field.

6. Teacher Education and Teacher Recruitment

6.1 Muslim teacher be so trained that their ideas and concepts are inspired by the true Islamic faith and their conduct as individuals and as social beings may be representative of Islamic values and principles in order that they may set the best possible example to their students.

6.2 The selection and appointment of teachers should not be based on their academic qualifications alone but their faith and behaviour must be *taken fully into account.*

6.3 Care be taken to equip teacher training colleges with all necessary aids, tools and facilities for the preparation and education of the good teacher.

6.4 Good and promising students be enrolled at these colleges and scientific incentives and rewards be given to encourage them. Full attention must be paid to the needs of the teacher, and teachers should enjoy material as well as moral prerogative which would help them continue in the teaching profession.

7. Female Education

7.1 As far as female education is concerned, the Conference is of the opinion that the countries which have co-educational systems and where *women are educated according to curricula originally formulated to suit* man's nature and meet his needs, without regard to the delicate nature of women and their individual and social functions, have begun to suffer from the impact of these systems on their communities. The evil consequences of the co educational system consist of moral corruption, family disintegration, inadequacy in the upbringing of the young, truancy among them and their susceptibility to criminal and abnormal tendencies at variance with the Islamic outlook. Hence the Conference recommends that men and women be taught separately.

7.2 *The* Conference recommends that a special female educational system based on carefully considered scientific principles be drawn up. Each stage in such a system should be self sufficient and independent. It shall offer courses which suit the nature of women, fulfil society's needs for female services, realise the objectives of Islam, preserve the ideals of chastity, strengthen family ties and morals, take into account natural and functional specializations and at the same time spread education among women on a wider scale since in Islam the obligation to acquire knowledge devolves on men and women alike.

8. *Non formal Education for Youth*

8.1 Actual application of Islam is absolutely necessary in every school. Therefore, mosques where congregational prayers are conducted and said at their appointed times, should be established in all educational institutions. Islamic behaviour, which condemns lying and teaches honesty, goodness, self-denial, discipline and cleanliness, must be encouraged among pupils. Any pattern of un Islamic social behaviour adopted by teachers and pupils should be rejected and resisted.

8.2 Youth institutions should be encouraged to practise activities suitable for this stage and in line with the objectives of our Islamic society and its present-day circumstances. Programmes should be purged of element alien to Islam and Islamic values.

9. Muslim Minorities

9.1 Thorough studies of the condition of Muslim minorities in non Muslim countries be prepared and educational policies be designed to protect Muslim minorities from liquidation and prevent their isolation from the Muslim world.

The Conference draws attention to the grave and serious situation of Muslims living in Palestine or abroad who receive education at the hands of Zionists or their allies. It urges all Muslim to provide adequate educational facilities for the children of this occupied land in view of the precarious circumstances under which Muslim minorities live, circumstances calling for continued and ceaseless support to them by all Muslim coun-

tries

9 2 A special fund be established for the education of Muslim minorities to which Muslim countries should contribute in order to help these minorities build up Islamic school and institutes in their host country

9 3 Specially trained and qualified teachers equipped with the right cultural and scholarly background suited to the circumstances of the countries where Muslim minorities live should undertake the task of teaching the Arabic language and Islamic culture Muslim minorities in the host countries should also be provided with plenty of school and university textbooks based on Islamic concept

9 4 Muslim countries should mediate between Muslim minorities and their respective host countries with a view to securing to them full rights to establish Islamic schools and persuade their host countries to recognise the degrees and certificates which Islamic schools and colleges award

9 5 Establishment of centres and institutes particularly in Arab countries for the teaching of Arabic to non Arabic speaking Muslims

9 6 Research into the situation of Muslims in non Muslim countries since information about their social cultural religious and educational conditions will be of considerable value in framing an educational policy that will bring the Muslim minorities closer to the Muslim world at large

10 Ban on Missionary activities

10 1 The Conference recommends that Muslims in the Islamic countries should abstain from enrolling their children in foreign or missionary schools in their countries whatever the inducements offered by these schools or their parent bodies and organisations because of their ruinous effects on pupils as regards their beliefs and loyalty to Islam and the Islamic nation as well as the danger arising from attempts by the enemies of Islam to combat Islam from within Islamic society itself

10 2 The Conference further recommends a ban on the establishment of further missionary schools in the Muslim world and urges that measures be taken to close down the existing missionary schools

11 Arabic Script

The Conference stresses the necessity of retaining the Arabic script in which all languages in Muslim countries should be written so that they might not be alienated from the language of the Holy Quran

12 Periodicals

The Conference further recommends that universities and Islamic research centres should undertake the publication of periodicals and papers in foreign languages containing the most important information about Islam published in Arabic and publish in Arabic journals such research published in other languages

13 World Organisation for Education Culture and Science

The Conference recommends that a World Organisation for Education Culture and Sciences be established with headquarters located at Mecca al Mukarrama in order to coordinate the work of universities and Islamic education and scientific institutions and supervise Islamic educational policies

14 World Centre for Islamic Education

The Conference recommends that King Abdulaziz University establish a world educational centre under the name of the World Centre for Islamic Education at Mecca al Mukarrama which would recruit competent scholars from various Muslim countries who are deeply versed in the culture and ideology of Islam and could be entrusted with the implementation of the resolutions of this Conference. Its functions would be as follows

First Drawing up educational policies modelled on the pioneering experiment to be undertaken in the Kingdom of Saudi Arabia which derives its fundamental principles from Islamic sources Detailed curricula for all teaching materials should also be advised and introduced in schools and universities Textbooks suitable for all levels of education from the kindergarten up to the university should be written For this purpose a central research library should be established with a documentation centre attached to it

Second The documentation centre should include a translation bureau mainly charged with the task of providing translation of the Quran which are lucid and easy to understand and completely free from the errors noticeable in the existing translations The translation bureau should also undertake the translation of books written in Arabic which deal with Islam into the languages of non Arab Muslims Useful Islamic books written in foreign languages should also be translated into Arabic

The Conference recommends that the translation bureau to be attached to the Education centre should immediately undertake the preparation and publication of translations into Arabic of work on science written in foreign languages particularly works embodying the latest achievements in this field

Third Drawing up a policy of cooperation among all scholars working in the field of Islamic education coordinating the work of Muslim states and institutions in the field of education and facilitating the accessibility and exchange of necessary documents and data

15 Implementation in Muslim countries

15 1 The Conference recommends that those Muslim countries which are in possession of material resources and manpower expertise should come forward with a pioneering experiment in the field of Islamic education that would serve as a model to be used by other Muslim countries when they try to put the resolutions of this Conference into effect

15 2 As the acquisition of knowledge in Islam is the duty of every individual Muslim in the sense that it will lead him to his Creator enable him to perform all rituals of worship enjoined upon him and make him adhere to Shariah in his dealings and actions the Conference recommends that all Muslim countries make education at all stages freely available and provide equal opportunities for all citizens throughout the Muslim World

15 3 The Conference urges Ministers of education and all supervisory staffs to plan and build educational establishments on the Islamic architectural pattern that will fulfil the needs of the local environment and contemporary requirements

15 4 Efforts should be made to stop the brain drain from the Muslim world and various incentives should be offered to expatriates to return to their respective Islamic countries

15 5 The Conference recommends reliance on the genuine Islamic experience in unifying Islamic studies in universities colleges and institutions in the Islamic countries and urges that help should not be sought in this regard from individuals bodies and institutions which neither rely on Islamic sources nor act on clear Islamic lines

15 6 The Conference recommends that opportunities be provided for people who have received special Islamic education to work in various fields of life

15 7 Facilities for studies overseas should be offered only to those who wish to specialise in certain subjects since students sent overseas are exposed to threats to their beliefs morals traditions and values The Conference recommends that students going overseas should receive moral and religious care and that they should be selected on the basis of their religion and morals not their scholarly distinctions alone Strenous efforts should be made to create all specializations in the Muslim world as a preliminary step to a complete stoppage of overseas scholarships unless absolutely necessary

16 World Union of Islamic and Arab Schools

The Conference is of the opinion that the establishment of the World Union of Islamic and Arab schools is a good initiative which deserves encouragement and puts on record its thanks to the Government of Saudi Arabia for their continued support of this union

17 Group Recommendations

The recommendations agreed upon by the three groups are to be issued by the Conference after being studied and finalised by the drafting committee and will constitute an integral part of the Conference s recommendations provided that they are in harmony with the objectives of the Conference

18 Proceedings and Papers

In view of the great value of the papers presented to this Conference and the serious discussions carried on among Muslim scholars specialised in various fields of education the Conference recommends that the Implementation Committee publish at once the complete proceedings of the Conference so that Muslim countries and Islamic educational institutions might benefit from them when designing an educational system on the basis of Islamic principles Until the Islamic Educational Centre comes into being the Conference recommends that the Organising Committee be transformed into a Follow up committee entrusted with the implementation of the Conference s resolution

19 Vote of Thanks

The Conference expresses its deep and heart felt thanks to the Kingdom of Saudi Arabia for convening this Conference the first of its kind to discuss the basis upon which an integrated self-contained Islamic educational system is to be built The Conference also extends its thanks to King Abdulaziz University for taking this good initiative and using it in the service of Islamic Da wa and the interest of all Muslims

فقہ مالکی پر ——— "المدونہ" اور کوئی اہم کتاب جس کا اہل علم انتخاب کریں۔

فقہ حنبلی پر ——— ابن قدامہ کی "المغنی"

فقہ ظاہری پر ——— ابن حزم کی "المحلی"

مذاہب اربعہ پر ——— ابن رشد کی "بدایۃ المجتہد" اور علماء مصر کی مرتب کردہ "الفقہ علی المذاہب الاربعۃ"

نیز ابن القیم کی "زاد المعاد" میں سے وہ حصے جو قانونی مسائل سے متعلق ہیں

معاشی مسائل پر ——— امام ابو یوسف کی کتاب "الخراج" یحییٰ بن آدم کی "الخراج" ابو عبید القاسم کی "کتاب الاموال"، ہلال بن یحییٰ کی "احکام الوقف" ومیاطی کی "احکام المواریث"

۴۔ پھر ہمیں اصول قانون اور حکمت تشریع کی بھی چند اہم کتابوں کو اردو کا جامہ پہنانا چاہیے تاکہ ان کی مدد سے ہمارے اہل قانون میں اسلامی فقہ کا صحیح فہم اور اس کی روح سے گہری واقفیت پیدا ہو۔ میرے خیال میں اس موضوع پر یہ کتابیں قابل انتخاب ہیں

ابن حزم کی "اصول الاحکام" علامہ آمدی کی "الاحکام لاصول الاحکام" خضری کی "اصول الفقہ" شاطبی کی "الموافقات" ابن القیم کی "اعلام الموقعین" اور شاہ ولی اللہ صاحب کی "حجۃ اللہ البالغہ"

ان کتابوں کے متعلق میں صرف اتنا ہی نہیں کہتا ہے کہ محض ان کے ترجمے اردو زبان میں کر ڈالے جائیں، بلکہ ان کے مضامین کو موجودہ زمانے کی قانونی کتابوں کے طرز پر از سر نو مرتب بھی کرنا ہوگا، نئے عنوانات قائم کرنے ہوں گے، منتشر مسائل کو ایک ایک عنوان کے تحت جمع کرنا ہوگا، فہرستیں بنانی پڑیں گی، اور انڈکس بنانے ہوں گے کیونکہ اس کے بغیر یہ کتابیں آج کل کی ضروریات کے لیے پوری طرح کارآمد نہ ہو سکیں گی۔ قدیم زمانے کا طریق تدوین کچھ اور تھا، اور اس زمانے میں قانونی مسائل کے لیے اتنے مختلف عنوانات بھی پیدا نہیں ہوئے تھے جتنے آج پیدا ہو گئے ہیں۔ مثال کے طور وہ لوگ دستوری قانون اور بین الاقوامی قانون کے لیے کوئی الگ نام نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کے مسائل کو وہ نکاح، خراج، جہاد، امارت اور میراث کے ابواب میں بیان کرتے تھے۔ فوجداری قانون ان کے ہاں کوئی الگ عنوان نہ تھا، بلکہ اس کے مسائل حدود، جنایات اور دیات کے مختلف عنوانوں میں تقسیم کر دیے جاتے تھے۔ دیوانی قانون کو بھی انہوں نے الگ مرتب نہیں کیا تھا، بلکہ ایک ہی مجموعہ قوانین میں بہت سے عنوانات کے تحت اس کو جمع کر دیا تھا۔ مالیات اور معاشیات وغیرہ نام ان کے ہاں نہ تھے۔ اس سلسلے کے مسائل کو وہ کتاب البیوع، کتاب الصرف، کتاب المضاربہ اور کتاب المزارعۃ وغیرہ عنوانات کے تحت۔ اسی طرح قانون شہادت، ضابطہ دیوانی، ضابطہ فوجداری اور ضابطہ عدالت وغیرہ جدید اصطلاحیں ان کے ہاں نہیں بنی تھیں۔ ان قوانین کے مسائل ان کی کتابوں میں آداب القاضی، کتاب الدعویٰ، کتاب الاکراہ، کتاب الشہادات اور کتاب الاقرار وغیرہ عنوانات کے تحت ملتے ہیں۔ اب اگر یہ کتابیں جوں کی توں اردو میں منتقل کر لی جائیں تو ان سے کماحقہٗ فائدہ اٹھانا مشکل ہے۔ ضرورت ہے کہ کچھ قانونی نظر رکھنے والے اہل علم ان پر کام کریں اور ان کی ترتیب بدل کر ان کے مواد کو جدید طرز پر مرتب کر ڈالیں، اور بالفرض اگر یہ بہت زیادہ محنت طلب کام نظر آئے، تو کم از کم اتنا تو ضرور ہی ہونا چاہیے کہ ان کی پرانی ترتیب ہی کے ساتھ شائع کی جائیں اور مختلف قسم کے انڈکس بنا دیے جائیں جن کے ذریعے سے ان میں مسائل کا تلاش کرنا آسان ہو جائے

تدوین احکام

اس سلسلے کا دوسرا اہم کام یہ ہے کہ ذی قدر علماء اور ماہرین قانون کی ایک ایسی مجلس مقرر کی جائے جو اسلام کے قانونی احکام کو جدید دور کی کتب قانون کے طرز پر دفعہ وار مدون (CODIFY) کر دے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے قانون کا اطلاق ہر اس قول پر نہیں ہوتا جو کسی فقیہ یا امام مجتہد کی زبان سے نکلا ہو یا کسی فقہی کتاب میں لکھا ہوا ہو۔ قانون صرف چار چیزوں کا نام ہے

۱۔ کوئی حکم جو قرآن میں اللہ تعالیٰ نے دیا ہو

۲۔ کسی قرآنی حکم کی تشریح و تفصیل، یا کوئی مستقل حکم جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو۔

۳۔ کوئی استنباط، قیاس، اجتہاد یا استحسان جس پر اُمت کا اجماع ہو یا جمہور علماء کا ایسا متفق ہو جسے ہمارے ملک کے مسلمانوں کی عظیم اکثریت تسلیم کرتی رہی ہے۔

۴۔ اسی قبیل کا کوئی ایسا امر جس پر ہمارے ملک کے اہل حل و عقد کا اب اجماع یا جمہوری فیصلہ ہو جائے

ہماری تجویز یہ ہے کہ پہلی تین قسموں کے احکام کو ماہرین کی ایک جماعت ایک مجلّۂ احکام (CODE) کی شکل میں مرتب کر دے۔ پھر جو جو قوانین آئندہ چوتھی یا جمہوری فیصلوں سے بنتے جائیں ان کا اضافہ ہماری کتاب آئین میں کیا جاتا رہے۔ اگر اس قسم کا ایک مجلّۂ احکام بن جائے، تو اصل قانون کی کتاب وہ ہوگی، اور باقی تمام فقہی کتابیں اس کے لیے شرح (COMMENTARY) کا کام دیں گی۔ نیز اس طرح عدالتوں میں قانون اسلامی کی تنفیذ اور کالجوں میں اس قانون کی تعلیم بھی آسان ہو جائے گی۔

قانونی تعلیم کی اصلاح

اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اپنے ہاں قانون کی تعلیم کا سابق طریقہ بدل دیں اور اپنے لاکالجوں کے نصاب اور طریق تدریس میں ایسی اصلاحات کریں جن سے طلبہ اسلامی قانون کی تنفیذ کے لیے علمی اور اخلاقی، دونوں حیثیتوں سے تیار ہو سکیں

اس وقت تک جو تعلیم ہماری قانونی درسگاہوں میں دی جا رہی ہے، وہ ہمارے نقطۂ نظر سے بالکل بیکار ہے۔ اس سے فارغ ہو کر نکلنے والے طالب علم صرف یہی نہیں اسلامی قانون کے علم سے بے بہرہ ہوتے ہیں، بلکہ ان کی ذہنیت بھی غیر اسلامی افکار کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے اور ان کے اندر اخلاقی صفات بھی ویسی ہی پیدا ہوتی ہیں جو مغربی قوانین کے اجرا کے لیے موزوں ترین مگر قوانین اسلامی نافذ کرنے کے لیے قطعاً غیر موزوں ہیں۔ اس صورت حال کو جب تک ہم بدل نہ دیں گے اور ان درسگاہوں میں اپنے معیار کے مطابق پیدا کرنے کا انتظام نہ کریں گے، ہمارے وہ آدمی فراہم ہی نہ ہو سکیں گے جو ہماری عدالتوں میں قاضی اور مفتی کے فرائض انجام دینے کے لائق ہوں۔

اس مقصد کے لیے جو تجاویز میرے ذہن میں ہیں، وہ میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ دوسرے اہل علم بھی ان پر غور کریں اور ان میں اصلاح و اضافہ فرمائیں تاکہ ایک جامع اور قابل عمل اسکیم بن سکے

● سب سے مقدم اصلاح یہ ہونی چاہیے کہ آئندہ سے لاکالجوں میں داخلہ کے لیے عربی زبان کی واقفیت ——— اتنی واقفیت جو قرآن، حدیث اور فقہ کا مطالعہ کرنے کے لیے کافی ہو ——— لازم قرار دی جائے۔ اگرچہ ہم اسلامی قانون کی پوری تعلیم اردو میں دینا چاہتے ہیں اور اس فن کی تمام ضروری کتابوں کو بھی اردو میں منتقل کر لینا چاہتے ہیں لیکن اس کے باوجود عربی زبان کے علم کی ضرورت پھر بھی باقی رہے گی اس لیے کہ اسلامی فقہ میں بصیرت بہرحال اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک آدمی اس زبان سے واقف نہ ہو جس میں قرآن نازل ہوا ہے اور جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کلام فرمایا ہے۔ ابتداءً نہیں لاکالجوں کے لیے عربی دان مہیا کرنے میں دشواری پیش آتی ہی ممکن ہے اس غرض کے لیے ہم کو چند سال تک ہر لاکالج میں ایک مستقل کلاس عربی تعلیم کے لیے کھولنی پڑے اور شاید تعلیم قانون کی مدت میں ایک سال کا اضافہ بھی کر دینا پڑے، لیکن آگے چل کر جب ہمارے پورے نظام تعلیم میں عربی بطور ایک لازمی زبان کے شامل ہو جائے گی، تو لاکالج میں داخلہ کے لیے جو گریجوایٹ بھی آئیں گے، وہ پہلے ہی عربی زبان سے بخوبی واقف ہوں گے

● عربی زبان کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ قانون کی تعلیم شروع کرنے سے پہلے طلبہ کو قرآن اور حدیث کے براہ راست مطالعہ سے دین کا مزاج اور اس کا پورا نظام اچھی طرح سمجھا دیا جائے ہماری عربی درسگاہوں میں بھی ایک مدت دراز سے یہ غلط طریقہ چلا آرہا ہے کہ تعلیم کی ابتداء

(باقی صفحہ ۳۴۳ پر ملاحظہ فرمائیں)

پیارے بیٹے!

اب کہو کہ تم کہاں رہو گے اور کیا کرو گے ..... ناگفت گفت سے مر جاؤ گے۔ یا پھر مرغ بادنما کی طرح ہوا کے رُخ پیچھے لگو گے بیٹو ... مجھے کیا ملا بہادرا باپ بن کر اور تمہیں کیا ملا مرا ملیاس کر ... !

قوم کے لاکھوں بچوں میں سے تم ایک ہو میں لاکھوں کو چھوڑ کر ایک کا کیسے ہو رہوں یہ تو اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ ہمارے اوپر ایک خالص اسلامی حکومت موجود ہو اسلامی معاشرہ تشکیل ہو چکا ہو وہ ایک بہترین طاقت ور اجتماعی مرکز ہو اس کی موجودگی میں ہم اپنی انفرادی تعمیر میں حصہ لے سکتے ہیں بلکہ اس وقت جو کرنے والے کا کام بھی یہی رہ جاتا ہے کہ ہر آدمی اپنے اپنے کام لگ جائے تو مکر ... کے کاموں کا نتیجہ ایک جیب نکلتا ہے اس سے سب کا کام ایک ہی کھاتے میں جمع ہو جاتا ہے!

میرے لخت جگر!

میں تمہارے لئے وہ صبح بہار لا رہا ہوں جس میں کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ شگوفے کھلتے ہیں، کلیاں پھول بنتی ہیں اور شجر پھولوں میں پھل لگتے ہیں ... تم کئی دوسروں کے حل میں اگر حل کئے ہو جب تک اسلام آزاد نہیں ہوتا میری فکر بھی حل جاتی ہے یا اسلام کو آزاد کر کے چھوڑوں گا یا عمر جو رکھی اسلام کے ساتھ پیدا وعدہ قبول کئے رکھوں گا!

میں نے تمہیں اپنی منزل اور اپنی راہ دکھا دی ہے۔ اگر مجھے جانشین بننا چاہو تو ابھی سے اس راہ کی تیاری کرنا شروع کر دو

۹ ہر فرعون کے لئے ایک موسیٰ ہے اور ہر موسیٰ کے لئے ایک فرعون ہے اور موسیٰ کامیاب رہا ہے اپنے رب کے فضل و کرم سے اور فرعون ڈوب مرا اپنے رب کی نافرمانی سے ... !

اپنی والدہ کی خدمت کرو بہن بھائیوں سے لڑائی جھگڑا نہ کیا کرو، تعلیم میں محنت کرو۔ اپنے اندر اچھے اخلاق پیدا کرنے کی کوشش کرو!

ترکی اور تعلیم کے لئے میں تمہیں وہی نصیحت کرتا ہوں جو حضرت لقمان نے اپنے لڑکے کو کی تھی اور وہ نصیحت خدا کو اسی پسند آئی کہ اس نے اسے آخری کتاب میں درج کیا اچھی طرح سنو اور اس پر اسے عمل کی بنیاد بناؤ

۱: خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو ... اس کی ذات، صفات، حقوق و اختیارات میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے!

۲: خدا کا شکر ادا کرو!

۳ اپنے والدین کی احسان فراموشی نہ کرو کہ انہوں نے تمہیں جنا، پالا پوسا اور تعلیم و تربیت کا بندوبست کیا خدا کے بعد والدین کا حق سب سے بڑا حق ہے ... لیکن اگر والدین کے حقوق خدا کے حقوق سے ٹکرا جائیں پھر اللہ کا حق باقی رہ جانے والا ہے اس کے سامنے حقوق ہیچ ہیں!

۴ جو لوگ اللہ کی طرف جانے والے راستہ پر چلیں، ان کا ساتھی بنا کہ یہی کامیابی کی راہ اور منزل مراد ہے!

۵ چھپے ہوئے اور ظاہر ہر حال میں خدا سے ڈرتے رہو، کیوں کہ ہر چھوٹا بڑا کام اس کی نگاہ میں ہے اور وہ قیامت کے روز ان کا ٹھیک ٹھیک بدلہ دے گا!

۶ نماز کی پابندی رکھنا کیوں کہ نماز برے کاموں سے روکتی ہے اور اس کے ذریعے بندے کے نفس کی صفائی ہوتی ہے اور اپنے رب کے حضور اظہار بندگی کا موقع ملتا ہے!

۷ خدا کے بندوں کو نیکی کی تلقین کرنا اور برے کاموں سے روکنا یہ بہت بڑی بات ہے ہر وہ کام نیکی ہے جس کا اللہ اور اس کے رسولؐ نے کرنے کا حکم دیا ہے ہر وہ برائی اور منکر ہے جس کے کرنے سے خدا اور اس کے رسولؐ نے منع کیا ہے اس پر تم خدائی فوجدار بن کر کھڑے ہو جاؤ اپنی زبان، دل اور ہاتھوں سے جیسا موقع پاؤ جیسے حالات ہوں ..... کام لو ... !

۸۔ راہ حق میں مشکلات اور مصائب پر صبر کرو اس لئے کہ بے صبری ایک مومن کے عزم و ہمت اور مقام سے فروتر ہے۔ بلکہ صبر نہ کرنا سخت ناشکری ہے اور بعض اوقات اس کی شدت کفر تک پہنچا دیتی ہے۔

۹: لوگوں سے محبت اور شفقت سے پیش آنا ہر وقت غرور یا تعلی سے منہ سکوڑ کے نہ پھرنا اور گال پھلائے نہ رہنا!

۱۰ زمین پر ایک مسلم، مومن کی چال چلنا یعنی ایک بندے کی طرح عجز و انکساری فروتنی اور خاکساری کی چال چلنا، وقار سے قدم جما کر چلنا، زمین پر پاؤں مار مار کر اکڑ کر چلنا، غرور و تکبر کی چال ہے۔ خدا کے مطیع و فرمانبردار بندوں کی چال کو پسند نہیں کرتا!

۱۱ کسی کے ساتھ کلام کرتے وقت خوش خلقی، متانت، آہستگی اور نرم زبانی کا رویہ اختیار کرنا زور سے آواز نکالنا، چیخ چیخ کر رعب ڈال کر باتیں کرنا اللہ کو پسند نہیں ہے، اس لئے کہ اونچی آواز گدھوں اور بے عقلوں کی آواز ہے علی اور خدا کی ناپسندیدہ زبان اور آواز ہے!

فی الحال اسی پر قناعت کرو۔ اور اسی پر عمل کرو!

میں چاہتا ہوں کہ تم دین اور دنیا دونوں شعبوں میں اعلیٰ تعلیم پاؤ اسلام کی اعلیٰ اقدار و روایات کے مطابق تمہاری تربیت ہو ... تمہیں معلوم ہے کہ میں نے تمہارا نام کس ذات مبارک کے نام پر رکھا ہے اس لئے خدا اور رسولؐ کے احکام و فرمان کے بعد ہمیشہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی سیرت کو سامنے رکھنا یہ تمہارے لئے آئینہ ہے!

والسلام
مدثر احمد (ڈاکٹر)

ڈسٹرکٹ جیل، ڈیرہ غازی خان

۲ جون ۱۹۶۴ء معتقبہ

پیارے عمار دل!

تم پر خدا کی طرف سے رحمت اور سلامتی ہو!

بیٹا! تمہارا سچا اور تمہاری تڑپ اور ہمیشہ تمہاری خوش آئند علامت ہے اور تمہاری پیدائش سے پہلے سب اہل خانہ تم دونوں بھائیوں کی پیدائش سے مایوس تھے کیوں کہ تمہاری بہنوں کا سلسلہ اس طرح لگاتار باقاعدگی سے چلا کسی کو امید نہ تھی!

اصل قصہ میں تمہیں بتاؤں

تمہارے دادا جان کی اولاد میں ..... میں سب سے بڑا ہوں ..... ہمارے والد محترم ہم سے دور اپنی قیام گاہ میں تشریف رکھتے ہیں اور سب سے اکثر چھوٹے بھائی میرے پاس ڈیرہ غازی خان میں تھے۔ ایک دن مجھے خیال آیا کہ اگر میرے ہاں کوئی لڑکا پیدا ہو جائے تو پھر میری ساری توجہ اس کی طرف نہ ہو جائے اور میرے چھوٹے بہن بھائی مناسب تعلیم و تربیت نگرانی اور سرپرستی سے محروم نہ رہ جائیں، اس لئے میں نے ایک دن مناجات میں آکر اپنے اللہ

سے ایک دُعا مانگ ڈالی کہ

"اے اللہ! جب تک میرے یہ بھائی تربیت پاکر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہ ہو جائیں تو مجھے بیمار نہ دینا!"

حسن اتفاق والد صاحب مرحوم کی وفات کے بعد میں نے اپنی اس دُعا کو پھر دہرایا۔ میرا یہی خیال ہے کہ خدا کے ہاں میری دُعا قبول ہوئی۔ اس لئے تم دونوں بھائیوں کی اس دنیا میں آمد بڑی تاخیر سے ہوئی۔ تمہارے بڑے بھائی کی پیدائش کے وقت میں اور تمہاری والدہ جیل میں تھے۔ خالانکہ میں اس سال میں مسجد میں اعتکاف کی غرض سے مقیم تھا کیونکہ یہاں تنہائی سکون اور اطمینان کوئی نصیب ہوتا ہے۔ ابوبکر کی پیدائش پر سب سے زیادہ خوشی تمہاری دادی نے کی۔ ہر خوشی کا حال مختلف ہے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ پیدائش پر خوشی اور موت پر رنج سب کو ہوتا ہے۔ پس زندگی کے عام معمولات کی طرح انہیں بھی قیاس کر لیتا ہوں۔ اور پھر ابوبکر اور تمہاری پیدائش پر خوشی کو ہر لہر کے پیچھے ذمہ داری، تعلیم و تربیت کا احساس، بگڑے ہوئے حالات میں تمہارے مستقبل کی فکر اور پھر سب سے زیادہ وہ تلخ تجربات جو مجھے دوسرے بچوں یعنی تمہارے بھائی بہنوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں ہو چکے ہیں۔ میرے بڑے بیٹے وہی ہیں، اور تم جیسے ہی تھے۔ ان کی اطاعت و فرمانبرداری اور خدمت گزاری کی طرف سے مجھے کوئی شکایت نہیں رہی۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی خوش نصیب کی اولاد اتنی اچھی ہوگی جتنی یہ میری معنوی اولاد میرے بھائی ہیں۔ لیکن میری ساری کوششوں کے باوجود مجھے میرے اصل مقصد حیات سے بیگانہ رہے۔ ان کی تعلیم و تربیت کے لئے جو کچھ ہو سکا میں نے کیا۔ میں کوئی رئیس تو تھا کہ اپنے ان بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے کوئی بڑا اہتمام کرتا۔ یہ بھی جو کچھ مجھ سے ہوا میں نے دریغ نہ کیا لیکن مجھے ہمیشہ اس بات کا افسوس رہے گا کہ میں اپنے اصل مقصد میں کامیاب نہ ہوا۔ میں ان بچوں کو اپنے مقصد حیات سے روشناس نہیں کرا سکا اور انہیں اس پر مطمئن نہیں کر سکا۔

سوچ کر کے بعد میں اب ہر کسی سے مایوس ہو جاتا ہوں۔ اسی وجہ سے ابوبکر اور تمہاری پیدائش پر مجھے حقیقی خوشی نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ تم پڑھ لکھ کر اگر ملک اور قوم کے ایک اعلیٰ یا ادنیٰ (جیسی تمہاری قسمت یا حالات ہوں گے) لیلیم یافتہ افراد میں ایک دو کا اضافہ کرو گے، جس تعلیم کو پانے کے بعد تم اپنے بزرگوں کو مولوی اور خدا اور اس کے رسولؐ سے ناآشنا دین، آخرت، قرآن، حدیث اور وحی الٰہی سے روگرداں ہو جاؤ گے۔ اور اس سب کچھ کے ساتھ ساتھ تم دنیاوی نقطۂ نظر سے بلکہ ان کے دور جاہلیت یا صدر بھی بن جاؤ تو مجھے کیا خوشی ہوگی! میں ڈرتا ہوں کہ آج لوگ پڑھ لکھ کر ہی بگڑتے ہیں اور جو نہیں بن سکتے وہ ایسا کرنے کے ارمان میں گھل گھل کر مر جاتے ہیں!

مجھے تو ایسی اولاد چاہئے جو مجھ کو دیکھے نہ لکھے ہات اور دیانت کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ وہ محض رب کے لئے اپنے عمر کے سو دے رچکائے۔ مجھے ایسے بچے چاہئیں جو خدا کے دین کا پیغام لے کر نکلیں گے، فرزانوں دیوانوں اور میرے ہیں، جو اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلیں تاکہ وہ کسی جگہ اسلامی نظام کو قائم کرنے کے لئے کل پڑیں۔ میں اسی لئے خدا کو دکھ پہنچا کر صاحب منصب و جاگیر ہو جائیں جس بات کو ہزار درجہ پسند کرتا ہوں اور خدا سے اس کی آرزو کرتا ہوں کہ میری اولاد یہ مجھے نہیں تو تم قید و بند کی آزمائشوں میں جائے اور پھر خدا کے فضل و کرم سے کامیاب اپنی منزل تک پہنچے۔ راہ حق میں اپنے عزیزوں کی قیادت ہزار درجہ پسند اور اس راہ میں پھانسی پا جانا لاکھ درجہ محبوب ہے!

فاروق بیٹا!

جس باپ کے عزائم اور ارادے ایسے خطرناک ہوں، اس کے بیٹوں کو ابھی تک سوچ لینا چاہیے کہ اگر وہ باپ کی پسندیدہ راہوں پر چلنا چاہتے ہیں تو یہ راہ کانٹوں کی راہ ہے لیکن اس پر چل کر تم ایک سرسبز و شاداب باغ میں پہنچو گے جو ہمیشہ ہی پھلا پھولا رہے گا جس میں دودھ کی نہریں بہتی ہیں، جس پر کبھی خزاں نہیں آئے گی اور تم وہاں سے نکالے بھی نہیں جاؤ گے اور جس نے کانٹوں کی اس راہ سے کنارہ کشی کی وہ کبھی بھی جنت نعیم میں داخل نہیں ہو سکے گا!

پیارے عمر فاروق!

تمہارے بھائی کی پیدائش سے پہلے میں نے تمہاری والدہ کو نام لکھ کر دے دیا تھا۔ اور پھر میں نے اس کی پیدائش کے بعد جب اس کا نام محمد ابوبکر صدیق رکھا تو لوگوں کو بہت حیرت ہوئی۔ کیونکہ صدیق تو نام عام ہے البتہ ابوبکر خال خال نام رکھے جاتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ لوگوں کے نزدیک نام کی قدامت ہے دوسرے ہر ایک کے اپنے اپنے نام اور معروفات ہوتے ہیں!

بہر حال نام رکھ کر جب اعتکاف کے دنوں میں مَیں نے اپنے بزرگ ملک تصوف کی زبان میں پیر و مرشد حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی خدمت میں ابوبکر کی پیدائش کی خبر بھی اور ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ابوبکر کے دوسرے بھائی بھی دیئے تو ان کے نام عمر فاروق، عثمان غنی اور علی حیدر رکھوں گا تو مولانا نے دُعا فرمائی کہ تم نے ساری خلافت راشدہ پوری کر دی۔ ہر ایک کے لئے انہوں نے دعا فرمائی۔ اسی منصوبے کے تحت جب تم پیدا ہوئے تو نام پہلے سے موجود تھا اور تم عمر فاروق کہلائے۔

پیارے بیٹے!

تمہاری طبیعت اور مزاج مجھے بہت ہی پسند ہے۔ تمہارا ہر وقت صاف ستھرا، خوش رہنا، چمکدار آنکھیں، کشادہ پیشانی اور اس کے پیچھے میں، اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دینا، اپنے حصے کی چیزوں کو دوسروں کو دے دینا بہت ہی خوش آئند علامت ہے۔

خدا کرے تم اپنے بزرگوں کی توقعات کے مطابق تعلیم و تربیت پا جاؤ۔ تمہارے نیک اور صالح اسلاف کے خلف الرشید ثابت ہو۔ تمہارے دادا جان اپنے دور کے بہت بڑے بزرگ تھے بظاہر سادہ سے زمیندار دکھائی دیتے تھے لیکن جن لوگوں نے ان کے سینے میں جھانک کر دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ مرد درویش، آزادی، خودداری، حلم، توکل اور تسلیم و رضا کے پیکر تھے۔ ساری عمر غریبوں اور ضرورت مندوں کی خدمت میں گزاری۔ لوگ بزرگوں کی زندگی میں کرامات تلاش کرتے پھرتے ہیں لیکن ان کی ساری زندگی کرامت تھی۔ مخلوق خدا کی جان، مال، عزت و آبرو کے محافظ تھے۔ حکام اور بڑے آدمیوں سے ہمیشہ کنارہ کش رہے۔ غریبوں اور عام لوگوں سے ہمیشہ شفیق بھائیوں اور کریم بزرگوں کی طرح ملتے رہتے۔ بیٹا ان کی کس کس نیکی کا ذکر کروں۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو۔ ان کی لغزشوں کو معاف کرے!

بیٹا فاروق!

تم یہ کبھی فراموش نہ کرو کہ تم کس کی اولاد اور کس کی اخلاف ہو۔ اور پھر تمہارا نام کس بزرگ ہستی کے نام پر رکھا گیا ہے۔ گو تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے کہ لوگوں نے محمدؐ اور احمد نام رکھ کر محمدؐ، احمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین و شریعت کی بیخ کنی کی۔ بعض نے بزرگ لوگوں کے نام کا توڑ کیا۔ لیکن پھر بھی نام، خاندان، قوم، ملک اور علاقہ بھی ایسے فیکٹر (FACTOR) ہیں جو آدمی کی اٹھان پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسی لئے حضور پاکؐ نے مسلمانوں کو اچھے اچھے نام رکھنے کی تلقین فرمائی تھی تاکہ نام لیتے ہی ایک اچھا تصور قائم ہو۔

تم جیل میں آکر کچھ باتیں مجھ سے مل گئے ہو۔ خدا کرے کہ راہ حق کی یہ منزل تمہیں یاد رہے!

اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو!

ڈسٹرکٹ جیل ڈیرہ غازی خان

والسلام

مدیر احمد (ڈاکٹر)

---

۲۱ جون ۱۹۶۴ء اتوار

"مشرقی پاکستانی کمانڈوز"

"البدر" میں صرف وہ وفادار محبِ وطن اور سرگرم پاکستانی نوجوان شامل تھے جنہوں نے خود کو پاکستان کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ "البدر" کے رضاکار زیادہ پرجوش تھے جنہوں نے دل و جان سے پاک افواج کے ساتھ تعاون کیا انہوں نے ہمیں کبھی دغا نہیں دی، کبھی فریب نہیں کیا، ہمارا ساتھ چھوڑ کر وہ کبھی باغی سے نہیں ملے، ہمارے دشمن سے کبھی سازباز نہیں کی۔ مجھے اپنے کمانڈوز کو دشمن کے علاقے میں بھیجنے کی اجازت نہ تھی، چنانچہ دشمن کی سرزمین میں یہ کارروائیاں اکثر و بیشتر "البدر" کے رضاکار کیا کرتے تھے انہوں نے اگرتلہ کے ایک تھیٹر میں بم پھینکے تھے اور اس واقعے سے بھارتی شہریوں کا حوصلہ پست ہوگیا تھا بہت سے لوگ اگرتلہ سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے اس واقعے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اگر مجھے سرحد پار کمانڈو بھیجنے کی اجازت ہوتی تو دشمن کے لیے اس کی اپنی سرزمین پر مسائل پیدا کیے جا سکتے تھے ان جوانوں نے کلکتہ میں بھی ایسی ہی کارروائی کی تھی جس کی تفصیلات مجھے ٹھیک طرح سے اب یاد نہیں رہیں۔

مشرقی پاکستان کے ان تمام رضاکاروں اور اسلام پسند جانبازوں کی خدمت میں مجھے بس یہی کہنا ہے۔

آں گروہے کہ از ساغر وفا مستند
سلام ما برسانید ہر کجا ہستند

ہمارے رضاکاروں کو جدید اسلحہ سے لیس نہیں کیا گیا تھا، ہمارے پاس ہتھیاروں کی کمی تھی، یہاں تک کہ ہمیں سول آرمڈ فورسز کے لیے بھی ٹھیک طرح اسلحہ سپلائی نہ ہوا تھا۔ بعض رضاکاروں کو تو ہم نے بامر مجبوری بارہ بور کی شاٹ گنیں دیں۔ رضاکاروں کا تو کیا ذکر میری اپنی آرٹلری میں بھی شدید قلت تھی وہ چار تھی تو کچھ تھوڑا بہت ہمارے پاس موجود تھا، اسی سے کام چلانا پڑا اور ہمارے ایک آرٹلری رجمنٹ کو ۳،۷ ہاؤٹزر سے مسلح کیا گیا جنہیں دوسری جنگ عظیم (۴۵-۱۹۳۹ء) میں بھی فرسودہ تصور کیا جاتا تھا یہ گنیں صوبہ سرحد میں قبائلیوں کے خلاف استعمال ہوئی تھیں آپ خود ہی اندازہ کیجئے کہ ہم نے ان فرسودہ ہتھیاروں کے ساتھ جدید جنگ لڑی ہے اور بھی دیگر اسلحہ درکار تھے جو اول تو فراہم نہ کی گئیں اور بعض صورتوں میں جو اسلحہ ہمارے پاس تھیں وہ یا تو مطلوبہ تعداد میں نہ تھیں یا فرسودہ ہو چکی تھیں دشمن کے تمام یونٹ، حتیٰ کہ پولیس اور مکتی باہنی کے افراد کے پاس جدید ہتھیار اور نئی ٹرانسپورٹ تھی لیکن نو ماہ کے اس طویل عرصے میں پاک فوج کے جوانوں نے ثابت کر دکھایا کہ اصل اہمیت اسلحے کو نہیں، بلکہ اسے استعمال کرنے والے کو حاصل ہے۔

("ٹائیگر بولتا ہے" از جنرل امیر عبداللہ خان نیازی کمانڈر ایسٹرن کمانڈ) قومی ڈائجسٹ — جولائی ۱۹۷۸ء)

اے وطن تو نے پکارا تو لہو کھول اٹھا
تیرے بیٹے، ترے جانباز چلے آتے ہیں
تری میلوں میں ہے وکھیل شہیدوں کا لہو
ہم تجھے گنج دو عالم سے گراں جانتے ہیں
ہم ہیں جو غیرت و ناموس پہ کٹ سکتے ہیں
ہم ہیں جو اپنی شرافت کا علم رکھتے ہیں
ہم نے سیکھا ہے بیابانوں کو صحراؤں کو
ہم جو بڑھتے ہیں تو تعمیر بنتے چلے جاتے ہیں

اور پاکستانی انقلاب کے سیلابِ سحر خیز کی یہ موجِ اوّل تو ہے، لیکن کوئی بڑی لہر نہیں کہ جس کے ساحل سمندر پر پہنچنے کے نتیجے بس ہم فوری طور پر موتیوں اور قیمتی گھونگھوں کی تلاش میں بھاگ کھڑے ہوں ـــــ!

عزیزانِ گرامی! منزلِ مراد کا ایک سنگِ میل ہے ـــــ جو زیادہ تر نظریاتی بحث سمیٹے ہوئے ہے ـــــ کاش! کوئی بعد آنے والا اس کا دوسرا نمبر نکالے کہ جو بہت سے عملی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے شاندار خاکے، بہترین حاشیے دے سکے ـــــ! اور ـــــ بھٹکا ہوا راہی ـــــ بھٹکی ہوئی موجیں آخر پالیں اپنا ساحل ، منزلِ مطلوب ! جس کا ظفریاب اسلامی انقلاب کی تکمیل کے روشن ترین اور آنکھوں سے لگا لینے والے روشن روشن الفاظ پر مشتمل ہو ـــــ جس کے پس منظر میں میرے اندری شہیدوں کی مقدس روحیں اور آکاش کے اس پار علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کی ارواح مسرت سے لبریز جذبات کے ساتھ موجود ہوں ـــــ!!

اس کی تکمیل کے مرحلے پر ان دوستوں کا شکریہ ادا نہ کرنا نہایت کنجوسی ہوگی کہ جنہوں نے اپنی دعاؤں، نیک تمناؤں، حوصلوں اور تحریکوں سے نوازا۔ ان میں ابھرنے والے چمکتے ہوئے چہروں میں برادرم لیاقت بلوچ (صحافت) برادرم راجہ شفقت (فلسفہ) برادرم سید نعیم (کامرس)، برادرم سید متین الرحمٰن برادرم سید ابن حسن۔ برادرم حسن نوار (صحافت)، محترم سعدر چودھری صاحب محترم ظفر منصور خالد (راولپنڈی) محترم ممتاز اقبال ملک صاحب (مادوان) جنابِ سمیع اللہ اصلاحی، جنابِ یوسف بٹ (جوش لویس) برادرم ذوالفقار چودھری، برادرم اختر جاوید ملک اور بہت سے بھائی ہیں ـــــ! علاوہ ازیں ادارہ مطبوعاتِ طلبہ اور اسلامی جمعیت طلبہ کا بھی بہت شکریہ کہ جن کی مطبوعات سے استفادہ کیا

دل اس مرحلے بہت رنجیدہ ہے کہ ـــــ وہ محترم، وہ عظیم ہستی، وہ مردِ درویش جنہیں لوگ ـــــ پروفیسر عبدالحمید صدیقی صاحب کے نام سے جانتے تھے، لیکن وہ میرے لیے روحانی سہارا تھے، اور جنہوں نے اس مقالے کے خاکے کو پسند کرتے ہوئے نہایت مفید مشورے دیے اور جو وقتاً فوقتاً پیش رفت کے بارے میں پوچھا کرتے مگر قدرت کی جانب سے بلاوا آنے پر وہ ۱۸ اپریل کو ربِ کریم کے حضور جا پہنچے، انا للہ وانا الیہ راجعون! اس پرچے پر میں صرف ان کے حصے کی خواہش تھی، مگر اب تو وہ اور کہیں چلے گئے ہیں، جی چاہتا ہے کہ اسے انہی کے نام معنون کر دوں، مگر اس کا اختیار نہیں ـــــ!!

مدیرِ اعلیٰ
محور

پنجاب یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین

۱۹۷۶-۷۷ء

صدر لیاقت بلوچ (شعبۂ صحافت) →

← نائب صدر راجہ شفقت (شعبۂ فلسفہ)
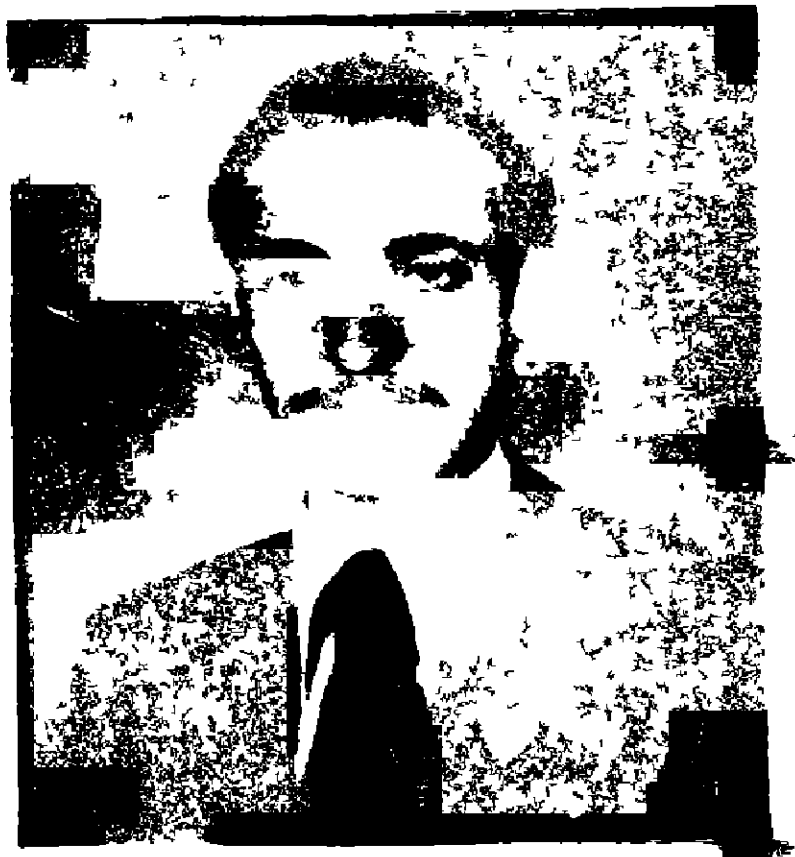
سیکریٹری محمد نعیم (شعبۂ کامرس) →

ابھی کام باقی ہے

حسب ذیل مضامین کے حصول و تکمیل کا مرحلہ درپیش تھا کہ کتاب پریس میں جا رہی تھی۔ خدا کرے کہ یہ کام کسی دوست کے ہاتھوں انجام پائے۔ (ادارہ)

۱ : تعلیم کے لیے قرآن و حدیث کی رہنمائی
۲ : تعلیمی مدارس کے لیے نصابی جائزے۔
۳ : اسلامی انقلاب اور تعلیم؟
۴ : پاکستان میں نظام تعلیم کے مقاصد کیا ہیں اور کیا ہونے چاہییں؟
۵ : معیار تعلیم کے انحطاط کے اسباب اور اس کا حل
۶ : اسلامی نظریہ تعلیم کی ترویج میں ذرائع ابلاغ کا کردار
۷ : طلبا میں بے چینی کے اسباب اور اس کا حل
۸ : پاکستان میں مختلف نظام ہائے تعلیم کا تجزیہ اور معاشرے پر ان کے اثرات
۹ : دور جدید کے نوجوان کی زندگی میں اسلامی فکر و عمل کو کس طرح جاری و ساری کیا جائے؟
۱۰ : نوجوانوں کے جذباتی مسائل
۱۱ : سائنس کی تعلیم میں نظریات کا دخل
۱۲ : عمرانی علوم کے ذریعے نظریاتی امور کی تعلیم
۱۳ : رہنمائی و مشاورت کا اسلامی تصور
۱۴ : دینی تعلیم اور عصری تقاضے
۱۵ : اساتذہ اور طلبہ کے لیے ضابطہ اخلاق
۱۶ : تدریس کو مؤثر بنانے کے طریقے
۱۷ : تعلیم یافتہ اور ہنرمند افرادی قوت کے بیرون ملک ہجرت کرنے کے اسباب و عوامل اور اس کی مؤثر بندش
۱۸ : تعلیم کو عام کرنے میں مساجد کا کردار
۱۹ : سول سروس کے تربیتی اداروں کا تنقیدی جائزہ اور تجاویز
۲۰ : مسلح افواج پاکستان کے تربیتی اداروں اکیڈمیوں کے نظام اور سسٹم کا تنقیدی جائزہ، نصاب اور تربیتی امور میں مشورے
۲۱ : حسب ذیل مفکرین کے تعلیمی نظریات: حضرت علیؓ، علی ہجویریؒ، ارسطو، مولانا اشرف علی تھانوی، حضرت شاہ ولی اللہ، جیمز مل و اسٹنگ
۲۲ : انجینئرنگ کی تعلیم میں نظریاتی آہنگ کا نفوذ
۲۳ : اسلامی یونیورسٹی۔ جامع اسکیم عمل کا خاکہ
۲۴ : اب تک بننے والے تمام پاکستانی تعلیمی کمیشنوں کا تجزیہ۔
۲۵ : پاکستان میں یونیورسٹیوں کا موجودہ ڈھانچہ تنقیدی جائزہ۔ وغیرہ وغیرہ